Асқад Мухтор

Опа-сингиллар

اسقد مختار

بہنیں

ناول

Асқад Мухтор

Опа-сингиллар
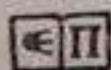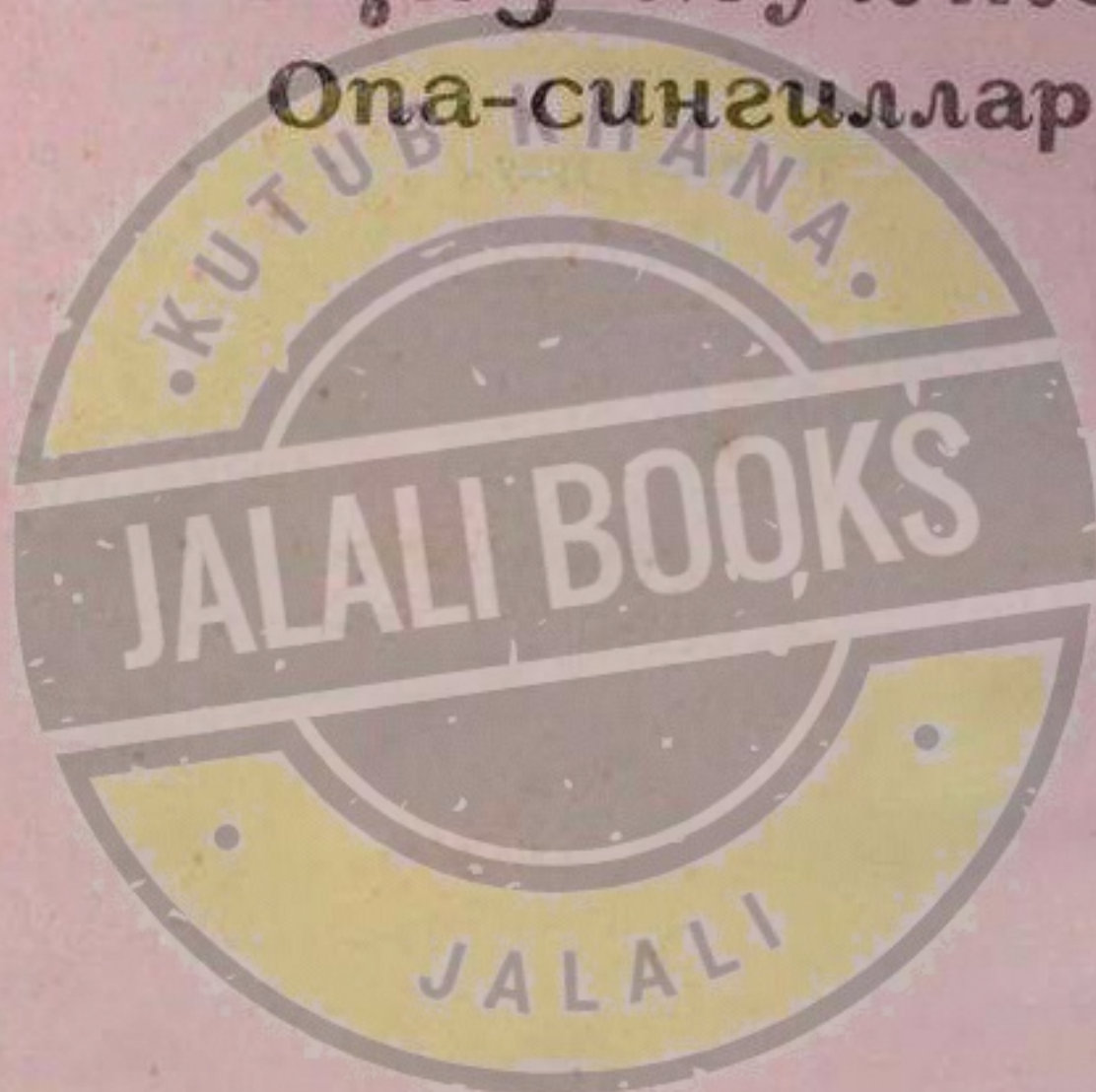
دارالاشاعت ترقی

تاشقند

ترجمہ: رضیہ سجاد ظہیر

نظرثانی: منظر سلیم

ڈیزائن: اندرئیی مارکیوچ

АСКАД МУХТАР

СЕСТРЫ

Роман

На языке урду
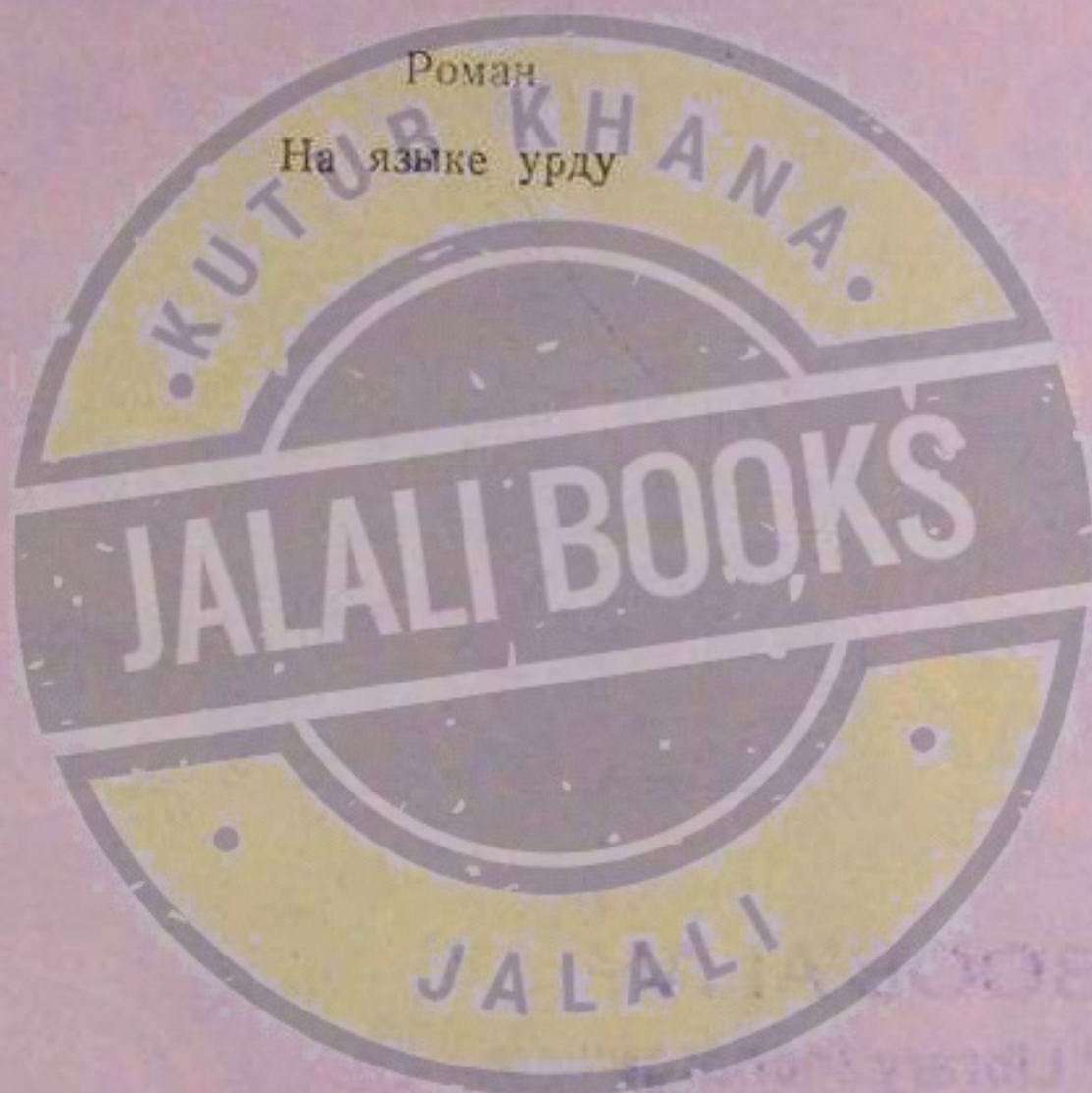
سوویت یونین میں شائع شدہ

М $\frac{70303 - 375}{014\ (01) - 78}$ 704 — 77

فہرست

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

اسقد مختار اور ان کا ناول "بہنیں"

زمانے کے ساز پر گانا —
یہی سب سے بڑا انعام ہے...
پیالی کی سطح پر جو قطرہ چمکتا ہے
اس میں آبشار کی سانس محفوظ ہوتی ہے۔

یہ اسقد مختار کی ابتدائی زمانے کی ایک نظم کی سطور ہیں۔ ان سطور میں مصنف کی تخلیقی کاوشوں کی غرض و غایت انتہائی واضح طور پر سامنے آئی ہے۔

اسقد مختار کو ہم اصلی معنوں میں زمانے کا مغنی کہہ سکتے ہیں۔ ان کی مختصر اور طویل نظموں، ناولوں اور ناولٹوں میں ازبیکستان کی زندگی کی تصویرکشی کی گئی ہے۔ ان میں جہاں ازبیک عوام کی محنت و جانفشانی کی ترجمانی کی گئی ہے، ان کے وہ عظیم کارنامے دکھائے گئے ہیں جو انہوں نے روئے زمین کو بدلنے کے سلسلے میں انجام دئے ہیں، وہاں فکر و عمل کے اس ٹکراؤ اور ان آلام و مصائب کی بھی عکاسی کی گئی ہے جن سے تاریخی نوعیت کی کوئی بھی تحریک خالی نہیں رہتی۔

اپنی طویل نظم "فولادساز" میں، جو ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی تھی اور کئی پہلوؤں سے کافی ناپختہ تھی، اسقد مختار نے ان انسانی ہاتھوں کی عظمت و توانائی کے ترانے گائے تھے جنھوں نے تپتے ریگستان کے بیچوں بیچ فولادسازوں

کے شہر بیک‌آباد کے نقوش ڈالے۔ یہ طویل نظم شہر بیک‌آباد کے وجود میں آنے کی کہانی بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ازبیک قوم کی زندگی میں رونما ہونےوالی انتہائی اہم تبدیلیوں کی داستان بھی۔

اسقد مختار نے اپنی بہترین نظمیں ان محنت‌کش لوگوں پر لکھی ہیں جن کو نام و نمود کی کوئی ہوس نہیں ہوتی جو چپکے چپکے اپنا کام کئے جاتے ہیں اور اکثر و بیشتر گرد و پیش کے لوگ ان کے وجود سے بےخبر سے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں جذباتی قسم کی وہ دو طویل نظمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن میں معمار نیاز اور موچی حیدر چچا کی رام کہانیاں سنائی گئی ہیں۔

اسقد مختار کی طویل نظم "عظیم منزل کے راہی" (۱۹۴۹ء - ۱۹۵۰ء) میں ایک ایسی پرجوش آرزو پیش کی گئی ہے، بےآب وگیاہ بیابانوں پر قابو پانے کی صبرآزما و طاقت آزما مہم ایک ایسے لطیف جذباتی انداز میں پیش کی گئی ہے کہ نظم قارئین کے ذہنوں پر گہرے اثرات ڈالتی ہے۔ نظم کے مرکزی کرداروں، ارسلان اور سلیم کا ٹکراؤ یوں تو عہد گزشتہ کی مشرقی مثنویوں میں ملنےوالا نیکی اور بدی، فراخ‌دلی اور تنگ‌دلی کا روایتی ٹکراؤ ہے لیکن اپنے اندر ایک بالکل نیا رنگ اور نیا مفہوم لئے ہوئے ہے۔ ارسلان نے اپنے محنت کے کارناموں سے جو قدرومنزلت اور شہرت پائی ہے اس سے سلیم جلتا ہے۔ وہ ارسلان پر اس بات کے لئے حسد کرتا ہے کہ ابھی کل کی بنجر زمینوں پر کپاس اگانے کا کام اس کے نہیں، ارسلان کے سپرد کیا گیا ہے...

اسقد مختار کا، محنت‌کشوں کی زندگیوں کو اس طرح اپنی توجہ کا مرکز بنانا، بڑی حد تک خود ان کے حالات زندگی کا نتیجہ ہے۔

اسقد مختار ۱۹۲۰ء میں فرغانہ میں ایک ادنی ریل مزدور کے خاندان میں پیدا ہوئے اور ان کا بچپن معمولی قسم کے محنت‌کشوں کے بیچ گزرا۔

یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ شہر اندیجان

کے ٹیچرز انسٹی‌ٹیوٹ میں ازبیک ادب کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ بعد میں کچھ عرصے تک اسی درس‌گاہ میں ازبیک ادب کے صدر شعبہ کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ اور پھر وہ ایک پیشہ‌ور مصنف بن گئے اور فولادسازوں، کپاس کے کاشتکاروں، باغبانوں وغیرہ کی خلاقانہ محنت کو، ان کی مہارت اور پر کاری کو اپنی تصانیف کا موضوع بنانے لگے۔ اور یہ کوئی اتفاق کی بات نہیں تھی۔ وہ ایک طرح سے اپنے آبائی گھر واپس آ گئے، عوام کی خلاقانہ محنت کا جو لازوال چشمہ ابل رہا تھا اس سے ایک فنکار کی حیثیت سے فیض اٹھانے لگے۔

۱۹۵۱ء میں اسقد مختار کی نظموں کا جو مجموعہ "میرے هموطن" روسی زبان میں دارالاشاعت "سوویت ادیب" ماسکو سے شائع ہوا اس کے مقدمے میں کہا گیا تھا کہ "اسقد مختار بحیثیت ایک فنکار ابھی ابتدائی مراحل طے کر رہے ہیں"۔ اور تب یہ ایک حقیقت تھی۔

اس کے بعد کے کچھ برسوں میں انہوں نے کچھ اور شعری مجموعے شائع کئے، ان کی کچھ نثری تخلیقات بھی، مثلاً "جہاں دریا ملتے ہیں"، "قاراقلپاقستان کا قصہ" وغیرہ منظر عام پر آئیں۔

مصنف کے فن میں پختگی آ گئی۔

اس کا واضح ثبوت ان کے ناول "بہنیں" سے ملتا ہے جو پہلی بار ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔

سوویت دور اقتدار کے ابتدائی برسوں میں ازبیکستان میں جو صورت حال تھی اس کی ناول "بہنیں" میں عکاسی کی گئی ہے۔ ان دنوں ازبیکستان کی زندگی سخت‌ترین قسم کی پوشیدہ جنگ کے ہنگاموں سے بھری ہوئی تھی۔ باسماچیوں (انقلاب‌دشمن مسلح غنڈوں) کے دستے کسی کسی جگہ ابھی باقی تھے اور قتل‌وغارت مچا رہے تھے۔ ان مسلح غنڈوں کے سہارے نظام کہنہ کے پرستار، ان عظیم تبدیلیوں کو روکنے کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے جو عوام‌الناس کی زندگی میں اور ان کے ذہنوں میں روز بروز زیادہ نمودار ہو رہی تھیں۔

ناول "بہنیں" میں جس زمانے کے واقعات بیان کئے گئے

هیں اس کے لحاظ سے یہ تخلیق یوکرینی مصنف استیلمخ کے مشہور و معروف ناول "انسانی خون پانی تو نہیں ہے" سے بہت ہی قریب ہے۔ ان دونوں ناولوں کی تخلیق سے کافی پہلے، ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۶ء کے درمیان نومشق روسی مصنف شولوخوف اپنی "ڈان کی کہانیاں" لکھ چکے تھے جن میں انہیں دنوں کا ذکر کیا گیا تھا۔

ڈان کا علاقہ، یوکرین اور ازبیکستان — ان تینوں کے درمیان ہزاروں کیلومٹر کا فاصلہ ہے۔ ان علاقوں میں بسنےوالی تینوں قوموں کے تاریخی ارتقا کے راستوں میں، رہن سہن کے طور طریقوں میں اور سوچنے سمجھنے کے انداز میں زمین و آسمان کا سا فرق ہے۔ متذکرہ بالا تینوں مصنفوں کے اسالیب بیان الگ الگ ہیں۔ ان کا تجربۂ حیات بالکل مختلف ہے۔ پھر بھی ان تینوں میں ایک چیز مشترک بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ تینوں ہی اپنے عہد کے تاریخی تغیرات کو لبیک کہتے ہیں، انقلاب کے پیدا کئے ہوئے نئے نظام حیات کو اپناتے اور اس کے استحکام و ارتقا کا پیغام سناتے ہیں۔ یہی وہ اندرونی قسم کا اٹوٹ رشتہ ہے جس کے ذریعے تمام سوویت ادیب اشتراکی حقیقت‌نگاری کے نظریۂ فن کی بنیاد پر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔

کسی مصنف کی مہارت، اس کی ذہانت اور عصری مسائل کی تہہ تک پہنچنے سے متعلق اس کی صلاحیت، اکثروبیشتر کرداروں کے انتخاب ہی میں سامنے آ جاتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سماج میں جب کوئی انقلاب آتا ہے تو اختلافات کی بیسیوں سال سے، بلکہ صدیوں سے سلگتی ہوئی آگ ایکدم بھڑک اٹھتی ہے۔ اسی قسم کے اختلافات میں سے ایک، خواتین مشرق کی حالت سے متعلق تھا جو جملہ حقوق سے محروم تھیں اور باندیوں کی سی زندگی بسر کرتی تھیں۔

اسقد مختار نے اپنا ناول "بہنیں" ازبیک عورتوں پر لکھا ہے۔ ان عورتوں پر جنھوں نے صدیوں پرانے فرسودہ رسم‌ورواج کے خلاف بغاوت کی تھی اور جن کے لئے انقلاب نے محبت

پر مبنی سوچی سمجھی ہوئی آزادانہ زندگی کا راستہ کھول دیا تھا۔

ناول کی ابتدا بنکروں کے محلے نعمانچہ کی تصویرکشی سے ہوتی ہے جس کے ذریعے مصنف ہم کو پیش آنےوالے واقعات کے پس منظر سے واقف کراتا ہے، اس زمانے کی جو ملک کی تاریخ میں "نیپ* زمانے" کے نام سے مشہور ہے، علامات کو بڑے مؤثر فنکارانہ انداز میں دکھا دیتا ہے۔ یہی نہیں، مصنف یہ بھی دکھاتا ہے کہ وہ اختلاف، وہ تنازعہ جو ناول کے واقعات کا محرک ہے، ایک خاص قومی نوعیت کا ہے۔

مزدور عورتیں، نیپ والے سیٹھ قدرت‌الله خواجہ کے کارخانے میں ان کی سخت محنت، دھول سے اٹی ہوئی وہ گلیاں جہاں وہ رہتی ہیں، ان کے شکستہ مکان، ان سب کی تصویرکشی مصنف نے بڑے خلوص اور محبت سے، بڑے اپنےپن سے کی ہے۔ ناول سے صاف جھلکتا ہے کہ جن عورتوں نے پرنجے (برقعے) اتار پھینکنے اور نئی زندگی کو لبیک کہنے کی جرأت کی، ان کے لئے مصنف کے دل میں گہری ہمدردی ہے، ان پر مصنف کو ناز ہے۔ اور یہ اس بات کا مظہر ہے کہ ان انقلابی واقعات میں جن کو مصنف نے بیان کیا ہے، تبدل و تغیر کی ایک عظیم طاقت پوشیدہ ہے۔

ناول "بہنیں" سخت‌ترین قسم کے تنازعات اور ہنگامہ‌خیز واقعات سے بھرا ہوا ہے۔ ناول اس بات کا آئینہ‌دار ہے کہ کس طرح نئے عزائم کے طوفان نے قوم کی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کر دیا ہے: معاشی اور سماجی پہلو کو بھی (کوآپریٹوں کا قیام، کپڑا بنانے کے سرکاری کارخانے کی تعمیر، نجی دکانوں، کارخانوں کا خاتمہ، ازبیکستان میں مزدور طبقے کا وجود میں آنا، اشتراکی قوتوں کی پیش قدمی وغیرہ)، اخلاقی اور ذہنی پہلو کو بھی (آزادیٔ خواتین کی تحریک عورتوں کو مردوں کے برابر کے حقوق دلانے، ان میں احساس خودی پیدا

---

* نئی اقتصادی پالیسی جس کی رو سے سرمایہ‌داروں کو عارضی طور پر کچھ حد تک چھوٹ دی گئی تھی۔ مترجم۔

کرنے، خوداعتمادی کے جذبے کو بیدار کرنے اور دینی تعصبات کا خاتمہ کرنے کی خاطر جدوجہد) اور رہن سہن کے طریقوں کو بھی۔

ناول کے تمام کردار بالکل واضح طور پر دو گروہوں میں بنٹے ہوئے ہیں۔ ایک طرف نعمانچہ کے محنت پیشہ لوگ ہیں۔ اناخان، جوراخان، حاجیہ جیسی ازبیک عورتیں ہیں، ان کے انقلابی دوست ہیں، بالشویک پارٹی کے ممبران یفیم دانیلووچ اور ایرگاش اور انجینیر دوبروخوتوف جو پارٹی میں شامل نہیں ہے۔ اور دوسری طرف مقامی امیر، ارباب دین، نیپ والا سیٹھ قدرت‌الله خواجہ، ٹیچر نعیمی اور جاسوس چائے کا تاجر وغیرہ۔

مصنف اپنے کرداروں کی معاشرتی اور گھریلو زندگیوں سے متعلق، ان کی ذہنیت اور طرز فکر سے متعلق خصوصیات کو اچھی طرح سمجھتا ہے جو ان کے افکار و اعمال پر بڑی حد تک اثرانداز ہوتی ہیں۔

جوراخان ایک مجاہد عورت ہے۔ وہ ماسکو ہو آئی ہے، لینن سے مل چکی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں لینن کے مہربان ہاتھوں کے لمس کی حرارت محفوظ ہے۔ وہیں ماسکو میں اس نے اپنا پرنجے اتار پھینکا۔ وہیں اس نے وہ راستہ اختیار کیا جس پر انتہائی ثبات و استقلال کے ساتھ چلتے ہوئے بالآخر دشمنوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئی۔ اس کی طبیعت میں جہاں نسائیت ہے، نرمی و تحمل ہے، وہاں رعب و تحکم، ثبات واستقلال بھی ہے جو اس کام کا نتیجہ ہے جس کو جوراخان ایک پارٹی اور سرکاری کارکن کی حیثیت سے سالہا سال تک بڑے جوش‌وخروش سے انجام دیتی رہی ہے۔ وہ اشتعال دلانےوالے ٹیچر نعیمی کو ٹوکتے ہوئے حیرت‌انگیز حد تک تیزوتند ہو جاتی ہے لیکن اپنی بھولی بھالی، دبی اور کچلی ہوئی "بہنوں" کے ساتھ ہمیشہ بےانتہا صبروتحمل اور ہمدردی سے پیش آتی ہے۔

اناخان گزشتہ زندگی سے ناطہ توڑتے ہوئے ذرا زیادہ پس‌وپیش کرتی ہے۔ لیکن ایک بار قدم آگے بڑھانے کے بعد پیچھے

مڑکر نہیں دیکھتی۔ نہ دھمکیوں سے اس کے قدم ڈگمگاتے ہیں اور نہ ہی قاتلانہ حملے اس کی ہمت کو توڑ پاتے ہیں۔

نزاکت جو ایک زندہ‌دل اور ہنسی مذاق کی دلدادہ عورت ہے، نئی زندگی کی طرف کھنچتی بھی ہے اور ایسا کرتے ہوئے جھجکتی بھی ہے۔ وہ عام رجحان کے زیر اثر اپنا پرنجے اتار بھی پھینکتی ہے اور مولوی کے ڈرانے دھمکانے پر اسے دوبارہ اوڑھ بھی لیتی ہے۔ اس کی زندگی مقابلتاً پرسکون اور خوشگوار ہے۔ اس کو ویسے آلام و مصائب نہیں اٹھانے پڑے ہیں جیسے کچھ دوسری عورتوں، مثلاً اناخان کو جھیلنے پڑے ہیں (اس کا گھربار تباہ ہوا، اس کا شوہر مستری صابر انقلاب کی خاطر لڑتے ہوئے ہلاک ہوا)۔

بوڑھی عنظیرت جو دادی شکراللہ کے نام سے مشہور ہے اور ہر اس چیز کے سامنے گھٹنے ٹیکتی ہے جو روایتی ہو، جس پر پرانی ہونے کی یا دین کی مہر لگی ہوئی ہو، نئے طرزحیات اور نئی اقدار کو اپنانے میں سب سے زیادہ پس و پیش کرتی ہے۔

الغرض جہان کہنہ کی طاقتوں کے ساتھ شدیدترین جنگ کے نازک حالات میں ہیروئنوں میں سے ہر ایک جو چال ڈھال اختیار کرتی ہے اس کو مصنف ہیروئن کے اپنے خاص حالات‌زندگی اور طرز فکر پر منحصر بتاتا ہے۔

قومی ڈھانچہ اور اشتراکی مضمون و مفہوم جن چیزوں کو کہتے ہیں ان کی یگانگت غالباً کرداروں میں زیادہ سے زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے۔ چنانچہ زیر بحث ناول میں لوگوں کی طبیعتوں اور ان کے سوچنے کے انداز میں، ان کی زندگیوں اور رہن سہن کی قومی خصوصیات بالکل واضح طور پر نظر آتی ہیں۔

اسقد مختار کی مہارت سب سے زیادہ اسی بات میں ظاہر ہوئی ہے کہ انہوں نے خاص قومی قسم کے ایسے کردار تخلیق کئے ہیں جو قارئین کے ذہنوں پر نقش ہو جاتے ہیں، جو اس ماحول سے پوری مطابقت رکھتے ہیں جس میں انہوں نے پرورش پائی ہے۔ یہ سارے کردار متحرک ہیں، تاریخ کے ساتھ ساتھ آگے

بڑھتے جاتے ہیں، واقعات کے زیراثر ان کے مزاجوں میں تبدیلیاں آتی جاتی ہیں۔

ناول کو پڑھتے ہوئے ہم اس بات کو نوٹ کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مصنف ازبیک عورتوں کی طبیعت کی باریکیوں، ان کے طرزفکر کی خصوصیات پر سے جنھوں نے ایک لمبی تاریخی مدت میں تشکیل پائی ہے، پردہ اٹھاتے ہوئے بڑی احتیاط اور شائستگی سے کام لیتے ہیں۔

ناول کی صف اول کی ہیروئنیں، جوراخان اور اناخان تو مجموعی طور پر صدیوں پرانی زنجیروں سے چھٹکارا پا چکی ہیں۔ چنانچہ دوسرے، تیسرے درجے کے چھوٹے موٹے نسوانی کردار ہمارے لئے بہت اہم ہو جاتے ہیں۔ ہمارے لئے ناول کے ان ٹکڑوں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے جہاں عورتیں بڑی تعداد میں اکٹھا نظر آتی ہیں۔

عورتوں کے ایک جلسے میں ٹیچر نعیمی تقریر کر رہا ہے۔ وہ عورتوں سے کہہ رہا ہے کہ "اپنے گھروں کی چہاردیواریوں میں سے نکل کر باہر آ جاؤ، کوآپریٹو میں شامل ہو جاؤ، پرنجے اتار پھینکو، اپنے بچوں کو نرسری کے حوالے کر دو، اگر تمہارے شوہر تم لوگوں کو روکنا چاہیں تو اس کی کوئی پرواہ نہ کرو" وغیرہ وغیرہ۔

بظاہر یہ باتیں بالکل صحیح ہیں، بالکل "انقلابی" قسم کی باتیں ہیں۔ لیکن ان کو سن کر عورتیں جلسے سے اٹھ اٹھ کر جانے لگتی ہیں کیونکہ ان کے نزدیک جو کچھ ماں کے دودھ کے ساتھ آکر عورتوں کے رگ رگ میں رچ بس چکا ہے، مثلاً شوہر کی عزت، خاندان کی محبت وغیرہ اسے ایک دم اس بیدردی سے روندا کچلا جا رہا ہے۔

ہاں، دراصل ٹیچر نعیمی انقلاب کے پردے کی آڑ میں ان عورتوں کو جان بوجھ کر اشتعال دلا رہا ہے۔ جوراخان بڑی مشکل سے ان کو روک کر انہیں تسلی دے پاتی ہے۔

ازبیک عورتوں کو چھٹپن ہی سے یہ بات ذہن‌نشیں کرائی جاتی رہی تھی کہ شوہر اور باپ کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرنا چاہئے۔ عورتوں کے نام تک نہیں لئے جاتے تھے۔

وہی عورتیں اچانک کیا دیکھتی ہیں کہ جوراخان نے ٹیچر کو بڑی سختی سے ٹوک دیا ہے، اس سے بڑے غصے سے کہا ہے: "بیٹھ جائیے!"

"لیکن زمین پھٹی نہیں- مرد نے اس کو مار نہیں ڈالا... لیکن پھر بھی منظر تھا بڑا دھشتناک"-

یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے لیکن مصنف نے اس میں کتنا بڑا مضمون بھر دیا ہے!

اور پھر انہیں عورتوں کو ہم کپڑا بنانے کے کارخانے کی تعمیر میں شرکت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں- ہم ان کو اپنے پرنجے اتار اتارکے پھینکتے ہوئے دیکھتے ہیں- جہاں کہنہ کی سیاہ طاقتوں نے جوراخان کو قتل کر دیا ہے- جوراخان جو ان عورتوں کی حمایتی تھی، جس سے وہ دل و جان سے محبت کرتی تھیں- اب ان سیاہ طاقتوں سے اپنی پیاری جوراخان کا بدلہ لینے کی خاطر وہ سب ایک ہی رو میں اپنے پرنجے اتار اتارکر نذر آتش کر رہی ہیں-

مصنف مرکزی کردار اناخان میں پیدا ہونےوالی ذہنی تبدیلیوں کی، اس کی طبیعت کی تدریجی ترقی کی تصویرکشی بیحد مہارت سے کرتا ہے- وہ اناخان کی زندگی کے ظاہری واقعاتی ڈھانچے کو خیالات وجذبات سے بھرتا جاتا ہے-

اناخان کا شوہر صابر ریلوے ورکشاپ میں ملازم تھا- وہیں بالشویکوں سے اس کی جان پہچان ہو جاتی ہے- انہیں کے زیر اثر صابر کے دل و دماغ میں تبدیلیاں آنے لگتی ہیں- وہ اپنی بیوی اناخان کے ساتھ بھی دوسری طرح کا سلوک کرنے لگتا ہے: اس کے ساتھ گھل مل‌کر باتیں کرتا ہے، اپنے دل کی باتیں اس کو سناتا ہے اور اس کی رائے پوچھتا ہے-

اس پر اناخان بڑی متعجب ہوتی ہے- "اس نے اس سے پہلے کبھی اپنے شوہر کو اتنا خوداعتماد اور طاقتور اور اتنا حسین نہیں دیکھا تھا- لیکن بیوی کے ساتھ ہمدردی رکھنا ایک مرد کو زیب تو نہیں دیتا- اس کو اپنی فکر کبھی نہیں ہوئی تھی- اپنے سکھ آرام کا خیال اس کو کبھی نہیں آیا تھا- دکھ تو

اس کی قسمت ہی میں لکھا ہے۔ اس کی ماں اور ماں کی ماں ایسے ہی رہتی آئی ہیں"۔

اپنے کرداروں کی تصویریں کھینچتے ہوئے مصنف اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ جس چیز نے عورتوں کو پرانے نظامِ حیات کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا وہ صرف ماحول ہی نہیں تھا، باہری حالات ہی نہیں تھے۔ اس غلامی کی ایک وجہ خود عورتوں کی ذہنیت بھی تھی۔ آزاد ہونے کے لئے ضروری تھا کہ ان کی ذہنیت میں انقلاب آئے، ان کے دل‌ودماغ فرسودہ خیالات کے زہر سے پاک ہو جائیں، وہ اپنے انتہائی احساس کمتری سے چھٹکارا پا جائیں...

دشمنوں کی چھری کی کاری ضرب کے بعد صحت‌یاب ہوتے ہی اناخان دشمنوں کو چیلنج کرتے ہوئے زندگی میں پہلی دفعہ پرنجے کے بغیر گھر سے باہر نکلی ہے...

"اس کے قدم تو مضبوطی سے پڑ رہے تھے مگر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ پیر تلے زمین ڈگمگا رہی ہے۔ جیسے صرف لوگ نہیں، در و دیوار بھی اس کو گھور رہے ہوں۔ پرنجے کے بغیر سر اٹھانا کتنا مشکل تھا، سامنے دیکھنا کتنا دشوار، معمولی چال چلنا کتنا محال"۔

اسعد مختار اپنے کرداروں کے باطن، ان کے تفکرات کی عکاسی بڑی صداقت سے اور قابل یقین انداز میں کرتے ہیں اور ہر دفعہ ان کے افعال، چال ڈھال اور حرکات‌وسکنات میں ذہن‌نشیں ہو جانے‌والی ایسی چھوٹی موٹی چیزیں ڈھونڈ نکالتے ہیں جو کرداروں کے ذہنوں میں، ان کی طبیعتوں میں ہونے‌والی گہری تبدیلیوں کی غمازی کرتی ہیں۔

جب شوہر نے بتایا کہ ہمارے ہاں ایک روسی آئےگا، تو اناخان سراسیمہ ہو گئی — دنیا کیا کہےگی؟ ہمسایے کیا سوچیں گے؟ اس نے تصور کیا کہ نعمانچہ کی ساری عورتیں کہہ رہی ہیں: "اناخان کو دیکھو، اس نے اپنے گھر میں روسیوں کا خیرمقدم کرنا شروع کر دیا، اس کا شوہر اپنے شراب‌خانے کے دوستوں کو گھر لاتا ہے۔ پھر تو سب ہی اناخان اور صابر سے

کنا کاٹنے لگیں گے، ان سے کترا کے نکلا کریں گے، وہ اناخان کو کام دینا بھی بند کر دیں گے"۔

لیکن کچھ دنوں بعد جب اس نے پرنجے اتار پھینکا اور بڑی حیرت اور خوشی کے ساتھ اپنے آپ کو ایک انسان محسوس کرنے لگی تو وہ روسی آدمی انجینیر دوبروخوتوف اس کو بہت پسند آ گیا اور جب اس آدمی پر برا وقت پڑا، جب وہ لوگوں کی بہتان‌تراشیوں کا شکار ہو گیا تو اناخان نے نڈر ہوکر اس کی حمایت کی۔

واقعات کے سلسلے میں یکے بعد دیگرے وقت کی علامات نظر آنے لگتی ہیں، مثلاً سرخ فوج سے رٹائر ہوکر آنےوالے ایرگاش نام کے ایک غریب نوجوان کی نظروں سے ہم نجی قسم کے کیفے، بازار کی بدعنوانیاں، منافع خوری کے ہنگامے وغیرہ دیکھتے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر نوجوان کا خون کھول اٹھتا ہے۔ اس سب کو نیست‌ونابود کرنے کو اس کا جی چاھتا ہے۔ جو کچھ وہ نوجوان دیکھتا ہے اور اس کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں وہ "نیپ" کے زمانے کی علامات ہیں ہی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نیک‌دل لیکن سیاسی شعور کے لحاظ سے اناڑی سپاہی کا جوشیلاپن، اس کے مزاج کی تیزی و تندی بھی اس تاریخی مرحلے کی ایک خاصیت ہے۔

بہت سی ایسی چیزیں جو پرانے شہر کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں، مصنف نے جوراخان کی وساطت سے پیش کی ہیں۔ مثال کے طور پر ذہن میں نقش ہو جانےوالے اس چھوٹے سے منظر کو لیجئے۔ ایک دن جب فضا میں آگ سی بھری ہوئی تھی اور ناقابل برداشت گھٹن تھی، ایک بےحد موٹا تازہ آدمی ایک سجے سجائے گدھے پر سوار آکر چائےخانے کے پاس رکتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک عورت ایک پرانے پیوند لگے پرنجے میں لپٹی اور ایک بچے کو گود میں لئے آتی ہے۔ وہ موٹا آدمی چائےخانے کے چبوترے پر ٹھنڈک میں بیٹھا بڑے آرام سے چائے کی چسکیاں لیتا ہوا اپنی تھکن مٹانے میں مصروف رہتا ہے اور اس کی بیوی باہر دھول سے اٹی ہوئی زمین پر بیٹھی اپنے بچے کو دودھ پلاتی رہتی ہے...

یہ سب قاری جوراخان کی نظروں سے دیکھتا ہے- یہی وجہ ہے کہ یہ منظر دیکھ‌کر وہ غصے سے تلملا اٹھتا ہے- یہاں جوراخان کا دل — انسان کے لئے ہمدردی اور مہرومحبت سے بھرا تڑپتا ہوا دل، بالکل کھل‌کر سامنے آ جاتا ہے-

اسقد مختار کی یہ تصنیف عورت کے لئے بےحد عزت اور احترام کے جذبے سے بھری ہوئی ہے- اس میں ایک عورت کا غم و غصے سے بھرا ہوا احتجاج، اس کی جرأت اور دلیری بڑے شاعرانہ انداز میں پیش کی گئی ہے- یہ کتاب ایک ایسی عورت کے متعلق ہے جو ایک ساتھی ہے، ایک مہربان بہن ہے-

ناول "بہنیں" یوں تو ایک نہایت واضح اور مکمل چیز ہے— لیکن پھر بھی فنی لحاظ سے یکساں طور پر پختہ نہیں ہے- اس میں کہیں کہیں کچھ خامیاں نظر آ ہی جاتی ہیں-

مصنف نے دشمنوں کے جو کردار پیش کئے ہیں ان میں ٹیچر نعیمی، امیرزادہ نصرت‌الله، نیلی مسجد کے امام عبدالمجید خواجہ، دکاندار متقوول کے کردار سب سے زیادہ واضح اور ذہن میں نقش ہونےوالے ہیں، ان میں سے ہر ایک میں "طبقاتی علامت" کے علاوہ کچھ ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جو صرف اسی کا خاصہ ہیں اور اس کردار کے سچا ہونے کا ثبوت ہیں-

ٹیچر نعیمی جو سوویت نظام حکومت کے دوست کا نقاب اوڑھے ہوئے ہے، مختلف جگہوں پر، مختلف مواقع پر بولتے ہوئے نظر آتا ہے: اسکول میں، عورتوں کے جلسوں میں، قدرت‌الله خواجہ کے گھر پر، چائے کے تاجر کے ساتھ گفتگو میں... اس کی شخصیت کے نئے نئے پہلو کھلتے جاتے ہیں اور اس طرح ہمارے ذہن کے پردے پر اس کی ایک واضح اور مکمل تصریر بن جاتی ہے-

امیرزادہ نصرت‌الله کا کردار بھی کافی محنت سے تخلیق کیا گیا ہے- وہ یوں ہی ایک آوارہ و ناکارہ عیش‌پرست آدمی نہیں ہے- اس میں کبھی کبھی انسانیت کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے- وہ تذبذب میں پڑ جاتا ہے، اس کے ارادوں کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں— یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مصنف اپنے

1—2710

کردار کی باطنی گہرئیوں تک اترنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
مصنف کے خیال سے سوویت نظام کے دشمنوں میں چائے کے تاجر کو سب سے زیادہ چالاک اور سب سے زیادہ دھن کا پکا ثابت ہونا تھا - متعدد اہم واقعات کا سلسلہ اسی سے جاکر ملتا ہے۔ اتاخان پر قاتلانہ حملہ، ٹیکسٹائل مل کے تعمیراتی پروجیکٹ میں توڑ پھوڑ کا کام، جوراخان کا قتل، ان سب میں اسی چائے کے تاجر کا ہاتھ محسوس ہوتا ہے۔ لیکن ناول ختم ہو جاتا ہے اور اس آدمی کی شخصیت پر پڑا ہوا راز کا پردہ اٹھ نہیں پاتا۔
آج روزمرہ زندگی میں اور لوگوں کے ذہنوں میں عہد گزشتہ کے اثرات کا خاتمہ کرنے کی خاطر ملک بھر میں فیصلہ کن جد و جہد ہو رہی ہے۔ اور ان اثرات میں سے زیادہ نفرت انگیز اور ذلیل چیز ہے عورتوں کے ساتھ جاگیردارانہ، مالکانہ سلوک جو آج بھی کبھی کبھار دیکھنے میں آ جاتا ہے۔
اس لحاظ سے اسعد مختار کا ناول "بہنیں" عہد گزشتہ کا آئینہ‌دار ہونے کے ساتھ ہی ساتھ عہد حاضر کے لئے بھی یقیناً اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ناول جو ازبیک نثری ادب کا کمال و پختگی کی چوٹیوں کو چھو چکا ہے، ایک تازہ شاہکار ہے۔

ایل۔ یکیمینکو

پہلا باب

نعمانچہ پرانے شہر سے کافی دور کے ایک علاقے کا نام تھا جہاں سدا سے بنکر لوگ رہتے آئے تھے۔

وہاں باپ اپنے بیٹوں کو ہمیشہ سے یہی کاروبار سکھاتے تھے، عورتیں سوت کاتتی تھیں اور مرد "متا" بنتے تھے جو ایک قسم کا موٹا کپڑا ہوتا تھا۔ اگر کوئی باپ مر جائے اور بیٹے کے لئے کرگھا نہ چھوڑ جائے تو یہ بڑی بدبختی سمجھی جاتی تھی۔ "چرخی" اور "نلکی" ان الفاظ میں سے تھے جو بچوں کی زبانوں پر سب سے پہلے آتے تھے اور ہر بچے کو شروع سے یہ سمجھایا جاتا تھا کہ انسان ہنر ہی کے ذریعے زندہ رہتا ہے۔

نعمانچہ میں ایسے بنکر بھی تھے جو اپنی پچھلی سات پشتیں گن کر یہ ثابت کر سکتے تھے کہ وہ سب بنکر ہی تھیں لیکن ایسا کوئی بنکر اب تک پیدا نہیں ہوا تھا جو اپنی کمر کے کسنے کے لئے بھی پٹکا خرید سکتا۔ ویسے بنکر کے پیشے میں کوئی بھوکوں تو نہیں مرتا تھا مگر اس پیشے میں وہ غریبی کے پنجے سے آزاد بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ لوگ بچپن ہی سے گندی، استعمال شدہ روئی کو چھڑوں سے پیٹتے رہتے تھے اور چالیس

برس کی عمر تک پہنچنے سے قبل ہی پھیپھڑوں کے چھلنی ہو جانے سے مر جاتے تھے۔ انہیں بنکر کی تقدیر کا علم تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے بچوں کو یہی مہلک پیشہ سکھاتے چلے جاتے تھے۔

گرمیوں کے موسم میں نعمانچہ کی گلیاں گھنی دھول سے اٹ جاتی تھیں۔ دھول کی ایک بھوری، بےجان چادر، چھتوں، مٹی کی دیواروں، یکا دکا پیاسے درختوں کے گرد لپٹی رہتی۔ روئی کے گندے ٹکڑے چھڑیوں سے دھنک کر صاف اور تازہ کر دئے جاتے اور ان سے نکلنےوالی دھول ہوا میں کہرے کی طرح بےحس و حرکت لٹکی رہتی۔ یہ دھول لوگوں کے ہاتھوں پر، چہروں اور کپڑوں پر جم جاتی تھی۔ آنگنوں میں جو مٹی کی شکستہ دیواروں کے سوراخوں سے اپنی تمام برہنگی کے ساتھ دکھائی دیتے، چاروں طرف بکھر جاتی تھی۔

یہ ایک بےرونق، تیرہ‌وتار اور حقیر علاقہ تھا۔ صرف ایک جگہ، نیلی مسجد کے پرے ایک محل جیسا مکان تھا جس کا پھولوں کا شاداب باغ یوں نظر آتا جیسے بےآب اسٹیپ کے بیچ نرکل اور پتاور کی گھنی جھاڑیاں۔ یہ قدرت‌الله خواجہ کا مکان تھا جو بنکروں کے اس علاقے کے پرانے مالکوں کے سلسلے کی آخری کڑی تھا۔ پہلے ایسے بہت سے لوگ تھے جو نعمانچہ کے جیتے جاگتے جسم کو جونک کی طرح لپٹے، اس کا خون چوستے رہتے تھے۔ علاقے کے بڑے بوڑھے اب بھی ان باعزت لوگوں، رقوم کا ہیر پھیر کرنےوالوں، سودخوروں اور دکان‌داروں کے نام بتا سکتے ہیں جو بنکروں کو رقمیں ادھار دیتے اور ان کی ادائیگی کے طور پر بنکروں کا تیار کیا ہوا مال لے لیتے تھے۔

سات سال ہوتے ہیں کہ نئی زندگی کی آبیاری نعمانچہ تک بھی پہنچی اور اس کے ذریعے محنت‌کشوں کے اس قصبے میں جان پڑنے لگی، لوگوں کے دل مضبوط ہوئے، نئی حکومت نے پہلی بار ان سے کہا کہ "ان کا ہنر، ان کا پیشہ احترام کے لائق ہے، سودخوری ایک نیچ اور ذلیل کام ہے"۔

مرد بنکروں نے متحد ہوکر ایک کوآپریٹو بنائی جس کا نام انھوں نے "سرخ سوتی مزدور" رکھا۔

لیکن قدرت اللہ اس پہلے وار سے پسپا نہیں ہوا تھا، وہ ادھار چلایا کرتا تھا لیکن اب نئی معاشی پالیسی کا حامی اور اس پالیسی کے تحت ایک نجی آجر بن گیا۔ اس نے سعید وقاس نامی عباؤں کے ایک تاجر کا جو تاشقند کے شیخن طور حصے میں رہتا تھا، کاروبار خرید لیا، وہاں سے مشینیں وغیرہ نعمانچہ میں واقع اپنی کاروان سرائے منتقل کر دیں اور اس جگہ اس نے خاصی بڑی ورکشاپ قائم کر دی۔ مرد تو سب ہی کوآپریٹو میں کام کرنے لگے مگر عورتیں گھروں میں رہتی تھیں۔ چنانچہ بنکر عورتوں اور خاص کر دستکاروں کی بیواؤں نے قدرت اللہ کے کارخانے میں کام کرنا شروع کر دیا۔

یہ کاروان سرائے ایک ایسی جگہ پر تھی جہاں کسی زمانے سڑک پر کافی بھیڑ بھاڑ رہتی تھی اور وہاں سے ہی ان دو پن چکیوں کو راستہ جاتا تھا جو اب بے کار پڑی تھیں۔ جس زمانے میں یہ پن چکیاں چلتی تھیں، بھری ہوئی گاڑیاں سڑک پر دھچکے کھاتی دھول کے بادل اڑاتی، ادھر سے گزرا کرتی تھیں، گاڑی بان اپنے گھوڑوں پر سوار، دیواروں پر سے جھانک جھانک کر نعمانچہ کی زندگی کا تاریک پہلو دیکھا کرتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی بانکا، آنگنوں میں کرگھوں پر کام کرتی یا روئی کی چھنٹائی کرتی لڑکیوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے گلا پھاڑ کر گانے لگتا۔ لیکن اب تو یہاں پانی کے نالے سوکھ جانے کی وجہ سے وہ پن چکیاں یوں ہی پڑی ہوئی تھیں۔ لوگ ان کا نام بھی بھول چکے تھے اور اب وہ جگہ قدرت اللہ کے "نئی قومی اقتصادی پالیسی کا کارخانہ" کے نام سے مشہور ہو چکی تھی۔

ایک لمبی نیچی عمارت کی دیوار سڑک کے برابر برابر چلی گئی تھی، عمارت کی چھت چھپر کی تھی جو اندر آنگن کی طرف جھکی ہوئی تھی اور اس کو بھوسے اور گوبر سے لیپ دیا گیا تھا۔ سادی اور بے کھڑکی کی دیوار کے اس رخ پر جو سڑک کی جانب تھا بھونڈے پن سے سفیدی کر دی گئی

تھی اور کچھ تو اس سفیدی کے، اور کچھ عمارت کی لمبائی کے باعث ورک‌شاپ علاقے بھر میں نمایاں حیثیت اختیار کر گئی تھی۔

یہاں کے پھاٹک ہمیشہ کھلے رہتے تھے اور ان کے سامنے گندے پانی کا ایک بڑا سا جوہڑ تھا جس پر خوب گھری موٹی سبز کائی جمی ہوئی تھی۔ جوہڑ جون کے گرم‌ترین دنوں میں بھی خشک نہیں ہوتا تھا۔

کیچڑ میں لتھڑے ہوئے ایک تختے کا، جسے کسی قوقندی گاڑی کے اونچے پہیئے کیچڑ سے باہر کھینچ لائے تھے، ایک سرا پانی کے اوپر ابھرا ہوا تھا (یہاں کسی زمانے میں ایک چھوٹا سا پل ہوا کرتا تھا)۔ شہتوت کا ایک پرانا پیڑ جس کی اس جانب کی شاخیں کاٹ دی گئی تھیں اور جدھر سے گاڑیاں گزرا کرتی تھیں، جوہڑ پر سایہ کئے ہوئے تھا۔ اس کی مضبوط شاخوں پر جو گھنی جھاڑی کی طرح خشک تھیں، روئی کے ننھے ننھے ٹکڑے چپکے ہوئے تھے۔

آنگن میں بھی ایک بڑے سے سائبان کے نیچے ایک گاڑی کھڑی تھی جس میں بید کی ٹوکریاں روئی سے بھری ہوئی رکھی تھیں اور ایک سرخ گھوڑا پاس ہی بندھا، لید بھری گھاس کو سونگھ سونگھ کر "فوں فوں" کر رہا تھا۔

اس کارخانے کے اندر جانے کے لئے جھکنا پڑتا تھا کیونکہ آنگن میں آر پار بندھی الگنی پر سوت کی رنگ برنگی لچھیاں لٹکتی رہتی تھیں۔ اندھیرے ہال میں سے ایک دروازہ دائیں اور ایک بائیں کو کھلتا تھا، بائیں جانب ہوا میں آٹے کی سی سفید دھول برابر اڑی رہتی تھی اور دائیں طرف سے ایسی کھٹاکھٹ مسلسل سنائی دیتی تھی کہ دماغ اڑائے دیتی تھی۔ داھنی جانب کا دروازہ جب بھی کھولا جاتا کھٹاکھٹ کا یہ شور بہت بلند ہو جاتا۔ یہ تھا دکان‌خانے، بنکروں کا سائبان۔ فرش پر کتھئی رنگ کی میلی میلی اینٹیں جڑی ہوئی تھیں۔ کھڑکیوں کے نام پر صرف چھت میں چھوٹے چھوٹے چھید تھے جن پر روغنی کاغذ مڑھا تھا۔ نو کرگھے تھے اور ہر ایک کے اوپر چھت میں ایک چھید تھا مگر بادامی روغنی کاغذ میں سے

روشنی بڑی مشکل سے آتی تھی اور وہ بھی صرف بنکروں کے ہاتھوں پر پڑتی تھی جو آگے پیچھے تیزی سے چلتے رہتے تھے۔

کارخانے بھر میں صرف ایک آدمی، کرگھوں کے بیچ میں زمین پر پڑی ٹوٹی چرخیوں اور نرکل کی نلکیوں میں ٹھوکر مارتا رہتا تھا۔ کبھی کبھار وہ کسی کرگھے کے پاس رک جاتا، اپنی ہڑیلی انگلیوں سے بانے کے کسی قدر چمکتے ہوئے ان تاروں کو چھوتا جو تانے پر کس کر تنے ہوتے یا کبھی کسی بنکر کو، دھاگے میں لٹکے ثقل کو اٹھانے میں مدد دیتا۔

اس داڑھی مونچھ صفاچٹ آدمی کے سامنے بنکر عورتیں چہرے کھول دیتی تھیں اور بغیر نقاب کے کام کرتی تھیں اور اس کی طرف دیکھتی تک نہیں تھیں۔ ویسے تو وہ فورمین تھا لیکن پیٹھ پیچھے سب اس کو "ہڑیلا مقسوم" کہتے تھے، چوہے کی طرح اس کی لال آنکھیں تھیں، چہرے پر مردوں کی سی سفیدی، جو ذرا سی سردی بڑھنے پر نیلاہٹ میں بدل جاتی تھی، ابروؤں کی جگہ دو چار چھدرے چھدرے سرخ بال۔

کہا جاتا تھا کہ پہلے وہ مردوں کو غسل دیا کرتا تھا اور اپنا کام بڑی شان کے ساتھ انجام دیتا تھا، مگر اسے اپنے پیشے کے لئے جو ازبیک لفظ تھا "یووگوچی" وہ پسند نہیں تھا نہ ہی اسے تاجک لفظ "مردہ‌شو" پسند تھا بلکہ اسے تو عربی لفظ "غسال" کی آواز پسند تھی، اس لئے وہ چاہتا تھا کہ سب اسے غسال ہی کہیں۔ جب قصبے کے ایک بےدرد آدمی عبدالرجب کا انتقال ہوا جسے سب "قصائی" کے لقب سے یاد کرتے تھے تو مقسوم نے بڑی ہمت کے ساتھ سب کے سامنے اس کے گناہ اپنے نام لکھوانا قبول کر لیا، اور اس نیک کام کی وجہ سے اس کی عزت اتنی بڑھ گئی کہ بارسوخ، بائے لوگوں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے لگا، اس نے "قصائی" کی جو جائیداد وراثت میں پائی (کیونکہ گناھوں کے ساتھ اس نے جائیداد بھی قبول کی تھی) اس کی بدولت وہ قدرت‌الله سے بھی قریب آ گیا اور پھر آھستہ آھستہ اس کا نفس ناطقہ بن گیا۔ مقسوم اپنی نئی ڈیوٹیاں نہایت تندھی سے انجام دیتا تھا۔ اسے اپنے مالک

کے نفعے کا همیشه خیال رهتا اور مالک سے بات کرتے وقت اس کی آواز سدا دھیمی رهتی، وہ کهتا: "آپ مجھے حکم دیجئے نا۔ آپ کی جو مرضی هے وہ مجھے بس بتا دیجئے۔"

ادھر کچھ عرصے سے مقسوم ذرا کم بولنے لگا تھا۔ ویسے تو اس کا جی چاهتا تھا که بنکروں کو زور سے ڈانٹے، اپنے پیر پٹخے۔ کیونکه وہ چاهتا تھا که عورتوں کی آنکھوں میں ڈر کی جھلکیاں اسے دکھائی دیں چاهے وہ پل بھر هی کو کیوں نه هوں، اسے ان کے تھکے هوئے مگر پرسکون خاموش چهروں پر غصه آتا لیکن اس سب کے باوجود اس کی همت نه هوئی تھی که اپنی سی کرے۔ سوویت قانون کے مطابق بنکروں سے آٹھ گھنٹے هی کام لیا جا سکتا تھا اور ان کو باقاعده تنخواه ملنی چاهئے تھی۔ تو پھر کسی کارخانے میں کسی اوورسیر کی ضرورت هی کیا باقی رہ جاتی تھی۔

مقسوم کے حقوق و فرائض بدلتے رهتے تھے۔ بنکر عورتیں بڑی مضحکه‌خیز نظروں سے اس کو کارخانے میں ادھر ادھر فضول هی گھومتے پھرتے دیکھتی رهتی تھیں اور یه بھی که وہ اکثر اناخان کے کرگھے پر رکتا اور کان لگا کر یه جاننے کی کوشش کرتا رهتا که عورتیں ایک دوسرے سے کیا باتیں کر رهی هیں۔

آج وہ دو بار اناخان کے کرگھے پر رکا، تانے کو پکڑنے والی کیلی کی طرف خواه‌مخواه هی انگلی دکھائی، تانے کو بلاوجه چھوا... لیکن جیسے هی اناخان نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اس نے اپنی ناک دو انگلیوں میں پکڑکر چھنکی اور کھسک لیا۔ آخر وہ کیا دکھانا چاهتا تھا که وہ مزدوروں سے کوئی اونچی چیز تھا؟ ویسے آپ کچھ کهه نهیں سکتے تھے کیونکه اس کی ناک تو همیشه هی بهتی رهتی تھی۔

دوپهر کے وقت هڑیلا مقسوم تیز تیز چلتا هوا ادھر نکل گیا جدھر کتائی هو رهی تھی، یهاں بھی نلکیوں کی کھٹاکھٹ رکنے لگی، بنکروں میں سب سے کم‌عمر اور سب سے زیاده هنس‌مکھ عورت حاجیه اپنی بنچ پر سے اٹھی۔

"چاو بھئی لڑکیو، اب کچھ هنسیں بولیں"۔ کھارجانے میں

جوان اور سن‌دار سبھی عورتیں "لڑکیں" کہلاتی تھیں۔ "آخر ہڑیلا مقسوم اتنا تیزی میں کیوں رہتا ہے؟"

"کیوں؟ وہ کیوں نہ دوڑے؟" قمری نے جواب دیا۔ وہ ایک بڑھتی عمر کی عورت تھی، گالوں کی ھڈیاں ابھری ہوئی۔ بڑے بڑے دانت، اس کی زبان خوب چلتی تھی اور وہ حاجیہ کے برابروالے ہی کرگھے پر کام کرتی تھی: "بات یہ ہے، لڑکیو کہ وہ نہایت آسانی سے دوڑ سکتا ہے، ہاں سچ دوڑ سکتا ہے۔ لوگ ایسا کہتے ہیں کہ بہت دن ہوئے جب قدرت‌الله نے اسے آختہ کروا دیا تھا۔"

سب عورتیں ہنسنے لگیں یہاں تک کہ اکھل کھری رضوان بھی ذرا سا مسکرا دی:

"اری شریرو، کمبختو، تمہاری عمر دراز ہو! تم سب نے کیسی اس کی عزت اتاری، اسے قبر کا گڈھا نصیب ہوا!"

اگر رضوان مسکرا دے تو لوگ سمجھتے تھے کہ سورج نہ جانے کدھر سے نکلا ہے، اسے ہڑیلے مقسوم اور اس کے آقا قدرت‌الله سے نفرت تھی کیونکہ ان لوگوں سے اس کی زندگی کے تلخ‌ترین اور نہایت غمگین برسوں کی یادیں وابستہ تھیں۔ وہ ان دنوں کو کبھی نہیں بھول سکتی تھی جب قدرت‌الله سود پر روپیہ چلایا کرتا تھا اور ہڑیلا مقسوم ہی یہ رقم تقسیم کیا کرتا تھا۔ اس وقت وہ کتنی چاپلوسی کرتا تھا! ایسے سریلے لفظ اس کے منھ سے ٹپکتے تھے کہ سانپ بھی سنے تو بانبی سے باہر نکل آئے۔ لیکن ہر جمعہ کو وہ تیارشدہ "متا" لینے آتا تھا اور اس دن تو وہ ذرہ بھر پرواہ نہیں کرتا تھا کہ وہ زندوں سے "متا" وصول کرتا ہے یا مردوں سے۔

رضوان خالہ کے مرحوم شوہر سلطان کی وفات اسی سال کی عمر میں ہوئی مگر وہ آخر وقت تک کام کرتا رہا اور ایک غیرمعمولی فنکار اور دستکار مانا جاتا تھا۔ اس کا بنا عباؤں کا دھاری‌دار کپڑا "آلاچہ" نعمانچہ کی مشہورترین چیز تھی۔ قدرت‌الله نے جو ماہر دستکاروں کی گھات میں رہتا تھا، اپنے مختار کو سلطان کے یہاں بھیجا۔ ہڑیلا مقسوم اس کے گھر آیا اور یوں ادب سے دستک دی جیسے وہ کسی بائے کے دروازے پر

آیا ہے، پھر مسکرا مسکرا کر بڑی تفصیل سے بتایا کہ اس کا مالک ہنرمند دستکاروں کی کس درجہ عزت اور احترام کرتا ہے۔ ہڑیلا مقسوم بڑا مستعد تھا، اسے باتیں بنانا خوب آتا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے اشارہ دیا کہ عمدہ سوت سستے داموں کہاں دستیاب ہو سکتا ہے اور آخرکار وہ بوڑھے دستکار کو اپنی راہ پر لے آیا۔ چنانچہ سلطان بھی بہت جلد اس سودخور کے پنجے میں اسی طرح گرفتار ہو گیا جیسے نعمانچہ کے اور بہت سے دستکار اس سے قبل ہو چکے تھے۔

ہڑیلا مقسوم ہر جمعہ کو آتا اور دھاری‌دار "متا" کا ایک تھان لے جاتا اور بوڑھے سلطان پر قرض کے بوجھ میں ہر ہفتہ اضافہ ہوتا رہا، اس کی قوت گھٹتی گئی۔ وہ رات دن کرگھے پر اپنی جان کھپاتا مگر ہڑیلا مقسوم سخت‌تر ہوتا گیا، اس کی زیادتیاں بڑھتی گئیں یہاں تک کہ پتھر اور اس میں کوئی فرق نہ رہا، چیختا چلاتا وہ گھر کے اندر گھس آتا۔

"میں تمہارا کرگھا اٹھا لے جاؤں‌گا! میں تمہارا گھر بکوا دوں‌گا!"

سلطان کو جمعہ کے دنوں کے خیال ہی سے دہشت ہونے لگی تھی۔ اس کے سینے میں درد رہنے لگا تھا، کھانسی پنڈ پڑ گئی تھی، بینائی جواب دے رہی تھی۔ بوڑھا دستکار رات رات بھر اپنی سیلی کوٹھری میں بیٹھا، موم‌بتی کی چندھی روشنی میں "متا" بنتا رہتا، تانا بٹنے اور وزن کا چھوٹا سا اینٹا اٹھانے کی بھی طاقت اس میں باقی نہیں رہ گئی تھی۔ تھکن سے چور ہوکر کبھی کبھی وہ کرگھے پر ڈھے پڑتا اور دیر دیر تک اپنا سفید بالوں‌والا نڈھال سر اٹھا نہ سکتا۔

ایک شام جب رضوان اپنے شوہر کے لئے بالٹی بھر پونیاں لے کر آئی تو اس نے دیکھا کہ وہ بنچ پر بیٹھا تانے میں سر چھپائے ہے۔ رضوان نے جو اسے پکڑکر اٹھایا، وہ اس طرح ہانپ ہانپ کر گہری گہری سانسیں لے رہا تھا جیسے کوئی گھوڑا دوڑتے دوڑتے بےدم ہو گیا ہو۔

"چلو، چلو مالک، چل‌کر لیٹ رہو ذرا، تم تو بہت ہی تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔"

"نہیں، کل جمعہ ہے" بوڑھے نے جواب دیا اور ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ارے ان کو قبر کا گڈھا نصیب ہو! اب ہمارے پاس رکھا ہی کیا ہے جو لے جائیں گے۔"

"کرگھا، نیک بخت کرگھا، پچھلی بار کرگھا اٹھا لے جانے کی دھمکی دی تھی نا۔"

اور کرگھا چھن جانے کا مطلب یہ تھا کہ بھیک مانگنے کا پیالہ ہاتھ میں آ گیا۔ واقعہ تو یہ تھا کہ اب تو گھر اور کرگھا دونوں جوڑ لئے جاتے تب بھی اس سودخور کی کثیر رقم ادا نہیں ہو سکتی تھی، دونوں بڈھا بڑھیا یہ سوچ سوچ کر دہلے جاتے تھے کہ وہ اپنا قرضہ ادا کئے بغیر مر جائیں گے اور ان کا اکلوتا بیٹا ایرگاش زندگی بھر کے لئے، بائے کا حلقہ بگوش ہو جائے گا۔ سو اور کوئی چارہ نہیں تھا، بوڑھے کو کام کرتے رہنا ہی تھا! رضوان نے موم بتی اٹھاکر کسی ذرا اونچی جگہ پر رکھ دی اور چپ چاپ باہر چلی گئی۔

اس رات رضوان کو نیند نہیں آئی۔ وہ اپنے آپ کو برابر کوستی رہی مگر وہ اپنے غریب اور مہربان شوہر کی مدد کے لئے کر ہی کیا سکتی تھی؟ یہی نا کہ صبح کو اس سے پیار محبت، تسلی دلاسے کے الفاظ کہہ لے؟ اس کی پھٹی عبا میں بڑی محنت سے اور پیوند لگا دے؟

ایرگاش پاس ہی کے قصبے میں ایک راج گیر کے ساتھ لگ گیا تھا اور مٹی کی دیواریں بناتا تھا۔ وہ ہفتے میں ایک بار گھر آتا تھا، ماں باپ کے لئے مسرت اور اپنے کمر کے پٹکے میں بندھے چاندی کے چار سکے لئے۔ آج وہ کہاں تھا؟ ابھی تک وہ گھر کیوں نہیں آیا؟

تانے کے اس سرے سے اس سرے تک دوڑتی نلکی کی آواز آنگن سے آ رہی تھی، بوڑھا ابھی تک کام کر رہا تھا۔ وہ رات بھر کام کرتا رہے گا، کہے گا کہ یہی ان کا مقدر ہے۔ شاید ایرگاش بھی کام ہی کر رہا ہوگا... کچھ دیر کے لئے رضوان آنسوؤں کی لہروں میں ڈوب گئی، سب کچھ جیسے محو ہو گیا...

صبح تڑکے ہی ایک جانی پہچانی، حقارت و نفرت بھری آواز سے اس کی آنکھ ایک دم کھل گئی۔

"میں تمہارا گھر بکوا دوں گا، میں تمہارا کرگھا اٹھوا لوں گا! میں کبھی یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ تم قدرت اللہ خواجہ کی دریادلی کو یوں پاؤں تلے روندو! یوں ناجائز فائدہ اٹھاؤ، دیکھنا وہ تمہیں کیسا بندر ناچ نچاتے ہیں، تمہاری ناک سے جھڑوا لیں گے اپنا پیسہ!"

رضوان ایک دم باہر دوڑی۔

ہڑیلا مقسوم کرگھے والے حصے کے سامنے، چوکھٹ پر کھڑا، زور زور سے ہاتھ پھینک پھینک کر چیخ رہا تھا اور سلطان، کل کی طرح، اس وقت بھی تانے پر سر ٹیکے بیٹھا تھا۔ چھت والے چھید میں سے کچھ کچھ روشنی اندر آ رہی تھی مگر موم بتی ابھی تک جل رہی تھی۔

رضوان اپنے شوہر کی طرف لپکی تو موم بتی یکایک بجھ گئی۔ بوڑھے کے سفید چہرے پر ایک سکون کا عالم طاری تھا، اس کی ادھ کھلی آنکھیں بے نیازی کے ساتھ اس "متا" کو تک رہی تھیں جو تیار ہو چکا تھا۔ بوڑھا بنکر اپنے بیٹے کے لئے جو کچھ کر سکتا تھا وہ کر گیا تھا۔

خالہ رضوان کی ٹانگیں تھرتھرا کے جواب دے گئیں اور وہ خدا کی دہائی دیتی ہوئی بے ہوش ہو کر دھڑام سے زمین پر گر پڑی۔

ہڑیلا مقسوم بھی یہ ماجرا دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ وہ الٹے پاؤں آنگن سے باہر نکلا، نالہ و فریاد کی آوازیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں:

"ہائے، میں کیسی بدنصیب عورت ہوں! ہائے، میرا وارث، میرا محبوب!"

دوپہر ہوتے ہوتے ایرگاش گھر پہنچا۔ وہ لمبے قد، مضبوط ہاتھ پیروں والا جوان تھا جس کی رنگت دھوپ میں کام کرتے کرتے سنولا ہو گئی تھی۔ اس پر ایک عجیب طرح کی خاموشی طاری تھی۔ رضوان غم کی ماری، اپنے شوہر، اپنے وارث کے لئے نوحہ و ماتم کرتی رہی لیکن ایسا لگتا تھا کہ اس

کا بیٹا جم کر پتھر ہو گیا ہے، جنازہ اٹھنے تک نہ اس نے ایک لفظ کہا نہ ایک آنسو بہایا۔

اپنے باپ کی تازہ قبر پر ایرگاش نے اپنا سکوت توڑا: "ماں، اب یہ حالات مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتے" اس کے ہونٹ روتے ہوئے بچے کی طرح کانپ رہے تھے۔ "میں ان خون چوسنےوالوں سے لڑوں گا اور میں قسم کھاتا ہوں کہ ان کو ہمارے غم کی قیمت دینی پڑےگی! میں اپنے باپ کے خون اور پسینے کی قسم کھاکے کہتا ہوں!"

رضوان نے بےبسی کے ساتھ اپنے بیٹے کو اپنے کلیجے سے لگا لیا۔

اس وقت رضوان کے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ایسا کرنے کے لئے اس کا بیٹا کہاں جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ البتہ اس نے یہ محسوس ضرور کیا کہ یہ جدائی طویل ہوگی اور اب وہ بالکل اکیلی رہ جائےگی۔ نہ شوہر نہ بیٹا!

جوان اور حسین نزاکت، دکان‌خانے کے دروازے کے پاس ہی والے کرگھے پر کام کرتی تھی اور یہی ایک کرگھا تھا جس پر ساٹن کا ٹانا لگا تھا۔ نزاکت کے بالوں کی چوٹیوں میں چاندی کے چھوٹے زیور لگے تھے، جو چلتے وقت بجتے تھے، وہ اپنی بھوؤں پر اوسمہ لگاتی تھی۔ کاہی رنگ جو جڑی بوٹیوں سے بنتا تھا اور اس سے وہ بھوؤں سے لےکر ناک کے بانسے تک پر دنبالہ کھینچتی تھی۔ ایک ٹوٹی شیشی میں اوسمہ ہمیشہ اس کے بنچ کے نیچے رکھا رہتا تھا۔

وہ نورمت کی بیوی تھی جو ایک کھاتا پیتا دستکار تھا اور سب اسے "بانکا" کہتے تھے، وہ نزاکت کو شہر نمانگان سے بیاہ کر نعمانچہ لایا تھا۔ ویسے تو بانکے نورمت کے گھر پر بھی ایک کرگھا تھا مگر وہ اپنی بیوی کو قدرت‌اللہ کے کارخانے میں کام کرنے کے لئے بھیجتا تھا۔ اس نے خود قدرت‌اللہ کے کہنے پر اسے خوش کرنے اور ان خوشگوار تعلقات کو مستحکم کرنے کے لئے ایسا کیا تھا جو برسوں سے ان دونوں میں قائم تھے۔ نزاکت نعمانچہ کی واحد عورت تھی جو ساٹن بنتی تھی۔

وہ بڑی ہنسوڑ اور چنچل تھی، ہمیشہ اپنی سہیلیوں سے مذاق اور چھل کرنے کو تیار مگر اس کے مذاق اکثر بےموقع ہوتے تھے۔ وہ دوسری عورتوں کو بالکل نہیں سمجھ پاتی تھی۔ وہ جن باتوں کو محض دل‌لگی سمجھتی تھی ان کی تہہ میں جو درد اور تلخی چھپی ہوتی اس تک اس کا ذہن جا ہی نہیں سکتا تھا۔

"مقسوم تو پھرکی ہے پھرکی، بس جب دیکھو تب اناخان کے چاروں طرف چرخی کی طرح چکراتا رہتا ہے، میرا تو خیال ہے کہ ہڑیلے کا دل چوٹ کھا گیا ہے" نزاکت نے کہا۔

سب کی ہنسی ایک دم رک گئی اور سب کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"نزاکت بیٹی، کاش کہ اس کے پہلو میں دل ہوتا" رضوان نے نلکی میں پھنسے ایک دھاگے کو دانت سے کاٹتے ہوئے اناخان کی طرف نظریں اٹھاکر کہا کہ کہیں اس کے جذبات کو ٹھیس تو نہیں لگی؟

لیکن اناخان اپنے کام میں مصروف اپنے خیالات میں گم تھی۔

کونے میں ایک بڑے سے کرگھے کے پاس بیٹھی، وہ قمیضوں کا چارخانہ بن رہی تھی۔

اس زمانے میں اس کپڑے، "سارپنکا" کی بڑی قدر تھی۔ اتنی چوڑائی کے کپڑے صرف بڑے کرگھوں پر مصری روئی کے کتے ہوئے سوت سے بنے جا سکتے تھے اور نعمانچہ میں صرف اناخان ویسا کرگھا چلا سکتی تھی۔ ایک دوسرا سبب جس سے نئی معاشی پالسی کے نام‌نہاد حامی قدرت‌الله نے بنکر اناخان کو دوسری بنکروں سے ذرا الگ ہی بٹھایا تھا، یہ تھا کہ وہ ادھر کچھ دنوں سے اناخان سے ذرا ڈرنے لگا تھا۔ اسے نظر آ رہا تھا کہ دوسری بنکر عورتیں اناخان کی عزت کرتی ہیں۔ چنانچہ مقسوم اپنے آقا کو سب سے پہلے اسی کے متعلق رپورٹ دیتا تھا، اس کا موڈ کیسا ہے، وہ دوسری عورتوں سے کیا باتیں کرتی ہے وغیرہ۔

قدرت‌الله کو یہ معلوم کرکے بھی خاصی دہشت ہوئی تھی

که اناخان برابر عورتوں کے کلب جاتی تھی جو پرانے شہر میں کھولا گیا تھا۔ اگر وہ آج کلب گئی تو کل کوآپریٹو میں شریک ہو جائے گی، عورتیں بھی وہی کریں گی جو مرد کر رہے ہیں اور اگر وہ اناخان کو اپنے کارخانے سے نکال بھی دے تو بھی اسے عورتوں کو بہکانے سے کون باز رکھ سکتا ہے۔ نہیں، نہ صرف یہ کہ اس کو نکال دینے سے کوئی فائدہ نہ تھا بلکہ موجودہ قوانین کے تحت جو اناخان اور اس کے ہی جیسے لوگوں نے بنائے تھے، اس کو نکال باھر کرنا ناممکن بھی تھا۔

چنانچہ اس جھلاہٹ اور کھسیاہٹ میں وہ برابر اپنے پٹھو مقسوم کو ہدایت دیتا رہتا:

"دیکھو، اپنی نظر جمائے رکھنا اس پر، اسے نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔"

اناخان سینگ کی بنی نلکی کو سات فیٹ چوڑے تانے پر سے برابر گزارے جا رہی تھی۔ اس کا نشانہ حیرت ناک طور پر صحیح ہوتا تھا اور عورتیں اکثر اس کے کرگھے کے پاس کھڑی رہ کر اسے کام کرتے دیکھا کرتی تھیں۔

"بھلا تم نے کبھی سوچا ہے کہ عورت، اور اتنا صحیح نشانہ لگائے" قمری سر ہلاکر کہتی۔

جب کبھی اناخان کام پر سے ذرا دیر کے لئے بھی اٹھتی تو عورتیں اس کے چاروں طرف اکٹھا ہو جاتیں۔ ظاھر تھا کہ ھڑیلے مقسوم کے جلدی ھی ادھر آنے کا سوال نہ تھا تو آخر اناخان اتنے اطمینان سے عورتوں سے باتیں کیوں کر رہی ہے؟

قمری اور حاجیہ کچھ کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ قمری نے حاجیہ کو ایک کہنی ماری جیسے کہ وہ کسی بات پر اصرار کر رہی ہو مگر حاجیہ کچھ گھبرائی ہوئی سی نظر آ رہی تھی جیسے اس کا کہنا نہ کرنا چاھتی ہو۔ آخر حاجیہ نے ہمت کرکے ایک سادہ کاغذ لیا، اپنی بے آستین کے جیکٹ کی جیب میں سے پنسل کا ایک ٹکڑا نکالا اور دھیرے دھیرے اناخان کے کرگھے کی طرف بڑھی۔

خالہ رضوان کی نگاھیں بڑی ہمدردی کے ساتھ ان چنچل

لڑکیوں کا پیچھا کر رہی تھیں۔ ہوں گے کوئی لڑکیوں والے راز... بہت جلد معلوم ہو جائیں گے! حاجیہ، رضوان کے لڑکے ایرگاش کو ایک خط لکھنا چاھتی تھی جس کو گھر سے گئے چار سال گزر چکے تھے۔

مائیں بوڑھی ہو چکی تھیں، بچے جوان ہو گئے تھے، ننھی بچی حاجیہ جو ننگے پاؤں بھاگتی پھرتی تھی، اب شادی کے لائق تھی اور ایرگاش ایک دلیر سرخ سپاھی بن چکا تھا۔ اب وہ ایک عظیم فوج میں نوکری کر رہا تھا جس کی کمان لوگ کہتے تھے کہ میخائیل فرونزے کے ھاتھ میں تھی۔

اس کارخانے میں اناخان کے علاوہ کوئی عورت لکھ پڑھ نہیں سکتی تھی۔ اس نے عورتوں کے کلب میں پڑھنا لکھنا سیکھا تھا۔ حاجیہ جاکر اناخان کے سامنے کھڑی ہو گئی، اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ نظریں اٹھائے، اور اس کا چہرہ پکے سیب کی طرح سرخ ہو رہتا تھا۔

"ان کو ایک خوبصورت سا خط لکھ دیجئے، بہت ھی اچھا سا جیسا کہ کتاب میں لکھا جاتا ھے اور کیا لکھنا ھے، وہ تو آپ خود ھی جانتی ھیں۔"

اور پھر اناخان کے ھاتھ میں کاغذ پنسل پکڑا کر وہ لڑکی بھاگتی ھوئی اپنی جگہ پر آ گئی اور اپنے کرگھے پر بیٹھ گئی۔

خالہ رضوان ضبط نہ کر سکی اور اس نے حاجیہ کے پاس پہنچ کر اسے گلے لگا لیا: "میری پیاری، میری ننھی سی بیٹی، خدا کرے تمھاری زندگی ھماری زندگیوں سے زیادہ سکھی رھے۔"

پھر ایسی خاموشی چھا گئی کہ آنگن میں سوت کاتتی ھوئی عورتوں کی کھسر پھسر، تکلیوں کی گنگناھٹ اور چھڑوں سے روئی کے پیٹے جانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور چھت پر روئی کے غبار کی دھند چھا گئی اور چھپر تلے اتنا اندھیرا ھو گیا جیسے سورج غروب ھو گیا ھو۔

"اناخان، آج تو تم ان‌تھک کام کئے جا رھی ھو" رضوان نے کہا۔ "کیا قدرت‌اللہ کو اور زیادہ امیر بنا دینے کا ارادہ ھے؟"

"خالہ رضوان، آپ تو جانتی ھیں، مجھے اپنے کام سے

عشق ہے" اناخان نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن میرے دل میں ایسی اندھیاری چھائی ہے جیسی اس دکان‌خانے میں۔"

سچ تو یہ ہے، اناخان، میری بیٹی کہ میرے بھی دل میں اندھیرا ہے، ورنہ بوڑھی ہوتے ہوئے کام کرنے کو تو میرا بھی جی چاھتا ہے مگر اس طرح نہیں، یوں نہیں۔"

"تو پھر کیسے؟" نزاکت نے حیرت سے پوچھا اور اپنا بنا ہوا ساٹن کا ایک ٹکڑا لہرایا۔ "کیا یہ کام نہیں ہے؟ اس میں کیا برائی ہے؟"

کسی نے اس کے ساٹن کا نوٹس نہیں لیا، سب عورتوں نے اناخان کو گھیر لیا تھا اور وہ ان سب کے چہروں کو یوں تک رہی تھی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔

"عورتوں کے کلب میں میں نے کچھ سمجھدار لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ اب ہماری محنت کی کیفیت وہ نہیں رہی ہے جو پہلے تھی۔ پرانے وقتوں میں تو وہ مصیبت تھی مگر اب اسے مسرت ہونا چاھئیے۔"

نزاکت بھی ہاتھ میں چاندی کے روبل جھنجھناتی ہوئی ان عورتوں کے جھنڈ میں آ ملی۔

"یہ اچھی مسرت ہے! یہ تو ہمیں قبر میں پہنچا دے گی۔"

"اچھا نزاکت، تم بتاؤ کہ تم کیوں کام کرتی ہو؟" اناخان نے پوچھا۔

"آپ کو نہیں معلوم؟ میرے شوہر کی یہی خواہش ہے، مالک اس کے پیسے جو دیتا ہے۔"

"مالک تم کو تو دیتا ہے پیسے اور اپنے صندوق میں بھرتا ہے روبل۔ یہ پھولدار ساٹن جو تم بنتی ہو، یہ تمہارے خیال میں کہاں جاتا ہے؟ میرا "سارپنکا" اور ہمارے "متا" کہاں جاتے ہیں؟ نئی اقتصادی پالیسی‌والے قدرت‌الله کی دکانوں اور اسٹالوں میں! اور ان کا منافع کون لیتا ہے؟ ہم چاھتے ہیں، اس منافعے سے ہم کو فائدہ ہو، ہم کو خوشی ہو! ہم خوشی کے ساتھ کام کرنا چاھتے ہیں، غموں کے بغیر کام کرنا چاھتے ہیں۔"

بوڑھی عنظیرت ایک لمبی سرد آہ کھینچی۔ وہ عورتوں کی باتوں میں کبھی شرتک نہیں ہوتی تھی۔ سب سے ذرا دور التی پالتی مارے بیٹھی وہ اپنی نلکی سے سوت اتار رہی تھی اور خود ہی خود بڑبڑاتی جا رہی تھی:

"جوانی میں روڑے کنکر بھی پھول دکھائی دیتے ہیں مگر بوڑھی عورت کے لئے پھولوں کی سیج بھی قبر کا پیندا ہے۔ اب دیکھ لو ان جوان لوگوں کو، زمین پر کھڑا بھی نہ ہونا آیا کہ آسمانوں پر اڑنے کی سوچنے لگیں۔"

حاجیہ کی چمکتی آنکھیں گول گول گھومنے لگیں۔

"دادی عنظیرت، سچ کہنا، کیا واقعی تمہیں کچھ نہیں چاہئے؟"

"ارے، اب ہم لوگ سوکھے شفتالو ہو گئے، جوتی کے تلے کی طرح کھڑنک، اب ہمارے لئے کیا رکھا ہے، بچیو... جو کچھ ہے بس اسی کے لئے شکر الله کا!"

"شکر الله کا" دادی عنظیرت کا تکیہ کلام تھا، اسی لئے سب اس کو "دادی شکرالله" کہتے تھے۔

"اوھو، دادی شکرالله" حاجیہ بولی۔ "تم تو شاید خنزیر کے سال میں پیدا ہوئی تھیں یا تمہاری پیدائش گیارہ صفر کی ہوگی، جو لوگ اس دن پیدا ہوتے ہیں وہ تارک الدنیا ہو جاتے ہیں، نہ انہیں اپنے لئے کچھ درکار ہوتا ہے نہ دوسروں کے لئے۔"

"بیٹی، میں تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں اور ایک نہ ایک دن تم لوگ مجھے وہاں پہنچا ہی دوگی لیکن میں نے تو کبھی لالچ کی نہ کبھی کسی سے حسد کیا، شکرالله۔"

"انہیں جانے بھی دو، لڑکیو" بوڑھی رضوان خفا ہوکے بولی۔ "ان کی بات پر دھیان نہ دو، ہم لوگ تو، زندگی اگر ہے تو زندہ رہنے کی سوچیں گے۔"

قمری نے طنز کے ساتھ مسکراتے ہوئے ایک چٹکی نسوار منہ میں ڈال لی۔

"لیکن ہم عورتیں کر ہی کیا سکتی ہیں؟ کسی غریب بیوہ کے بس کی کیا بات ہے؟"

اناخان اپنی بنچ پر سے اٹھی، اس کا قد اونچا تھا، جسم مضبوط۔ وہ حاجیہ کی طرف دیکھکر محبت سے مسکرائی کیونکہ حاجیہ اسے بڑے اعتماد کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"بہنو، ہم لوگ بھی کوآپریٹو میں شریک ہوں گے۔"

"اف میرے خدا" نزاکت بےساختہ اپنے چہرے کو آستین سے چھپاتے ہوئے چیخ کر بولی۔ "تو کیا ہم لوگ مردوں کے ساتھ کام کریں گے؟"

"میں تو کہیں بھی چلی جاؤں گی جہاں اس ہڑیلے بدبخب کی منحوس صورت مجھے دکھائی نہ دے، اسے موت آوے" رضوان نے کہا۔

باقی سب عورتیں چپ ہو گئیں۔ حیران و ششدر ہوکر سہمی سہمی سی اناخان کو تکنے لگیں۔

اناخان قہقہہ لگاکے ہنسنے لگی۔

"نہیں بہنو، اتنا نہ گھبراؤ، ہم عورتوں کی کوآپریٹو بنائیں گے۔"

اب تو پھر کیا تھا، سب ہی بولنے لگیں۔ حاجیہ نے دوڑکر اناخان کے کندھے پر پیار کیا اور قمری نے نزاکت کے پاؤں کے پاس نسوار تھوکا۔

"وہ جو تیرا بانکا ہے، نورمت، بھلا وہ کب تجھے کوآپریٹو میں شامل ہونے دےگا چاہے تو منتیں کر کرکے مر بھی جا، وہ تو تجھے فاحشہ بنا دےگا، میں کہتی ہوں، تو ذرا مزا چکھنا۔"

"ہاں، ہاں، دیکھیں گے، جیسے تم مزا نہیں چکھوگی" نزاکت دانت پیس کر بولی۔

"تو کیا تمہارا مطلب ہے کہ ہم بیواؤں کی زندگی بھی بہتر ہو سکتی ہے؟" رضوان نے اناخان کے بازو کو ٹھوکا دیتے ہوئے پوچھا۔

"اصل میں مشکل یہ ہے کہ کوآپریٹو کے لئے کافی تعداد چاہئے" اناخان نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "اور ہم عورتیں ہیں کم اور اگر ہم نعمانچہ کی دوسری عورتوں کو اس میں نہ لا سکے تو ہماری بڑی ہیٹی ہو جائے گی۔"

"مگر بیٹی، یہ بات کس نے شروع کی تھی کہ عورتوں کا کوآپریٹو ہو؟ سرکار نے؟ اگر ایسی بات ہے تو پھر تم کیا سمجھتی ہو، بھلا کون عورت ایسی بےوقوف ہوگی جو اس میں شامل نہ ہو؟"

"بہن جوراخان نے۔"

"جوراخان نے خود؟ وہی جوراخان جو جج ہیں؟"

لیکن اناخان کو اپنی پوری بات کہنے کا موقع نہیں ملا، یکایک عورتیں اپنے اپنے کرگھوں پر یوں واپس چلی گئیں جیسے انہیں کسی نے حکم دیا ہو۔ حاجیہ نے هڑیلے مقسوم کو دروازے کے پیچھے کھڑا دیکھ لیا تھا۔

اور پھر وہ اندر آ گیا، وہ ایک ہاتھ سے اپنی چھوٹی چھوٹی لال لال مکار آنکھوں پر سایہ کئے تھا اور دوسرے ہاتھ میں لکڑی کی ایک چرخی سر سے اونچی اٹھائے گھما رہا تھا اور اس میں سے تربڑیا کی سی آواز آ رہی تھی۔ یہ گویا اعلان تھا کہ آج کا کام ختم ہوا۔

کتائی اور بنائی کرنےوالیاں سب اپنی اپنی جگہ سے اٹھیں اور ہال کے ایک تاریک کونے میں جاکر پرنجوں کے ڈھیر میں سے اپنا اپنا پرنجے ڈھونڈنے لگیں۔

"دادی شکراللہ، دیکھنا یہ ہے تمہارا پرنجے؟"

"اگر کنارے پر پیوند لگا ہے تو پھر وہ میرا ہی ہوگا، شکراللہ کا۔"

"میری اچھی آئینیسا، ذرا میرا چاچوان تو اٹھا دینا۔"

"ارے دیکھ تو، کہاں چڑھی چلی آ رہی ہے۔ موٹی بھینس کہیں کی!" قمری بھاری آواز میں کسی مرد کی نقل کرتے ہوئے چلائی۔ "یہ تیری چوٹیوں میں گندھے روبل ابھی نوچ کے پھینک دوں گی!"

"چتھڑوں کی چمک دھل گئی ہے کیا؟ بڑی آئی چیچک کے داغ‌والی صورت لئے۔ کپڑے دھونے کا ٹب کہیں کی!" نزاکت نے غصے سے چیختے ہوئے جواب دیا۔

عورتیں جلدی جلدی گڑبڑ سڑبڑ اپنے اپنے پرنجے ڈھونڈ رہی تھیں۔ حاجیہ نے اناخان اور خالہ رضوان کا پرنجے

ڈھونڈکر ان لوگوں کو دیا اور پھر جلدی جلدی بھیڑ میں سے نکل آئی۔

دوسرا باب

جس زمانے میں یہ دستور تھا کہ عورت کو اس کے نام سے پکارنا اسے خواہ مخواہ کے لئے سر پر چڑھانے کے معنی ہیں تو اناخان کو صابر مزدور کی بیوہ کہتے تھے۔ مگر گزشتہ چند برسوں میں یہ نام "اناخان" نعمانچہ کے سب سے زیادہ باعزت ناموں میں شمار ہونے لگا تھا۔

اناخان کا معمولی سا، مٹی کی چھت والا مکان دو گلیوں کے نکڑ پر تھا اور بلاک کی تمام ہی عورتوں کے لئے ایک عجیب سی کشش رکھتا تھا۔ کچھ عورتیں بڑے فخر اور امید کے ساتھ اسے دیکھتی تھیں، کچھ بڑی احتیاط سے کیونکہ اس گھر میں جو عورتیں آتی جاتی تھیں وہ پرنجے نہیں ڈالتی تھیں، بعض کے بال کٹے ہوئے تھے اور وہ اپنے سر پر سرخ رومال باندھتی تھیں۔ جوراخان جو جج عورت تھی اور شہر بھر میں مشہور، اسے بھی یہاں دیکھا گیا تھا۔

یہاں اناخان اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی زندگی شدید جد و جہد کی زندگی تھی، خرچ مشکل سے پورا ہوتا تھا مگر اس گھر کی صفائی سترائی کی مثال دی جاتی تھی۔ وہ تھکی ہاری کام سے واپس آتی تھی لیکن جیسے ہی وہ اپنی بیٹیوں کو دیکھتی اور معمول کے مطابق ان کی آواز سنتی: "امی، کھانا لگائیں؟" تو اس کی گرمجوشی لوٹ آتی۔ لوٹ کے بہت ٹھنڈے پانی سے وہ منہ ہاتھ دھوتی اور ہوا کے ساتھ آنگن میں چاول کے شوربے، سبزیوں اور دھی کی اشتہا انگیز خوشبو پھیل جاتی۔ لڑکیوں کی جلدی جلدی ادھر ادھر چلت پھرت کی

آواز ماں کے کانوں میں پڑتی رہتی اور وہ سوچتی رہتی: "میری ننھی گھروالیاں، اپنی سی سب کچھ کرتی ہیں، میری بچیاں۔"

اناخان کو گھر میں بہت ہی کم کام کرنا پڑتا تھا کیونکہ اس کی لڑکیاں جو اب بڑی ہو رہی تھیں، ان میں خاص کر بڑی، بشارت، اپنی ماں کو خانہ‌داری کا کوئی کام نہیں کرنے دیتی تھی۔ آج بھی حسب معمول ماں آلتی پالتی مار کر ایک نیچے سے تخت کے سامنے بیٹھ گئی جس پر سفید "متا" کا میزپوش بچھا تھا۔ یہ تخت، مٹی کے فرش میں کھدے ہوئے ایک گڈھے پر رکھا تھا جو انگیٹھی تھی اور جس میں جاڑوں کے موسم میں کوئلے جلائے جاتے تھے۔ اس زمانے میں ایسی "انگیٹھیاں" اکثر گھروں میں ہوا کرتی تھیں۔

اس موسم بہار میں جب خوبانیوں میں پھول آئے تو بشارت پندرہ برس کی ہو گئی۔ وہ بہت کچھ اپنے باپ پر پڑی تھی۔ وہی چپٹی ناک، گول گلابی گال اور بےحد گھنی بھنویں۔ اس کے بھونرا سے بال خوب گھنے تھے مگر وہ ان کو ترشواتی تھی اور سر کے پیچھے، گردن کے اوپر ایک دم کی سی چٹیا نکلی رہتی تھی۔ وہ گٹھے ہوئے مضبوط جسم کی لڑکی تھی اور اس کی ماں کی بےآستین‌والی جیکٹ اس کو بالکل ٹھیک آتی تھی۔

تورسنائی اپنی بہن سے ڈھائی سال چھوٹی تھی اور اس کی لمبی لمبی چوٹیاں کمر تک پہنچ کر اس کی پرانی مخمل کی جیکٹ پر بڑی دیدہ زیب لگتی تھیں۔ اس کا چہرہ زردی مائل اور لمبوترہ تھا، چھوٹی سی نوک‌دار ٹھڈی۔ وہ اپنی ماں سے مشابہ تھی، کوئی کنگن یا بندے پہنتا تو اس کو رشک آتا مگر زیور اس کی پتلی گردن اور بازوؤں پر سجتے نہیں تھے جن میں نیلی نیلی رگیں دکھائی دیتی تھیں۔

بڑی بہن چنچل تھی، وہ ہنسی مذاق پسند کرتی اور ہر کام کو جلدی اور ہڑبڑاہٹ کے ساتھ انجام دیتی۔ گھر میں اگر چینی کا کوئی برتن ٹوٹے تو یقینی بات تھی کہ یہ بشارت کی حرکت ہے۔ اس کے برعکس تورسنائی کم‌سخن تھی، سوچ میں غرق رہنے‌والی، اپنی عمر سے کہیں زیادہ فکرمند اور بےحد حساس!

بشارت کبھی کبھی اپنی بہن کو ڈرانے کے لئے گھر کی چھت پر چڑھ کر چیختی ہوئی وہاں سے کود پڑتی اور جو وہ چاہتی وہ ہو بھی جاتا کیونکہ پاس کھڑی تورسنائی آنکھیں بند کرکے جیسے غش کی سی حالت میں ہو جاتی اور بڑی دیر تک اس پر خوف چھایا رہتا۔

بشارت لڑکوں کی طرح کھاتی تھی، خوب جی بھرکے اور جلدی جلدی سب سے پہلے کھانا ختم کرکے اس نے نمدے کے قالین کے نیچے سے ایک پرانا اخبار نکالا اور اسے کھول کر تخت پر رکھ دیا۔ چچا یفیم بھی ایسا ہی کرتے تھے، وہ ہمیشہ رات کے کھانے کے بعد اخبار پڑھتے تھے۔ ایک مضمون پورے ایک صفحے پر پھیلا ہوا تھا اور آخری صفحے پر صرف اشتہارات تھے۔یہ اخبار بشارت کی ماں پچھلے ہفتے عورتوں کے کلب سے لائی تھی۔ بشارت اس کو بڑی محنت سے حرف بحرف پڑھ رہی تھی۔ بڑی سرخیوں سے لےکر پریس کے پتے تک۔

"کارخانہ... کارخانہ... بنام... بنام" لڑکی ٹٹول ٹٹول کر بڑبڑا رہی تھی اور پھر اس نے ایک دم پڑھا: "لینن!"

اس کی چھوٹی چھوٹی کالی کالی آنکھوں میں بجلی سی چمکی، مڑکر اس نے ماں اور بہن کی طرف دیکھا۔ بشارت یہ نام جانتی تھی۔ جس سطر میں یہ نام آتا تھا وہ اس نے زبانی یاد کر لی اور ہر بار جب سطر کے آخر میں یہ نام آتا تو اسے اس کو دوہرانے کی خوشی ہوتی۔

تورسنائی کے لئے پڑھنا ایک طلسمی چیز تھی، جب بشارت نے اشتہاروں والا ورق الٹا تو وہ بور ہو گئی۔

"آپا، کیا اس میں نظمیں نہیں ہیں؟" اس نے اپنی چھوٹی سی مٹھی پر ٹھڈی ٹکائے ٹکائے پوچھا۔

"نظمیں؟ ارے یہ تو اخبار ہے، اخبار۔ تجھے تو بس نظموں ہی کی پڑی رہتی ہے!"

"نظمیں ہوتیں تو میں کوئی گیت گا سکتی۔"

تورسنائی کو گانے کا بڑا شوق تھا، جو گانا سنا کرتی وہ فوراً اس کے دماغ میں بیٹھ جاتا۔ چولھا جلاتے یا جھاڑو دیتے

میں وہ ہمیشہ گنگنایا کرتی۔ پڑوسیوں کو بھی اسے گاتے سننا پسند تھا۔ جب بھی بعمانچہ میں کوئی شادی رچتی اور بیاہ کے گانے گائے جاتے تو تورسنائی کو وہاں سے ہٹانا ناممکن تھا۔ اسے رنگیلے گیت "ننھا سیب" یا "لعل بدخشان" بہت اچھے لگتے تھے۔

یہ گیت اس نے ان گاڑی‌بانوں سے سنے تھے جو روئی سے لدی گاڑیاں ہانکتے اسی راستے سے کارخانے کی طرف جایا کرتے تھے۔ لیکن جب وہ اکیلی ہوتی تو زیادہ‌تر غمناک گیت گایا کرتی تھی۔

ایک دن اناخان نے بھی یہ گیت سن لیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"تیری آواز کتنی اچھی ہے، میری جان۔"

تورسنائی نے خوابیدہ سے، کھوئے کھوئے انداز میں پوچھا:

"امی، میں یہ سوچ کر حیران رہتی ہوں کہ وہ لوگ کیسے ہوتے ہوں گے جو شعر کہتے ہیں؟"

"جب لوگ شاعری کرتے ہیں تو وہ آسمان کی طرف تکنے لگتے ہیں" بشارت بڑے یقین کے ساتھ بولی۔ "اور پھر سوچتے جاتے ہیں، سوچتے جاتے ہیں اور پھر وہ کوئی نظم ایجاد کر لیتے ہیں مگر کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے وہ تو ایسا ہوتا ہے جیسے لکھنے‌والے نے سب کچھ خود دیکھا ہو۔ امی، آپ کو پتہ ہے، ایک کتاب ہے، اس کے بارے میں خالہ صوفیہ نے مجھے بتایا ہے۔ تو اس میں سب کچھ وہی لکھا ہے جو ہمارے ابا پر گزرا۔"

اناخان ایک ٹوپی پر پھول بوٹے کاڑھ رہی تھی، اس کے تھکے ہوئے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ابا... کیسی عجیب، کتنی دردناک آواز تھی اس لفظ کی۔

کیا اسی وجہ سے اناخان کی آنکھوں میں کبھی مسرت کی پرچھائیاں نہیں لپکتی تھیں؟ جب وہ مسکراتی تھی تب بھی ایک غمگین، دردناک سی چمک ان میں دکھائی دیتی تھی، چنچل بشارت نے تو کبھی اس بات پر غور نہیں کیا لیکن حساس تورسنائی کو اپنی ماں کی آنکھوں میں جو کچھ دکھائی

دیتا تھا وہ لاشعوری طور پر اسے پریشان کئے رہتا تھا: "امی، کیا آپ روئی ہیں؟" کبھی کبھار رہ ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیتی۔

"ہاں، ہاں، یہ بات بالکل سچ ہے!" بشارت نے اعلان کیا۔ "میں کل چچا یفیم کے یہاں جاکے وہ کتاب لاؤں گی اور کسی سے مدد لئے بنا خود ہی پڑھوں گی۔ ٹھیک ہے نا، امی؟"

"ہاں میری ننھی، ہاں ٹھیک ہے۔"

چچا یفیم کا ذکر آتے ہی اناخان کی ہمت بندھ گئی۔ جب تک چچا یفیم اور خالہ صوفیہ زندہ ہیں وہ اور اس کی بچیاں خود کو دنیا میں تنہا نہ محسوس کریں گی۔

پھر بشارت نے ہنستے کھلتے، غل مچا مچاکر سب کے بستر لگائے اور اس کام میں تورسنائی کو بھی گھسیٹا۔ دونوں نے دیوار میں بنی بخاری میں سے کمبل اور تکئے کھینچے، توشکوں پر لوٹ لگائی اور ایک دوسرے کی چٹیاں کھینچیں، پھر دونوں لیٹ گئیں اور ذرا دیر بعد ہی خاموشی چھا گئی۔

اناخان نے پیرافین کے تیل کے چراغ پر ہاتھوں سے سایہ کرتے ہوئے پھونک مارکر اسے بجھایا اور ایک دم اس کی نگاہیں صابر کی ایک چھوٹی سی فوٹو پر جاکر ٹھہر گئیں جس میں وہ روئی بھرا دگلا پہنے نظر آ رہا تھا۔ یہ تصویر اس وقت لی گئی تھی جب صابر جوان تھا اور اس وقت وہ دیوار پر لگی، اندر آتی ہوئی چاندنی میں تنہا رہی تھی۔

صابر جو ایک بنکر کا بیٹا اور خود بھی بنکر تھا، ساری زندگی تنگ دستی کا شکار رہا۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی اپنے بال بچوں کے لئے کافی کھانا پینا کبھی مہیا نہ کر سکا، جن دنوں میں اس کی پولیس کے آدمی سے ملاقات ہو جاتی اور وہ "سگریٹ" ٹیکس مانگتا یا خاص کر جب ہڑیلا مقسوم صبح ہونے سے پہلے ہی آ دھمکتا، ان دنوں تو صابر کا بالکل دل ٹوٹ جاتا اور اسے اپنے کرگھے کی طرف دیکھتے بھی متلی آتی۔

گھربار بڑی تنگی میں رہتا، نہ کوئی سامان تھا نہ اسباب۔ اکثر فاقے ہوتے تھے۔ اناخان دن بھر سوت کاتتی

یا پاس پڑوس میں کوئی اور کام تلاش کرتی پھرتی مگر پھر بھی صابر بعض اوقات اپنی بیوی پر چیختا چلاتا کہ "تو نے کھانا کیوں نہیں پکایا" اور وہ پھوٹ کر روتی۔

بےبسی کی حالت میں وہ اندر ہی اندر غصے سے کھولتا رہتا اور اپنا یہ غصہ بیوی بچوں پر اتارتا۔

ایک دن وہ نشے میں گھر آیا، دھڑام سے دروازہ کھولا، ایک زور کی ٹھوکر مارکر پونیوں سے بھری بالٹی الٹ دی اور پھر اناخان کو گالیاں دیتا اس پر جھپٹا مگر اسے مار نہ سکا۔ بچیاں ڈر کے مارے ماں کے پیچھے ایک کونے میں چھپ گئیں۔ پھر صابر اپنا سینہ پیٹتا الٹے پاؤں کھسکنے لگا تو اپنے باپ کی وراثت، اپنے کرگھے سے ٹکراکر لڑکھڑا گیا۔ پرانا کرگھا جو پہلے ہی شکستہ حالت میں تھا، چرمراتا ہوا اس کے بوجھ سے الٹا ہو گیا۔ صابر نے طیش میں آکر بڑے زور سے اس پر تھوکا، پھر ایک ایسی ٹھوکر ماری کہ دھرا نکل کے دور جا پڑا اور کرگھا کھل کے ٹکڑے ٹکڑے ہوکے بکھر گیا۔

اگلے دن صبح کو وہ بڑی دیر تک بستر ہی میں منھ تک کمبل اوڑھے پڑا رہا۔ غم اور شرمندگی کے احساسات سے اس کا دم گھٹا جاتا تھا۔

اپنی چھوٹی بچیوں کی آنکھوں میں اسے خوف اور خاموش التجا کی پرچھائیاں دکھائی دی تھیں۔ بیوی نے اس سے کچھ نہیں کہا، بس اتنا ہی بولی: "یہ سب کچھ ہماری مفلسی کی وجہ سے ہے۔" لیکن بیوی کے صبر کو دیکھ کر بھی کلیجہ پھٹتا تھا۔ صابر کو کچھ نہ سوجھتی تھی کہ کیا کرے۔

پھر اس نے کام کرنا سرے سے بند ہی کر دیا۔ ٹوٹا ہوا کرگھا بیچ کمرے میں پڑا رہتا۔ صابر چند دنوں تک صبح تڑکے ہی گھر سے باہر جایا کرتا اور کسی کو علم نہ تھا کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ رات گئے وہ واپس آتا اور کسی سے بات کئے بغیر منھ تک کمبل اوڑھ کر لیٹ جاتا۔ اناخان رات کو دیر تک جاگ جاگ کر مٹی کے چراغ کی دھواں دیتی لو کے سامنے بیٹھی ٹوپیاں کاڑھا کرتی۔ دن میں بشارت اس کا ہاتھ بٹاتی۔ وہ چھے

سال کی ہوئی تھی تب ہی سے دھاگے کے لچھے کھولنے میں ماں کی مدد کرنے لگی تھی۔

اب ان لوگوں نے آتش‌دان کے اوپر ہنڈیا لٹکانا بند کر دیا تھا لیکن اناخان نے صرف ایک بار اپنے شوہر سے بات کرنے کی کوشش کی جبکہ وہ گھر سے باہر جا رہا تھا۔

"دیکھو جی وہ..."

صابر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے صرف سوکھی، مریل، قابل رحم تورسنائی کے سر پر ہاتھ پھیرا جو دروازے کے پاس کھڑی تھی اور پھر باہر نکل گیا۔

شام کو وہ بیس بیس کوپک کے چھے سکے لےکر آیا اور ان کو طاق پر رکھ دیا۔ اس نے اپنے بال بچوں کو نہیں بتایا کہ یہ سکے اس نے ایک بنکر کے یہاں روزینے کی مزدوری کا ذلیل کام کرکے کمائے ہیں۔ جو خود بنکر ہو اس کے لئے ایسی بات تسلیم کرنا نہایت ہی ہتک‌آمیز تھا۔

"مجھے ریلوے کے کارخانے میں نوکری ملنےوالی ہے" ایک دن اس نے کہا۔

اناخان نے ایک آہ دھیمے سے بھری۔ آخر کار!.. اخر کار اس کے شوہر نے کم‌ازکم اس سے بات کرنا تو شروع کی جیسے وہ اس کی صلاح مانگ رہا ہو اور ایسا ہونا ہی اس کے لئے سب سے بڑی مسرت تھی۔

صابر کو ریلوے کارخانے میں نوکری مل گئی۔ ایک مہینہ گزرا اور پھر ایک سال۔ صابر کے پاس نوکری تھی! موروثی بنکر مطمئن تھا، وہ خوش‌نصیب تھا کہ قرض‌خواہوں اور سودخوروں کے پنجے سے آزاد ہو چکا تھا۔

زندگی ہمیشہ ہی جیسی مشکل رہی البتہ اناخان کو اپنے شوہر میں کچھ تبدیلیاں محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ اپنی بچیوں سے زیادہ پیار اور نرمی سے پیش آنے لگا تھا۔ کام پر سے واپس آکر وہ انہیں ریلوے اور انجن کے متعلق بتاتا اور منہ سے انجن کی سیٹی کی نقل کرتا۔ کبھی کبھار جب اناخان کو اتنا کام ہوتا کہ اسے کھانا پکانے کا بھی وقت نہ ملتا تو صابر اسے ہنڈیاں چڑھانے میں مدد دیتا۔ رات کو جب وہ

ٹوپیاں کاڑھنے بیٹھتی تو وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہتا:

"بس رہنے دے، آج بھر کے لئے اتنا بہت ہے، اندھی مت ہو جانا، حفاظت کر آنکھوں کی۔"

صابر کی اس وقت جتنی آمدنی تھی وہ پہلے سے کچھ زیادہ نہ تھی مگر اناخان کو گھبراہٹ یا پریشانی نہیں تھی۔ وہ بڑی احتیاط سے اس کے وہ پتلون اور موزے دھوتی جو کالی چکنائی سے چمکتے تھے اور بشارت اور تورسنائی اپنے باپ کے کام پر سے گھر آنے کے وقت اس کا انتظار کیا کرتیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب صابر وقت بےوقت اور دیر دیر سے گھر آنے لگا تو ان ماں بیٹیوں کو فکر نے گھیرا اور ان کا ماتھا ٹھنکا۔

کبھی کبھی تو وہ آدھی رات تک باہر رہتا اور چھٹی کے روز تو دن بھر غائب رہتا۔ اناخان کو یہ تو کبھی یقین نہیں آ سکتا تھا کہ صابر کسی نشےخانے میں اپنا وقت گزار رہا ہے۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا تھا اور وہ پوچھتی کیسے؟ کیا اپنے شوہر پر بےاعتباری کا اظہار کرکے اس کی ہتک کرتی؟ لیکن ایک دن جب صابر نے اسے پریشان دیکھا تو خود ہی بولا:

"میں اپنے ساتھیوں سے ملنے گیا تھا۔ اچھے لوگ ہیں۔"

اناخان اور بھی پریشان اور فکرمند ہوئی۔ زمانہ خراب ہے، ابھی نئے شہر کی افواہ سننے میں آئی ہے کہ کئی سو لوگوں نے مل کر کسی اہم دفتر پر حملہ کر دیا، دروازے، کھڑکیاں توڑ ڈالے، بہت سے حملہآور گرفتار بھی ہو گئے۔ لوگ کہتے تھے کہ دو محنتکشوں نے گورنر جنرل کے باغ میں پولیس کے ایک آدمی کو ہلاک کر دیا ہے۔ اناخان کو فکر ہوئی کہ صابر کہیں اس قسم کے چکروں میں نہ پھنس جائے۔

"کون ہیں وہ تمہارے ساتھی؟" اس نے بڑی احتیاط سے پوچھا۔

"جیسے میں مزدور ہوں ویسے ہی میرے ساتھی بھی مزدور ہیں۔"

"دیکھو سنو" اناخان لجاجت بھری لہجے میں بولی۔ "وہ تو سب ٹھیک ہے مگر کہیں ان لوگوں سے دوستی کے چکر میں نہ پڑ جانا جو پولیس‌والوں کو قتل کرتے ہیں۔"

صابر نے اس بات کا نہ برا مانا نہ اسے غصہ آیا۔ سیاہ تیل کی بدبو سے بھرے اپنے کھردرے ہاتھوں میں اس نے بیوی کا ہاتھ پکڑ لیا اور دھیمے سے نرمی اور سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ اناخان نے اس سے قبل کبھی بھی ایسے الفاظ نہیں سنے تھے۔

"میرے ساتھی پولیس‌والوں کو قتل نہیں کرتے، ایسا کام کرنے‌والے لوگ نہیں ہیں وہ، مگر وہ خون سے ڈرتے بھی نہیں ہیں۔ جب ہماری تقدیروں کا سوال اور فیصلہ ہوگا تو وہ ہچکچائیں گے نہیں۔ وہ جانتے ہیں کس طرح زندہ رہا جاتا ہے۔ تم اپنے کو دیکھو، تم نے زندگی میں کیا پایا ہے؟ کیا دیکھا ہے؟ پہلے تمہارے باپ نے تمہیں ایک بوجھ سمجھا اور چاہا کہ جس قدر جلد ہو سکے تمہیں فروخت کر دے، ظاہر ہے ایسا صرف اس لئے ہوا کہ وہ بیچارے مفلس تھے اور جاہل تھے، پھر میں تھا۔ میں جو تمہیں چاہتا تو ہوں مگر نہ کبھی تمہیں ڈھنگ سے پیٹ بھر کھلا سکا نہ اب ہی کھلا سکتا ہوں، اور تم، ایک جوان عورت، تم یہ ٹوپیاں کاڑھ کاڑھ کے اپنی آنکھیں پھوڑے ڈالتی ہو، یہ ٹوپیاں، جن میں سے ایک بھی تم خود نہیں پہن سکتیں۔"

اناخان کے سینے میں خوف اور مسرت کی ملی جلی تڑپ اٹھی۔ آج وہ پہلی بار اپنے شوہر میں اتنی خوداعتمادی، اتنی قوت محسوس کر رہی تھی۔ اس وقت وہ کتنا وجیہ لگ رہا تھا مگر مرد کے لئے عورت سے اتنی ہمدردی کیا ٹھیک بات تھی؟ اناخان نے تو کبھی رک‌کر اپنے متعلق سوچا تک نہ تھا، اپنی خوشی کا تو اسے کبھی دھیان ہی نہ آیا تھا، مصیبت بھگتنا تو اس کی قسمت تھی۔ آخر عورتیں ہمیشہ سے اسی طرح گزر بسر کرتی آئی ہیں — اس کی ماں اور نانی اور سب ہی عورتیں! سدا ہی سے!

"ایسے بھی لوگ ہیں جو تمہارے متعلق سوچتے ہیں، ہم

غریبوں کے متعلق سوچتے ھیں" صابر اس طرح بولا جیسے وہ اس کے خیالات، اس کے جذبات کو بھانپ گیا ہو۔ میں نے انہیں دیکھا ھے، میں ان سے ملا ھوں، میں جانتا ھوں، وہ پولیس‌والوں کو قتل نہیں کرتے۔ آخر پولیس‌والے کی حقیقت ھی کیا ھے، ایک غلام ھے وہ، جو کچھ نہیں جانتا۔ اصل میں تو وہ ھاتھ کاٹا جانا چاھئے جس نے اس کو ھمارے سر پر لاٹھی کی طرح مسلط کر رکھا ھے اور جب وہ وقت آ جائے گا تو میرے ساتھی بےخوف ھوکر ایسا کریں گے! وہ ھاتھ زار کا ھے۔"

خوف کے مارے اناخان کا لہو جمنے لگا۔

"تو... تو تم زار کے خلاف ھو گئے ھو... دیکھو خدا کے لئے، ھمارے منھ کے آگے بچے ھیں!"

اس کے شوھر نے چپ چاپ بڑی محبت سے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور اپنے کھردرے ھاتھوں سے اس کے رخساروں پر بہتے ھوئے آنسو پونچھنے لگا۔ ان کی بچیاں غافل سو رھی تھیں، ایسی پرسکون نیند جیسے اس دنیا سے زیادہ پرامن جگہ کوئی نہ ھو۔

"یہ سب کچھ ان بچیوں ھی کے لئے کیا جا رھا ھے، اناخان۔ ڈرنا بڑی شرم کی بات ھے اور پھر ھم اکیلے تو نہیں ھیں، میرا ایک دوست ھے، بےحد عقلمند، بڑا وفادار، وہ قید یا جلاوطنی سے نہیں ڈرتا۔ وہ تو سائبیریا کی برف بھی بھگت چکا ھے لیکن ایسا ھونے سے اس کے دل میں محبت کی گرم‌جوشی اور بڑھ گئی ھے۔"

سائبیریا کی برف، قیدخانہ، جلاوطنی! دھشت کے مارے اناخان کانپنے لگی اور اپنے شوھر کو خوش کرنے کے لئے اس نے مسکرانے کی بےسود کوشش کی۔ وہ شوھر کی کھردری داڑھی کے ایک ایک بال سے، اس کے جسم کے روئیں روئیں سے پیار کرتی تھی، پھر اسے ڈر کیوں نہ لگتا۔

"میں تمہیں سب کچھ ٹھیک سے نہیں سمجھا سکتا ھوں" صابر نے کہا۔ "وہ میرا دوست سمجھا سکتا ھے، جب وہ ھمارے یہاں آئے گا تو تم دیکھنا۔ اس کا نام یفیم دانیلووچ ھے۔"

"خدا ھمیں اپنی پناہ میں رکھے! روسی ھے وہ؟"

صابر مسکرا دیا۔

"ہاں، اور وہ بہت اچھا انسان بھی ہے۔ وہ سینٹ پیٹیرس برگ کا ایک مزدور ہے۔"

اناخان نے تصور میں دیکھا کہ نعمانچہ کی ساری عورتیں کہہ رہی ہیں: "اناخان کو دیکھو، اس نے اپنے گھر میں روسیوں کا خیرمقدم کرنا شروع کر دیا۔ اس کا شوہر اپنے شراب خانے کے دوستوں کو گھر لاتا ہے"۔ پھر تو سب ہی اناخان اور صابر سے کنی کاٹنے لگیں گے، ان سے کترا کے نکلا کریں گے، وہ اناخان کو کام دینا بھی بند کر دیں گے۔ مگر پھر بھی نہ جانے کیوں اناخان کا جی چاہتا تھا، وہ اس شخص کو ضرور دیکھے جسے اس کا شوہر اپنا استاد کہتا تھا۔

اور یفیم دانیلووچ رات کو آیا جب نعمانچہ گھری نیند میں سویا ہوا تھا۔

چوکھٹ پار کرتے ہی اس نے اپنی چمک دار نوک والی ٹوپی اتاری اور اس کے ملائم سنہرے بال اس کے ماتھے پر بکھر گئے۔ ہلکی سرخ مونچھوں کی وجہ سے اس کا چہرہ عام اور کافی عرصے سے جانا پہچانا سا لگتا تھا۔ وہ صابر سے تو عمر میں بڑا تھا لیکن اپنی عمر کے حساب سے خاصا جوان لگتا تھا۔

اناخان اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے تو سوچا تھا کہ وہ کوئی بڑا ہی خوف ناک سا آدمی ہوگا، سائبیریا کے برفانی طوفانوں کی طرح دہشت ناک، کسی جیل خانے کی طرح سرد اور اداس، تیوریوں پر بل پڑے ہوں گے، نفرت اور انتقام کے شعلے اس کی پراسرار آنکھوں میں بھڑکتے ہوں گے، وغیرہ۔

لیکن اس سب کے بجائے وہ خوش اخلاقی سے مسکرایا اور اس نے اناخان کو بڑی سادگی کے ساتھ سلام کیا اور پھر سب سے زیادہ حیرت کی بات تو یہ ہوئی کہ وہ ازبیک زبان میں بات کرنے لگا۔ دہلیز پار کرتے وقت اس نے اپنے بھاری جوتوں میں لگی کیچڑ بڑی احتیاط کے ساتھ صاف کی۔

اناخان نے بشارت کی جیکٹ اپنی سر پر ڈال لی اور اس

کے کناروں سے اپنا منہ چھپاکر کن انکھیوں سے بڑی مشکوک نظروں کے ساتھ اس کی ہر بات کو دیکھنے لگی۔ اسے یہ بھانپنے کی فکر تھی کہ وہ پستول یا چھرا کہاں چھپائے ہوئے ہے۔

"تو لیجئے یفیم دانیلووچ، ہم اپنے گھر پہنچ گئے۔ یہ میری بیوی ہے، اناخان۔"

اناخان بے ساختہ میاں کے پیچھے چھپ گئی۔

"خوب، بہت خوب" نووارد نے نمایاں طور پر روسی لہجے میں کہا۔ "اناخان" بہت خوب، روسی میں ہو تو اسے آننا کہیں گے، میری بیوی کا نام صوفیہ یا آپ لوگ تو صوفیہ خان کہیں گے اسے؟ مگر وہ ایوانوو وازنیسینسک میں ہے، اس نام کا شہر ہے نا۔ وہ بھی بنکروں ہی کا شہر ہے مگر یہاں سے بہت دور ہے۔"

صابر نے بشارت اور تورسنائی کی طرف اشارہ کیا جو بڑے والے صندوق کے پاس سو رہی تھیں۔

"یہ ہماری بچیاں ہیں۔"

"بچیاں... خوب، بہت خوب" یفیم دانیلووچ نے بڑے خلوص سے کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اور بھی کچھ کہنا چاھتا تھا مگر غالباً اس کو مناسب ازبیک لفظ یاد نہیں آ رہے تھے۔

"صوفیہ کے اور میرے اولاد نہیں ہے، ایسا ہے نا کہ ہم دونوں زیادہ تر الگ ہی رہتے ہیں۔ ذرا دقتیں ہیں، ویسے کام بھی تو بہت ہے ورنہ تو ہم دونوں کو بھی بہت چاؤ ہے کہ بچے ہوتے۔"

اناخان پر حیرانگی سے زیادہ حیرانگی طاری تھی۔ اس آدمی کی تمام خواھشیں ایسی تھیں جنھیں وہ سمجھ سکتی تھی۔ کیا واقعی ایسا ہو سکتا تھا کہ جو لوگ خود زار کی زندگی اور اس کا اقتدار ختم کر دینا چاھتے تھے وہ اتنے معمولی لوگ تھے؟ یہ آدمی تو بہت ہی نیک اور ایماندار لگتا تھا جب ہی تو صابر اس کا دوست بن گیا۔ ایسے آدمی پر تو واقعی بھروسہ کیا جا سکتا تھا جو کہ جانتا تھا کہ غریبوں کو کیا

چاھئے۔ تو پھر صابر نے جو کچھ کہا تھا وہ ٹھیک ہی نکلا۔ واقعی ایسے لوگ بھی تھے جنھیں اناخان جیسی مجبور اور بےبس عورتوں کی مسرت کی فکر تھی۔

صابر نے مہمان سے بیٹھ جانے کی درخواست کی اور وہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔

اناخان کان لگاکر دونوں کی باتیں سننے لگی اور ساتھ ہی ادھ کھلے کیواڑ میں سے روٹیاں، پھل اور کھانے کی چیزیں بھی پکڑاتی جاتی تھی لیکن دونوں ہی مرد بڑی ہی معمولی، روزانہ کی باتوں کے متعلق گفتگو کر رہے تھے، کوئی بھی خاص یا پراسرار بات نہیں ہو رہی تھی۔

اناخان نے نووارد کو جوراخان کا نام لیتے سنا اور اس احترام کے ساتھ گویا وہ کسی مولوی کا نام تھا اور وہ سوچنے لگی: "جوراخان کون ہے؟ کس کی بیوی ہے؟" اور پھر ایک دم سے اسے گفتگو سے اندازہ ہوا کہ یہ عورت بھی ان لوگوں کے ساتھ ہے۔

چائے پینے کے بعد نووارد اور اناخان کا شوہر ایک کتاب لےکر بیٹھ گئے جس میں جلد نہیں تھی اور دھیرے دھیرے باتیں کرنے لگے۔ نووارد صابر کو سمجھا رہا تھا کہ مزدوروں کو کسانوں سے دوستی اور تعلقات بڑھانے چاھئیں۔ اناخان کچھ نہیں سمجھی کہ وہ کیوں ایسا کرنے کو کہہ رہا تھا۔ پھر ان لوگوں نے زار اور اسی کے قسم کے کسی بدمعاش بادشاہ کے درمیان جنگ کے متعلق بات‌چیت کی۔ اس دوسرے کا نام ولہلم تھا مگر اناخان نے زار کو ختم کر دینے کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں سنا۔

اناخان کو کچھ تسلی سی ہو گئی تھی۔ صابر بڑے کھلے دل سے بیٹھا اپنے دوست کی بات سنے جا رہا تھا اور ایسا نرم دل، عقلمند اور دلکش لگ رہا تھا جیسا وہ پہلے کبھی نہیں نظر آیا تھا۔ اناخان کا دل خوشی سے بھر گیا اور اس نے محسوس کیا کہ صابر کے لئے اس کے دل میں ایسی محبت بھر گئی تھی کہ پہلے کبھی جس کا تجربہ اسے نہیں ہوا تھا۔

یکایک یفیم دانیلووچ نے کہا کہ اب اسے جانا چاھئے۔

اس نے چائے کے لئے اناخان کا شکریہ ادا کیا اور صابر کو روکتے ہوئے بولا: "نہیں، نہیں، مجھے پہنچانے کے لئے چلنے کی کوئی ضرورت نہیں، آپ تکلیف نہ کیجئے۔"

صابر نے اس کی بات کا کوئی خیال نہ کرتے ہوئے کوٹ پہننا شروع کیا۔

"رہنے دیجئے، ایسا نہیں ہونا چاہئے، آپ میرے ساتھ نہ آئیں" یفیم دانیلووچ مسکراکر بولا۔

"یہ الفاظ کچھ ایسے تھے کہ درخواست نہیں بلکہ حکم لگتے تھے اور اناخان کو یکایک محسوس ہوا کہ یہ نیک، سیدھا سادہ انسان سخت خطرے میں زندگی گزار رہا ہے۔

وقت آدھی رات سے اوپر ہو چکا تھا اور یفیم دانیلووچ جس خاموشی کے ساتھ اچانک آیا تھا ویسے ہی چپکے سے نکل گیا۔

"اس کے جیسے آدمی کو، جسے ڈھکی گھوڑا گاڑی میں رخصت کیا جانا چاہئے تھا، یوں رات میں اکیلے جانا پڑ رہا ہے، چوری چھپے، جیسے کہ وہ کوئی چور ہو" اناخان نے تلخی سے کہا۔ "وہ پھر آئے گا کہ نہیں؟"

صابر تن کر کھڑا ہو گیا اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ضرورت ہوتی ہے تو وہ ذرا بھی نہیں ہچکچاتا۔ دن ہو یا رات، وہ نزدیک یا دور، کسی بھی جگہ کو چلا جاتا ہے چاہے جتنی مشکلات ہوں، چاہے جتنا خطرہ ہو۔"

اگلی بار اناخان نے دانیلووچ کو کوئی چھ مہینے کے بعد دیکھا۔ اس مرتبہ وہ دو دن اور دو رات ان کے یہاں ٹھہرا۔ اناخان نے سنا کہ وہ جو زار تھا وہ تو اب نہیں رہا مگر کچھ بدمعاشوں نے مل‌کر ایک اور زار کو تخت پر بٹھانے کی کوشش کی ہے لیکن لوگوں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب وہ زار کے بغیر ہی رہیں گے، انہیں زار وار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس وقت صابر اور یفیم دانیلووچ دونوں ہی جھلائے ہوئے تھے۔ وہ جو بھی بات کرتے، چاہے ریلوے کی ہو، کارخانے، بازار، شرابخانے، پولیس‌والوں، کسی کی بھی ہو، انہیں

اس میں کوئی نہ کوئی عیب، گڑبڑ، بےانصافی اور کمینہ‌پن نظر آتا تھا جو عوام کے لئے نہایت ہتک آمیز تھا۔ گویا خود وہ دونوں آئے تھے کسی پرستان یا جنت کی داستان سے نکل‌کر کہ انہیں اپنے ارد گرد کی کوئی چیز پسند نہیں آتی تھی اور ہر چیز کو بدلنا چاہتے تھے۔

یفیم دانیلووچ بندوقوں اور مشین‌گنوں کا ہی کلمہ پڑھتا رہتا تھا۔ اس کی آواز میں غصہ رہتا تھا اور صابر کی آنکھوں میں بھی طیش۔ اس بار اناخان کو یہ تسلیم کرتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی تھی کہ خوف کے مارے اس کا برا حال تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ مدرسے کا ایک استاد اور مولوی کا بیٹا محمود نعیمی شہری میونسپل کونسل کا صدر ہو گیا۔

"یہ ان کا اقتدار زیادہ دن چلے گا تھوڑی ہی" یفیم دانیلووچ نے کہا اور سینے پر ہاتھ رکھا۔ "یہ تو ہماری گدی ہے۔"

بڑی احتیاط کے ساتھ کسی اندر کی جیب سے اس نے ایک سیاہ، چمکدار پستول نکالا۔ اناخان سہم‌کر پیچھے ہٹ گئی، اس نے زندگی میں پہلی بار ایسا خطرناک ہتھیار دیکھا تھا اور وہ اس سے خوف‌زدہ ہو گئی۔

یفیم دانیلووچ نے اپنی بیوی کا بھیجا ہوا ایک خط پڑھ‌کر سنایا، صوفیہ نے ایوانوو وازنیسنسک میں بنکروں کی زندگی کے متعلق بہت کچھ لکھا تھا، دانیلووچ نے خط کے معنی اپنے طور پر لگائے اور بہت خوش ہوا کیونکہ اس کی بیوی نے درپردہ، بین‌السطور اس کو یہ اطلاع دی تھی کہ روس کے بڑے بڑے شہروں میں اور فیکٹریوں اور ملوں میں مزدوروں نے خفیہ طور پر مسلح ہونا شروع کر دیا تھا۔

اناخان صوفیہ کے متعلق سوچنے لگی۔ وہ کیسی عقلمند ہوگی جو اس ہوشیاری سے خط لکھتی تھی... مگر اپنے شوہر سے اتنی دور رہ‌کر وہ کیسے زندگی بسر کر رہی تھی؟ وہ اپنے شوہر کو یاد تو کرتی ہی ہوگی، اس کے متعلق فکرمند بھی رہتی ہی ہوگی! اناخان اس عورت کا ٹھیک سے تصور تو

نہیں کر سکی تھی مگر اس سے ایسی ہمدردی محسوس کرتی تھی جیسے وہ اس کی اپنی ہی بہن ہو۔

تیسرے دن صبح تڑکے ہی یفیم دانیلووچ کہیں چلا گیا۔ چلتے وقت اس نے سوتی ہوئی تورسنائی کو چوما۔

صابر بھی دانیلووچ کے ساتھ گیا۔

پھر جو دن گزرے وہ ایسے لگتے تھے کہ کبھی ختم ہی نہ ہوں گے اور اناخان کے لئے تو وہ بڑی تشویش اور پریشانی کے دن تھے۔ ہر روز شام کو اپنی بچیوں کو سلا دینے کے بعد وہ دل میں درد چھپائے بیٹھی، شوہر کی واپسی یا اس کے متعلق کسی بری خبر کا انتظار کرتی رہتی۔ صابر کبھی کبھار ہی آتا تھا جب کبھی آتا، تو روٹی ضرور لاتا مگر پھر بہت جلد غائب ہو جاتا۔ اس کے رویے سے درشتی اور سختی جھلکتی تھی۔ اناخان کا جی چاھتا، اس سے کہے: "بچیوں سے تھوڑی دیر ھنس بول لو، میری جان، ان کے ساتھ کھیلو، اس سے تمھیں وھاں خطرہ جھیلنے کا سہارا ملے گا" مگر وہ ھچکچاکے رہ جاتی اور کچھ کہتے نہ بنتی۔

وہ اسے چھوڑنے دروازے تک گئی تو اس نے کوشش کی کہ خوش نظر آئے۔

"مالک، اب کے آپ ھماری بچیوں کے لئے کیا لائیں گے؟"

"میں ایک چھوٹا سا ستارہ لاؤں گا۔ ایک چھوٹا سا سرخ ستارہ!" صابر نے جواب دیا۔

وہ اپنی بیوی اور بچیوں کو اپنے سینے سے لگاکے پیار کرنے کے لئے تڑپ رہا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اب کی بار وہ جائے تو شاید کبھی واپس نہ آ سکے لیکن ایسا کرکے وہ ان کے دل میں کسی خطرے کا احساس نہیں پیدا کرنا چاھتا تھا۔ اس لئے اس دن وہ ان کو گلے لگاکے خدا حافظ کہنے کے بجائے دور ہی سے رواروی میں ھاتھ ھلاکر رخصت ہو گیا۔

اور واقعی وہ پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ وہ ریلوے مزدوروں کے کارخانے میں کام کرنے جاتا تھا لیکن وھاں جو کام کرتا تھا، وہ کام نہ تھا جس کی تفصیلات شاموں کو

واپس آکر بشارت اور تورسنائی کو بتایا کرتا تھا۔ یہ وہ کام تھا جو ایک نئی تاریخ بنا رہا تھا اور اس زمانے میں لاکھوں محنت‌کش اسی ایک کام میں جان لڑائے ہوئے تھے۔

حالات زیادہ سے زیادہ پریشان‌کن اور خطرناک ہوتے جاتے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ نئے شہر میں گھڑسوار سپاہی سڑکوں اور گلیوں میں گھوم رہے ہیں اور زبردستی لوگوں سے کہہ رہے ہیں کہ وہ گھروں سے باہر نہ نکلیں۔ یہ افواہ بھی اڑی ہوئی تھی کہ نعمانچہ میں پولیس‌والے اپنی یونیفارم کی جگہ روئی بھری عبا پہن‌کر اپنے رشتے‌داروں کے یہاں چھپ گئے ہیں اور تاشقند میں ایسے ایسے سپہ‌سالار آ گئے ہیں کہ جن کی تلواریں خون سے سرخ ہو رہی ہیں۔

راتوں کو اناخان کی پلک سے پلک نہ لگتی اور ایسی ہی ایک رات کو یکایک فضا میں گولیاں چلنے کی آواز گونجنے لگی جو کبھی قریب سے سنائی دیتی، کبھی دور سے۔ اناخان اپنی سہمی ہوئی بچیوں کو اپنے کلیجے سے لگائے صبح تک یوں ہی بیٹھی رہ گئی۔

صبح کو اس نے تورسنائی کو تو اپنے ایک پڑوسی کے حوالے کیا اور خود بشارت کو لے‌کر گھر سے نکلی۔

نعمانچہ کی گلیوں میں کہیں کوئی ایک فرد نہ تھا۔ بازار سے گزرکر اناخان رک گئی۔ اب کہاں جائے؟ نئے شہر؟ ریلوے کے کارخانے یا واپس گھر اور وہاں صبر کئے بیٹھی انتظار کرے؟ نہیں، وہ واپس نہیں جائے‌گی، آج اسے اپنے شوہر کو دیکھے گیارہ دن گزر چکے تھے۔ طرح طرح کے اندیشے اس کے دل پر ہجوم کئے تھے۔

اس کے پاؤں خود بخود آگے بڑھنے لگے، اس پر کچھ ایسی وارفتگی طاری تھی کہ اس نے یہ بھی نہیں خیال کیا کہ جس ننھی سی بچی کو وہ ہاتھ پکڑے گھسیٹتی جا رہی تھی اس سے ساتھ نہیں چلا جا رہا تھا، بار بار وہ ٹھوکر کھا کھاکر لڑھکتی تھی۔ بشارت سے جتنا تیز ممکن ہو سکتا تھا دوڑ رہی تھی، اتنی تیز کہ وہ اپنے ننگے پیروں میں چبھتے کانٹوں کی بھی شکایت نہیں کر پا رہی تھی اور نہ ہی اس نے شکایت کی۔

چاروں طرف کا سناٹا بچی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور ماں کی کھوئی ہوئی ادھر ادھر ڈھونڈتی نگاہیں دیکھ کر وہ خوف کے مارے بدحواس تھی۔

کارخانے کے پھاٹک پر ایک چیچک‌رو نوجوان نے اناخان کو روکا۔ اس کی کمر کی پیٹی میں ایک دستی بم تھا اور بازو پر سرخ رنگ کی پٹی بندھی تھی۔ پھر فوراً ایک ذرا سن‌دار روسی مزدور آ گیا۔ اس کے بازو پر بھی پٹی بندھی تھی اور کندھے پر سے بندوق لٹک رہی تھی۔

"یہ صابر مزدور کی بیوی ہے" نوجوان بولا۔

"وہ یہاں نہیں ہے" سن‌دار آدمی نے ازبیک زبان میں کہا۔ "تم فوراً اپنے گھر واپس جاؤ، آخر تم کیا سمجھتی ہو کہ کہاں جا رہی ہو؟ صابر تو قلعے میں ہے اور وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔"

پھر بشارت اور اناخان نے اور کچھ سننے کا انتظار نہیں کیا۔ دونوں نئے شہر کی طرف دوڑیں۔

نعمانچہ کی طرح نئے شہر کی بھی ساری سڑکیں سنسان پڑی تھیں لیکن جیسے جیسے یہ دونوں قلعے کے قریب آتی گئیں ان کو اس چیچک‌رو لڑکے اور اس سن‌دار مزدور بندوقچی کی طرح کے اور لوگ ملتے گئے۔ ایک سڑک کو لکڑوں، گاڑیوں کے پہیوں، چھوٹے بڑے پیپوں، ریت کی بوریوں اور دوسری بوریوں سے جن میں روڑے بھرے تھے، بند کر دیا گیا تھا، ایسا لگتا تھا کہ جیسے کوئی پہاڑی چشمہ بارش کے بعد ابل گیا ہو اور اس کے پانی کو روکنے کے لئے یہ سب انتظام کیا گیا ہو۔ ماں بیٹی نے اس رکاوٹ کا چکر کاٹا ہی تھا کہ یکایک پیچھے سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آنے لگی اور بہت سے گھڑسوار ان کے پاس سے یوں آگے نکل گئے جیسے شکاریوں کا کوئی دستہ کسی شکار کا پیچھا کر رہا ہو۔ پھر انہیں نظر آیا کہ بڑے بڑے مکانوں کی کھڑکیوں کے شیشے چکناچور ٹوٹے ہوئے تھے، پھاٹک چوپٹ کھلے ہوئے تھے اور ٹوٹ پھوٹ گئے تھے، سڑک کے بیچوں بیچ ایک گھوڑا مرا پڑا تھا جس پر زین اب تک کسی تھی۔

اناخان شاذ ہی کبھی نئے شہر جاتی تھی لیکن اس نے فوراً ڈاک‌خانے کو پہچان لیا حالانکہ اس کی دیواروں پر چھید سے ہو گئے تھے اور اوپر سے نیچے تک عمارت ایسی سیاہ ہو رہی تھی جیسے آگ اور دھوئیں کی لپیٹ میں آ گئی ہو۔ عمارت کے سامنے لگے تار کے کھمبے دوھرے ہو ہوکر جھک گئے تھے اور ٹوٹے الجھے تار سانپوں کی طرح زمین پر لوٹ رہے تھے۔ پوری عمارت میں کوئی کھڑکی سلامت نہ تھی۔ فٹ پاتھ پر ٹوٹے شیشے کے چمکدار ٹکڑے، اینٹیں، لکڑیوں کے چیلے، لوھے کے پتر بکھرے ہوئے تھے اور دروازوں کو قبضوں سمیت اکھیڑ لیا گیا تھا۔

ڈاک‌خانے کے پھاٹک اور دروازے پر مسلح لوگ کھڑے تھے اور ان کے کپڑوں سے اناخان کو اندازہ ہوا کہ وہ مزدور تھے۔ نقاب ڈالے ہوئے ایک عورت اور اس کے ساتھ ایک بچی کو دیکھکر ان میں سے ایک آگے بڑھا جس کی بڑی بڑی سیاہ مونچھیں تھیں، کمر میں بندوق کی گولیوں‌والی ایک پھٹی پرانی چتھڑا سی پیٹی بندھی تھی اور اس نے ان دونوں کو انگلی کے اشارے سے بلایا اور ڈاک‌خانے سے ملے ہوئے ایک گھر کے اندر لے گیا۔ اناخان پرنجے میں سے اس کو بڑی امید بھری نظروں سے تکتی گئی لیکن اس مونچھیل مزدور نے بس اتنا ہی کیا کہ دونوں کو وہاں چھوڑکر باہر گلی میں نکلنے کے لئے سختی سے منع کرکے چلا گیا۔

صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس گھر میں جس کی کھڑکیوں کے سردل غائب تھے، کوئی دکان رہی ہوگی، اب کھڑکیوں پر تختے جڑ دئے گئے تھے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف چند بچی کھچی کرسیاں کاؤنٹر کے پاس رکھی تھیں۔

اناخان نے ڈرتے ڈرتے چاروں طرف دیکھا ہی تھا کہ اسے یفیم دانیلووچ ایک کمرے سے نکلتا نظر آیا۔ اس کمرے کے اندر سے زور زور سے بحث کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یفیم ننگے سر تھا اور اس کے بھورے بال بکھرے ہوئے تھے، چھوٹی سی چمڑے کی جیکٹ کھلی ہوئی تھی، کمر سے پستول لٹک

رہا تھا اور منھ میں ایک بڑا سا، ہاتھ سے بنایا ہوا، دھواں دیتا سگریٹ دانتوں کے بیچ میں دبا تھا۔

دونوں ماں بیٹیاں چپ‌چاپ اس کی طرف دوڑیں۔

"ادھر، وہ یہاں ہے" یفیم دانیلووچ نے کہا۔ اس کا چہرہ کچھ زرد سا پڑ گیا۔ "اب تم لوگ آ گئی ہو تو پھر آ ہی جاؤ۔"

وہ انہیں ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا جہاں بہت سے لوگ بھرے ہوئے تھے اور ان میں سے زیادہ‌تر لوگ ایک لمبی سی میز کو گھیرے کھڑے تھے جس پر ایک بڑا سا نقشہ پھیلا ہوا تھا (اناخان سمجھی، شاید میز پر قالین بچھا ہے)۔ اناخان کو یہ دیکھکر بڑی حیرت ہوئی کہ کمرے میں ایک لڑکی بھی موجود تھی، دبلی پتلی، یفیم دانیلووچ کی طرح کاھی چمڑے کی جیکٹ پہنے۔ وہ ایک کونے میں بیٹھی تھی اور اس کے سامنے تار بھیجنے کی مشین اور دیگر سامان رکھا تھا۔ تو اس لڑکی نے بھی یہاں آنے کی ہمت کر ہی لی تھی؟ آخر وہ کس کو تلاش کر رہی تھی؟

"اب یہاں آ گئی ہو، تم لوگ تو ذرا سا بیٹھ جاؤ، ذرا سستا لو" یفیم دانیلووچ نے فکرمند انداز سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

لیکن اسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، یفیم نے رسیور اٹھایا اور اس کے چہرے کے تاثرات اور بار بار خوشی بھرے "واہ"، "ہاں" وغیرہ سے اناخان کو ایسا اندازہ ہوا کہ شاید یفیم بڑی دیر سے ان خبروں کو سننے کے لئے منتظر اور پریشان تھا۔ کمرے میں بالکل سناٹا چھا گیا تھا۔ تاروالی مشین پر بیٹھی لڑکی بھی تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں مسرتیں رقص کر رہی تھیں۔ وہ مونچھیل مزدور جو اناخان کو گھر کے اندر لایا تھا، دروازے میں آکر فوجی انداز سے کھڑا ہو گیا تھا مگر وہ بھی اپنی مسرت کو چھپا نہیں پا رہا تھا۔ فوراً ہی اس نے اپنی ٹوپی گھماکر ایک بانکپن کے ساتھ زاویہ بدل‌کر دوسری طرف سر پر جمائی اور بھاگ گیا۔ پھر ایک ہی لمحے

بعد پورے مکان اور آنگن اور احاطے میں ایک زور کی آواز گونجی: "ارا!"

یفیم دانیلووچ نے اس لڑکی کو اشارہ کیا اور فوراً ہی کونے میں اپنی چھوٹی میز کے پاس پہنچ گئی۔ یفیم کمرے میں ٹہل ٹہل کر روسی میں کچھ بولنے لگا اور لڑکی کی انگلیاں کھٹاکھٹ مشین پر چلنے لگیں۔ سب لوگ بالکل چپ ہوکر یفیم کے وہ الفاظ سننے لگے اور لڑکی کی انگلیاں برابر یوں چلنے لگیں جیسے وہ طبلہ بجا رہی ہو۔ اناخان سمجھ گئی کہ ملک کے کونے کونے کو کوئی اچھی خبر بھیجی جا رہی ہے۔

یفیم دانیلووچ جو کچھ کہہ رہا تھا اس میں سے اناخان کی سمجھ میں بس دو ہی لفظ آ رہے تھے — "تاشقند" اور "قلعے کی محافظ فوج" اور اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اسی قلعے کی بات کر رہا تھا۔ وہ نفرت‌انگیز جگہ، جس سے اناخان جیسے غریب لوگ جب بھی نئے شہر میں آتے، کترایا کرتے تھے۔ اس کے چاروں طرف عجلت کے ساتھ مٹی کی اونچی دیواریں تعمیر کر دی گئی تھیں اور کانٹےدار تار لگاکر حدبند کر دیا گیا تھا۔ چمکتی سنگینیں، چڑھی ہوئی رائفلیں کاندھے سے لٹکائے فوجی سپاہی دیواروں پر عموماً دکھائی دیتے تھے۔

نقاب کے اندر اناخان نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر دبا لئے اور اپنے دل کی تیز دھڑکن کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کا صابر بھی وہیں تھا، قلعے کے اندر۔ وہ جو ذرا سن‌دار مزدور کارخانے کے پھاٹک پر ملا تھا، اس نے تو یہی کہا تھا۔ تو پھر صابر نے کونسا ایسا کارنامہ کیا تھا کہ اس کے ساتھی اس قدر خوش تھے؟

پھر ایک لڑکی جلدی جلدی کمرے میں آئی۔ اس کے سر پر سفید رومال بندھا تھا اور اس رومال پر ایک سرخ صلیب سلی ہوئی تھی۔ اس لڑکی نے یفیم کے کان میں کچھ کہا، یفیم کی تیوری پر بل پڑ گئے، جیسے وہ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا ہو اور پھر وہ اس لڑکی کے ساتھ جانے کو ہوا

کہ اناخان اور بشارت اس کی طرف دوڑیں۔ وہ اس واحد آدمی کو آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاھتی تھیں جو صابر سے واقف تھا۔ یفیم نے بشارت کا ھاتھ پکڑا اور سر کے اشارے سے اناخان کو ساتھ آنے کو کہا۔

دروازے تک پہنچ کر یفیم کو ایک دم چکر آیا اور بشارت کا ھاتھ اس کے ھاتھ سے چھوٹ گیا۔ مردوں نے لپک کے یفیم کو سنبھالا اور جو سب سے قریب کرسی تھی اس پر بٹھا دیا، سفید رومال والی لڑکی نے یفیم دانیلووچ کی جیکٹ کے اندر ھاتھ ڈال کر اس کا بایاں کندھا ٹٹولا اور پھر جو اس نے اپنا ھاتھ باھر نکالا تو وہ خون سے تر تھا۔

"یفیم دانیلووچ..."

"چچا یفیم!" بشارت اور اناخان چیخیں۔

یفیم کے چہرے پر صرف ایک کمزور سی مسکراھٹ آئی۔

لڑکی نے جلدی جلدی مرھم پٹی کا سامان اپنے بیگ میں سے نکالا اور زخم کو باندھا۔

"جلدی آؤ" اس نے اٹھکر دوبارہ بشارت کا ھاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

وہ انھیں لے کر باھر سڑک پر آیا، پھر ایک ٹوٹے ہوئے جنگلے کے ساتھ چلتا ہوا خوبانیوں کے ایک باغ میں گھسا جہاں وہ ایک چھوٹی جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔

وھاں صابر ایک کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس، ایک تخت پر لیٹا تھا۔

"ابا، ابا!" بشارت چلائی جس نے اس کو سب سے پہلے دیکھا تھا۔

پھر اناخان پلنگ کی طرف دوڑی اور چپ‌چاپ اس کے پاس پہنچ کر زمین پر دوزانو ہو گئی، نقاب جو اس نے پیچھے کو الٹ دی تھی، زمین پر گر پڑی۔

اسے فوراً ھی یہ نظر آ گیا کہ اس کا شوھر اور اس کی بچیوں کا باپ دنیا سے رخصت ہو رھا ہے۔

صابر کے زرد چہرے پر داڑھی بڑھی ہوئی تھی، آنکھیں

اندر کو دھنس گئی تھیں، لب خشک تھے اور آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں۔

کیا اسے دکھائی دے رہا تھا؟ کیا وہ اپنی بیوی اور بچی کو پہچان سکتا تھا؟

"اناخان... بشارت..." صابر نے بےآواز الفاظ میں کہا۔

"ابا" بشارت کی آواز نے جیسے ان الفاظ کو گونج بخش دی۔

"یفیم دانیلووچ" صابر نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"میں یہاں ہوں، صابر۔ یہ ہوں۔"

"قلعے کی محافظ فوج..."

"اسے پسپا کر دیا گیا، صابر۔ شہر اب ہمارے قبضے میں آ گیا ہے۔"

صابر نے اپنی مائل بہ انحطاط قوت کو سمیٹتے ہوئے سر اٹھایا۔ اناخان اور یفیم نے بڑھ کر اس کے کندھوں کو سہارا دیا۔ ڈاک‌خانے کی چھت پر لہراتا ہوا لال جھنڈا کھڑکی میں سے دکھائی دے رہا تھا۔

"اباجان، وہ دیکھئے، لال جھنڈا۔ آپ کو دکھائی دے رہا ہے نا؟"

"میری نگاہیں کمزور ہو گئی ہیں، بیٹی۔ تمہارا باپ بہت تھک گیا ہے۔"

یفیم اور اناخان کی مدد سے وہ پھر تکئے پر لیٹ گیا، آنکھیں بند کر لیں اور اناخان کا ہاتھ ٹٹولا۔

"صابرجان!" اناخان نے ایک چیخ ماری۔ وہ خود اپنی آواز کو مشکل سے پہچان رہی تھی۔

اس کے بعد اسے یاد نہ تھا کہ کیا ہوا۔

دوسرے دن جب اسے ہوش آیا تو صابر زندوں میں نہیں تھا۔ اس کے پاس یفیم دانیلووچ بیٹھا تھا اور اس کے بائیں کندھے پر پٹیاں بندھی تھیں۔ بشارت یفیم سے لپٹی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں روتے روتے سرخ ہو گئی تھیں۔ ان لوگوں کے پاس، نیچے فرش پر تورسنائی بیٹھی، اپنی موٹی موٹی

گلگتھنا انگلیوں سے اپنے باپ کی پرانی ٹوپی پر سے ننھا سا لال ستارہ نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"امی، دیکھئے ایک ننھا ستارہ، ایک ننھا لال ستارہ!"
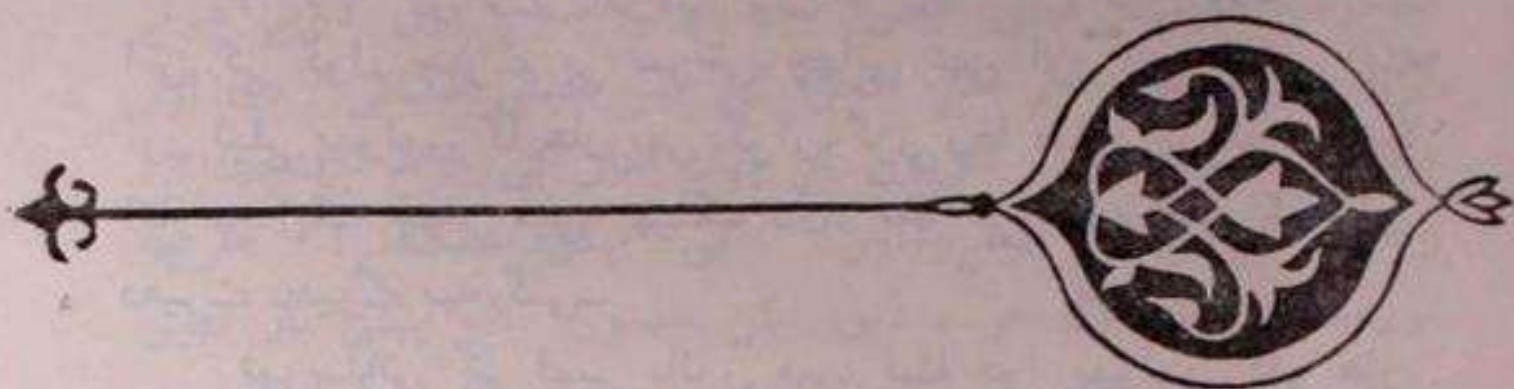
تیسرا باب

قدرت اللہ نے نئی اقتصادی پالیسی کے تحت جو کارخانہ لگایا تھا اس کے پاس ہی ایک پرانا قبرستان تھا۔

قبروں کی مٹی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر ایسے لگتے تھے جیسے بہت سے اونٹ رات میں یہاں ٹھہر گئے ہوں اور یہ ان کے کوہان ہوں۔ اور ان کے درمیان ہزار شیخ کا نہایت ہی بلند مقبرہ کھڑا ہوا تھا جس کے چاروں طرف سرسبز جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ان کی بیلوں نے مقبرے کی شکستہ دیواروں کو گنبد جیسی چھت تک ڈھک رکھا تھا۔

بشارت اور تورسنائی قبرستان میں سے ہوکر بھی جا سکتی تھیں مگر انہوں نے اس کا کاوا کاٹا۔ بہار کا موسم تھا، دھوپ نکلی ہوئی تھی اس لئے لڑکیاں بڑے مزے میں تھیں۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ چلتی ہی جائیں، چلتی ہی جائیں ان نالیوں کو پھلانگتی ہوئی جن پر گھاس اگ آئی تھی، آلوچے کے پھولتے ہوئے پیڑوں کی طرف ہاتھ اونچا کر کرکے لپکتی ہوئی چلتی ہی جائیں۔

دونوں جس سڑک پر جا رہی تھیں اس پر گھوڑاگاڑیاں چلا کرتی تھیں اور اس سڑک کے دونوں طرف طرح طرح کی جنگلی گھاس خوب گھنی اگ آئی تھی، امربیل، گرکھرو، کیڑا پتی پودینہ گھاس وغیرہ۔ سورج اوپر ہی اٹھتا جا رہا

تھا اور گھاسوں میں سے طرح طرح کی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ شہد کی مکھیوں اور بھونروں کی بھنبھناہٹ ہوا میں تیر رہی تھی۔

بشارت نے اپنے سر پر لپٹا ہوا پرانا بلاؤز کھول دیا۔ اس کے گول چہرے پر سرخی چھائی تھی اور اس کو پودینہ اور نیلے پھولوں کا ہار بھی گراں گزر رہا تھا۔ اس نے وہ مالا اتار کے ایک چھلے میں پھینک دی، مالا نے ایک چکر کاٹا اور دھیرے دھیرے بہہ گئی۔

تورسنائی کے لمبے بالوں میں لپٹا ہوا پھولوں کا ہار، بشارت کے ہار سے مختلف تھا۔ اسے تورسنائی نے آق گل نامی پھولوں سے بنایا تھا، گول پنکھڑیوں والے سفید نازک پھول جو چاندی کے سکوں کی طرح لگتے تھے اور جن میں لمبی لمبی پتلی نازک ٹہنیاں ہوتی تھیں۔ بشارت نے ان پھولوں کو دیکھا:

"تمہارا چہرہ بالکل زرد ہو گیا ہے، اپنی اس مالا کو پھینک دو اور سر کو ڈھکو۔"

لیکن تورسنائی اپنی خوبصورت مالا کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ہار اس پر بہت زیب دیتا ہے۔

"میں تو صوفیہ چچی کے یہاں جاؤں گی یہ مالا پہن کر" اس نے کہا۔ "اور وہ مجھے پہچانیں گی بھی نہیں۔"

تورسنائی بڑی احتیاط کے ساتھ راستہ منتخب کرتی ہوئی چل رہی تھی تاکہ اس کی شلوار پر بھی گرد نہ جمے۔ اس کے برعکس بشارت کسی لڑکے کی طرح اپنی ایڈیوں سے گرم دھول کے بادل اڑاتی، کیچڑ میں پاؤں رکھتی اور چھوٹے گڈھوں سے پانی اچھالتی چلی جا رہی تھی۔

پرانے خوبانی کے درختوں کی شاخیں مٹی کی دیواروں کے اوپر چھا گئی تھیں، پھول گرنے شروع ہو گئے تھے اور پھلوں کی پتیاں لگنے لگی تھیں، پوری سڑک اور خاص کر دیواروں کے قریب سے گزرنے والے راستے پر سفید اور گلابی پنکھڑیوں کا فرش بچھا تھا۔ پنکھڑیوں سے ڈھکی دھول پر لڑکیوں کے پاؤں کے گہرے نشانات بنتے جاتے تھے۔

جلد ہی دونوں بڑی سڑک پر پہنچ گئیں، یہاں شہد کی مکھیوں اور بھونروں کی بھنبھناہٹ یکایک رک گئی۔ پیپوں سے بھری ہوئی گاڑیاں پتھر جڑی سڑک پر کھڑبڑاتی ہوئی جا رہی تھیں۔ کبھی کبھی کچھ لوگ سوچ میں ڈوبے ہوئے گزر جاتے، پھر دور سے انجن کی تیز سیٹی سنائی دی اور دھوئیں کی بو آئی! گاڑیوں کے پہئے ساز کی طرح جھنجھنائے، ریلوے کے انتظام کرنے والوں کی بگل خنخنائے! اگرچہ تورسنائی ان لال ہرے ڈبوں کی چھتوں کو پہلی بار نہیں دیکھ رہی تھی پھر بھی انہیں دھوپ میں دمکتے دیکھکر وہ حیران سی رہ گئی۔

بشارت نے اپنے جوتوں کے اوپر ربڑ کے جوتے پہن لئے، ہاتھ میں پکڑے بلاؤز سے پھر اپنا سر ڈھک لیا۔ تورسنائی نے با دل ناخواستہ مرجھاتا ہوا پھولوں کا ہار سڑک کے کنارے رکھ دیا۔

دونوں بہنیں ریلوے مزدوروں کے لمبے، سرمئی بارک کے قسم کے ہوسٹلوں کے سامنے سے گزریں، حاطوں میں حدبندی کے جنگلے نہیں تھے اور لکڑی کے بے جان سائبانوں اور کوڑے کے ٹینوں کے سوا اور کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ منظر بڑا ہی اداس تھا۔ یہاں وہاں پیڑ لگائے تو گئے تھے مگر انہوں نے جڑ نہیں پکڑی تھی۔ درختوں کے خشک، سیاہ تنوں کے درمیان الگنیاں بندھی تھیں اور ان پر کپڑے سوکھنے کو پھیلائے گئے تھے۔

دونوں کارخانے کے اندر گھس گئیں۔ وہ بہت اترا رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں: "ہمیں دیکھو، ہم کتنے بڑے ہو گئے ہیں، ہم کسی بات سے نہیں ڈرتے"۔ انہیں معلوم تھا کہ چچا یفیم یہ سن کر بہت ہی خوش ہوں گے۔

پرانے پرانے انجن کارخانے کی اینٹوں کی عمارت میں ٹیڑھی میڑھی بچھی پٹریوں پر کھڑے ہوئے تھے، چاروں طرف زنگ لگے ریلوے کے پہئے اور ٹوٹا پھوٹا لوہا پڑا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کھلے ہوئے پھاٹک میں گھس گئیں۔

یکایک انہیں بھٹیوں میں سے جشک، گرم ہوا کا ایک جھونکا آتا ہوا محسوس ہوا اور پھر بھاری ہتوڑوں کی آواز سے کان گنگ ہو گئے۔ دھوئیں سے سیاہ چوکور شیشوں سے پٹی ہوئی غیرمعمولی چھت‌والی اس بڑی سی عمارت کی ہر چیز ایک ایسی قوت کی آئینہ‌دار تھی جسے مغلوب نہ کیا جا سکتا ہو — بھٹیاں، ہتھوڑے اور عوام۔ دو مزدور کمر تک ننگے، تانبے کے رنگ کی پیٹھیں پسینے سے چمکتی ہوئی، بڑے بڑے چمٹوں میں سفید، دھکتے ہوئے لوہے کا مستطیل ٹکڑا پکڑے ہوئے تھے۔ تورسنائی سہم‌کر پیچھے ہٹی اور آنکھیں سکیڑ لیں لیکن اس کے برعکس بشارت نے اپنی آنکھوں کو اور بھی کھول دیا۔ جو تجسس کے جذبے سے چمک رہی تھیں۔

بھٹی کے سرخ جبڑوں میں سے شعلے کی ایک لمبی سی زبان یوں نکلی جیسے وہ سامنے رکھی تمام ھڈی بوٹیوں کو چاٹ جائے گی۔ بھٹی پر کھڑا ہوا مزدور جھکا اور بڑی بےباکی اور دلیری کے ساتھ ایک لمبی، سیاہ لوھے کی چھڑ، یوں اس کے منھ میں گھسیڑی جیسے بھٹی کو ایک زور کی ضرب لگا رہا ہو۔

سب سے پہلے ایک لمبے، دبلے پتلے آدمی کی نظر ان لڑکیوں پر پڑی۔ وہ گول ٹوپی پہنے تھا اور سر سے پاؤں تک کالکھ سے پتا ہوا تھا۔

"اوھو، یفیم دانیلووچ کے دوست آ گئے" وہ سفید چمک‌دار دانت دکھاتے ہوئے مسکراکر بولا۔ "یہ تو بڑی مشکل ہوئی۔" پھر اس نے مڑکر پکارا: "فورمین! ساتھی نادیژدین!"

بشارت کی نبض تیز تیز چلنے لگی۔ یہاں سب ایک دوسرے کے ساتھی تھے اور ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ "میں لڑکا ہوتی تو یہیں کام کرنے آتی" اس نے سوچا۔

یفیم دانیلووچ اپنی لڑھکتی ہوئی چال چلتا ہوا لڑکیوں کے پاس آیا اور ان کی طرف اپنے دونوں ھاتھ بڑھائے۔

صابر کے مرنے کے بعد جو سال گزرے ان میں یفیم

دانیلووچ کافی بدل گیا تھا، کچھ موٹا ہو گیا تھا اور ذرا بوڑھا بھی لگنے لگا تھا۔ سر کے بھورے بال بھی کافی ہو گئے تھے، کنپٹیوں پر سفید تار دکھائی دینے لگے تھے مگر مونچھیں ابھی تک شہد کے رنگ کی سی سنہری تھیں۔

"اچھا، تو تم لوگ آ گئیں، اچھی لڑکیاں! بھئی واہ، تم لوگ تو بڑی جان‌دار لگ رہی ہو۔"

پھر اس نے تورسنائی کو شرماتے دیکھا تو اسے پیار سے گلے لگایا اور گود میں لےکر اپنے سر سے بھی اونچا اٹھا دیا، پھر اس نے بشارت کی ننھی سی چوٹی میں گندھی پودینے کی پتیوں میں سے ایک توڑی اور اسے مل‌کر سونگھا اور یوں گر پڑنے کی ایکٹنگ کی جیسے وہ بےہوش ہوکر گرنے ہی والا ھے۔

دونوں بچیاں قہقہہ مارکے ھنسنے لگیں۔

"تمھاری امی ٹھیک ھیں؟"

"جی ھاں، اور ھم لوگ وہ کتاب لینے آئے ھیں" تورسنائی نے جواب دیا۔ "بشارت اسے پڑھ‌کر دیکھے‌گی کہ اس میں ھمارے ابا کے متعلق کیا لکھا ھے۔"

"تم بھی پڑھوگی؟"

"میں تو یہ چاھتی ھوں کہ ایک گیت گاؤں - اپنے ابا کے بارے میں۔"

یفیم دانیلووچ کے ماتھے پر ایک بل آیا، پھر اس نے مونچھوں کو سہلایا۔

"اچھا، تو تم لوگ ایسا کرو کہ میرے گھر چلی جاؤ۔ تمھاری چچی صوفیہ وھاں ھیں۔ بس ایک پاؤں یہاں رکھو اور دوسرا وھاں۔ میں بس تمھارے پیچھے ھی آتا ھوں۔"

فیکٹری کی سیٹی نے تان لگائی۔

کارخانے کے دروازے پر ایک آدمی نظر آیا اور وہ اندر آ گیا۔ اس کے ھاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ یفیم دانیلووچ جلدی جلدی اس کی طرف بڑھا، بشارت نے تورسنائی کو ایک طرف کو ھٹا لیا۔

بریف کیس‌والا آدمی ناٹے قد کا تھا، کندھے بہت ھی جھکے

ہوئے، لمبے لمبے بازو، کینوس کا بریف‌کیس بڑا اور تکئے کی طرح ایسا پھولا ہوا تھا جیسے اس آدمی کو کچلے ڈال رہا ہو۔ جب یفیم دانیلووچ بات کر رہا تھا تو وہ آدمی اپنی نظریں زمین پر جمائے رھتا اور کبھی کبھی کن‌انکھیوں سے جب یفیم کو دیکھتا تو اس کے چہرے پر ننھی ننھی جھریاں پڑ جاتیں۔

"وہ اچھا اور محنتی مزدور ھے" یفیم جوش میں زور زور سے کہہ رہا تھا۔ "البتہ اس کی صحت خراب رھتی ھے اس لئے پریشان ھے اور تنگی میں ھے۔"

"اگر کوئی آدمی بیمار ھے تو اس کی دیکھ بھال کے لئے ڈاکٹر موجود ھیں اور جہاں تک تنگی کا سوال ھے... تو دیکھئے نا اب ھم سب ھی یہاں مزدور ھیں، کوئی رئیس بورژوا تو نہیں ھیں۔"

"مگر اس کی صحت تو محاذ پر خراب ہوئی اور پھر اس کے بچے بھی ھیں!"

بریف کیس‌والے آدمی نے اپنا ایک لمبا بازو اس طرح اوپر اٹھایا جیسے کوئی مار پڑنےوالی تھی کہ اسے روک رہا ہو۔

"اچھی بات ھے، ھم آپ کی درخواست پر غور کریں گے۔"

پاس کھڑے جو مزدور یہ گفتگو سن رھے تھے وہ بیچ میں بولنے لگے: "کتنی بار آپ یہ بات کہہ چکے ھیں! آخر آپ فیکٹری کمیٹی کے کیسے چیرمین ھیں؟"

"یفیم دانیلووچ ٹھیک کہتے ھیں، اس مزدور کو مدد کی سخت ضرورت ھے۔"

بشارت نے دل ھی دل میں سوچا کہ یہ کندھے جھکا آدمی یہاں کسی کو نہیں پسند کرتا اور نہ ھی کوئی اسے پسند کرتا ھے۔

اس نے یفیم دانیلووچ کے پیروں کی طرف سختی سے گھورتے ہوئے پوچھا:

"آپ نے مجھے یہاں کیوں بلوایا ھے؟ آپ کیا چاھتے تھے؟"

"ہم کارخانے کی توسیع اور نئی مشینیں وغیرہ حاصل کرنے کے سوال پر ایک چھوٹا سا جلسہ کرنےوالے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ اس جلسے میں آپ موجود رہیں۔"

طویل قامت، دبلے پتلے آدمی نے سن کے موٹے ریشے سے اپنا ہاتھوں کا سیاہ تیل پونچھتے ہوئے تمسخر کے ساتھ اضافہ کیا:

"اس سوال کا جائزہ لیا جانا چاہئے۔ ہم جب اس کا جائزہ لے چکیں گے تو ہمیں ازسرنو جائزہ لینا ہوگا۔"

چیرمین تلخی کے ساتھ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

"اس قسم کے کسی بھی منصوبے کے لئے رقم درکار ہوگی تو وہ کہاں سے آئے گی؟ آپ مجھ سے کہیں گے کہ آپ یہ رقم حکومت سے حاصل کر لیں گے۔ آپ کے خیال میں ہماری سرکار کے پاس کیا نوآبادیات ہیں جو وہاں سے سونا درآمد کر لے گی، ہماری سرکار، ہمارے آپ کے ایسے غریبوں کی سرکار ہے، ہمیں تو چاہئے کہ ہم اپنا سب کچھ اسے دے ڈالیں نہ کہ اس سے کچھ طلب کرکے اپنے لئے رسوائی مول لیں!"

اس بات پر مزدوروں میں شور مچنے لگا، ایک بوڑھا آدمی جس کی داڑھی گھریلو تمباکو پیتے پیتے زرد ہو گئی تھی، ایک قدم آگے بڑھا۔

"چیرمین صاحب، ذرا میری بات سنئے۔ ایک طرف تو آپ یہ راگ الاپے جا رہے ہیں کہ ہم سب مزدور ہیں اور مزدوروں میں آپ اپنے کو بھی شامل کر رہے ہیں اور دوسری طرف، آپ نے مزدوروں کو بالکل سمجھنا ہی چھوڑ دیا ہے - ایک بات! اور دوسری بات یہ کہ ہماری حکومت، غریب حکومت نہیں ہے جیسے کہ آپ از راہ مہربانی ہم لوگوں کو بتا رہے ہیں۔ یہ مزدوروں اور کسانوں کی سرکار ہے! اور کوئی وجہ نہیں کہ ہمیں اس پر شرم آئے۔ اگر ہم سرکار سے کوئی چیز لیتے ہیں تو گویا اپنے آپ سے لیتے ہیں اور اگر ہم اس چھوٹے موٹے کارخانے کو ایک بڑی فیکٹری بنا دیتے ہیں تو فائدہ کس کو ہوگا؟ سرکار کو! آیا سمجھ میں آپ کی؟"

"لیکن فیکٹری کے لئے رقم کون دے گا، پاخومیچ؟" چیرمین نے کہا۔ "شاید تم دوگے؟"

چیرمین کا خیال تھا کہ اس کی بات پر لوگ ہنسیں گے لیکن کوئی نہیں ہنسا اور اس کا تیر خالی گیا۔ اس کے چہرے کی جھریاں اور بھی گہری ہو گئیں جیسے بس اب رویا ہی چاہتا ہو۔

"سنو دوستو" وہ ٹھنڈی آہ بھرکر بولا۔ "ایسے اہم معاملات ایک منٹ میں طے نہیں ہوا کرتے! ہمیں اس کی باقاعدہ تیاری کرنی ہوگی، مناسب سطح پر اسے رکھنا ہوگا، اس پر غور کرنا ہوگا..."

"پھر وہی اصیل مرغے کی ایک ٹانگ۔"

"آپ اس پر غور کرتے رہئے صاحب، اور ہم فیصلہ کریں گے۔"

"یفیم دانیلووچ، آپ میٹنگ شروع کیجئے!"

بریف کیس والے آدمی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جب اس نے دیکھا کہ یفیم دانیلووچ یوں اچک کے قریب کے ایک پلیٹ فارم پر چڑھ گیا جیسے کہ وہ کوئی بالکل نوجوان لڑکا ہو اور اس نے ایک ہاتھ اٹھایا۔

"ساتھیو، ہمیں لینن گراد کے مزدوروں کے نقش قدم پر چلنا چاہئے۔"

"پھر وہی میٹنگیں!" بریف کیس والا آدمی غصے سے چیخا۔ "کوئی تنظیم نہیں! کوئی ڈسپلن نہیں! دقیانوسی کہیں کے!"

"ارے بیٹا" پاخومیچ نے ٹھنڈے دل سے کہا۔ "ہم نے انقلاب کو بھی منظم کیا تھا اپنے بل بوتے پر، خود اپنے لئے۔"

اس کے بعد سے پھر کسی نے اس جھکے کندھوں والے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

تورسنائی جو کچھ دیکھ رہی تھی اس سے ڈر ڈرکر بار بار بہن کی آستین کھینچتی کہ "چلو، چچا یفیم نے تو ہم سے کہا ہے کہ ان کے گھر جائیں۔"

بشارت جیسے مسحور ہوکر رہ گئی تھی۔ وہ سمجھنا چاہتی تھی کہ ہو کیا رہا ہے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس میٹنگ میں سب مزدور وہی چاہتے تھے جو چچا یفیم شروع سے کہتے آئے تھے۔ وہ ایک بیمار ساتھی کی مدد کرنا چاہتے تھے جس کی صحت محاذ پر جانے کی وجہ سے خراب ہو گئی تھی اور جس کے بچے بھی تھے اور مزدوروں کا یہی اصول اور قانون تھا کہ ایک دوسرے کی مدد کی جائے۔ چچا یفیم نے ہمیشہ امی کی بھی تو مدد کی تھی، اس کی یعنی بشارت کی بھی، تورسنائی کی بھی۔ اس بات کے لئے تو سب ہی ان کی عزت کرتے تھے کہ وہ سب کے کام آتے تھے۔

اس نے دل ہی دل میں سوچا: "اچھا تو میٹنگ ایسی ہوتی ہے۔"

امی کے کارخانے میں اور ہی حالات تھے۔ بنگر عورتیں اکثر اپنے ہی بارے میں باتیں کرتی تھیں۔ کوئی کہتی کہ اس نے کس طرح گدا یا رضائی تیار کی، کوئی بتاتی کہ وہ کسی میت میں گئی تھی تو وہاں کیا کیا ہوا تھا اور کسی کو یہ شکایت ہوتی کہ تمباکو بیچنےوالا بڑا ہی لالچی اور ٹھگ ہے۔

بشارت نے چچا یفیم کی سی باتیں کرتے تو بس ایک ہی عورت کو دیکھا تھا اور وہ جوراخان تھی جو پرنجے نہیں پہنتی تھی۔ ایک بار وہ ان کے گھر بھی آئی تھی اور بشارت کی خوب تعریف کی تھی کہ وہ پڑھ سکتی ہے اور تورسنائی نے جب اس کو ایک گانا سنایا تو اس نے تورسنائی کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ پھر اس نے امی سے کلب کے متعلق بات کی تھی۔ کلب وہ جگہ تھی جہاں عورتیں میٹنگوں کے لئے جمع ہوا کرتی تھیں اور پھر آپس میں گھری، دیرپا دوستی ہو جاتی تھی۔

"آؤ نا بشارت، میں صوفیہ چچی کے یہاں جانا چاہتی ہوں" تورسنائی نے بار بار کہا یہاں تک کہ وہ روہانسی ہو گئی۔

آخرکار بشارت راضی ہو گئی اور دونوں لڑکیاں کارخانے سے باہر نکلیں، پھاٹک پر پہنچ کر بشارت نے مڑکر دیکھا تو مزدور تالیار بجا رہے تھے اور بڑے جوش میں تھے۔

بشارت نے کارخانے میں جو کچھ دیکھا اس کے بعد وہ بستی کے متعلق اور ہی طریقے سے سوچنے پر مجبور ہوئی۔ کتنی بدصورت بارکیں تھیں اور ان میں کتنے دوست‌نواز، شریف اور مضبوط ارادے کے لوگ رہتے تھے۔ وہ ہر کھڑکی پر تجسس بھری نظریں ڈالتی جاتی تھی۔ یہاں کے رہنےوالے سب ایک دوسرے کے ساتھی تھے اور اسی لئے وہ اتنے مطمئن اور خوش تھے لیکن امی کے ساتھ جو عورتیں کام کرتی تھیں وہ ہمیشہ اپنی قسمت کو روتی رہتی تھیں، گلے شکوے کرتی رہتی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ انہیں اپنی تنہائی اور بےبسی پر ایک طرح کا فخر محسوس ہو رہا ہو۔

وہ ان ہی خیالات میں کھوئی آگے بڑھتی رہی اور یہ بالکل نہ دیکھا کہ تورسنائی پیچھے چھٹ گئی ہے۔ پھر اس نے مڑکر جو دیکھا تو اس کی بہن بارکوں میں سے ایک کی کھڑکی کے نیچے رخسار لگائے کھڑی تھی۔ بشارت کو بڑا تعجب ہوا، الٹے پاؤں واپس گئی۔

کھلی ہوئی کھڑکی کے اندر سے گانے کی آواز آ رہی تھی اور تورسنائی وہاں کھوئی کھوئی سی کھڑی تھی۔ گانے کے سوا اسے کسی بات کا ہوش نہ تھا اور اس کے نازک چہرے پر ایک مسرت بھری مسکراہٹ تھی۔

گانا ختم ہونے کے بعد بھی تورسنائی وہیں کھڑی رہنا چاہتی تھی۔ بشارت جلدی میں تھی لیکن تورسنائی نے اس کی خوشامد کی کہ ٹھہر جائے، شاید گانا پھر شروع ہو۔ اس کا سارا شرمیلاپن جیسے بالکل غائب ہو چکا تھا۔

لڑکیاں ابھی بارکوں کے پاس ہی تھیں کہ یفیم دانیلووچ آ پہنچا۔

"چچا یفیم، یہاں کون رہتا ہے؟" تورسنائی نے اس سے پوچھا۔

"ہوں — تو تمہیں اس کی کرید لگ گئی؟ بہت اچھا

ہوا۔ یہ کلب ہے اور یہ لوگ ایک کنسرٹ کے لئے ریہرسل کر رہے ہیں۔"

"تو یہ لوگ ایکٹر ہیں؟ سچ مچ کے ایکٹر؟"

"نہیں، حلقے کے ممبر ہیں۔"

"کون سا حلقہ؟ میں ذرا سا دروازہ کھول کر اندر جہانک لوں؟ یہ لوگ خفا تو نہیں ہوں گے؟"

"نہیں" یفیم سنجیدہ ہوکر بولا۔ "البتہ وہ لوگ تمہیں اپنے حلقے میں شامل کر لیں گے، تم سے دستخط کروا لیں گے اور تمہیں گھر نہیں جانے دیں گے۔"

تورسنائی اس مذاق پر سنجیدہ تو ہو گئی مگر ڈری بالکل نہیں۔ یفیم ہنستا ہوا دونوں لڑکیوں کو لےکر بارک میں داخل ہوا۔

"اور تم تو کہتی تھیں کہ وہ لوگ ہمیں اندر ہی نہیں آنے دیں گے" تورسنائی چپکے سے اپنی بہن سے بولی۔ "بڑی سب کچھ جاننےوالی" اور اس نے سر کو ایسا ہلایا جیسے ناچ رہی ہو۔

یہ سب ایک بڑے سے ہال میں داخل ہوئے۔ اس کے پرلے کنارے پر ایک اسٹیج تھا جس پر ایک میز تھی، لال کپڑے سے ڈھکی ہوئی۔ ایک کونے میں دو لال رنگ کے جھنڈے رکھے ہوئے تھے اور ایک لال کپڑا جس پر کوئی نعرہ لکھا تھا، دیوار پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا تھا۔ لمبی لمبی بنچیں دیواروں سے لگا دی گئی تھیں اور بہت سے لڑکے لڑکیاں جمع تھے۔

تورسنائی اور بشارت کو وہی لمبا آدمی ملا جسے انہوں نے کارخانے میں دیکھا تھا۔ اس نے کپڑے بدل لئے تھے، منہ ہاتھ پر سے کالکھ دھو ڈالی تھی اور بالکل کمسن لگ رہا تھا، بشارت کی عمر کا ہوگا۔ "آئیے، آئیے" وہ بڑی محبت سے بولا۔ "ہم لوگ ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں، مجھے عبدالصمد کہتے ہیں اور میں آپ کو یہاں دیکھکر خوش، بہت ہی زیادہ خوش ہوا۔"

اس نے ایک بنچ آگے کو گھسیٹی۔

"یفیم دانیلووچ آپ بڑے موقعے سے آئے، آج تو ہماری ڈریس ریہرسل ہے مگر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اچھا بھئی، اب سب کوئی اپنی اپنی جگہ جائیں!"

صاف ظاہر تھا کہ عبدالصمد کے ہی ہاتھ میں یہاں کا سب انتظام تھا۔ سب لڑکے پیچھے قطار باندھکے کھڑے ہوگئے، لڑکیاں ان کے آگے کھڑی ہو گئیں اور سب نے اس طرح نیم دائرہ بنا لیا جیسے تصویر کھنچوا رہے ہوں۔ پھر نوجوان سنگیت‌کار نے اپنی چھڑی اوپر اٹھائی اور بانسری‌والے لڑکے اور تنبورے‌والی لڑکی نے بھی تیاری کر لی۔

عبدالصمد نے اپنا بازو جھلایا اور فرش پر لکڑی کے ایک جوتے سے تال دینی شروع کی اور ٹولی نے گانا شروع کر دیا۔

تورسنائی دھیرے دھیرے خود بخود اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہونے لگی جیسے کہ وہ اس گانے کی کسی زبردست لہر کی لپیٹ میں آگئی ہو، اس نے یہی گانا کھڑکی کے نیچے کھڑے ہوکر سنا تھا اور اسے الفاظ یاد ہو گئے تھے۔ اور بالکل غیرارادی طور پر اس کے ہونٹ ہلنے لگے اور وہ بغیر آواز کے ازبیک قوم کے پہلے سوویت شاعر حمزہ حکیم‌زادہ کے جوشیلے الفاظ دوہرانے لگی:

اٹھ اے مزدور محنت‌کش
تیرا زمانہ آ گیا، دور تیرا آ گیا
اس نئی نئی آزادی کو،
تو ہاتھ سے جانے مت دینا!
شاہوں، امیروں، بیگوں کا اب
زمانہ چلا گیا، تیرا دور آ گیا!

یفیم دانیلووچ بڑے غور سے تورسنائی کی صورت دیکھ رہا تھا۔ اس کا اضطراب دوسرے گانے‌والوں کو بھی محسوس ہو رہا تھا۔ جب گانا ختم ہو گیا تو ٹولی کی لڑکیوں نے تورسنائی کو گھیر لیا۔

"تمہیں گانا پسند آیا؟ ہمارے کلب میں پہلی بار آئی ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟"

تورسنائی کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ یوں سب کی توجہ کی مرکز بن جائے گی، جھینپ کر وہ بڑی بہن کے پیچھے چھپ گئی۔

"تم کیسی بےوقوف ہو، سب کو اپنا نام بتاؤ" بشارت نے ڈانٹا۔ "انہیں بتاؤ کہ تم کو تورسنائی کہتے ہیں اور تم خود بھی تو کتنے گانے جانتی ہو۔ بتاؤ نا۔"

تورسنائی نے بہن کے جیکٹ میں اپنا منہ چھپا لیا اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ بہن سے لپٹ گئی۔ اس کو رام کرنے کے لئے ایک لڑکی نے اس کی چوٹی گوندھنی شروع کر دی۔ تورسنائی نے اسے شکرگزار نظروں سے دیکھا۔

"شرماؤ مت، یہ سب بھی تمہاری بہنیں ہیں" یفیم نے لڑکی کا ھاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "اب ہم لوگوں کو ایک گانا تو سنا دو۔"

"مجھے کوئی گانا نہیں آتا" تورسنائی بڑبڑائی۔

یفیم دانیلووچ نے عبدالصمد کو آنکھ ماری۔

"تو پھر ہم سب ایک ساتھ گائیں گے۔"

نوجوان لڑکے لڑکیاں یفیم دانیلووچ کے گرد اکٹھا ہو گئے۔ اس نے اپنے کندھے تانے، ایک گہری سانس لی اور سائبیریا کا ایک گانا شروع کیا۔ وہ بڑے احساس و جذبہ کے ساتھ دھیمے گا رہا تھا جیسے کسی خیال میں کھویا ہوا ہو، کچھ سوچ رہا ہو۔

مقدس بیکل، ایک سمندر ہے بوڑھا اور شریف
سالمن مچھلیوںوالا میرا پیپا کس وقار سے سمندر میں تیرتا ہے...

پھر نوجوانوں کی آوازوں کے کورس نے الفاظ اٹھا لئے:

اب موجیں تیزتر ہوں تو کیا
اب طوفاں شمال مشرق سے اٹھیں تو کیا
اب تو ہمیں دور نہیں جانا ہے۔

اس گانے سے بیتے دنوں کی یادوں نے یفیم کے دل کو جھنجھوڑ دیا، اسے بہت دور واقع وہ سرزمین ایک بار پھر دکھائی دینے لگی جو اسے بہت عزیز تھی۔ اس کے سرسبز کھیت، کہر بھری دھندلی صبحیں — اسے ایسا لگا جیسے وہ پھر سے اس دشوار لیکن شاندار زمانے میں جی رہا ھے جب لوگوں کی ھمتوں کی آزمائش ہوئی تھی۔

عبدالصمد کے ساتھ سب ھی نوجوان بڑی سنجیدگی سے گانے میں شریک ھو گئے۔ یہ طاقتور گانا اپنے معنی کی طرح ھی جان‌دار تھا۔

تورسنائی ایک بار پھر بےحس و حرکت کھڑی تھی، سانس روکے، بار بار وہ آنکھوں کو پھاڑتی مگر اب ان آنکھوں میں اعتماد آ چلا تھا۔ یفیم دانیلووچ نے متاثر ھوکر اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور ایسا کرتے وقت اسے محسوس ھوا کہ اس کے بائیں کندھے میں یکایک درد ھوا مگر یہ صرف یفیم کا تصور تھا کیونکہ اسے واقعی درد نہیں ھوا تھا۔ زخم تو مدتیں گزریں بھر چکا تھا اور اب وہ بھی ایک یاد ھی سی رہ گئی تھی۔

"کیوں لڑکیو، ھم لوگ گھر چلیں؟" یفیم نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، نہیں!" تورسنائی ایک‌دم بول اٹھی جیسے اس سوال نے اسے چونکا دیا ھو۔ "میں بھی ایک گانا گاؤں‌گی" پھر اس نے چچا یفیم کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور ان کے چھرے پر اپنا ماتھا رگڑنے لگی جس سے ابھی تک پگھلے ہوئے لوھے کی مھک آ رھی تھی۔

بڑے سے ھال میں خاموشی چھا گئی، یفیم دانیلووچ نے تورسنائی کو ایک کرسی پر کھڑا کر دیا۔

تورسنائی نے اتنے لوگوں کے سامنے کبھی پھلے گایا نہیں تھا مگر پھر بھی وہ ڈری نہیں کیونکہ وہ گانا سنانے کی بےحد مشتاق تھی اور اسے محسوس ھو رھا تھا کہ اسے گانا ھی پڑےگا۔ اگر وہ لوگ اسے سنانے کی اجازت نہ دیتے تو وہ رونے لگتی۔

اس کی نرم بہتی ہوئی آواز ہال میں یوں گونجی جیسی کوئی ننھی سی چاندی کی گھنٹی بج رہی ہو۔ اس نے بڑی سادگی کے ساتھ، بغیر کسی بناوٹ کے، بڑی خوشی سے گانا گایا جیسا کہ صرف کوئی ایسا بچہ کر سکتا تھا جو بالکل بگڑا ہوا نہ ہو، ہر لفظ ایسے مؤثر طریقے سے ادا کیا کہ ناممکن تھا کوئی متاثر نہ ہو۔

حسین پھول کھل رہے ہیں،

ہوا کو خوشبوؤں سے بھر رہے ہیں

جوانیوں پر بھی بہار آنے دو

بہار، ہر جگہ بہار ہونے دو!

ویسے تو کچھ سامعین نے سوچا تھا کہ ذرا مذاق رہے گا، انہوں نے سوچا تھا کہ ایک تیرہ برس کی بچی کو "بہار میرے دل میں کھل رہی ہے" عنوان کی نظم سناتے دیکھنے میں کچھ دل‌لگی رہے گی لیکن اب تو سامعین کی نظروں میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ یہ بیچاری کیا گائے گی۔

بڑی دیر تک تورسنائی اپنے آپ کو لوگوں کے گلے لگانے اور پیار کرنے سے چھڑا نہیں سکی۔ گانا گانے کے بعد اس نے بڑی ہی سادگی سے کہا تھا:

"کیسا خوبصورت گیت ہے یہ۔"

بڑی مشکل سے عبدالصمد نے سب کو خاموش کروایا۔

"میرا خیال ہے، ہم تورسنائی کو اپنے حلقے میں شامل کر لیں اور یہ بھی ٹالی کے ساتھ کنسرٹ میں گانا گائے" اس نے کہا۔

"تم نے اپنا خاندانی نام کیا بتایا تھا؟"

"صابرووا" یفیم نے تورسنائی کا سر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ عبدالصمد نے پنسل کی نوک میں لب لگایا اور لکھا:

"تورسنائی صابرووا۔ تنہا گیت۔" آپ کو اپنا گانا اسٹیج پر سنانا ہوگا" وہ بولا۔

"سنا کچھ؟" بشارت نے بہن کو کہنی ماری۔ "بول نا، شکریہ تو کہہ۔"

"شکریہ" تورسنائی نے عبدالصمد کو بڑی بے اعتبار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

باہر سڑک پر نکل کر بشارت نے بڑے فخر کے ساتھ اپنی بہن کا ہاتھ پکڑ لیا مگر اس فخر میں کچھ رشک کا جذبہ بھی شامل تھا۔ ہائے وہ سب ایک دم تورسنائی پر فدا ہو گئے! کامریڈ صابرووا... بھلا انہوں نے تورسنائی کو یہ لقب کیوں دے دیا؟ بس صرف اس لئے کہ اس نے ایک گیت گا دیا؟

"چچا یفیم، کیا ہم لوگ بھی کامریڈ کہلا سکتے ہیں؟" بشارت نے احتیاط کے ساتھ پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"یعنی میں یا تورسنائی؟"

یفیم دانیلووچ نے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا: "ہاں ہاں، کیوں نہیں، جو کوئی بھی سماج کے لئے فائدہ‌مند ہوگا اور اپنے بھر اچھی طرح سے سماج کی خدمت کرنے کو تیار ہوگا وہ سب ہی لوگوں کا ساتھی ہوگا۔ تمہارے ابا ایک مزدور تھے اور انہوں نے مزدوروں، محنت‌کشوں کے لئے اپنی جان قربان کی، تمہیں ان پر فخر تو ہے ہی مگر ساتھ ہی تم اپنے کو بھی اس لائق بناؤ کہ ان کی بیٹی کہلاؤ۔ تو یہ بات ہے کامریڈ صابرووا!"

دونوں کامریڈ صابرووا‌ؤں نے ایک دوسرے کو بڑے شوق سے دیکھا۔

اب یہ لوگ اس بارک کے نزدیک آ گئے تھے جہاں چچا یفیم رہتے تھے۔ بشارت اور تورسنائی اکثر ان کے گھر آتی تھیں۔ ان کے یہاں ایک کمرہ تھا، ایک باورچی‌جانہ اور ایک برآمدہ۔ دونوں لڑکیاں دراصل اپنے باپ کے انتقال کے بعد یہاں سال بھر کے قریب رہی تھیں، اس وقت وہ بہت ہی چھوٹی تھیں۔

اسی زمانے میں یہ لوگ اپنی مہربان چچی صوفیہ سے بھی ملی تھیں۔ وہ اسی وقت دوردراز واقع ایوانوو وازنیسینسک سے آئی تھیں اور انہوں نے اناخان کی دونوں

بچیوں کو اپنی اولاد کی طرح اپنے گھر میں رکھا تھا۔ انہوں نے ان کے روسی نام رکھ دئے تھے: ویرا اور تانیا اور صابن سے نہانا دھونا اور کانٹے سے کھانا سکھایا تھا۔ شروع میں جب یفیم مترجم کا کام کرنے کے لئے آس پاس نہ ہوتا تو چچی صوفیہ بےچاری سمجھ ہی نہ پاتی کہ لڑکیاں کیا کہہ رہی ہیں کیونکہ وہ ازبیک زبان نہیں جانتی تھی۔ لیکن بشارت نے اس معاملے میں مدد کی اور چچی صوفیہ سے زیادہ تیز نکلی، جتنی مدت میں چچی نے ازبیک سیکھی اس سے جلدی بشارت نے روسی زبان سیکھ لی۔ اور پھر چچا یفیم کے گھر میں دونوں ہی زبانیں بولی جانے لگیں۔ جب اناخان اپنی بچیوں کو واپس لے گئی تو دونوں ہی کو کافی دنوں تک چچی صوفیہ بےحد یاد آتی تھی۔

یہی تھا وہ برآمدہ اور لال لال گملوں میں لگے ہوئے پھول۔ چچی صوفیہ جیسے ہی اپنے شوہر کے پاس واپس آئی، اس نے یہ پھول خریدے تھے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس بستی کے چھوٹے سے بازار میں چچی صوفیہ نے جو پہلی چیز خریدی وہ یہی پھول تھے۔ اسی جگہ بشارت نے چچی صوفیہ کی سنسنی‌خیز کہانیاں سنی تھیں، اسی برآمدے میں گھر کے سب لوگ بیٹھا کرتے تھے۔ تورسنائی چچا یفیم کے لانگ‌بوٹ میں کوئی گڑیا بٹھا دیتی اور پھر اسے ڈوری سے فرش پر گھسیٹتی اور سب لوگوں سے کہتی: "جاؤ، ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ۔ راستہ دو، راستہ دو۔" بشارت کو اس بات پر کتنا غصہ آتا تھا! تورسنائی اس کو چچی صوفیہ کی باتیں ٹھیک سے نہیں سننے دیتی تھی۔

چچی صوفیہ زیادہ‌تر کہانیاں ایک کتاب سے سناتی تھیں جس کا نام تھا "ماں" اور یہ کہانیاں مزدوروں کے بارے میں ہوتی تھیں۔ بشارت کو اس کتاب سے محبت ہو گئی تھی — ان دلیر لوگوں سے جن کی داستان اس میں بیان کی گئی تھی۔ پھر چچی صوفیہ نے الگ سے کچھ باب اور کچھ صفحے پڑھ‌کر سنانے شروع کئے تھے اور وہ اتنی تیزی سے پڑھتی تھی کہ جیسے ساری کتاب زبانی یاد ہو، بس کن‌انکھیوں

سے ذرا سا کتاب میں جھانک لیتی اور پڑھتی چلی جاتی۔ بشارت کو یقین تھا کہ چچی صوفیہ کتاب میں کہانیاں نہیں پڑھتی، دل سے بناتی ہے۔

جب چچی گھر پر نہ ہوتی تو لڑکی کتاب اٹھا لیتی اور حروف کو دیکھا کرتی مگر ان حروف کا مطلب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ پھر چچی صوفیہ نے جلدی ہی اس کو پڑھانا شروع کر دیا اور قبل اس کے کہ کسی کو پتہ چلتا، وہ پڑھنے لگی۔

تو پھر یہ ہوا کہ بچپن میں، چچا یفیم اور چچی صوفیہ کے علاوہ بشارت کو ایک اور عظیم اور وفادار ساتھی مل گیا — وہ کتاب "ماں"۔

"جانتی ہو یہ لوگ یہاں کیوں آئی ہیں؟" یفیم دانیلووچ لڑکیوں کو برآمدے میں لاتے ہوئے بولا۔

"کچھ سمجھتی تو ہوں" چچی صوفیہ نے بشارت پر ایک تعریف بھری نظر ڈالی اور جواب دیا۔

چچی صوفیہ کے بچہ ہونےوالا تھا، اس کا جسم بھر گیا تھا اور اس کا موٹے سوتی کپڑے کا ڈریسنگ اس کو تنگ ہونے لگا تھا لیکن بشارت کا خیال تھا کہ ان کا چہرہ اور نیلی نیلی آنکھیں آج کل جتنی خوبصورت لگتیں اتنی پہلے کبھی نہیں لگی تھیں کیونکہ ان میں مامتا کی نرم، ہلکی پرچھائیاں دکھائی دیتی تھیں۔ چچی صوفیہ نے ایک بار امی سے کہا تھا: "اگر میرے کبھی لڑکی ہوئی تو میں اس کا نام ویرا رکھوں گی۔" بشارت نے چچی صوفیہ کی بھاری کمر میں اپنے دونوں بازو حمائل کر دئے اور ان سے کس کر لنگ گئی۔

"کیوں ویرا پیاری، امی اچھی ہیں؟ انھوں نے کہا تھا کہ آئیں گی، کتنے دن ہو گئے کہ میں نے ان کو نہیں دیکھا۔"

"امی اچھی ہیں" قبل اس کے کہ بڑی بہن جواب دیتی، تورسنائی بول پڑی: "اور ہمارے شہتوت بھی اب جلدی ہی پک جائیں گے!"

"تمہاری چچی صوفیہ آج کل شہتوت نہیں کھاتی ہیں"

یفیم دانیلووچ ہنسے۔ "انہیں تو بس، وہ کیا کہتے ہیں کہ کچی کھٹی خوبانیاں پسند آئیں گی۔"

تورسنائی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن وہ مسکرا دی، البتہ بشارت کے کان کھڑے ہو گئے۔

"کلب کو جاتے ہوئے تورسنائی ٹوپی بھر کے کچی خوبانیاں لے آیا کرے گی۔"

"کلب جاتے ہوئے؟"

"جی ہاں، وہ اسٹیج پر گانا گانےوالی ہے نا" بشارت نے بڑے فخر سے کہا۔

"اور چچا یفیم بھی ایک پیارا سا گانا گائیں گے" تورسنائی نے کہا۔

"مجھے تو یہ سن کر ذرا بھی تعجب نہیں ہوا! ہاں، ہاں، ہم سب جانتے ہیں، وہ بڑے عظیم گلوکار ہیں..."

پھر سب لوگوں نے ہاتھ دھوئے اور کھانا کھانے بیٹھے۔ چچی صوفیہ کو یہ بات بہت اچھی لگتی تھی کہ کھانے کی میز پر بہت سے لوگ ہوں اور ان کو لوگوں کو کھلانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ انہوں نے لڑکیوں کو وہیں بٹھایا جہاں وہ پہلے بیٹھتی تھیں اور پھر اصرار کراکے خوب کھلایا۔

کھانے پر یفیم دانیلووچ نے اپنی بیوی کو بتایا کہ مزدوروں نے میٹنگ میں کیا فیصلہ کیا تھا، اچانک بشارت بیچ میں بولی:

"مگر چچا یفیم، یہ لوگ اپنے فیصلے پر قائم رہیں گے نا؟"

"ہاں، بی‌بی۔"

"چچا یفیم، مزدور طبقے کا کیا مطلب ہوا؟"

یفیم دانیلووچ نے چمچہ رکھ دیا، مونچھوں کو پونچھا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا تو عظیم گلوکار صاحب، اب اس سوال کا جواب دیجئے" اس کی بیوی مسکرائی۔

چچا یفیم بھی ان کی طرف دیکھکر مسکرائے۔

"کامریڈ صابرووا، یہ تو بڑا ہی گمبھیر سوال ہے۔"

پھر اس نے اپنی کرسی بشارت کے پاس کھینچی اور اس پر بیٹھکر ہتھیلی پھیلائی - چوڑی ہتھیلی۔ "ادھر دیکھو" اس نے کہا اور انگلیوں کو ایک ایک کرکے گننے لگا۔ "دیکھو، گنو، یہ ایک مزدور، یہ دوسرا مزدور، یہ تیسرا، یہ چوتھا..." اور پھر اس نے سب انگلیاں بھینچ کر مٹھی باندھ لی اور مکا تان کے بولا: "یہ ہوا مزدور طبقہ۔ آیا سمجھ میں؟"

پھر ایک‌دم کسی سوچ میں غرق ہوکر کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

"تم چچی صوفیہ سے کبھی ان کے ابا کے متعلق پوچھو۔ وہ لینن سے ملے تھے، انہوں نے لینن سے بات کی تھی۔"

"لینن سے!" بشارت نے یوں چچی صوفیہ کو دیکھا جیسے وہ زندگی میں پہلی بار ان کو دیکھ رہی ہو۔

"کوئی بیس سال قبل چچی صوفیہ کے باپ ایک امیر آدمی، موروزوف کی فیکٹری میں کام کرتے تھے جب مزدوروں نے مسلح ہوکر بغاوت کی تو وہی سب کے آگے جھنڈا لئے چل رہے تھے، پھر زار کے سپاہیوں نے مزدوروں پر گولی چلائی..."

یفیم دانیلووچ نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور ایک‌دم چپ ہو گیا۔

"کوئی بات نہیں، ٹھیک ہے" اس نے بشارت کے پاس آتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ "میں روؤں‌گی نہیں، میں کبھی نہیں روئی، ویرا پیاری! میرے ابا نے مجھے یہی سبق سکھایا تھا۔ جب وہ جلاوطن کئے جا رہے تھے تو مجرموں‌والی موٹر کی چھڑوں سے انہوں نے اپنے ہتھکڑیاں پڑے ہاتھ تھوڑے سے نکالے تھے اور ان کے الوداعی الفاظ یہ تھے: "کبھی نہ رونا، ہمیشہ مضبوطی دکھانا۔" میں جب تک زندہ رہوں‌گی، ان الفاظ کو یاد رکھوں‌گی۔ میرے ابا تو پھر کبھی واپس نہیں آئے مگر میں نے وہی کیا جو وہ چاہتے کہ میں کروں۔ میں تو خیر، اب بہت بڑی ہو گئی ہوں مگر تم چھوٹی ہو اور تمہیں ابھی مضبوط اور سمجھدار بننا ہے اور تم کبھی ہرگز نہ رونا۔"

"بس اتنا کافی ہے" یفیم دانیلووچ نے اپنا ہاتھ صوفیہ

چچی کے بازو میں حمائل کرتے ہوئے کہا۔ "تم کیا کہہ رہی تھیں کہ میز صاف کرنا چاہتی ہو؟"

بشارت اچھل کر اپنی کرسی پر سے اٹھی، بھلا وہ اتنے غیرمعمولی انسان کو جیسی کہ صوفیہ چچی تھیں، میز صاف کرنے دے گی؟

آستینیں چڑھاکر وہ کام میں جٹ گئی، سماوار سے نکلتے گرم پانی سے پلیٹیں، چمچے، کانٹے دھوئے۔ چچا یفیم بڑے خوش ہو ہوکر اسے دیکھ رہے تھے، بشارت بھی یہ دیکھ دیکھ‌کر خوش ہو رہی تھی۔ جب لڑکیاں گھر جانے کو تیار ہوئیں تو یفیم دانیلووچ نے وہ کتاب ڈھونڈکر دی جس کے لئے وہ آئی تھیں۔ اس پر دفتی کی پرانی جلد تھی۔ بشارت نے کتاب سینے میں دباکر پوچھا:

"ہمارے ابا بھی مزدور طبقے کے تھے نا چچا؟"

"تم اب کتنی بڑی اور سمجھدار ہو گئی ہو، بیٹی" یفیم دانیلووچ نے جواب دیا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

دونوں لڑکیاں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے باہر سڑک پر نکلیں، چچا یفیم اور ان کی بیوی جب ان دونوں کو نکلتے دیکھ رہے تھے تو سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

چوتھا باب

نعمانچہ میں دوپہر کے بعد اتنی گرمی ہوتی ہے کہ سانس گھٹنے لگتی ہے، مٹی کی دیواریں سورج کی تمازت

سے تپ کر بھٹیوں کی طرح آنچ دیتی معلوم ہوتی ہیں، ہوا جیسے دم نکالے لیتی ہے۔

تین چار مٹی میں کھیلتے ہوئے بچوں کے علاوہ گلی بالکل سنسان پڑی تھی، ننھے لڑکوں نے کمر کمر، اونچی ریت جمع کی تھی، اس پر کیچڑ تھوپی تھی گویا اسے آٹے کی دکان بنا دیا تھا۔ ایک حبشیوں جیسا سیاہ، دبلا پتلا لڑکا دکان‌دار بنا ہوا تھا اور بڑے کاروباری انداز سے گلی کی مٹی کو تول تول کر بیچ رہا تھا۔ باقی لڑکے، ہاتھوں میں مٹھائی لپیٹنے کے خالی کاغذ لئے، لائن لگائے کھڑے تھے، انگلیوں پر تھوک تھوک کر وہ بڑی احتیاط سے کاغذ کے نوٹ گن کر دکان‌دار کو دیتے، اس سے ریزگاری واپس لے کر اپنے پتلونوں کی پٹیوں میں کمر پر کھونستے اور اپنا سودا قمیضوں کے دامن میں لے کر چلے جاتے۔

سب سے چھوٹا گاھک ایک کالے گھنگھریالے بالوں‌والا بچہ تھا جس کی عمر کوئی پانچ سال ہوگی۔ وہ ہانپتا کانپتا لڑکھڑاتا سب کے پیچھے پیچھے لڑھکتا جاتا۔ سر سے پاؤں تک وہ خاک میں اٹا تھا، نہ تو اس کے پاس پیسے تھے اور نہ ہی کمرپیٹی جس میں وہ ریزگاری رکھتا۔ جب وہ اپنے ننھے سے کرتے کا میلا دامن پھیلائے ترازو کے پاس جاکر کھڑا ہوا تو دکان‌دار نے کچھ مٹی اس کی قمیض کے اندر پھینک دی۔ بغیر پتلون‌والے اس ننھے سے گاھک کو اپنی ذلت کا اس قدر شدید احساس ہوا کہ وہ گلا پھاڑ کے رونے لگا۔

گلی کے اس سرے پر سے ایک عورت آئی اور لونڈے سب ادھر ادھر بھاگ گئے، ان کے بھاگتے ہوئے ننگے پیروں کی اڑائی ہوئی دھول کے بادل دیر تک ہوا پر چھائے رہے۔

وہ عورت مٹی کی دیوار کے برابر برابر، سائے سائے چلتی ہوئی جا رہی تھی، وہ پرنجے بھی نہیں پہنے تھی، چلتے چلتے وہ چاند ستارےوالے مینار کی لمبی پرچھائیں کے آڑ سے نکلی، گلی پار کی اور رومال سے اپنی کنپٹیوں پر سے پسینہ پونچھا۔

چھوٹے سے بازار کے پاس بنے ایک مکان کے پھاٹک پر تین عورتیں کھڑی باتیں کر رہی تھیں، انھوں نے اسے پہچانا۔ ان تین عورتوں میں سے ایک بوڑھی اور اتنی پستہ قد تھی کہ بچہ سی لگتی تھی۔ اس کی دکھتی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا، اس نے ایسا ظاہر کیا جیسے اس عورت کو دیکھا ہی نہیں، باقی عورتیں کم عمر کی تھیں اور انھوں نے اس عورت کو گھورا جس کا منھ کھلا تھا۔

"یہ جوراخان ہے" ان میں سے ایک نے سرگوشی کی۔

"وہ جو پہلی عورت جج ہے" دوسری نے گویا پہلی کی گونج سنائی۔

ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں، اندر بھاگ جائیں یا باہر جاکر جوراخان سے ملیں۔ اس اثنا میں بڑھیا ایسا بڑبڑاتی رہی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔

"اب دیکھو بہو، میں یہاں آکر تم سے گپ‌شپ کرنے میں لگ گئی اور آئی تھی اس لئے کہ تم سے ذرا وہ مانگ کے لے جاؤں گی۔ وہ چھلنی۔ اور ایسی مت پھر گئی ہے کہ بھول ہی گئی۔ تو اچھی ذرا بتا دیتیں کہاں رکھی ہے وہ چھلنی۔"

بڑھیا اپنی بہو کو آنگن میں گھسیٹ لے گئی اور لکڑی کا پھاٹک بند کر دیا۔ دوسری جوان عورت نے کچھ متجسس، گھبرائی سی نظر سے ایک بار جوراخان کو پھر دیکھا اور وہ بھی اپنی ساتھیوں کے ساتھ اندر چلی گئی۔ اب پھاٹک پر دو چھوٹی بچیاں رہ گئیں۔

جوراخان نے سب کچھ دیکھا اور بہت کچھ سمجھ گئی۔ اسے یاد تھا کہ جب وہ پہلے پہل نعمانچہ آئی تھی تو عورتیں کتنی ڈر گئی تھیں لیکن اب اتنا شکر تھا کہ یہ دونوں نہیں بھاگیں۔ جوراخان کو یقین تھا کہ ان بچیوں کو جان بوجھ کر گلی میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ عورتیں غالباً دیوار کے اس طرف کھڑی کان لگائے سن رہی ہوں گی۔

وہ جوراخان سے اسی طرح چھپ گئی تھیں جیسے مردوں سے چھپتی تھیں۔ ان کو ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ایک

ایسی عورت کا سامنے کریں جو آفتاب کو پرنجے میں سے نہیں، کھلے منھ دیکھتی تھی کیونکہ وہ لوگ اب تک "اچکاری" میں رہتی تھیں (یعنی گھروں میں عورتوں کے لئے جو الگ کوٹھریاں بنائی جاتی تھیں)۔ لیکن جوراخان کو یہ بات دوسروں سے کہیں زیادہ معلوم تھی کہ ان عورتوں کے اندر کیسا اضطراب پوشیدہ تھا، ان کے دلوں میں کیسے طوفان اٹھ رہے تھے۔ بعض خوف کی وجہ سے ڈر رہی تھیں، بعض عادتاً۔ اور ایسی بھی بہت تھیں جو کچھ معلوم کرنے کے اور رشک کے جذبے سے مضطرب تھیں۔ اور ایسے ہی جذبات کے ساتھ تو پھر ارادہ وجود میں آتا ھے۔

"جج خالہ، السلام علیکم" بڑی لڑکی نے کہا۔ اب جوراخان دونوں کے پاس پہنچ گئی تھی۔

"السلام علیکم" چھوٹی لڑکی نے بھی طوطے کی طرح دوھرایا۔ اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی اور مارے گھبراھٹ کے وہ اپنی ناک نوچے جا رہی تھی جو ننئے آلو کی جیسی تھی۔

جوراخان رک گئی، وہ اپنے بیگ میں بشارت اور تورسنائی کے لئے مٹھائیاں لئے جا رہی تھی، ایک ایک مٹھائی ان دونوں بچیوں کو بھی نکال کے دی۔ چھوٹی والی موٹے "متا" کا پیوند لگا لباس پہنے تھی جو اس کے لئے کافی بڑا اور ڈھیلا تھا اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ کسی اور کا ھے۔ جوراخان نے بچی کی آنکھوں پر سے اس کے بال ھٹاکر کان کے پیچھے کرتے ہوئے جھک کر اس کی ابروؤں کو چوما جو پسینے سے تر اور نمکین ہو رہی تھیں۔

لڑکیوں نے مٹھائیاں اپنے ھاتھ میں لے لیں اور پیچھے کو سر جھکاکر اس لمبے قد کی عورت کو جو پرنجے نہیں پہنے تھی، کچھ یوں گھورنے لگیں گویا کہ وہ کہیں باھر سے پکڑکر لایا ھوا کوئی جانور تھی۔

جوراخان کا نیلے رنگ کا، گھرے کٹے ہوئے گلے کا چست لباس اس کے بھرے ہوئے جسم پر خوبصورتی سے لپٹا ھوا تھا، سر پر وہ ایک زرد ریشمی رومال باندھے تھی

جس پر کپاس کے پھولوں کا پرنٹ تھا، اس رومال کو پیچھے سے، چوٹیوں کے اوپر سے لاکر سامنے ایک گرہ میں باندھا گیا تھا۔ چہرہ جو اب جوان نہیں تھا، کچھ چپٹا، گالوں پر باریک باریک سرخ نسیں دکھائی دیتی ہوئی، آنکھوں کے نیچے مہین مہین جھریاں!

"تمہارے ماں باپ کون ہیں؟" جوراخان نے پوچھا۔

"میرے باپ کا نام سلیم بنکر ہے اور یہ رہی بانکے نورمت کی منھ بولی بیٹی، ہمارے ساتھ ہی رہتی ہے..." بڑی لڑکی جلدی سے بولی۔

"او، اب میں سمجھی" جوراخان ایسا مسکرائی جیسے اس کی ان لوگوں سے برسوں کی دوستی ہو۔ "اپنے ماں باپ سے کہنا، تم لوگ بہت اچھی بچیاں ہو۔"

اگلے گھر تک پہنچتے پہنچتے جوراخان نے ایک بار مڑکر دیکھا، بچیاں وہ مٹھائیاں کسی کو دکھا رہی تھیں جو لکڑی کے پھاٹک کی آڑ میں تھا!

جوراخان نے چائےخانے کی طرف سے جانے سے بچنے کے لئے گلی پار کی حالانکہ ایسا کرنے سے دھول میں اٹ جانے کا ڈر تھا۔

چائےخانے میں اس وقت کوئی نہیں تھا، دبلا پتلا چائےخانےوالا اپنی قمیض کو آستینوں سے کمر میں باندھے، ایک بالٹی میں پانی لئے چلوؤں سے چھڑکاؤ کر رہا تھا تاکہ بڑے سے تخت کے پاس مٹی بیٹھ جائے اور تپش کم ہو جائے۔ تخت پر ایک جھنا، تار تار قالین بچھا تھا۔

پھر گلی کے اس سرے سے گدھے پر بیٹھا ہوا ایک آدمی داخل ہوا۔ چائےخانے کو دیکھتے ہی گدھے نے کان کھڑے کئے اور تیز چلنے لگا کیونکہ وہ بہت دور سے سفر کرتا آ رہا تھا اور بےحد تھک گیا تھا اور اسے امید ہوئی کہ یہاں وہ اپنا بھاری بوجھ اتارکے ذرا دیر سانس لے سکےگا۔ دور سے گدھے پر بیٹھا وہ آدمی ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی لدی ہوئی گاڑی۔ آدمی گدھے سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔ مطمئن اور خود اپنی اہمیت کے احساس سے پھولا ہوا، وہ نہایت ہی

مضحکہ‌خیز معلوم ہو رہا تھا اور گدھے پر بیٹھا ایسا لگتا تھا جیسے کوئی تراشا ہوا بت ہو۔ گدھے کا سر بالکل جھکا ہوا تھا اور اس کے دونوں لمبے لمبے کان باہر کو نکلے ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے روئی کے کسی بڑے سے گٹھر کے نیچے سے نکلے ہوئے ہوں۔

سواری کے جسم پر زردوزی بنی ہوئی زربفت کی عبا تھی اور نہایت عمدہ چمڑے کی مخسی۔ بائیں ہاتھ میں وہ چمڑے کے جوتے "کاووش"* پکڑے تھا اور دائیں ہاتھ میں ایک بڑا سا زرد رنگ کا رومال جس سے وہ بار بار اپنا سیاہ، تھل تھل پل پل چہرہ اور موٹی گردن پونچھتا۔ اس کا بال‌دار سینہ کھلا تھا اور ڈھیلا، لٹکا ہوا پیٹ تازہ گندھے ہوئے آٹے کی طرح پھیلتا جاتا تھا۔

پرنجے منھ پر ڈالے ایک عورت اس سے کوئی تیس قدم پیچھے پیدل آ رہی تھی۔ جوراخان کو گمان بھی نہیں ہوا کہ اس عورت اور زربفت کی عبا پہنے اس آدمی کے درمیاں کوئی رشتہ بھی ہو سکتا تھا۔

وہ آدمی اپنے گدھے کی وجہ سے بڑا معزز تھا کیونکہ جب اس کا بھاری، چھوٹی ٹانگوں‌والا جسم چائےخانے کے قریب گدھے پر سے پھسل‌کر زمین پر ٹکا تو گدھے کی پوری شان نمایاں ہوئی۔ اس پر ایک رنگین بارڈروالی جھول پڑی تھی اور اس جھول پر ایک اور جھول تھی جس میں نرم چمڑے کی گوٹ لگی تھی۔ گدھے کا ساز، جھالروں اور کڑھائی‌والے کپڑوں سے سجا تھا، زین سے سرخ سرخ پھندنے لٹک رہے تھے اور دم کے بند میں چمک‌دار ٹکلیاں لگی تھیں، سفید ایال پر بڑے بڑے سیاہ موتی سجے تھے اور ماتھے پر دو سفید چمک‌دار سیپ جگمگا رہے تھے۔

جوراخان دل ہی دل میں سجے سجائے سفید گدھے کی تعریفیں کر رہی تھی کہ اس کی توجہ پرنجے ڈالے ہوئے عورت کی طرف مبذول ہو گئی۔ اس کا پرنجے پرانا تھا،

---

* سلیم‌شاہی جوتے جیسے۔ اڈیٹر۔

اس میں جا بجا پیوند تھے، دھوپ سے اس کا رنگ اڑ چکا تھا، دھول سے اس پر ایک سفید تہہ سی جم گئی تھی۔ وہ گود میں ایک بچہ لئے تھی، سر پر ایک بھاری گٹھری اٹھائے تھی، ٹوٹے پھٹے چمڑے کے مردانے "کاووش" چلنے میں اس کی ننگی تنگی ایڑیوں پر "سٹ پٹ"، "سٹ پٹ" لگ رہے تھے۔

وہ چائےخانے سے ذرا دور مٹی کی دیوار کے پاس ایک سوکھے سے شہتوت کے پیڑ کے سائے میں ٹھہر گئی، بچے کو زمین پر اتارکر وہ خود زمین پر دوزانو ہوئی اور سر پر سے گٹھری اتاری۔

اس کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ نہ موٹے آدمی نے اور نہ ہی چائےخانےوالے نے۔ صرف جوراخان اپنی نظریں اس پر سے ہٹا نہ سکی۔ کون تھی وہ؟ کاش وہ اس کی صورت دیکھ سکتی۔ وہ بوڑھی تھی کہ جوان؟ اس بھاری، پسینے سے بھیگے پرنجے سے اس گرمی میں اس کو کتنی تکلیف ہو رہی ہوگی، اس کے ہونٹ سوکھ گئے ہوں گے، گلا خشک ہوگا...

موٹا آدمی بڑے آرام سے چوڑے تخت پر بچھے قالین پر آلتی پالتی مارکے بیٹھ گیا اور ٹھنڈک کا لطف لینے لگا۔ چائےخانےوالا بھی اس کی خوشامد میں دوڑکر آنگن میں سے ہری گھاس کا ایک پولا لے آیا اور گدھے کے آگے ڈالا اور پھر اس کی گردن اسی خوشامد سے تھپتھپائی جس سے وہ مالک کے ساتھ پیش آ رہا تھا۔

بچہ جہاں بٹھایا گیا تھا وہاں شاید چیونٹیاں تھیں، وہ ایک‌دم چیخنے اور ہاتھ پیر پھینکنے لگا اور زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ موٹے آدمی نے بڑے اطمینان سے گردن موڑی اور جھنجھلاکے عورت کو دیکھا۔ اس نے جلدی سے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور اپنی چادر کے پلو کو آڑ کرکے اسے دودھ پلانے لگی۔

"ارے یہ تو اس کی ماں ہے!" جوراخان نے بڑے غم اور غصے کے ساتھ سوچا۔

پھر زمین پر بیٹھی گھسا ہوا گندہ پرنجے پہنے، وہ عورت اس طرح خاموش ہو گئے جیسے اس کی جان نکل چکی ہو...

بچہ جی بھر کے دودھ پی چکا تو چادر کی آڑ سے نکلا۔ اس کی کالی چندیا پر ایک لال ٹوپی تھی، گلے میں نظربد سے بچانے کے لئے تعویذ اور نیلے کالے موتی تھے اور پیچھے گدی پر بال، چھوٹی سی چٹیا میں گندھے تھے، عورت نے اس کا کرتا ٹھیک کیا، کمر پر بندھی پیٹی کسی اور چائےخانے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"جاؤ" اس نے کہا۔ "اپنے ابا کے پاس دوڑ جاؤ۔"

جوراخان نے چائےخانے کی طرف دیکھا، باپ بیٹھا اپنی سفید قمیض کے دامن سے اپنے بال‌دار سینے کو ہوا دے رہا تھا اور بڑا مزہ لے لے کے پھینٹی ہوئی، شکر ملی انڈے کی زردی میں روٹی لگا لگاکے کھا رہا تھا۔ پھر چائےخانےوالا ایک پھول‌دار چینی کے چھوٹے سے پیالے میں گرم گرم خوشبودار چائے لایا اور جھک کر اس کے سامنے پیش کی۔

غصے کے مارے جوراخان کا خون کھولنے لگا اور وہ وہاں سے جلدی جلدی چلتی ہوئی روانہ ہو گئی۔

آج سے چند سال پہلے ہو سکتا تھا کہ وہ ایسے منظر کو زیادہ بےپروائی سے دیکھ سکتی لیکن اس وقت تو اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اب تک اس نے ذاتی طور پر جتنے غم اٹھائے، زیادتیاں جھیلیں اور خطرے بھگتے تھے ان سب سے زیادہ کوفت اسے یہ منظر دیکھکر ہوئی۔

شاید اسے واپس جانا چاھئے؟ اس عورت کا ہاتھ پکڑنا چاھئے، وہ نقاب اور چادر اٹھکر اس کی ان آنکھوں میں جھانکنا چاھئے جنھوں نے آفتاب کی روشنی کو کبھی بھرپور نہیں دیکھا؟ مگر... نہیں ایسا کرنے سے تو وہ عورت خود ہی ڈر جائے گی۔

یکایک دیوار کے ادھر سے کچھ چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ جوراخان نے ایک بار پھر اپنی رفتار آہستہ کی۔ ایک عورت کسی پر چلا رہی تھی، ایک مرد کی آواز کے ساتھ

کچھ کہتی جا رہی تھی مگر صاف ظاہر تھا کہ اس کی بات آگ پر تیل کا کام کر رہی ہے۔ ذرا سی دیر بعد اس جھک جھک میں کسی بوڑھے آدمی کی منت سماجت کی غم آلود آواز اور ایک بچے کی ڈری ہوئی چیخیں بھی شامل ہو گئیں۔

جوراخان سننے لگی۔

"اچھا تو تم سوویت ذمے داروں کے خلاف ہو؟" مرد کی آواز نے دھیرے سے پوچھا۔ "اگر ایسا ہے تو پھر جاکے ان سے کہہ دو نا کہ تم ان کے خلاف ہو۔"

عورت خاموش ہو گئی، روتا ہوا بچہ بھی چپ ہو گیا، پھر جوراخان کے کان میں بوڑھے مرد کی کمزور آواز آئی۔

"مگر بھائی، یہ سب تو اپنی مرضی کی بات ہے، ہر کوئی جتنا دے سکتا ہے اتنا دے۔ اور سوویت ذمے داروں کو تو آپ بےکار ہی بیچ میں گھسیٹ رہے ہیں۔"

"میں نے آپ لوگوں سے جو کچھ کہا ہے وہ سرکاری حکم ہے، میں کیسے اس کی نافرمانی کر سکتا ہوں۔ ضرورت روپیے کی ہے، دلیل حجت کی نہیں، آپ کو اعتراض ہے تو جاکے کہہ دیجئے، میں نے اپنی ڈیوٹی پوری کر دی ہے!"

پھر لکڑی کا پھاٹک کھلا اور ایک دبلے پتلے کندھوں اور لمبی ٹانگوں والا آدمی گلی میں نکل آیا۔ وہ نیلے موٹے کپڑے کا گھڑسواری کی برجس اور زرد بوٹ پہنے تھا۔ منڈا ہوا اس کا سر چھلے ہوئے ابلے انڈے کی طرح لگتا تھا، چندیا پر لال مخملی ٹوپی جمی تھی۔

جوراخان کو دیکھکر وہ اس کی طرف اپنا ہاتھ پھیلاتا ہوا لپکا۔

"آج کا دن کتنا مبارک ہے! میں آپ کو دیکھکر بےحد خوش ہوا، جوراخان" وہ اپنے سونے کے دانت چمکا کر بڑی مکھن بازی کے ساتھ بولا۔

"اچھا تو ادھر آپ تھے؟" جوراخان نے دیوار کے اوپر نظر ڈال کر کہا۔

"جی ہاں، خاکسار ہی تھا۔ بات یہ ہے کہ علم سکھانے اور روشنی پھیلانے میں تو پورے دل و جان سے کام کرنا پڑتا ہے اور اپنا سب کچھ لٹا دینا پڑتا ہے، اور یہاں تو محترمہ جوراخان، اس لئے اور بھی دقت ہے، ناقابل بیان مشکل ہے کیونکہ آپ کا یہ خادم خاص یہاں اکیلا ہے اور فدوی کو مدد دینے والا کوئی نہیں۔ سو میں تو یہاں مشکلات کا بالکل شکار ہوکر رہ گیا ہوں۔ بالکل شکار سمجھئے۔"

اس کا چہرہ مارے رنج کے جھریوں سے بھر گیا، آنسو آنکھوں سے تقریباً چھلک پڑے، صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بےچارے کی ہتک کی جاتی ہے، عام طور پر لوگ اس کے ساتھ بےاعتنائی برتتے ہیں اور کوئی اس کی نہ قدر کرتا ہے، نہ اس کو سمجھ پاتا ہے۔

محمود نعیمی لڑکیوں کے ایک اسکول میں ٹیچر تھا۔ جوراخان کی اس سے حال ہی میں ملاقات ہوئی تھی جب کہ اس کا شہری پارٹی کمیٹی کے عورتوں والے شعبے میں تقرر ہوا تھا۔ عورتوں کے کلب میں ناخواندگی دور کرنے کے واسطے، ایک کمیٹی بنائی گئی تھی اور جوراخان کو ٹیچروں کی تلاش تھی، اسی سلسلے میں اس کی ملاقات اس "روشن خیالی کے حمایتی" سے ہوئی۔ پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ویسے بھی کم تھی۔ چنانچہ پڑھانے کا کام اس شخص کے حوالے کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

"کیا بات ہے؟ اس گھر میں کیا ہو گیا ہے؟"

"نہایت زوردار معاملہ ہے، صحیح معنوں میں نہایت انقلابی مسئلہ ہے! بات یہ ہے کہ شہری محکمے کی ہدایت کے مطابق "ماہ روشن خیالی" منایا جا رہا ہے نا۔ تو لوگ نعمانچہ میں ایک ابتدائی مدرسہ قائم کرنے کے لئے رضاکارانہ طور پر چندا اکٹھا کر رہے ہیں۔ اب آپ خود ہی دیکھ لیجئے، جوراخان کہ میں اپنے مقدور بھر دوڑ دھوپ اور کوشش کر رہا ہوں۔ آدھے دن تک تو میں وہ سبق اور کورس پڑھاتا ہوں جو آپ نے منظم کئے ہیں، لڑکیوں کے اسکول میں بھی میں تنہا ہوں اور اوپر سے یہ سب پریشانیاں... لیکن اب کیا کیا جائے! ہم

لوگ ایک تہذیبی انقلاب کے دور سے گزر رہے ہیں اور یہ کوئی ہنسی دل‌لگی تو ہے نہیں۔ ہمیں امید رکھنی چاہئے کہ تاریخ ہمیں یاد رکھے گی۔"

"دیکھئے سنئے، میرے عزیز ساتھی" جوراخان نے اپنی باریک بھنویں سکوڑتے ہوئے سختی سے کہا۔ "آپ ذرا کل صبح شہری پارٹی کمیٹی میں آئیے، ہم تعلیم‌عامہ سے متعلق شہری محکمۂ تعلیم عامہ میں جتنے "انقلابی" ہیں سب کو بلائیں گے اور ذرا یہ گفتگو کریں گے کہ سوویت اقتدار اور سوویت سرکار عام لوگوں کی رضاکارانہ مدد کا کیا مطلب سمجھتی ہے۔ سمجھ گئے نا؟"

نعیمی کی زبان ایک‌دم بند ہو گئی اور وہ اپنی آنکھیں جھپکانے لگا۔

"جی ہاں، آپ حکم دیں اور بندہ تابعدار ہے۔ میرا مطلب ہے کامریڈ جوراخان، ہمیں آپ کی امداد اور رہنمائی کی شدید ضرورت ہے۔"

جوراخان ایک‌دم مڑ گئی اور چل دی۔ نعیمی اپنے سینے پر ہاتھ رکھے کھڑے کا کھڑا رہ گیا اور اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا اور جب وہ نکڑ پر مڑ گئی تو نعیمی کے چہرے پر کھسیائی ہوئی مسکراہٹ جیسے جم کے رہ گئی۔

یہاں سے چلتی ہوئی جوراخان، اناخان کے گھر پہنچی اور وہاں پہنچتے ہی اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اناخان اسے دیکھ‌کر اتنا خوش ہوئی کہ جوان لگنے لگی، زیادہ خوبصورت دکھائی دینے لگی۔

بہن جوراخان، آپ آج میری دوسری مہمان ہیں، اگر "سویونچی"* دلوائیے تو آپ کو دکھاؤں میری پہلی مہمان کون ہیں۔"

جوراخان نے اپنے بیگ میں سے ایک مٹھائی نکالی۔

---

*اچھی خبر سنانےوالے کو جو انعام دیا جاتا ہے اسے "سویونچی" کہتے ہیں۔ جیسے ہمارے یہاں کہتے ہیں "منہ میٹھا کروائیے تو ایک خبر سنائیں"۔ مترجم۔

"لو، اپنی سویونچی"!

پھر دونوں کمسن لڑکیوں کی طرح ہنسنے لگیں۔

پھر صوفیہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے برآمدے میں نکل آئی۔ دوانوں نے ازبیک زبان میں سلام کیا:

"ایسان میسز، آمان میسز؟"*

"مبارک ہو، میری پیاری، بہت اچھی لگ رہی ہو" جوراخان ذرا سا پیچھے ہٹی اور صوفیہ کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولی۔ "تم ماں بننےوالی ہو!" پھر ذرا خفگی کے ساتھ اناخان سے بولی: "بھئی اناخان، ویسے تو میں تمہیں دعائیں دیتی ہوں، سلامت رہو، عمر دراز، مگر ایسے وقت میں تو تم کو ہی اپنی دوست کے یہاں ملاقات کرنے جانا چاہئے تھا، بھلا اتنا بوجھ اٹھاکر کون کہیں جا سکتا ہے۔"

"یہ اناخان کا قصور نہیں ہے" صوفیہ ہنستی ہوئی بولی۔ "بشارت نے مجھے کچھ خوبانیوں کی لالچی دی، سو میں کھنچی چلی آئی۔"

پھر سب ہی عورتوں نے ایک دوسرے کو بڑے پیار سے دیکھا، اناخان نے ایک سادہ چھوٹا سا کمبل طاق سے نکالا، اسے چھوٹی سی میز کے پاس بچھایا اور میز پر میزپوش ڈالا۔

"جوراخان، مجھے تمہارا لباس بڑا پسند آیا" صوفیہ میز کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ "میں بھی بالکل ایسا ہی کپڑا بنا کرتی تھی، اسی لئے میں نے فوراً پہچان لیا۔"

"تم ایوانوو وازنیسنسک کو بھول نہیں سکتی ہو نا؟"

"ہاں، مجھے وہ مل بہت یاد آتی ہے" صوفیہ نے جواب دیا۔

"یہ سوتی کپڑا تو میں نے دکان سے خریدا ہے" جوراخان نے کہا۔

---

* ازبیک خواتین ملاقات کے وقت یہ فقرہ مزاج پوچھنے کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ اڈیٹر۔

"یہاں سوتی کپڑا بہت مہنگا ہے۔"
"بہت۔ ہم لوگ بس صرف "متا" بننا جانتے ہیں، بنکروں کو اور بھی قسم کا کپڑا بننا بھی سکھانا چاہئے۔ میرا خیال ہے، پیاری بہن صوفیہ کہ اگرچہ تم یاد تو کرتی ہو..."
"میں تمہارا مطلب سمجھ گئی، ویسے میں نے اور یفیم نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اب یہیں رہوں گی۔"
"شکریہ، تمہارا بہت شکریہ میری پیاری" جوراخان نے اس کا ہاتھ دبایا۔ "وہاں تو تم ایک معمولی بنکر رہی ہوگی مگر یہاں..."
"مگر یہاں... صاف بات یہ ہے کہ یہاں کچھ مجھے اپنا سا نہیں لگتا اور یہ بھی پریشانی ہے کہ دیکھو، میری عمر خاصی ہو گئی ہے اور پہلا بچہ اب ہو رہا ہے۔"
"بات یہ ہے کہ ہم ہر چیز میں پہل کر رہے ہیں" اناخان نے کہا۔ "پہلی مسرت، پہلی بےنقاب عورت، پہلی کوآپریٹو..."
پھر اناخان نے صوفیہ کے سامنے شوربے کی ایک پلیٹ رکھی۔
"لو، یہ کھاؤ، یہ تمہارے لئے کچی خوبانیوں سے زیادہ مفید چیز ہے۔"
صوفیہ سر جھکاکر شوربہ کھانے لگی۔
"فی‌الحال تو ہمارے بنکر" اناخان نے بات جاری رکھی، "نہ سوتے ہیں، نہ آرام کرتے ہیں، وہ خیالات کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں، تبدیلیوں کے سلسلے میں بڑی بڑی امیدیں لگائے ہوئی ہیں، انہوں نے آج تک کبھی اس طرح کے بحث مباحثے نہیں کئے جیسے وہ آج کل کر رہے ہیں۔ جہاں ذرا سا موقع ملا لوگ اکٹھے ہو گئے اور کھسر پھسر کرنے لگے، اب وہ ہڑیلے مقسوم سے احتیاط ضرور برتتے ہیں مگر اس سے ڈرتے نہیں ہیں۔ تم خالہ رضوان کو جانتی ہو؟ وہ تو ہڑیلے کی منحوس صورت دیکھنے کے بجائے مردوں کے کوآپریٹو میں شامل ہونے کو تیار بیٹھی ہیں۔ پھر وہ عنظیرت

ھے، نیک بوڑھی عورت - ارے وھی، دادی شکراللہ... وہ اور ھی راگ الاپتی رھتی ھے۔ "اری میری لاڈلیو، اس گڑبڑ سڑبڑ، اس دوڑ بھاگ سے کچھ ھونا ھوانا نھیں ھے، یہ سب گناہ ھے، یہ کیا بری بری باتیں تم لوگوں نے شروع کر دی ھیں، یہ گناہ ھے، گناہ!" رضوان نے تو اس بڑھیا سے صاف کھہ دیا کہ بڑی بی اگر تم گناہ سے اتنا ھی ڈرتی ھو تو ھم لوگوں سے مت ملا جلا کرو کیونکہ ھم لوگوں کو تو یہ گناہ اچھا لگتا ھے! ھاں۔"

"خالہ رضوان تو عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ جوان‌تر ھوتی جاتی ھے" جوراخان نے مسکراتے ھوئے کھا۔ اس کے رخساروں کی ابھری ھوئی ھڈیوں پر ھلکی سی سرخی چھا گئی۔

"ایک دن ھم لوگوں نے سنا کہ مالک خود کارخانے میں آنےوالا ھے، بس دادی شکراللہ نے لب لب کرنا شروع کر دیا: "ارے میری پیاریو، ذرا مسکراؤ، ذرا خوش نظر آؤ، دل میں کینہ کدورت رکھنا گناہ ھے، اب اس نے کبھی کبھار تم لوگوں کو ناراض کر دیا تو کیا کیا جائے، ایسی باتوں سے کون بچ سکتا ھے، ھو ھی جاتا ھے ایسا... گئی گزری بات تو برا خواب ھے، بھول جانا چاھئے۔ دیکھو نا اب ھو کیا رھا ھے مالک کو حکومت بھی عزت دے رھی ھے، بالکل جیسے پرانے وقتوں میں ھوتا تھا۔ وہ تو ھمارا مائی باپ ھے، خود ھم لوگوں سے ملنے آ رھا ھے جیسے چاند نکل آئے پورم پور، آخر کیوں؟ یھی معلوم کرنے کے لئے نا کہ ھم کس طرح زندگی بسر کر رھے ھیں، اور ھم لوگ ھیں کہ تیوری چڑھائے ھوئے ھیں، منہ بنائے ھوئے ھیں... یہ تو ٹھیک بات نھیں ھے، ایسے تو نھیں چل سکتا!" تو قصہ مختصر یہ کہ دادی شکراللہ اور نزاکت مالک سے ملنے گئیں اور ھم سب اپنے اپنے کرگھوں پر ڈٹے بیٹھے رھے اور ھم میں سے کسی نے سر اٹھاکر دیکھا تک نھیں۔ تو یہ حالات ھیں! جیسے ھی کوآپریٹو کھلے گا، آدھی بنکر عورتیں تو قدرت‌اللہ سے جان چھڑاکر وھاں فوراً چلی جائیں گی۔ رضوان کھتی ھے کہ اگر

بائے ہم لوگوں کو نہیں جانے دے گا تو ہم اسی کو نکال باہر کریں گے۔"

"ابھی ہم ایسی بہت کم ہیں، بہت ہی کم" جوراخان نے اداسی سے کہا۔ ویسے تو نعمانچہ میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ہم ایسی بہت کم ہیں۔"

پھر اس نے اپنی دوستوں کو بتایا کہ اس نے چائےخانے پر کیسا منظر دیکھا تھا اور ایسا دردناک بیان کیا کہ صوفیہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"ہم لوگ ابھی تک ایک دوسرے سے کتنی دور ہیں" جوراخان نے کہا۔ "کیا ہم بہنیں نہیں ہیں؟ کتنا اچھا ہو اگر ہم گھر گھر جائیں اور ہر خاندان میں جاکر ماؤں اور بیویوں کو سچائی سے آگاہ کریں۔"

"مگر سوال یہ ہے کہ وہ لوگ سمجھیں گی بھی؟ کیا سب کچھ ان کی سمجھ میں آ جائے گا؟" اناخان نے شک میں سر ہلایا۔

"وہ ہماری بات ضرور سمجھیں گی! اگر عقل سے نہیں تو دل سے تو سمجھیں گی ہی، ہمیں محنت‌کش عورت کے دل پر اعتماد کامل رکھنا چاہئے!"

اناخان نے مضطرب ہوکر اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔

"کبھی کبھی میرا کتنا دل چاھتا ہے کہ میں سب عورتوں کو جمع کروں... دادی شکراللہ سمیت... نزاکت سمیت... اور میرے دل پر جتنی باتیں بوجھ بنی ہوئی ہیں، سب ان سے کہہ دوں! مگر کیسے کہوں؟ کیا الفاظ ہوں؟"

"ایسے کہو" صوفیہ نے جواب دیا۔ "یوں کہو کہ پیاری بہنو، عزیز رفیقو، اب تک تو تم بڑی تاریکی میں اپنے دل کی چوٹ چھپائے بسر کرتی رہیں، شریعت کا بہانہ بناکر تمہیں زنجیروں میں جکڑا گیا، تم سے کہا گیا کہ تم کنیزیں ہو، تم کو نفرت کی نظر سے دیکھا گیا، حقارت سے برتاؤ کیا گیا، تم ایک ذلیل و خوار زندگی بسر کرتی رہیں، تمہارے جسموں، تمہاری روحوں کو اذیتیں دی گئیں، تم زندگی کو

جنم دینےوالی ہو، تم حیات کی خالق ہو لیکن تمہیں محبت اور روشنی سے محروم کر رکھا گیا۔ جب بھی تم یہ زیادتیاں برداشت نہ کر سکیں اور درد سے تم نے چیخنا چاہا تو پھر بھی تم نے اس طوفان کو دل میں دباکر رکھا کہ تمہاری صدا کوئی سن نہ لے، تم کو زبردستی یہ بھلایا گیا کہ تم بھی انسان ہو اور تم واقعی بھول بھی گئیں۔ لیکن یاد رکھو کہ تم انسان ہو! یاد رکھو کہ تمہارے دل میں صرف زخم نہیں ہیں، مسرتوں کے خواب بھی ہیں۔ ہیں یا نہیں؟ تو پھر تم کس بات سے ڈرتی ہو؟ اپنے سر کو بلند کرو، اپنے پروں کو پرواز کے لئے پھیلاؤ، اپنے چاروں طرف نظر ڈالو اور دیکھو کہ ایک نئی زندگی کے اکھوے ہر جگہ پھوٹتے دکھائی دے رہے ہیں۔ اور یہ نئی زندگی تمہارے بغیر برگ و بار نہیں لا سکتی۔ آگے بڑھکر اس کا استقبال کرو، اس کو گلے لگاؤ۔ اور یاد رکھو کہ اب تمہیں ایک معتبر حمایتی، ایک مخاص اور پرجوش طرفدار حاصل ہے۔ سوویت اقتدار!"

صوفیہ اپنے جوش و خروش میں بالکل کھوکر اس طرح بولتی جا رہی تھی جیسے وہ کسی بڑے جلسے کو خطاب کر رہی ہو اور اناخان حیرت سے دم بخود، مسحور سنتی جا رہی تھی۔

"ہائے کاش کہ میں اس طرح تقریر کر سکتی" وہ خواب کی سی کیفیت میں آہستہ سے بولی۔

جوراخان نے اٹھ کر اسے گلے لگاکر پیار کر لیا۔

"اگر یہ سب کچھ تمہارے دل میں ہے تو تمہیں الفاظ بھی مل جائیں گے۔ نعمانچہ میں ہماری امیدیں تم ہی سے وابستہ ہیں۔ ہاں، تم سے! میں یہ بات تم سے، اس اقتدار کے نام پر کہتی ہوں جس کے لئے تمہارے شوہر نے اپنی جانِ‌عزیز قربان کر دی۔ وہ اقتدار جو قدرت‌اللہ کی بالکل پرواہ نہیں کرتا۔ یہ سب باتیں اس خالہ عنظیرت اور اس کے ایسے لوگوں کو سمجھاؤ - اس کام کو بھلا تم سے بہتر کون کر سکتا ہے۔"

کسی نے لکڑی کا پھاٹک دھڑ سے کھولا اور پل ہی بھر

بعد لڑکیاں ہلڑ مچاتی دوڑتی ہوئی آنگن میں داخل ہوئیں۔ دونوں نے پہلے تو صوفیہ چچی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں، پھر ذرا شرماکر جوراخان کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ صوفیہ نے دیکھا کہ لڑکیاں بڑے رشک کے ساتھ جوراخان کے لباس کے کپڑے کو دیکھ رہی ہیں۔ اس نے اناخان کی طرف دیکھکر آنکھ ماری۔

"ویرا، بھئی یہ کیا بات ہے کہ تم نے خود ہی تو مجھے اپنے گھر بلایا اور خود ہی غائب ہو گئیں۔ تم یہاں میرا استقبال کرنے کو کیوں نہیں تھیں؟" صوفیہ نے شکایت کے لہجے میں کہا۔

"اچھا، اچھا، مجھ سے خفا نہ ہوئیں صوفیہ چچی، میں ابھی پلک جھپکتے میں آپ کے لئے کچی خوبانیاں لاتی ہوں" بشارت نے کہا اور دوڑتی ہوئی برآمدے کی سیڑھیوں سے اتر گئی۔

"اور میں ان خوبانیوں کو آپ کے لئے رومال میں باندھ دوں گی" تورسنائی بولی اور پھر ایک گیت گنگناتی، پھدکتی ہوئی وہ بھی بڑی بہن کے پیچھے دوڑ گئی۔

پانچواں باب

قدرت اللہ کے گھر میں بڑی اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ بائے کی عادت تھی کہ صبح کو وہ اپنے سایہ‌دار باغ میں حوض کے کنارے بیٹھکر صبح کی "قمیز"* پیا کرتا تھا۔ لیکن آج کیا ہوا کہ کسی نے وہاں دسترخوان بچھانے کی بھی زحمت نہیں کی۔

---

* گھوڑی کا دودھ ۔ اڈیٹر۔

ہڑیلا مقسوم اپنی سرخ آنکھیں لئے، صحن میں باؤلوں کی طرح ادھر ادھر دوڑتا پھر رہا تھا۔ پہلے تو وہ منہ سکوڑے زنان‌خانے کی طرف گیا، پھر ادھر سے ساٹن کی ایک توشک اور ریشمی تکیہ بغل میں دبائے، واپس باغ کی طرف بھاگا پھر اندر کی طرف دوڑا۔ راستے میں پڑی ایک لمبی سی جھاڑو اور ایک بھاری سے لوہے کے بنے، وضو کے آفتابے سے ٹھوکر کھائی۔ پھر بیٹھک میں داخل ہوا، اپنے "کاووش" اتارے اور سینے پر ہاتھ رکھکر بولا: "السلام..."

اور کئی بار یہی کہتا رہ گیا۔

لیکن بیٹھک میں متقوول کے علاوہ کوئی تھا ہی نہیں۔ دکاندار متقوول جو اتنا موٹا تھا کہ روئی کی گانٹھ لگتا تھا، وہ ایک کونے میں، سوت اور ریشم ملاکر بنے ہوئے رگ پر بیٹھا تھا اور حسب دستور بالکل ساکت اور جامد تھا۔ اس نے مقسوم کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ دکاندار کی الجھی الجھی بھنویں جو ناک کے بانسے پر آکر ملتی تھیں اور بکری کی کھال پر کے روئیں کی طرح لگتی تھیں، اس کے پھولے ہوئے پپوٹوں پر جھکی ہوئی کچھ خفا سی دکھائی پڑتی تھیں۔ بار بار وہ ایک بڑے زرد رومال سے اپنا بالوں سے بھرا سینہ اور اپنی موٹی گردن پونچھتا تھا۔

آج اس آدمی کی بدولت مقسوم کی بڑی جان بچی تھی!

بات یہ ہوئی کہ سورج نکلتے ہی مقسوم دوڑا دوڑا بائے کے گھر آیا اور بائے کو جانگیہ پہنے نالے کے قریب دیکھکر وہ دوزانو ہو گیا تھا۔

"مالک... مالک..."

وہ ہلا دینےوالی خبر لایا تھا: حکومت نے روٹی اور سوتی کپڑا، دونوں کے دام کم کرنے کے فیصلے کا اعلان کیا تھا۔

"نئی معاشی پالیسی‌والے قدرت‌الله کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور مارے غصے کے اس نے اس بیچارے خبر لانےوالے کے ہی منہ پر تھوک دیا۔

ہڑیلے مقسوم کی اتنی بھی ہمت نہ پڑی کہ تھوک پونچھ لیتا، وہ تو اس سے بھی بڑی ہتک برداشت کرنے کو

تیار تھا بشرطیکہ اسے اپنے مالک کو اتنا زیادہ پریشان نہ دیکھنا پڑتا۔ اور اگر دکاندار متقوول اسی وقت نہ آ جاتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ "چلو، شکر ہے خدا کا! اب یہ دونوں مل کر ایک دوسرے کو سمجھا بجھا لیں گے" مقسوم نے دل ہی دل میں سوچا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی زخمی روح پر کسی نے مرہم رکھ دیا۔

کسی سچے روشن ضمیر مرشد کی طرح متقوول نے زیادہ الفاظ برباد نہیں کئے۔

"آپ نے کچھ خبر سنی مالک؟" اس نے آہستہ سے کہا۔ ایسا کہتے میں اس کے موٹے ہونٹ بس برائے نام ہی ہلے اور اس کے بعد اس نے ایک لفظ نہیں کہا۔

متقوول بڑا چالاک تاجر تھا لیکن وہ دن بھر میں مشکل سے دس لفظ کہتا اور جب زبان کھولتا بھی تھا تو یوں جیسے کوئی انکشاف کر رہا ہو۔ جب گفتگو کرتا تو بڑی سنجیدگی کے ساتھ اور پھر گھنٹوں خاموش رہتا۔ اس رویے نے اس کی یہ شہرت پھیلا دی تھی کہ وہ بہت معتبر آدمی ہے۔

قدرت اللہ خواجہ نے کندھوں پر ایک عبا ڈالی اور بیٹھک میں آ گیا۔ وہ پچاس سال کا، لمبے قد اور اکھرے جسم والا آدمی تھا۔ چھوٹی سی گھنی داڑھی، البتہ اس کی پیشانی پر گوشت کافی تھا اور اس پر جھریاں بھی، ناک طوطے کی سی اور اس پر بھی گوشت اور جھریاں۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کا تمام چہرہ صرف پیشانی اور ناک پر مشتمل ہو لیکن اس کے نقشے میں یہی ایک چیز تھی جو اسے عام لوگوں سے ممتاز کرتی اور بائے کی مغرور صورت بخشتی تھی۔

وہ نووارد متقوول کے پاس آ بیٹھا۔ آدھے گھنٹے متقوول کچھ ہلا، کچھ خود ہی خود غرایا اور پھر اپنی جھنکاڑ بھنویں پرمعنی انداز میں اوپر اٹھائیں:

"فیصلہ... سوتی کپڑا سستا ہوگا۔"

ان سوچے سمجھے نپے تلے الفاظ کو آہستہ آہستہ یوں ادا کیا گیا تھا جیسے کوئی بری بات ظاہر ہے کہ بری ہوگی، اس کے متعلق زیادہ الفاظ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔

قدرت‌الله نے ایک آہ بھری اور کراہ کے پہلو بدلا۔

ایک سنہری زرد بالوں‌والی بلی اطمینان سے، آرام سے اس کسے ہوئے تکئے پر اپنے پنجے پھیلائے غرغو کر رہی تھی جس کے سہارے بائے بیٹھا تھا۔ بائے چونک پڑا۔ اس نے بلی کو اس کی گردن کے بالوں سے پکڑا، غصے سے اسے تکئے پر سے کھینچا اور زور سے کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔ بلی متقوول کے سر پر سے اڑتی ہوئی گئی اور وہ خوف‌زدہ ہوکر اپنے معمول سے زیادہ تیزی سے بولنے لگا:

"مالک، ایسا لگتا ھے کہ آپ نے شیطان اتار پھینکا..."

بائے نے کوئی جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

دکاندار نے اپنے بالدار سینے پر کئی بار پڑھ پڑھ کر پھونکا جیسے بدروحوں کو بھگا رہا ہو۔

پھر صحن میں جوتوں کی چرمراہٹ سنائی دی اور ایک آدمی برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا۔ وہ نیلے رنگ کی گھڑسواری کی برجس پہنے تھا، سفید ریشم کی قمیض جس میں بڑی شاندار پھندنوں‌والی پیٹی بندھی تھی۔

"یہ روز سعید کتنا مبارک ھے" نعیمی نے کہنا شروع کیا اور ایک‌دم رک گیا۔ "وہ بری خبریں..."

"تو پھر تمہیں کس بات کی فکر ھے، استاد؟" بائے نے نعیمی کی بھڑکیلی قمیض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم تو کوڑی کے مول یہ ماسکو کا ریشم خرید لوگے۔"

"جب مصیبت آتی ھے تو کمزور لوگ ایک دوسرے سے جھگڑنے اور ایک دوسرے پر الزام لگانے لگتے ھیں اور شہزور عوام کو طاقت دیتے ھیں۔"

بائے طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

ظاھر ھے تم تو شہزوروں کی نسل سے ہو!"

نعیمی نے کچھ مایوس ہوکر کندھے ہلائے۔

یکایک صحن سے ایک مسرت بھری آواز آئی۔ بائے اور اس کے مہمانوں نے ایک دوسرے کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہتے ہوں: "وھی ھے!"

وہ محمد سعید تھا جسے تمام بازاروں میں سب چائے

کے سوداگر کی حیثیت سے جانتے تھے۔ تاجروں کی دنیا میں سب جانتے تھے کہ وہ کتنے وسائل‌والا سوداگر ہے۔ مشرق کے تمام ہی ملکوں کو جا چکا ہے اور کاروانوں کے راستے ناپ ناپ‌کر اس کے بال سفید ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ افغان ہے جب کہ دوسروں کو یقین تھا کہ وہ ہندوستان سے آیا ہے۔ وہ ابھی پانچ سال پہلے ہی پرانے شہر میں آکر بس گیا تھا اور چائے کی ایک دکان کھول لی تھی۔ وہ ہر قسم کی چائے فراہم کر سکتا تھا چاہے کہیں پاس کی ہو یا باہر کی، تول کر بھی دیتا تھا اور پیکٹوں میں بھی، ویسے دکان سے اسے زیادہ منافع نہیں ہوتا تھا مگر وہ کبھی شکوہ نہیں کرتا تھا، کہتا: "سچے مسلمان کو تو سب سے زیادہ اس بات کی لگن ہوتی ہے کہ وہ مقامات مقدسہ کی زیارت کرلے" اس قسم کے خیالات سے اس کو فائدہ تو کچھ نہیں ہوتا تھا، البتہ یہ ضرور تھا کہ اگرچہ وہ امیر نہیں تھا مگر پھر بھی باقی سوداگر اس کو اپنے برابر کا گردانتے تھے۔ محمد سعید نے دنیا میں بہت کچھ دیکھا تھا، وہ بہت کچھ جانتا تھا۔ مشرق کے بڑے بڑے تجارت کے مرکزوں کی دلکش زندگی کا حال وہ بڑی خوبی کے ساتھ سنایا کرتا اور نئی اقتصادی پالیسی کے تاجر منھ کھول‌کر اس چرب‌زبان سیاح کی باتیں سنا کرتے۔

قدرت‌الله کو اس کے آنے کا انتظار تھا کیونکہ وہ بڑی عقلمندی سے سودا کرنا جانتا تھا۔ یہ غیرملکی تاجر ہوشیار تو تھا مگر کوئی بے‌وقوف ہی ہوتا جو اس کی بے‌نیازی کو بھانپ نہ لیتا۔ بہرحال، دیکھنا چاہئے تھا کہ آج کے منحوس دن کے متعلق اس کی کیا رائے تھی جب کہ قیمتیں گرا دی گئی تھیں!

ھڑیلے مقسوم نے بار بار جھک جھک‌کر نووارد مہمان کو جس کا کافی دیر سے انتظار تھا، اندر پہنچایا۔ پھر سے ایک بار اپنے مالک کو سلام کیا، باقی مہمانوں کو بھی، اور پھر بھاری ریشم کے میزپوش کو یوں لپیٹنے لگا جیسے وہ قالین ہو۔ پھر اس نے ایک اور میزپوش بچھایا، کشمش

اور سوکھی خوبانیوں اور بادام سے بھری ایک پلیٹ لایا۔ پھر بھاپ نکلتی "شیرچائے" بھرے پیالے۔ "شیرچائے" میں خوب دودھ، مکھن اور کالی مرچ ڈالی گئی تھی، ساتھ میں بھربھری شیرمالیں جن پر مصالحےدار تل چپکے ہوئے تھے۔

جیسے ہی ناشتہ لگا متقوول زور زور سے ہونٹ چاٹنے لگا تاکہ میزبان خوش ہو اور ناشتے کی عمدگی بھی ثابت ہو جائے۔

چائے کا تاجر مسکرایا۔ اس کے چہرے کا رنگ راکھ کی طرح سرمئی تھا اور اس کی صورت پر بوڑھوں کی سی تھکن چھائی ہوئی تھی اور مسکراہٹ ایسی طنزیہ کہ قدرت‌الله تھرتھرا اٹھا۔

چائے کے تاجر نے پاؤں پھیلائے اور گھٹنے سہلاتے ہوئے اپنے قصے شروع کر دئے۔ لگتا تھا جیسے نہ تو اسے نظر آ رہا ہے اور نہ وہ اس بات کی پرواہ کر رہا ہے کہ اس گھر میں کیوں پریشانی پھیلی ہوئی ہے۔ وہ بڑے جوش‌وخروش سے اپنے مشہد اور کشمیر میں قیام کو یاد کرتا اور کلکتے کے سوداگروں کی شاندار عباؤں کا ذکر کرتا رہا اور پھر قاشغر کے سوداگروں کے یہاں کیا رسم و رواج تھے یا ایک مزےدار بات سنئے: آپ نے سنا ہے وہ قصہ کہ بمبئی کا ایک سوداگر کس طرح لندن پہنچا! وغیرہ۔

قدرت‌الله خاموش سنتا رہا۔ اس کا رنگ زرد، اور زرد پڑتا جا رہا تھا اور چائے والا تھا کہ برابر اس کا مذاق اڑائے جا رہا تھا اور وہ جو کہ کسی زمانے میں نعمانچہ کا مالک تھا، اس کی اتنی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ ایک فضول سے دکاندار کو اپنے یہاں سے بھگا دے۔

"تو کہئے، بائے؟ آپ میں سے تو جیسے دھواں نکل رہا ہے۔ کیا جگر میں آگ لگ گئی ہے، آپ کے؟" چائے کے تاجر نے یکایک خی خی کرکے نحوست سے ہنستے ہوئے پوچھا۔

نعیمی نے جو نہایت گھٹیا قسم کا حاشیہ‌بردار تھا، یوں تو یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ ایسی بدتمیزی اسے اچھی نہیں لگی مگر اس نے بھی اپنی آواز بلند ہی کر دی:

"مالک، آپ اپنے اس حقیر غلام سے خفا نہ ہوں تو میں عرض کروں کہ یہ قصور آپ کا ہی ہے، مالک!"

"میرا قصور؟"

"آپ قوم کے سب سے بااثر لوگوں میں سے ایک ہیں! آپ مسلم دنیا کے ایک گل شگفتہ ہیں مگر آپ نے اپنے آپ کو یہاں نعمانچہ میں دفن کر رکھا ہے۔ آپ قوم کی روح ہیں، اس کی قوت ہیں، آپ فخر قوم ہیں اور آپ نے اپنا روپیہ سب گاڑ رکھا ہے... اور آپ کو حاصل کیا ہوا؟ آپ کی دکانوں میں "متا" کے گٹھر کے گٹھر گنجے ہیں اور ان میں پھپھوندی لگ رہی ہے اور ہم لوگ ماسکو کا ریشم پہن رہے ہیں!"

"ارے میرے مالک، میرے استاد" قدرت اللہ طنز کے ساتھ بولا، "پانچ سال سے تم طوطے کی طرح بس یہ ایک ہی بات رٹے جا رہے ہو، میرے کان میں بس یہی پھونکے جا رہے، یہی پیٹے جا رہے ہو کہ قوم، قوم، قوم... مسلم دنیا... مگر اب تو مسلمان کسی روسی سے بھی زیادہ خطرناک ہو گیا ہے۔ عورتیں تک تو سر اٹھا رہی ہیں۔ ایک وہ ہے، ارے وہی مزدور صابر کی بیوہ، اس سے تو مجھے اتنا ڈر لگتا ہے جتنا قیمتیں گھٹنے سے بھی نہیں لگتا۔"

چائے کے تاجر نے آنکھیں سکیڑ کر پوچھا:

"کیا اس کا نام اناخان ہے؟"

قدرت اللہ نے تعجب سے بھنویں چڑھائیں، اس کے پرگوشت ماتھے پر لکیریں آ گئیں۔

"تم اسے جانتے ہو؟"

"ہاں، مردوں کے کان بھی کبھی کبھی عورتوں کی اڑائی باتیں اور گپ شپ سن لیتے ہیں" چائے کے تاجر نے ایک تحقیرآمیز نگاہ نعیمی پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "اور عورتوں کی اڑائی کبھی کبھار مردوں کی زبان پر بھی آ جاتی ہے۔ استاد معظم کی بات پر ذرا دھیان دیجئے گا بائے، یہ سیاست میں اپنا دخل رکھتے ہیں! غور کرتے رہئے کہ ہوا کا رخ کیا ہے، آپ بھی کمیونسٹ ہونے کے ذریعے امیر بن جائیے، بائے! یہ بڑی قابل رشک زندگی ہے..."

چائے کا تاجر پہلے تو زور سے ہنسا پھر کھانسنے لگا، ایسا لگ رہا تھا کہ قہقہے اور کھانسی سے اس کا دم رک رہا ہے۔

قدرت‌الله اسے غصہ اور خوف بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"محمد سعید، تمہارا سا تو آدمی ہونا مشکل ہے، تم تو جنازے پر بھی ہنستے ہی رہوگے مگر یاد رکھو تم بھی کچل دئے جاؤگے!"

چائے کا تاجر ہنستا رہا۔

"بس یہیں پر آپ سے غلطی ہو رہی ہے، آپ کی بدنصیبیوں کا مجھ پر اثر کیوں ہو؟ خدا کے فضل سے میرے ملک میں اخلاقیات کی موت نہیں واقع ہوئی ہے۔ ہم اپنے اخباروں میں عورتوں کے متعلق نہیں لکھتے اور ہمارے یہاں مرد پروپیگنڈے میں وقت ضائع نہیں کرتے۔" پھر اس نے طنز و مضحکہ کے انداز میں نعیمی کی طرف اشارہ کیا: "ہم اپنے دل میں شکوک پیدا کرکے پریشان نہیں ہوتے، ہم تو صاف بات کرتے ہیں، گلے پر خنجر اور بس پھر نہ کوئی الجھن، نہ پریشانی! جبھی تو ہمارے اصول اپنی جگہ پر قائم ہیں، میں ہنستا ہوں... اگر میری سمجھ میں آپ کی بات نہ آئے تو میں کیوں نہ ہنسوں؟ زمانہ تو خون کا متقاضی ہے اور آپ محبت جتا رہے ہیں۔ کسی کنواری کی طرح شرما شرماکر، "ہیں۔ ہیں۔ ہیں۔ ہیں" کر رہے ہیں۔ جب آپ کے ہی گلے پر خنجر چلے گا، تب کیا کہئے گا؟ کیا گھگھیاکے کہئے گا "ارے ارے دوست" یہ نہ کرو، ایسے نہیں، ایسے نہیں؟، اناخان! ایک مزدور کی بیوہ... سارا نعمانچہ اس سے دہشت کھا رہا ہے! آپ کھائیں دہشت، مجھے تو بڑا لطف آتا ہے۔ واہ واہ۔"

"تو تم سمجھتے ہو، وقت آ گیا ہے کہ... بائے آواز نیچی کرتے ہوئے دھیرے سے بڑبڑایا۔

"وقت؟" چائے کے تاجر نے حقارت سے کندھے اچکائے۔ "ذرا یاد کرو، کوشش کرکے یاد کرو، میں نے پانچ سال پہلے کیا کہا تھا؟ کہ چارہ مت نگلو، اس کے اندر کانٹا ہے،

پھنس جاؤگے، انڈے سینےوالی مرغی نہ بنو۔ سو دیکھ لو، سوویت حکومت کے منظور نظر نئی اقتصادی پالیسیوالی... سماج کے ستون... مجھے امید ہے تم کم از کم اب تو یہ سمجھ گئے ہوگے کہ تم ایک انڈے سینےوالی مرغی ہو۔ پانچ سال سے تم انڈوں میں سے بچے نکال رہے ہو۔ تم اپنے کارخانے اور اپنے ہنرمند بنکروں کے بڑے گن گاتے ہو۔ وہی ہیں چوزے جو تم نے نکالے ہیں اور اب دیکھنا وہ کام آئیں گے بالشویکوں کے، اور جہاں تک انڈے سینےوالی مرغی کا سوال ہے وہ اس کی گردن مروڑ کر اس کا شوربہ بنا لیں گے، ہاں دیکھنا۔"

دکاندار متقوول نے چبانا بند کر دیا اور نیم‌خوابیدہ کیفیت میں اپنے چکنے چکنے ہونٹوں پر زبان پھیری:

"مرغی کا شوربہ..." اس نے کہا اور پھر یوں سر ہلایا جیسے کوئی بڑی اہم بات کہی۔ "یہ بہترین غذا ہے۔"

چائے کا تاجر ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے سینے پر ایک ہاتھ رکھکر درباری انداز میں جھکا۔

"ناشتے کے لئے آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اور ان عقل سے بھرپور تقریروں کے لئے بھی شکریہ، میں آپ کی میزبانی کی ناشکری نہیں کروں گا، میں نے خوب کھایا۔"

ھڑیلا مقسوم فوراً دروازے میں آکر کھڑا ہو گیا کہ گھر میں آئے معزز مہمان کو باہر لے جائے۔ چائے کے تاجر نے اوورسیر کا جائزہ لیا اور ایک بار پھر میزبان کے آگے جھکا۔

"بدمعاش؟.. چالباز!.. مشہد کی تجارتی چوکیوں میں جاکر کچھ ترکیبیں، کچھ چالیں سیکھ لیں!" نعیمی نے چائے کے تاجر کے باہر جانے کے بعد کہا۔ "یاد ہے؟ پانچ سال پہلے کیا کہا تھا؟ کس قدر گستاخ ہے، آخر یہ چاھتا کیا تھا؟"

قدرت‌الله نے جواباً ادھر ادھر ایسی نظروں سے دیکھا جن میں شر اور بزدلی دونوں ملی ہوئی تھیں، پانچ سال پہلے چائے کے تاجر نے اس کو رائے دی تھی کہ اپنا سونا "مسلم فوجیوں" یعنی بسماچیوں کے لئے اسلحہ خریدنے میں استعمال کرے۔

"آہ!" نعیمی نے کہا اور چاروں طرف ڈر ڈرکر دیکھا۔

"یہ آدمی بڑا لاپرواہ ہے، پاگل ہے، پاگل! آخر اس کے پاس کھونے کے لئے ہے ہی کیا!"

"مگر آپ نے تو بڑی احتیاط برتی!" بائے نے پراسرار طریقے سے سوچا۔

استاد کافی دبلا ہو گیا تھا، ایسا جیسے منڈی ہوئی بھیڑ، لیکن باتیں کیسی بناتا تھا! اس کے ایک ایک لفظ پر ہجوم اکٹھا ہو جاتے تھے، کسی کو بھلا یقین آ سکتا تھا کہ ۱۹۱۷ء میں اسی نعیمی نے پرانے شہر کے مسلمانوں کو اینٹوں والی مسجد میں جمع کرکے ان کو تقریباً بغاوت پر آمادہ کر ہی دیا تھا۔ اس وقت اس نے ہجوم کو کتنا متاثر کر دیا تھا۔ "مسلمانو، تم امیر ہو یا غریب، تمہارا آپس میں خون کا رشتہ ہے!" اور پھر اس نے ان سے اپیل کی تھی: "روسی حکومت مردہ‌باد! قوقان خود‌مختاری زندہ‌باد!" اس وقت وہ بہت کم‌عمر تھا لیکن بڑے بڑے باعزت علما، سفید عمامے‌والے، شریعت کے محافظ، اس کے سامنے جھکتے تھے۔

اب لوگوں کو وہ سب کچھ یاد نہیں تھا اور نعیمی کی حیثیت بس ایک معمولی استاد اور ایک روشن‌خیالی پھیلانے‌والے کی سی رہ گئی تھی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح حکومت کے لوگوں کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ اس کا ایسی جگہوں پر بھی خیرمقدم کیا جاتا تھا جہاں چائے کے تاجر کو اپنی ناک تک گھسانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ تو کیا یوں ہی سب باتیں کی جانی چاہئیں؟

نعیمی بھی روانہ ہونے کو تیار ہونے لگا۔ قدرت‌الله نے اسے زیادہ محبت کے ساتھ رخصت کیا بہ‌نسبت اس محبت کے جس سے اس کا استقبال کیا تھا۔ بلکہ اس نے تو ہڑیلے مقسوم کو ایک طرف ڈھکیل کر، لکڑی کا پھاٹک نعیمی کے لئے خود کھولا۔

اور پھر قدرت‌الله نے دیکھا کہ نعیمی نے ایک بار بھی پیچھے مڑکر نہیں دیکھا اور سڑک کے اس پار چلا گیا۔ کیا اس کی بھی ضرورت تھی؟ ایسا لگتا تھا کہ اب تو صرف ہڑیلا مقسوم وہ واحد آدمی ہے جسے بائے سے انس ہے، جو بائے کا وفادار ہے۔

بیٹھک میں واپس آکر قدرت‌اللہ نے عقلمند دکاندار کو بھی فوراً رخصت کر دیا اور اس نے بڑے وقت سے ایسا کیا کیونکہ اسی وقت قدرت‌اللہ نے صحن میں اپنے بیٹے نصرت‌اللہ کی آواز سنی۔

قدرت‌اللہ کا بیٹا سعادت‌مند نہیں نکلا تھا اور قدرت‌اللہ اسے پسند نہیں کرتا تھا۔

باپ کی پریشانیوں اور مشکلوں سے بیٹے کو نہ کوئی تعلق تھا، نہ دلچسپی اور باپ کو بیٹے کی دلچسپیوں اور مقاصد کی کوئی خبر نہ رہتی تھی۔ نصرت‌اللہ باپ کے دوستوں سے کنی کاٹتا تھا، اپنے دوستوں کو گھر لاکر باپ سے کبھی نہیں ملاتا تھا۔ نہ وہ اپنے باپ کے معاملات میں کوئی حصہ لیتا تھا، نہ بائے کو اس سے کسی فائدے کی امید تھی۔ اس نے باپ کی جائیداد اور دولت میں ایک پیسے کا اضافہ نہیں کیا تھا اور باپ کو شک تھا کہ وہ کبھی بھی ایسا کرے گا اسے تو بس پیسہ خرچنے کا شوق تھا اور اس لحاظ سے وہ اپنے باپ کے لئے نقصان ہی ثابت ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی بائے بڑی تلخی کے ساتھ سوچتا تھا کہ جو دولت اس نے زندگی بھر میں اکٹھا کی ہوی اور جسے پچھلے چند دشوار برسوں میں محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی وہ سب ایک نکمے اور بے وقوف آدمی کے ہاتھ لگے گی۔ قدرت‌اللہ کو پختہ یقین تھا کہ آج وہ مر جائے تو کل ہی، اس کا بیٹا ساری دولت ہوا پر اڑا دے گا، یہاں تک کہ قدرت‌اللہ خواجہ کے نیک نام کی یاد تک باقی نہیں رہ جائے گی بلکہ اس سے بھی زیادہ بری بات ہو سکتی تھی۔ یہ خراج لونڈا کہیں بازی لگا بیٹھے گا اور بائے کی ساری دولت ایک بار پانسہ پھینک کر لٹا بیٹھے گا۔ خدا نہ کرے!

"آؤ، اندر آ جاؤ منٹ بھر کو" قدرت‌اللہ نے بیٹھک کے دروازے پر ہی کھڑے کھڑے کہا۔ مگر اس کے بیٹے نے اپنا چیچک کے داغوں‌والا چہرہ گھمایا تک نہیں۔ اس کے چہرے پر اتنے داغ تھے کہ جیسے برف کے چھرے لگے ہوں۔

"نہ میں نے آپ کے ایک پیسے کو ہاتھ لگایا ہے، نہ آپ

کی کوئی چیز لی ہے" اس نے کہا اور اندر زنان‌خانے میں اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔

قدرت‌اللہ کی بیوی خاجاربی‌بی اپنے بیٹے سے بےحد لاڈ کرتی تھی۔ وہ کبھی یہ نہیں سوچتی تھی کہ وہ ذہین ہے یا احمق، کام کرتا ہے یا کاہل‌الوجود ہے، اس کو تو بس ایک ہی فکر کھائے جاتی تھی کہ بیٹا جوان ہو گیا ہے اور وقت آ گیا ہے کہ اب اس کے لئے ایک بیوی ڈھونڈ دی جائے۔ نصرت‌اللہ کو گھر سے جو کچھ بھی لگاؤ تھا وہ ماں کی اسی اندھادھند محبت کی وجہ سے تھا۔ وہ کبھی بھی اس قسم کے سوالات پوچھکر اسے پریشان نہیں کرتی تھی کہ تم کہاں گئے تھے یا تم نے کیا کیا یا تم کیا سوچ رہے ہو؟ بس نوکروں کی طرح بیٹے کے آگے پیچھے گھومتی، اس کی مرضی پوری کرکے خوش ہوتی، اسے دیکھ دیکھکر جیتی۔ اس کی ماں کی طرح تو کوئی بھی نہ اس کے نخرے اٹھاتا، نہ اس کی تعریفیں کرتا۔

"جاؤ بیٹے، اپنے ابا کے پاس جاؤ نا" اس کی ماں نے کہا۔ اسے یقین تھا کہ آخرکار بہو کے معاملے پر بات ہوگی، بیٹے کی شادی کا سوال اٹھے گا۔ واقعی ایک ہونہار فرزند اور محبت‌شعار باپ کے درمیان بھلا اس سے زیادہ اہم اور کون سا موضوع ہو سکتا تھا؟

نصرت‌اللہ نے عبا اٹھاکر ایک کندھے پر ڈالی اور ہچکچاتا ہوا اپنے باپ کی طرف بڑھا۔ ویسے اسے اس انٹرویو سے کوئی خاص نتیجہ برآمد ہونے کی امید نہیں تھی اور وہ بیٹھک کے ایک کونے کو بےمطلب گھورے جا رہا تھا۔ اس کی ناک پر کے چیچک کے داغ ہاتھی دانت کی طرح چمک رہے تھے، گالوں کی چوڑی چوڑی ہڈیاں کانوں تک ابھری ہوئی تھیں۔

"بیٹھ جا میرے پیارے بیٹے، بیٹھ جا، کچھ تجھے خبر ہے تیرے باپ پر کیا مصیبت ٹوٹ پڑی ہے؟"

خاجار بی‌بی ہاتھ میں ایک چلیم لئے اندر آئی۔ گفتگو شروع کرنے کے لئے چلیم سے بہتر بہانہ کیا ہو سکتا تھا۔

"اب اس بیچارے کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کے باپ کو کیا پریشانی ہے؟" خاجار بی‌بی نے خوشامدانہ لہجے

میں سیپ کی مونہال اپنے شوہر کی طرف بڑھاکر دیاسلائی جلاتے ہوئے کہا: "ویسے یہ احساس بہت ہے... ہم سب ایک ہی فکر میں تو مبتلا ہیں۔"

"اچھا تو پھر" بائے نے خاجار بی‌بی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "آج سے میں چاہتا ہوں کہ گھر کے اخراجات میں کفائت برتی جائے، یہ نہیں کہ ہر الٹے سیدھے آدمی کو بلاکر کھلانے لگو، یہ زمانہ فضول‌خرچی کا نہیں ہے۔"

خاجار بی‌بی نے سر ہلاکر خامی بھری اور جلدی جلدی میز پر سے نیم‌خوردہ شیرمالیں اور میٹھائیوں کے ٹکڑے ریزے صاف کرنے لگی۔

"آپ فکر نہ کریں، ابا، اس سب کا خیال ہم کو بھی ہے، بھلا آپ نے کیسے سوچا کہ ہم اتنے دن سے جس تقریب کا انتظار کر رہے ہیں اس کا انتظام ہم نہیں کر سکیں گے۔ بس آپ کی اجازت چاہئے..."

"یہ تم کہاں کی بات کر رہی ہو؟" بائے نے لہجے کو کھینچ‌کر متفکر آواز میں کبھی بیوی اور کبھی بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کون‌سی تقریب؟ کیسی اجازت؟"

خاجار بی‌بی میز پر جھکی کی جھکی رہ گئی، اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ سر اٹھائے۔ قدرت‌الله مکا تان‌کے اپنے بیٹے کی طرف بڑھا۔

"یہ سب کیا معاملہ ہے؟ تو کیا کرنے‌والا ہے، نکمے؟ تیرے باپ کو تو اتنی اونچ نیچ سے گزرنا پڑ رہا ہے! کوآپریٹو سارے کے سارے ماسکو کے سستے سامان سے بھرے پڑے ہیں، الماریوں کے تختے ان کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں۔ اور مصیبت ہے کہ مجھے کوئی پھٹیچر گاھک نہیں نصیب ہوتا، کوئی ٹٹ پونجیا تک نہیں ملتا، میرا "متا" تو کوئی ادھار نہیں لیتا۔ مجھے تو پتہ بھی نہیں چلے گا اور اپنی دکانیں بند کر دینی پڑیں گی... اور تو نکمے مست گھومتا پھرتا ہے، اپنے باپ کے لئے زھر ہے۔ تو اس کا دشمن ہے، تو اور سوچ کیا رھا ہے؟ بتا اس تیرے سر میں کیا بات چکر کاٹ رہی ہے؟"

نصرت‌الله نے اکتائی ہوئی نظروں سے باپ کو دیکھا،

ناک کھجائی، اس کی پتھرائی ہوئی سی آنکھوں میں فکر کا شائبہ تک نہ تھا۔ آخر وہ کیا سوچ رہا تھا؟ اہا۔ ہا، وہ کیا احمق تھا جو فکر کرنے لگتا، یہ دردسری تو اس کے باپ کی قسمت تھی، وہی سوچ رات دن، تبھی تو وہ اتنا کنجوس تھا اور اتنا لالچی۔

نصرت اللہ نے طے کر لیا تھا کہ اب کے وہ اپنے معاملے پر جم کے زور دے گا۔ وہ انتظار کرتا رہا کہ اس کا باپ کب ملامت بھرے الفاظ کے بوچھار کو روکے، پھر بڑی سستی اور ڈھٹائی کے ساتھ اطمینان سے بولا:

"آپ میرے لئے بیوی کب تلاش کر رہے ہیں؟"

بائے چیختے چیختے بے دم سا ہو کر پیچھے تکیوں پر گر گیا۔ اب بھلا ایسے بیٹے کو کوئی کیا کرے!

خاجار بی بی نے ہمت کی، ایک میٹھی مسکراہٹ اس کے زرد جھریوں پڑے چہرے پر آئی اور اس کی صورت باسی، سکڑے ہوئے خربوزے کی طرح لگنے لگی۔

"اتنے ناراض نہ ہوئیے، اپنے بیٹے سے بات کیجئے ٹھیک سے، اتنا تو وہ اچھا ہے، اسے بھی کچھ اپنی جوانی کا لطف لینے کی اجازت دیجئے، یہ دیکھ کر آپ کا دل نہیں دکھتا کہ وہ اپنی قوت برباد کرتا رہتا ہے؟"

بائے نے نفرت اور حقارت کے ساتھ تھوکا۔

"گھونگھے کی طرح منمنا مت! تو اس کی طاقت کو تو روتی ہے جو یہ آوارگی میں برباد کرتا پھرتا ہے، اور اپنے شوہر کے لئے کچھ محسوس نہیں کرتی؟ شوہر کی حالت پر تجھے افسوس نہیں ہوتا؟"

وہ یکایک سر پکڑ کر دوہرا ہو گیا اور کراہتے ہوئے اپنے سر کے پچھلے حصے پر مکے مارنے لگا۔

خاجار بی بی دہشت کے مارے اپنے میاں کی طرف دوڑی، نصرت اللہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

"بہرحال" وہ اکتائی ہوئی ڈھٹائی کے ساتھ بولا، "میں تو نعمانچہ کے مزدور صابر کی بڑی بیٹی سے شادی کروں گا۔"

اس اعلان سے میاں بیوی پر سکتہ طاری ہو گیا، دونوں کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ھائے میں مر جاؤں!" خاجار بی‌بی بچوں کی سی آواز میں چیخی۔ "وہ تو اناخان کی بیٹی ھے!"

بائے نے موقع محل کے وقار کے مطابق کندھے تانے اور شاھانہ انداز کے ساتھ دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"باھر نکل، نگھرا کتا! دور ہو میری نظروں سے! بدمعاش، اپنے سلسلۂ نسب کو بھول گیا، کتیا کا بچہ! نکل، دفع ہو!"

نصرت‌الله بڑے اطمینان سے اٹھا جیسے اسے صحن میں ذرا دیر کے لئے جانے کی ضرورت پیش آئی ہو۔ پھر وہ مڑا اور سکون کے ساتھ کمرے سے باھر نکل گیا۔ اس کی ماں روتی پیٹتی، ھاتھ ملتی اس کے پیچھے دوڑی۔

قدرت‌الله کی گالیوں کی آواز آتی رھی، مگر اس کی آواز میں غصے سے زیادہ حیرانگی تھی۔ "کیسا احمق ھے! آگ اور پانی کا ملاپ چاھتا ھے... ایسا کرنے سے تو میں اسے ذبح ہوتے دیکھوں تو زیادہ بہتر ھے، بھلا ایسے گنڈے سے آپ اور امید بھی کیا کر سکتے ھیں۔"

وہ برآمدے میں نکل‌کر سیڑھیوں پر بیٹھ گیا، اپنے عمدہ چمڑے کے جوتے پہنے اور مضطرب ہوکر چاروں طرف دیکھا۔ ھڑیلا مقسوم برآمدے کے سامنے کھڑے چاپلوسی کے انداز میں اپنی چھوٹی چھوٹی، سرخ سرخ آنکھیں جھپکا رہا تھا۔

"چاربازار اور قوش‌قاواق کی تمام دکانوں میں جاؤ" بائے نے حکم دیا۔ "اسٹالوں پر میں خود جاؤں‌گا، بس کافی کہنا سننا ہو چکا!"

اس نے اپنی بھاری کامدار ٹوپی کو چار تہہ کیا اور بغل میں دبایا، پھر کھونٹی پر لٹکتی بالدار ٹوپی پر سے اس نے ایک پرانی سیاہ ٹوپی اتاری، اسے دو بار اپنے ھاتھ پر جھاڑا اور پھر اس کی شکنیں دور کرکے اسے اپنی چندیا پر جما لیا۔

مگر اس سب سے بھی اسے اطمینان نہ ہوا!

"سنا تم نے! وہ میرے پیارے صاحبزادے نے کیا عمدہ انتخاب کیا ہے! ہائے کوئی احمق اپنے کو اتنا بھی ذلیل کر سکتا ہے! خدا نہ کرے کہ نعمانچہ میں کسی کو اس بات کی خبر ہو جائے، اس جھگڑالو بیوہ نے تو ویسے ہی میری زندگی میں زہر گھول رکھا ہے، ہائے اگر پرانا زمانہ ہوتا تو گندی جھاڑو سے اس کو یوں جھاڑ کر پھینک دیتا کہ پتہ نشان نہ ملتا۔"

ہمدردی میں ہڑیلے مقسوم نے ایک آہ تو بھری مگر قدرت اللہ کی امید کے بالکل خلاف ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

"مالک، میرا خیال ہے آپ اس عورت کے متعلق ذرا زیادہ احتیاط برتا کریں، کارخانے کی عورتیں اس طرح اس کا حکم مانتی ہیں جیسے حرم کی بیویاں سلطان کا۔ وہ کچھ کہتی ہے تو عورتیں اس سے بحث تو کرتی ہیں مگر آخر میں مانتی اسی کی ہیں۔ اب میں آپ کو بھلا کیا سمجھاؤں، آپ تو خود ہی سمجھدار ہیں، سب کچھ جانتے ہیں، تجربےکار ہیں۔"

قدرت اللہ غصے کے مارے کانپنے لگا: تو وہ یہ دیکھنے کو زندہ رہ گیا تھا! ایک ذلیل غلام، ایک حاشیہ‌بردار اس کی مخالفت کرے۔ بائے کا جی چاہا چیخے، تھوکے، مکا دکھائے مگر وہ کچھ نہ کر سکا۔

"آہ؟" وہ بےبس ہو کر بڑبڑایا۔

مقسوم اس کے سامنے بالکل جھک گیا، اگر اس کے دم ہوتی تو ہلانے لگتا۔

بائے سوچ میں ڈوبا اپنی ہڑیلی انگلیاں داڑھی پر پھیرتا رہا پھر چپ‌چاپ واپس بیٹھک میں آ گیا۔ ہڑیلا مقسوم بھی پنجوں کے بل چلتا، دبے پاؤں اس کے پیچھے آیا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا کیونکہ اسے محسوس ہوا کہ بائے کوئی اہم فیصلہ کرنے والا ہے۔

اسے کچھ ایسا لگا جیسے بائے کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک پرچھائیں دکھائی دی۔

"میری بیوی کو بلاؤ۔"

ہڑیلا مقسوم فوراً دروازے سے باہر بھاگا اور ایک ہی منٹ بعد خاجاربی‌بی اندر آئی۔

"جاؤ، اپنے بیٹے سے کہو، مجھے یہ رشتہ منظور ہے" قدرت‌الله نے حکم دیا۔

خاجار بی‌بی گھبراکے دوزانو ہو گئی۔

"ہائے میں مر جاؤں!.. اپنا ارادہ بدل دیجئے، اپنے بیٹے کی نسل کو خراب نہ کیجئے، کیا دوسری نیک لڑکیاں نہیں ہیں جو ہماری دہلیز پار کریں؟"

"مجھے جو کہنا تھا کہہ دیا! جاؤ، اپنے لاڈلے کا جی خوش کرو۔" خاجار بی‌بی کمرے سے بھاگ گئی اور قدرت‌الله نے ایک کینہ‌پرور قہقہہ لگایا۔

"کیوں؟ کیسی رہی؟" وہ ہڑیلے مقسوم کی طرف مڑکر بولا۔ "میں نے اجازت دے دی، سنا تم نے؟ شاید تم سمجھتے ہوگے کہ قدرت‌الله کا دماغ چل گیا ہے لیکن یہ غلط ہے! ابھی مجھ میں بہت دم ہے! اب میں اس بیوہ کو تگنی کا ناچ نچاؤں‌گا اور وہ ننھی بےبس چڑیا کی طرح میری مٹھی میں پھڑپھڑائےگی۔ قدرت‌الله خواجہ کے یہاں رشتہ کیا کوئی معمولی بات ہے! وہ تو سر کے بل دوڑتی آئےگی! اور اسے جیسے ہی اس بات کا پتہ لگے گا، اس کے سب خیالات ہوا پر اڑ جائیں گے۔ بھیک‌منگی... ارے، وہ تو ایک پیالے دلیہ پر کسی کوڑھی کو اپنی بیٹی بیاہ دےگی چہ‌جائیکہ ایسا خاندان اور اس کی دولت کے سارے دروازے اس پر کھل جائیں گے، وہ کیا کوئی احمق عورت ہے جو اپنا نفع نہیں جانےگی!"

"جی مالک، بیوقوف تو وہ بالکل نہیں" ہڑیلے مقسوم نے واضح شک کے ساتھ کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

قدرت‌الله نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔

"میرا وہ نیم پاگل آخر کسی کام آ ہی گیا!" بڑی خوشی اور مسرت سے اچھل‌کر بولا۔ "میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کسی بھی مصرف کا ہو سکتا ہے۔ وہ بڑی مشکل کے وقت باپ کی مدد کر رہا ہے..."

چھٹا باب

یہ سڑک جس پر اتنی آمد و رفت ہے، کسی زمانے میں مارکیٹ اسٹریٹ کہلاتی تھی۔ جہاں یہ ذرا چوڑی ہو کر گھوڑا گاڑی کے اڈے کے سامنے ایک چوک سا بناتی ہے، وہاں ایک سفید عمارت تھی جس کی اوپری منزل پر کھپریلی چھت کا ایک کمرہ تھا۔ ۱۹۱۶ء میں اس عمارت میں شہر کونسل کا دفتر تھا۔ بازار کے تمام اسٹال چاربازار منتقل کر دئے گئے تھے اور اس سڑک پر پتھر جڑ دئے گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ اسے پتھروالی سڑک کہتے تھے۔ پورے سال بھر تک، ایک سیاہ لوہے کا سائن بورڈ اس سفید بلڈنگ پر ٹنگا رہا جس پر لکھا تھا: "پرانے شہر کی کونسل"۔ یہاں تک کہ سائن بورڈ کا نشان پڑ گیا تھا۔ پھر اس عمارت میں اونچی سی ایک لکڑی کی تعمیر شامل کر دی گئی اور اس کے کھمبوں پر لال جھنڈے لہراتے دکھائی دینے لگے۔ بیچوں بیچ میں پلائی‌ووڈ کا ایک تختہ لگا تھا جو دھوپ سے اینٹھ گیا تھا اور جس پر لکھا تھا: "پرانے شہر کا زنانہ کلب"۔

آج کلب کے باہر بہت سے لوگ نظر آ رہے تھے۔ پرنجے ڈالے ہوئے عورتیں ٹولیوں میں ادھر ادھر کھڑی تھیں اور ان کے ساتھ ننگے پیر بچیاں اور الجھے الجھے بالوں‌والے ننھے منے لڑکے ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے تھے، خوانچہ‌والے گھر کی بنی مٹھائیاں لئے صدائیں دے رہے تھے۔ وہ تو ہر اس جگہ پہنچ جاتے تھے جہاں بھیڑ اکٹھی ہو جائے۔

کلب کے اندر بھی کافی بھیڑ تھی۔ عورتیں اپنی نقابیں گھٹنوں پر رکھے، پاس پاس قطاریں باندھے، بنچوں پر بیٹھی

تھیں، کچھ دروازے کے پاس اور کچھ دیواروں سے لگی کھڑی تھیں، الٹی ہوئی نقابیں ان کے سروں پر پڑی تھیں۔

نوعمر لڑکیاں ہنس بول رہی تھیں اور دوتارے کے تاروں کا ہلکا ہلکا نغمہ سنائی دے رہا تھا۔

ہال کے اس سرے پر، لال کپڑا پڑی ہوئی میز کے بائیں طرف سے کلب کے دفتر میں دروازہ کھلتا تھا جو اس وقت کھلا ہوا تھا۔ دفتر میں موسیقی اور کشیدہ‌کاری کے حلقوں کی رہنما عورتیں اور ضلعے کی تمام سرگرم کارکن عورتیں موجود تھیں۔ ٹیچر نعیمی بھی ان ہی میں تھا۔

جوراخان کو عورتیں گھیرے ہوئے تھیں، سب ہی کو کوئی نہ کوئی ضروری کام تھا جو فوراً طے ہونا تھا، سب ہی پریشان اور جلدی میں تھے۔ صرف جوراخان پر سکون طاری تھا۔ پل بھر کی فرصت نکال کر اس نے اناخان کو اپنے پاس بلایا۔

"نعمانچہ کی عورتیں کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"یہاں ہیں بہن جوراخان، رضوان خالہ تو قمری کو لے آئی ہے، صرف نزاکت اور دو اور عورتیں ابھی نہیں آئی ہیں۔"

"نزاکت کہاں ہے؟ اس کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔"

نعیمی بڑی خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ اپنے سونے کے دانت چمکاتا ہوا بیچ میں بولا:

"اب مجھ سے یہ نہ کہئے گا کامریڈ جوراخان کہ آپ کو اب بھی اطمینان نہیں ہے۔ دیکھئے، آج تو ہمیں کتنی زبردست فتح حاصل ہوئی ہے! مجھ میں اب ذرا بھی سکت نہیں رہی، صبح تڑکے سے یہاں آیا ہوا ہوں۔ یقین مانئے، مجھے تو نہایت سنسنی‌خیز قسم کی خوشی محسوس ہو رہی ہے..."

"استاد محترم، آپ اپنی صحت کا خیال نہیں کر رہے ہیں" جوراخان بڑے روکھےپن سے بولی اور پھر وہ باقی عورتوں سے مخاطب ہو گئی: "حفیظہ‌خان، وہ تصویر کا کیا ہوا؟ تیار ہے وہ تصویر؟"

ایک چھوٹے سے قد کی، چھائیاں پڑی صورت والی عورت نے اپنا لال پرنجے اتار کے طاق پر پھینکا اور جلدی سے جاکر دوسرے کمرے سے ایک عورت کی تصویر لے آئی۔ تصویر میں اس عورت کے بال سفید تھے مگر آنکھیں جوان اور چمکیلی نظر آ رہی تھیں۔ تصویر پر پھولوں کے ہار پڑے تھے۔ جوراخان نے اظہار پسندیدگی کے طور پر سر ہلایا اور تصویر ہال میں لے جائی گئی۔

نعیمی ایک جوان عورت کے پاس پہنچا جو کمرے کے ایک کونے میں آرام کرسی پر بیٹھی تھی، اور اپنے کمر کے پٹکے کے پھندنوں سے کھیلتے ہوئے اس سے بڑے دلار کے انداز میں بولا:

"آپ نے کیا یہی فیصلہ کر لیا ہے کہ پیرس کی تمام حسیناؤں کو مات دے کے چھوڑیں گی۔ ایں خانم؟"

اس خانم کا لباس باقی تمام عورتوں سے مختلف تھا۔ وہ سبز زیتونی رنگ کا چھوٹا، چست فوجی کوٹ پہنے ہوئے تھی جس کے کالر کھڑے ہوئے تھے اور ایک چوڑی پیٹی کس کر اس کی کمر میں بندھی تھی۔ اس کا اٹنگا اسکرٹ گھٹنوں سے بھی کہیں زیادہ اوپر تھا اور اس قدر چست کہ لگتا تھا ایک ایک سیون بس اب ادھڑ جائے گی۔ بال چھوٹے کٹے ہوئے مردوں کی طرح، سر پر جاکیوں (ریس کا گھوڑا دوڑانے والے سوار) کی سی ٹوپی جس میں ایک لمبا سا طرہ لگا تھا، بڑے بانکے زاویے کے ساتھ رکھی تھی، ہونٹوں پر چیختی ہوئی لپ اسٹک بڑی بے حیائی کے ساتھ لگی تھی مگر وہ گرمی کے مارے جگہ جگہ سے تڑخ بھی گئی تھی اور سیاہ بھی ہو گئی تھی۔

"ایسا لگتا ہے کہ انتظار کرتے کرتے آپ بھی پریشان ہو گئی ہیں" نعیمی نے اپنی جیب گھڑی کا ڈھکن کھٹ سے بند کرتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ گھڑی میں چاندی کی ایک لمبی زنجیر لگی ہوئی تھی۔ "چلئے، ذرا ٹہلتے چلتے ہیں۔"

دونوں ہال میں گئے۔

خانم کے اونچے اونچے بوٹ اس کے گداز پنڈلیوں پر خوب کسے ہوئے تھے اور چلتے میں چرچراتے تھے، چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی وہ بڑی ادا سے جھومتی چلی جا رہی تھی۔ نعیمی اس کی بانہہ پکڑے تھا، کندھے سے کندھا ملائے وہ گلیارے میں سے گزرے جہاں خوب بھیڑ تھی۔ اور پھر لال کپڑا پڑی ہوئی میز کے پیچھے سے گزرکر پورے ہال سے ہوکر نکلے۔ وہ آہستہ آہستہ بات کر رہے تھے اور ایک دوسرے کی طرف بڑے پیار سے کن‌انکھیوں میں دیکھتے جاتے تھے۔ اپنی باتوں میں وہ اس قدر محو تھے کہ انہوں نے یہ بھی غور نہیں کیا کہ چاروں طرف کیا ہو رہا ہے۔

یکایک ایسا سناٹا چھا گیا جیسے سارا ہال خالی ہو گیا ہو، پھر کچھ کھسر پھسر ایسی سنائی دی جس میں تعجب ہو۔ بنکروں اور مزدوروں وغیرہ کی بستیوں سے آئی ہوئی عورتوں نے گھبراکر اپنے منھ پھیر لئے، یہاں تک جو عورتیں نعیمی کے کلاس میں اس سے پڑھتے وقت اپنا منھ کھول دیتی تھیں، وہ بھی ڈر اور شرم سے آہیں بھرنے لگیں جیسے کہہ رہی ہوں: "ہائے، میں مر جاؤں"۔ اور پیچھے کی ہوئی نقابیں پھر منھ پر ڈال لیں۔ سب سے اگلی قطار میں پرنجے ڈالے ہوئے ایک عورت نے اپنی لڑکی کے ماتھے پر تڑ سے ایک طمانچہ مارا کیونکہ وہ خانم اور نعیمی کو ایک ٹک گھورے جا رہی تھی۔ ماں اٹھی اور ان دونوں کی طرف پیٹھ کرکے بیٹی سے باتیں کرنے لگی۔

جب اناخان ہال میں آئی تو پرنجے پہنے ہوئے ایک عورت نے اس کا راستہ روکا۔

"اناخان بیٹی، میں تو گھر جا رہی ہوں۔"

اناخان نے اس کی آواز سے پہچانا کہ وہ قمری ہے۔

"ارے، کیوں؟"

"وہ بچوں کو گھر چھوڑ آئی ہوں نا، اور پھر میرا آٹا بھی گندھا رکھا ہے۔"

"نہیں، نہیں، واہ، آپ کیسے جائیں گی، میٹنگ اب

شروع ہی ہونےوالی ہے، پھر ہم دونوں ساتھ ہی چلیں گی، اتنا پریشان نہ ہوئیے، یہاں رکی رہئیے، میں ابھی آئی۔"

اناخان نے اس جوان عورت کو اشارے سے بلایا جو فوجی چست کوٹ پہنے نعیمی کے ساتھ گھوم رہی تھی اور اسے جوراخان کے پاس لے گئی۔

"کیوں، اس کا کیا مطلب ہے؟ تمہارے محلے سے کوئی عورت کیوں نہیں آئی؟" جوراخان نے پوچھا۔

"میں نے تو ہر ایک سے کہہ دیا تھا" خانم نے منھ بناتے ہوئے نخرے کے ساتھ جواب دیا۔ "میں نے ان کو سمجھایا بجھایا، کہا سنا، خفا بھی ہوئی... میں تو اس پوری تحریک سے پاگل ہو گئی کامریڈ جوراخان۔ مجھ سے تو ہر ایک ہی نے وعدہ کر لیا تھا کہ آئیں گے... میرے تو خود ہی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔"

"میری بات سنو" جوراخان نے اس کو غصے اور ناپسندیدگی کے ساتھ سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ "عورتیں تمہارے کہے کی پروا نہ کریں گی۔ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ پھر تم کھیتوں میں پرندوں کو ڈرانے کے پتلوں جیسے وہی کپڑے پہن کر آئیں؟ کیا عورت کی آزادی اسی میں مضمر ہے؟ فوراً گھر جاؤ، ابھی اور کوئی معقول لباس پہن کر آؤ۔ میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ اب کبھی کلب میں یہ بےحیائی کا لباس پہن کر نہ آنا۔ سمجھیں؟"

"آپ مجھے حکم دے رہی ہیں؟ کیا آپ میری مرحومہ ساس کی جگہ لینے کی کوشش کر رہی ہیں، جوراخان آپا؟"

جوراخان نے پرسکون اور تحکمانہ انداز میں ہال کی طرف اشارہ کیا۔

"ہال میں محنت‌کش عورتیں جمع ہیں۔ وہ سب تمہاری ساسیں ہیں! میں تمہیں کہے دیتی ہوں کہ اگر تم نے میرا حکم نہ مانا تو ہم لوگ تمہاری ایسی بھد اڑائیں گے سب کے سامنے کہ تم یاد رکھوگی اور اگر تم کو واقعی اپنی عزت کا خیال ہے، تم آبرودار عورت ہو، تو ہمیں ایسا کرنے پر مجبور نہ کرو۔"

اس خانم نے کچھ جواب نہیں دیا، بس نگاھیں جھکاکر ایک طرف کو چلی گئی۔ جوراخان کچھ کارکنوں کے ساتھ، ان کے آگے آگے چلتی ہوئی ھال میں داخل ہوئی۔

وہ سب میز کے پاس بیٹھیں اور نعیمی میز کے ایک طرف بیٹھا۔

ان کے آتے ھی ھال کا موڈ ایک دم بدل گیا۔ سب ھی نگاھیں اشتیاق سے جوراخان کو تکنے لگیں، بہت سی عورتیں تو کرسی سے آدھی اٹھکر یا گردنیں کھینچ کھینچ کر جوراخان کو اچھی طرح دیکھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ ان عورتوں کی حالت ایسے افراد کی سی تھی جو بےآب و گیاہ تپتے ہوئے صحرا میں سفر کرنے کے بعد نخلستان کے قریب پہنچ رہے ہوں۔

کئی ایک عورتیں جوراخان کے کارناموں سے واقف تھیں۔ تیسری قطار میں سرخ پرنجے ڈالے ایک عورت تھی جس کا نام حفیظه تھا۔ اس زمانے میں عورت کے لئے سرخ پرنجے ڈالنا ایسا ھی تھا جیسے انقلاب کے برسوں میں مرد لوگ ٹوپی پر سرخ ستارہ لگا لیا کرتے تھے۔ جب حفیظه کے ظالم شوھر اور سسر نے اس کو بدنام کیا تو جوراخان عدالت میں گئی تھی اور پورے ایک گھنٹے تک حفیظه کی وکالت میں تقریر کی تھی اور اب دو سال سے حفیظه اسی لئے سرخ نقاب پہنتی تھی کہ لوگ دیکھ لیں اسے کس نے بچایا تھا۔

میز کے اوپر جو تصویر لگی تھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جوراخان نے تقریر شروع کی:

"میری دوستو، اس تصویر کو دیکھو، تمھیں پته ھے ھم نے اسے پھولوں کے ھاروں سے کیوں سجایا ھے؟ یہ عورت ایک کمیونسٹ ھے اور ھماری بہن ھے، اور اس کا بھیجا ہوا ایک خط ھمیں آج ھی ملا ھے۔ اب میں ان لوگوں کو جو ابھی تک اسے نہیں جانتے، یہ بتاتی ھوں کہ یہ کون ھے۔ یہ ھماری عزیز بہن کلارا زیٹکن ھے، ولادیمر ایلیچ لینن کی وفادار مددگار اور منزل کی طرف ان کی ھمسفر!"

لینن کی مددگار! عورتوں کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کوئی عورت کیسے یہ مقام حاصل کر سکتی ہے اور اگر یہ معجزہ ہونا ممکن ہو سکتا تھا تو پھر اس کا مطلب یہ تھا کہ دنیا میں عورت کوئی بھی کام کر سکتی ہے، کچھ بھی کر سکتی ہے۔

جوراخان کلارا زیٹکن کے متعلق تقریر کرتی رہی۔ کتنی شاندار، کتنی باہمت اور عقلمند تھی مگر وہ کتنی دور تھی اور تصور بھی پوری طرح اس کی عظمت کا احاطہ نہیں کر سکتا تھا لیکن سامعین، بوڑھی اور جوان سب ہی سامعین خود جوراخان کے متعلق سوچ رہی تھیں۔ جیسے ہال میں سب ہی عورتیں ازبیک تھیں ویسے ہی جوراخان بھی تھی لیکن اس کو ایسی مسرت حاصل ہو گئی تھی جیسی صرف پریوں‌والی داستانوں میں جادو سے حاصل ہوتی ہے۔ یعنی اس نے لینن کو بچشم‌خود دیکھا تھا، ان سے ہاتھ بھی ملایا تھا۔ جوراخان کے چہرے پر نظر ڈالنے اور اس کی آواز سننے سے عورتوں کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ان مسرت کے لمحوں کو پھر سے محسوس کر رہی ہے۔ ۱۹۲۱ء میں جب جوراخان ماسکو سے واپس آئی جہاں وہ عورتوں کی ایک کانفرنس میں شریک ہونے گئی تھی تو شہر کے کونے کونے سے لوگ جوق در جوق جمع ہو گئے تھے اس عورت کو دیکھنے جس نے لینن سے گفتگو کی تھی۔ اس وقت بھی سامعین بڑے اعتماد اور شوق کے ساتھ اس کی تقریر سن رہے تھے، کوئی ایک بھی دل بےاعتنائی سے نہیں دھڑک رہا تھا۔

"ازبیکستان کی پیاری عورتو..." جوراخان نے کلارا زیٹکن کا خط پڑھنا شروع کیا۔ "وسط ایشیا کی مختلف قوموں کی عورتوں نے جو تمہاری ہی بہنیں ہیں، سوویت ری‌پبلک کی اہمیت کو سمجھ لیا ہے، انہوں نے جان لیا ہے کہ یہ ری‌پبلک ان کو انسانی عزت اور مسرت دینے کے لئے کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ حیات عامه کا شاید ہی کوئی میدان ایسا ہو جس میں وسط ایشیا کی عورتوں نے، محنت‌کشوں اور کسانوں کی ہماری اس ری‌پبلک میں کمیونزم کی تعمیر میں

ھاتھ بٹانے کے لئے اپنے عزم مستحکم اور اپنی صلاحیت کا ثبوت نہ دیا ہو... تم بھی اپنے دلوں کی تمام گرمجوشی، اپنی روحوں کی تمام پاکیزگی اور اشتیاق، اپنی قوت ارادی۔ وہ سب کچھ جو تم میں ھے سوویتوں کی ری پبلک کے تحفظ اور کمیونسٹ جذبے کے ساتھ اس کی تکمیل کے لئے نچھاور کر دو...“

”نہایت درست“ نعیمی نے کرسی سے ذرا سا اٹھکر اپنی اھمیت جتاتے ھوئے کہا۔

لیکن جوراخان نے جیسے اس کی بات سنی ھی نہ ھو، بھوئیں تک نہیں ھلائی۔ اور تمام ھی سامعین نے اس بات کو دیکھا اور محسوس کیا۔ جوراخان تھی بڑی بہادر! اچھا کیا جو ٹیچر کو سبق سکھا دیا۔ آخر اسے بیچ میں بول پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ تو عورتوں میں آپس میں بات چیت ھو رھی تھی اور بالکل ایک دوسرے کے دل کی باتیں تھیں، عورتوں کو اس مرد کی واہ واہ کی کیا ضرورت تھی!

بہن کلارا اور بہن جوراخان نے تو عورتوں سے مخاطب ھوکر کہا تھا کہ وہ روسی عورتوں کے نقش قدم پر چلیں، پھر اس نے اپنی دوست صوفیہ ندیژدینا کا ذکر کیا جو ایک روسی انقلابی کی بیٹی تھی، بڑی دور سے آئی تھی اور اسی شہر کو اب اس نے اپنا وطن بنا لیا تھا۔ وہ ازبیک عورتوں کو عمدہ قسم کی بنکر بننا سکھائے گی، ایک نئے ھی انداز سے زندگی بسر کرنے کی تعلیم دے گی۔

”تو پیاری دوستو، اب بتاؤ، تم اپنے دل کی بات بتاؤ“ جوراخان نے کہا۔ ”کلارا زیٹکن کو ھم کیا جواب لکھیں گے؟“

عورتیں خاموش رھیں، صرف کسی کی گود کا بچہ ٹھنٹھنانے لگا۔

”مجھے اجازت دیجئے!“ نعیمی بڑے جوش سے بولا اور پھر اس نے دونوں بازو بلند کر دئے کہ ظاھر ھو کلارا زیٹکن کے خط نے اسے کس درجہ متاثر کیا تھا۔

لیکن جوراخان نے اسے روک دیا۔

”نہیں۔ پہلے ھمیں عورتوں کی بات سننا ھے۔“

ہال بھر میں تعریف و تحسین میں کھسرپھسر ہونے لگی۔
جوراخان نے اپنے پاس بیٹھی عورت کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ساتھیو، کہئے تو ہم اناخان سے درخواست کریں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر شرما رہی ہے، ہم اسی سے پوچھتے ہیں۔"

پہلے تو ڈائس پر بیٹھی عورتوں اور پھر ہال بھر میں جمع عورتوں نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ اناخان آہستہ سے اپنی کرسی سے اٹھی، وہ کبھی لال پڑتی تھی، کبھی زرد اور پھر اشتیاق بھری خاموشی میں اس نے بےربطی سے بولنا شروع کیا:

"مجھے تو تقریر کرنا نہیں آتا، میں تو کبھی نہیں بول سکتی مگر یہ خط، یہ اتنا اچھا خط ہے... اتنا خوبصورت جتنا وہ گیت جو میری بچی گاتی ہے، اگر میں کچھ ٹھیک سے نہ بول پاؤں تو آپ لوگ مجھے معاف کیجئے گا مگر ہم لوگوں کو تو کسی نے آج تک اتنا اچھا خط نہیں لکھا..."

سب عورتیں سانس روکے سن رہی تھیں۔ یہ ایک معمولی بنکر عورت تقریر کر رہی تھی، ایک بیوہ، ایک ماں! بےشک وہ شرما شرماکے بول رہی تھی مگر بولی تو سہی اور عورتیں اس کو اسی حیرت سے تک رہی تھیں جس سے وہ جوراخان کو دیکھ رہی تھیں۔ اناخان بھی اس بات کو محسوس کر رہی تھی اور اس احساس سے اسے کچھ بڑھاوا مل رہا تھا۔

"مگر ساتھ ہی میں یہ بھی کہوں گی کہ ہم تعمانچہ کی بنکر عورتیں کوآپریٹو میں کام کرنا چاہتی ہیں اور میں آپ کو بتاتی ہوں کہ ہم کیوں ایسا چاہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جب تک ہم قدرت‌اللہ کے لئے کام کرتے رہیں گے اس وقت تک ہم سوویت ری‌پبلک کی کیسے مدد کریں گے۔"

نعیمی جس کرسی پر بیٹھا تھا وہ ایک بار زور سے چرچرائی اور اس کا پول کھل گیا کہ وہ پھر پہلو بدل‌کر اٹھ رہا تھا اور وہ اٹھ ہی گیا اور جلدی سے زور سے بولا: "بالکل درست!"

"ہم سات عورتیں ہیں اور ہم ساتوں کوآپریٹو میں کام کرنا چاہتے ہیں اور ہم یہ بھی چاہیں گے کہ آپ بہن کلارا کو جو بھی خط لکھیں اس پر ہم ساتوں بھی دستخط کریں۔"

قمری کی مخالفت کرتی ہوئی آواز ہال میں گونجی:

"کیوں، سات کیوں بیٹی، آٹھ لکھو!"

"آٹھ کیوں؟" پھر اور آوازیں گونجنے لگیں۔ "اور بھی بہت سی عورتیں دستخط کرنا چاہتی ہیں۔ آخر خط تو انہوں نے سب ہی عورتوں کو لکھا ہے..."

اناخان مسکرانے لگی۔ سب عورتیں ایک ساتھ باتیں کرنے لگیں جیسے وہ نعمانچہ میں، کارخانے میں بھی کیا کرتی تھیں!

خالہ رضوان اپنی چادر اور پرنجے بغل میں دبائے؛ پیچھے کسی قطار سے اٹھی اور آگے آ بیٹھی۔ اور پھر اٹھکر اسٹیج کی طرف گئی اور میز کے پاس پہنچ کر مڑی اور سامعین کا سامنا کرتے ہوئے، اونچی تیز آواز میں کہنے لگی تاکہ سب سن سکیں:

"لڑکیو، شکوہ شکایت سے کچھ نہیں ہوگا، مجھ بڑھیا کی بات سنو، میں اتنی بوڑھی ہوں مگر اس جلسے میں آئی ہوں لوگوں نے میرے متعلق کچھ باتیں بھی اڑانی شروع کر دی ہیں۔ آپ نے سنا کہ نعمانچہ کی آٹھ بنکر عورتیں کوآپریٹو میں شامل ہونا چاہتی ہیں، تو میں ان میں سے دوسری ہوں اور اناخان پہلی ہے۔ تو یہ ہے میری حقیقت اور اب میں کچھ بات کہنا چاہتی ہوں۔ ایک بوڑھی عورت کی بات پرانے زمانے کے بارے میں۔ ہنسئے مت! جوراخان نے آپ کو ابھی اس عورت کا حال بتایا جس کی یہ تصویر ہے..." اور خالہ رضوان نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ "ذرا سوچئے تو سہی یہ اتنی دور رہتی ہے، پھر بھی اسے معلوم ہے کہ یہاں کی عورتیں، ہم لوگ، کس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس نے ہمیں سلام بھیجا ہے۔ جوراخان نے بہن صوفیہ کا بھی ذکر کیا۔ ہم سب ان کو جانتے ہیں، ان کا احترام کرتے ہیں، لیکن میں اس وقت آپ کو جوراخان کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں۔ میں جب بھی اسے دیکھتی ہوں پرانے زمانے کی یادیں میرے ذہن پر ہجوم کرتی ہیں۔ کوئی نو سال ہوتے ہیں جب جرمن

زار کے خلاف جنگ جاری تھی تو اسی مارکیٹ اسٹریٹ میں ایک ایسا واقعہ ہوا تھا جسے میں کبھی بھول نہیں سکتی۔ اسی مکان کی کھڑکی کے بالکل نیچے وہ واقعہ ہوا، اسی مکان کے جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہیں، زار نے ہم سے ہمارے شوہر، بیٹے اور داماد چھیننے شروع کر دئے تھے۔ پرانے شہر کی ہر عورت لکڑیاں، لاٹھیاں، کریدے اور چمٹے لےکر مارکیٹ اسٹریٹ کی طرف دوڑ رہی تھی۔ یہ مکان "آفس" کہلاتا تھا اور یہاں پولیس تھی اور پولیس باہر نکلی اور قطاریں بناکر ہمارے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ ہم چیخ رہے تھے کہ ہم ان کو اپنے بیٹے نہیں دیں گے اور اگر وہ لئے ہی جا رہے ہیں تو ہم کو اتنا تو بتائیں کہ ایسا کرنے سے کس کو فائدہ ہوگا۔ پولیس‌والوں میں سے ایک لال صورت‌والا آدمی تھا، اس کے بڑی بڑی مونچھیں تھیں، سارا شہر ہی اس کو پہچانتا تھا، جانتا تھا، اسے موت آئے! اس نے ہمیں مکا دکھاکر دھمکی دی، کھنے لگا: "میں تمھیں بتاتا ہوں کس کو فائدہ ہوگا! پھر عورتوں نے کھڑکیوں پر پتھر پھینکنے شروع کئے اور پولیس‌والوں پر ڈنڈے برسانے لگیں۔ بس ایسا منظر تھا کہ میں آپ کو کیا بتاؤں! پھر اس مونچھیل نے اپنا ایک بازو اٹھایا اور پکارا: "تیار!" اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر ہم نہیں ہٹیں گے تو گولی چلے گی ہم پر اور واقعی سب پولیس‌والوں نے بندوقیں اٹھاکر ہم پر نشانہ لگایا۔ عورتیں گھبراکے پیچھے ہٹیں، بہت سی تو بھاگ لیں لیکن ان میں سے ایک نے اپنی نقاب یوں اٹھائی اور کھلے منھ آگے بڑھی۔ سب سے آگے! اس کا سینہ تنا ہوا تھا، پیٹھ بالکل سیدھی تھی اور وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی اور پھر وہ پولیس‌والوں کے بالکل پاس پہنچ گئی یہاں تک کہ ان کی بندوقیں بالکل اس کا نشانہ باندھنے لگیں۔ افوہ! کس قدر دہشت تھا! لیکن وہ عورت کسی بات سے نہیں ڈری اور اس نے صدا دی۔ اس کی آواز کتنی اونچی، کتنی صاف تھی! "بزدلو، تمھاری ہمت ہے کہ تم گولی چلاؤ! یہاں مفت کے کھانے کھاکر بجوؤں کی طرح کپا ہو رہے ہو تو یہی بہتر ہے کہ تم اپنی اس خونی جنگ میں کیوں نہیں چلے جاتے،

اپنے زار کے پاس۔ کس سے لڑ رہے ہو؟ کمزور اور بےبس عورتوں سے؟ بےشرم مردو، جھکاؤ اپنی بندوقیں!"

"مجھے ایک ایک لفظ ایسا یاد ہے جیسے اس عورت نے ابھی ابھی وہ الفاظ کہے ہوں۔ اور کیا آپ سوچ سکتے ہیں کیا ہوا؟ سولہ کے سولہوں پولیس‌والوں نے اپنی بندوقوں کی نالیں زمین کی طرف الٹی کر دیں۔ وہ مونچھیل غصے کے مارے تقریباً پھٹ پڑا۔ اس نے اپنے آدمیوں پر چیخنا شروع کیا، ان کو گالیاں دینے لگا اور نہ جانے کیا کیا اور پھر گھڑسواری کی چابک سے ان کو مارنے بھی لگا۔ اس درمیان ہم لوگوں نے دفتر کو گھیر لیا۔ اس عورت نے پولیس‌والوں کی طرف پیٹھ کر لی اور جب وہ ہماری طرف مڑی تب ہم نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں! آپ سنتیں تو بس سنتی ہی رہ جاتیں کہ کس طرح اس نے کہا: "پیاری ماؤں اور بہنو، اپنے شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کو ہرگز اس خونی جنگ کی بھٹی میں جھونکنے نہ دینا، ہرگز انہیں نہ جانے دینا!"

"اس مونچھیل نے اور دوسرے پولیس‌والوں نے اس عورت کو پکڑ لیا، اس کی مشکیں کس دیں اور اسے گھسیٹتے ہوئے دفتر کے اندر لے گئے، پھر گھڑسوار فوجی ادھر سے ادھر گھوڑے دوڑاتے ہوئے، ہم پر لاٹھیاں چلانے اور ہمیں کچلنے لگے اور میں نہیں بتا سکتی کہ میں کیسے زندہ واپس گھر پہنچی۔ لیکن آج جب میں نے جوراخان کی تقریر سنی اور اس کو یہاں، اس سرخ میز کے پاس بیٹھے دیکھا، تو مجھے بےساختہ وہ دن یاد آیا اور وہ عورت یاد آئی جو پولیس‌والوں کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ دیکھئے، آپ میں سے ایک ایک دیکھئے، یہی ہے وہ عورت! یہی ہے وہ عورت جس کے متعلق میں نے ابھی آپ کو بتایا۔ وہ عورت جوراخان ہی تھی۔ ہاں، میرے بچو، وہ یہی تھی..."

اور خالہ رضوان کے رخساروں پر آنسو بہنے لگے، اناخان نے جوراخان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں.. اور خالہ رضوان دیر تک اپنے آنسو پونچھتی رہی اور سب، پورا ہال خاموش رہا، انتظار کرتا رہا کہ وہ ذرا اپنے جذبات کو قابو میں کر لے۔

"آپ سب ہی لوگ غالباً سوچ رہی ہوں گی کہ اب میں کیا کہوں گی؟" رضوان نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تو مجھے بس اتنا ہی کہنا ہے کہ جوراخان ہم سے جو کہے ہم وہی کریں تو ہم بالکل صحیح بات کریں گے اور ہم سے کوئی غلطی سرزد نہ ہوگی۔ میری بچیو، جوراخان خود لینن سے مل چکی ہے، اس نے لینن سے ہاتھ ملایا ہے اور اس لئے اس کا ہاتھ مبارک ہے اور پاک ہے۔ اور اب میں آخری بات یہ کہوں گی کہ آپ بوڑھی عورتوں کا دل نہ دکھائیں ان کا بھی نام لکھ لیں اور ان کو بھی کوآپریٹو میں شریک ہونے کی اجازت دے دیں۔ ہم لوگ جانتے ہیں پرانی زندگی کیسی تھی اور ہم بھی نئی زندگی دیکھنا چاہتے ہیں۔"

ہال میں جوش و خروش پھیل گیا، خوشی بھری آوازیں اور اشتیاق بھری نعرے لگنے لگے۔

"ہم بھی شریک ہوں گے، ہم نے بھی تو پرانی زندگی دیکھی ہے، واہ، ہم نئی زندگی نہ دیکھیں؟"

پھر ایک لڑکی تیز تیز چلتی ہوئی آئی اور میز کے پیچھے سے گھوم کر جوراخان تک پہنچی اور اس نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ جوراخان نے ذرا متفکر انداز میں بھوئیں سکوڑیں۔ شہری کمیٹی سے کوئی قاصد آیا تھا اور اس سے کچھ بات کرنے کو رکا ہوا تھا۔ اسے چند منٹ کے لئے ہال سے جانا پڑا۔ جوراخان کرسی سے اٹھی اور لڑکی کے پیچھے پیچھے اسٹیج کی بائیں طرف، کمرے میں چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی فوراً نعیمی نے اسٹیج پر قبضہ کر لیا۔ اب تک تو ہر تقریر کرنے والا نیچے رکھی میز کے برابر کھڑا ہوکر تقریر کر رہا تھا مگر نعیمی کے لئے ضروری تھا کہ وہ اچک کر اسٹیج کے اوپر چڑھ جائے۔ اس نے اپنی چاندی کی لمبی زنجیروالی جیبی گھڑی نکالی، ہاتھ میں اسے ایسے اچھالا جیسے اس کا وزن کر رہا ہو۔ پھر بڑی شان کے ساتھ کھٹ سے اسے کھول کر سامنے رکھ لیا۔ لٹکے ہوئے پیرافین سے جلتے لیمپ کی روشنی میں اس کی منڈی ہوئی چندیا چمک رہی تھی۔

"میری غریب، میری پیاری ماؤں!"

ہال میں فوراً خاموشی چھا گئی۔

"ہم سوویتوں کے بڑے مشکور ہیں کہ انہوں نے ہمیں روشنی دکھائی۔ اب وقت آ پہنچا ہے کہ ہم اپنی مدتوں پرانی جہالت کو جڑ سے اکھاڑ دیں کیونکہ آزادی کے دور کی صبح آ پہنچی ہے! ہم لوگ جو سائنس کے پھولوں کے باغ یعنی روشن‌خیالی کے علمبردار ہیں، نہایت تلخی اور آفسوس کے ساتھ تمہارے مرجھاتے ہوئے چہروں کا تصور کرتے ہیں۔ ان مصیبتوں کے بارے میں سوچتے ہیں جو پرنجے کی لائی ہوئی ہیں۔ کتنی بدنصیبی کی بات ہے کہ اب بھی ہم میں ایسے کمزور اور بےبس لوگ موجود ہیں جو اپنے باپ دادوں کے وراثت میں پائے ہوئے، فرسودہ رسم و رواج کے غلام ہیں۔ ہمیں ان رسموں، ان دستوروں کو یک‌قلم موقوف کرنا ہے! مثلاً دیکھئیے کہ ابھی تک کچھ عورتیں اپنے شوہروں اور سسر لوگوں کے حکم پر کیسا دوڑتی ہیں... وہ اپنے منھ پرنجے سے ڈھکتی ہیں۔ سوچئیے اب ہم کس دور میں آ پہنچے ہیں! اور اس دور میں یہ کتنی شرمناک بات ہے۔ سوویت زمانہ اس پچھڑےپن کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اور میں کہتا ہوں آپ خود ہی سوچئیے کہ آپ عورتیں کب تک خود کو اپنے خاندانوں میں محدود رکھیں گی؟ کب تک آپ بار بار یہی کہتی رہیں گی کہ آپ شوہروالی ہیں، بچوں‌والی ہیں؟ نئی روشنی کے ایک حامی کی حیثیت سے میں مطالبہ کرتا ہوں کہ آپ سب اپنے پرنجے نوچ پھینکیں اور کوآپریٹو میں شامل ہو جائیں! ڈرئیے مت، گھبرائیے مت، سوویت گورنمنٹ آپ کے بچوں کی دیکھ‌بھال کرے‌گی! اور وہ اتنی مضبوط ہے کہ آپ کے جاہل، دقیانوسی شوہروں کو لگام لگا سکتی ہے!"

حاضرین میں بےچینی پھیلنے لگی اور ایک بار پھر کچھ ڈری ڈری سی کھسر پھسر سنائی دینے لگی۔

"ہائے، میں مر جاؤں..."

اناخان نے جلدی سے اٹھ‌کر مقرر کو ہچکچاتے ہوئے روکنے کی کوشش کی مگر وہ ایسے جوش میں تھا کہ اس نے سنا ہی نہیں۔

"میں پھر کہتا ہوں: ہمارے یہاں ایسی بھی عورتیں ہیں جو اپنی دیگچیوں کو کالکھ کی طرح لپٹی ہیں۔ یہ بڑے ہی شرم کی بات ہے! بہت ہوا! وہ زمانہ گزر گیا، یہ بات اُن سب عورتوں کو یاد رکھنی چاہئے جو اپنے بچوں کی مامتا کے علاوہ اور کچھ جانتی ہی نہیں ہیں جن پر ان کے شوہر مظالم ڈھاتے رہتے ہیں۔ سوویت حکومت کو محنت‌کش عورتوں کی ضرورت ہے! اگر آپ کے گھر کے لوگ آپ کے راستے میں روڑے اٹکائیں تو آپ فوراً سوویت عدالت سے رجوع کیجئے اور ایسے بےکار گھروالوں سے یک‌قلم ناتہ توڑ لیجئے۔ کوئی بات نہیں اگر لوگ آپ پر انگلیاں اٹھائیں کہ آپ کے تو چولھا چکی نہیں ہے، آپ کے پاس آپ کے سوویت کوآپریٹو کی شاندار بارکیں ہیں جو آپ کا ٹھکانہ بنیں گی، آپ کے بچوں کو یتیم‌خانوں میں داخل کر دیا جائے گا۔ ہماری جو بہنیں آگے بڑھیں گی اُن کی شان و شوکت زندہ‌باد!"

اب ہال میں صرف ایک بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ پیچھے کی قطاروں میں بیٹھی عورتیں خاموشی سے اٹھیں اور باہر جانے کے لئے دروازوں کی طرف بڑھیں۔

یہ ماجرا دیکھ‌کر میز کے پاس بیٹھے لوگ ایک دم کھڑے ہو گئے۔ اناخان میز کا کاوا کاٹ‌کر دروازے کی طرف جھپٹی۔

"قمری آپا۔ اے، قمری آپا۔ آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

آخرکار جوراخان واپس آئی اور نعیمی نے جیسے ہی اسے اندر آتے دیکھا وہ اناخان کے پیچھے دوڑا اور گویا بڑی بےبسی کے عالم میں دونوں بازو پھیلاکر چیخنے لگا:

"پیاری بہنو، ساتھیو... اس بات کا کیا مطلب ہے؟ واپس آئیے میٹنگ ابھی پانچ منٹ میں ختم ہو جائے گی، پیاری خالاؤ..."

جوراخان کو یہ اندازہ لگانے میں پل بھر بھی نہیں لگا کہ کیا ہوا۔ اس کے آتے ہی عورتوں کو جیسے ایک‌دم چین آ گیا اور پھر بیٹھنے لگیں مگر بہت سی نشستیں خالی پڑی رہ گئیں۔

اناخان واپس آ گئی، اپنے آنسوؤں پر قابو حاصل کرنے کے لئے وہ یہی کر سکتی تھی۔

"قمری آپا چلی گئیں، کہتی ہیں وہ ہمارے کوآپریٹو

سے کوئی مطلب نہیں رکھنا چاھتیں، کیا کیا جائے، وہ تو بس چلتی ھی چلی گئیں۔ اوروں کو بھی اپنے ساتھ سمیٹ لے گئیں۔"

نعیمی بھی اناخان کے بعد ھال کے اندر آیا۔ وہ بےحد غمگین اور پریشان لگ رھا تھا۔ ماتھے سے پسینہ پونچھتے ھوئے وہ میز کے پاس پہنچ کر اپنی کرسی پر ڈھے پڑا۔

"آپ کم‌ازکم کوئی اشارہ تو دے دیتیں کامریڈ جوراخان، ھم لوگوں کو ھوشیار تو کر دیتیں، میں تو سمجھا کہ آپ نے جن عورتوں کو یہاں جمع کیا تھا وہ کچھ تو جانتی سمجھتی ھوں‌گی کہ ھم کیا چاھتے ھیں، کچھ تو وہ لوگ ترقی‌یافتہ ھوں‌گی۔ کیا آپ سمجھتی ھیں کہ ایسے لوگوں کو ساتھ لےکر آپ کوئی کوآپریٹو چلا سکتی ھیں؟ میں کہتا ھوں، نہیں جوراخان، ھرگز نہیں! آپ مجھے معاف کریں مگر ھر کام کو کرنے کے لئے چند اچھے کارکنوں کا ایک گروہ بہت ضروری ھے۔ آخر آپ ان ھی سے تو شروع کریں‌گی جن کو کچھ عقل ھوگی۔ چند منتخب عورتیں ھوں تو وہ اس بھیڑ بھاڑ سے کہیں بہتر ھوں‌گی!"

"پہلے تم مجھے یہ بتاؤ" جوراخان نے اس کی بات کاٹی۔ "تم نے یہ سب کس مقصد سے کیا؟ تم دراصل یہاں کیوں آئے تھے؟"

جوراخان کے لہجے پر نعیمی ایک‌دم اٹھ کھڑا ھوا اور ایسی صورت بنائی جیسے وہ بےحد مظلوم ھو۔

"جی... میں تو اپنی قوم کی عورتوں سے یہ کہنا چاھتا تھا کہ آزادی کے لئے ایک زبردست وار کریں..."

"تم!" جوراخان نے طیش میں آکر کہا اور پھر وہ ایک‌دم ایسا خاموش ھوئی جیسے اپنے غصے کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رھی ھو... "تم نے ان کے مادرانہ جذبات کی توھین کی، جو محبت وہ اپنے بچوں سے کرتی ھیں اس کا تم نے مذاق اڑایا، وہ اپنے شوھروں کی جو عزت کرتی ھیں اس کا مضحکہ بنایا۔ تم نے سوویت حکومت کو بدنام کیا!"

"اللہ کی پناہ! کیا واقعی میں نے ایسا کیا؟" پھر مارے خوف کے اس کا جیسے گلا گھٹنے لگا۔ "مگر یہ تو ناممکن

ھے، مجھ سے ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔ لیکن اگر مجھ سے کوئی بےجا حرکت ہوئی، میں نے کوئی بےموقع بات کہی تو میں خود ہی اس کی تلافی کروں گا۔ آپ کہتی ہیں میں نے ان عورتوں کی ہتک کی؟" وہ بڑے وقار کے ساتھ جھکا۔ "میں معافی مانگنے کو تیار ہوں۔"

"بیٹھ جاؤ!"

اس نے فوراً جوراخان کا حکم مانا۔ کھٹ سے بیٹھ گیا۔

عورتوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار یہ منظر دیکھا کہ ایک عورت نے سب کے سامنے ایک مرد کو ڈانٹ کر بٹھا دیا اور آسمان نہیں پھٹ پڑا اور اس مرد نے اس عورت کو جان سے بھی نہیں مار ڈالا۔۔۔ ویسے بات کافی خوفناک تھی۔

اب جوراخان نے عورتوں کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں تلخی اور غم تھا: "آہ عورتو، میری پیاری بہنو! زندگی نے تمہیں کس اندھیرے اور ذہنی افلاس کے کس گڑھے میں ڈھکیل دیا ہے۔"

اسے صبر سے کام لینا تھا، اس کے علاوہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"پیاری دوستو، ساتھیو" اس نے دھیرے سے کہا۔ "کوآپریٹو کی ممبری کوئی زبردستی نہیں ہے، آپ کا جی چاہے تو کوآپریٹو کی ممبر بنئے ورنہ نہ بنئے۔"

"یہ تو آپ لوگوں کو بغیر کہے ہی سمجھ لینا چاہئے تھا!" نعیمی نے جوش سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ کے شوہر کو برا لگے، وہ بڑبڑائے تو اس کو سمجھائیے، اس کو یقین دلائیے، اس کے غصے کو ٹھنڈا کیجئے، اور اگر پھر بھی وہ آپ سے اتفاق نہ کرے تو آپ کوآپریٹو میں مت شامل ہوئیے۔ اسے وقت دیجئے، دھیرے دھیرے وہ سمجھ جائے گا اور اگر وہ اندھا نہیں ہے تو خود ہی بہت باتیں دیکھ لے گا۔ کوآپریٹو میں شامل ہونے کے لئے آپ کو پرنجے اتارنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ عورتوں کا کوآپریٹو ہوگا، مرد وہاں نہیں ہوں گے۔ ممبر عورتیں اپنی سہولت کے مطابق جس وقت چاہیں گی وہاں کام کر سکیں گی۔ جب اپنی

گھر گرھستی کے کام سے فرصت پائیں تب وھاں کام کریں۔ اگر آپ اپنے ننھے منوں کو اپنے ساتھ لائیں گی تو ھم ایک طرف کو ان کے لئے انتظام کریں گے، ان کی دیکھ بھال ھوگی، ان کے کھیلنے کے لئے گڑیاں اور کھلونے ھوں گے۔ ھم آپ کو ایک ھنر سکھائیں گے، آپ کو بھترین بنکر بنائیں گے اور جو "متا" آپ لوگ بنیں گی، وہ عورتوں کی ایک خاص دکان پر، کوآپریٹو کے مقرر کئے ھوئے بھاؤ پر بیچا جائے گا۔"

جوراخان کا لہجہ نرم اور پرسکون تھا جیسے کوئی ماں، آسانی سے خوف‌زدہ ھو جانے‌والے بچوں کو سمجھا رھی ھو۔ صرف چند عورتوں نے محسوس کیا کہ اس کی آواز میں ایک پوشیدہ سی اداس سرزنش کی پرچھائیاں تھیں۔

"میں آپ سے جو کہہ رھی ھوں، وہ ٹھیک ھے نا؟" اس نے مسکراتے ھوئے پوچھا۔

"جی ھاں، ٹھیک ھے" کئی آوازوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

"آپ لوگ ڈر تو نھیں رھی ھیں؟"

"ن... نھیں! سامنے کی قطار میں بیٹھی ایک نوجوان عورت بولی۔"

جب میٹنگ ختم ھو گئی اور عورتیں چلنے لگیں تو نعیمی ان سرگرم کارکنوں کے بیچ میں گھسا جو جوراخان کو گھیرے کھڑی تھیں۔ اور سینے پر مکے مار مار کے ان تکلیفوں اور پریشانیوں کا ذکر کرنے لگا جو اس نے سائنس کی خدمت کرنے کے تیس برسوں کے دوران برداشت کی تھیں۔ اس نے کھا کہ پرانے دانشور اگرچہ آج روشن‌خیالی اور تھذیبی انقلاب کے لئے اپنی جان قربان کرنے کو تیار تھے مگر پھر بھی ان کے سامنے کتنی مشکلات تھیں۔ اگر اسے موقع ملتا تو وہ اگلے دن تک ان مشکلات کی وضاحت کرتا رھتا۔

لیکن جوراخان نے اسے وھاں سے بھگا دیا۔

پھر یہ لوگ کلب کے دفتر پھنچیں۔ لکڑی کا فرش جسے دھو رگڑکر صاف کیا گیا تھا، بےشمار قدموں تلے آکر پھر گندہ ھو گیا تھا۔ اتنے لوگ تو اس کلب میں مدتوں سے کبھی

اکٹھے نہیں ہوئے تھے۔ لیکن جوراخان کچھ بجھی بجھی سی لگتی تھی،اس نے باغ میں کھلنےوالے ایک بڑے دریچے میں سے باھر جھانک کر دیکھا، چینی گلاب کی کلیاں اس پودے میں کھلنی شروع ھو گئی تھیں جو کھڑکی کے نیچے اکیلا لگا ھوا تھا۔

"آج جو کچھ ھوا وہ ھم سب کے لئے ایک سبق ھونا چاھئے" اس نے ایک آہ بھرتے ھوئے کہا۔ "مگر تم نے اس شیخی‌خورے کو کیوں نہیں روکا؟ تم بھی ھوش حواس کھو بیٹھیں، مجھے اس کی توقع نہ تھی تمھیں تو چاھئے تھا زور سے اس پر چیختیں!"

"جی ھاں، پتہ نہیں کیا ھوا، میں چاھتی تو تھی کہ اسے چپ کر دوں" اناخان نے تسلیم کیا۔ "مگر... وہ ٹیچر بھی تو ھے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ھے، تم کو ھمیشہ اپنے دل کا کہا کرنا چاھئے" جوراخان نے کہا۔ "اور چپ نہیں ھونا چاھئے، اناخان، بہت ھی جلد اس سے بہت مشکل سوال کھڑے ھوں گے جن کا فیصلہ تم کو کرنا ھوگا۔"

"اب میں روز کلب میں اپنی ڈیوٹی دیا کروں گی۔ اتنا تو آج میری سمجھ میں بھی آ گیا ھے کہ سب سے اھم کام لوگوں کا نام لکھنا اور ان کی فہرست بنانا نہیں ھے بلکہ ان کی مدد کرنا اور ان کو سمجھانا ھے تاکہ ایک بار جب وہ کوئی فیصلہ کر لیں تو پھر پیچھے نہ ھٹیں۔"

جوراخان مسکرائی۔

"تمھیں معلوم ھے ھم تمھیں اپنے کوآپریٹو کی صدر نامزد کر رھے ھیں۔"

اناخان نے بڑی بےبسی سے اپنے بازو ھلائے۔

"جوراخان، میری بہن، ایسا نہ کرنا، بھلا میں کیسے انتظام کر پاؤں گی۔ کیا خود تمھیں یہ بات معلوم نہیں؟ بہن صوفیہ کہیں زیادہ موزوں ھیں۔"

"صوفیہ بھی تمھاری مدد کرے گی۔"

"لیکن وہ صدر ھوں اور میں ان کی مدد کروں تو کیا حرج ھے؟"

"نہیں۔ ہم عورتوں کے شعبے میں اس بات کا فیصلہ کر چکے ہیں اور شہری کمیٹی میں بھی۔ اور سب طے ہو گیا ہے۔ میری پیاری دبو بہن، تم ہی اس کام کے لئے سب سے زیادہ مناسب سمجھی گئی ہو!"

"کیا شہری کمیٹی میں لوگ مجھ کو جانتے ہیں؟"

"بےشک! تم کیا سمجھیں کہ تمہیں جانے بغیر یہ سب کیا گیا ہے؟"

اناخان نے اپنے دونوں کانپتے ہاتھ اپنے رخساروں پر رکھے تو وہ انگاروں کی طرح دھک رہے تھے جیسے کہ اسے بخار ہو۔

ساتواں باب
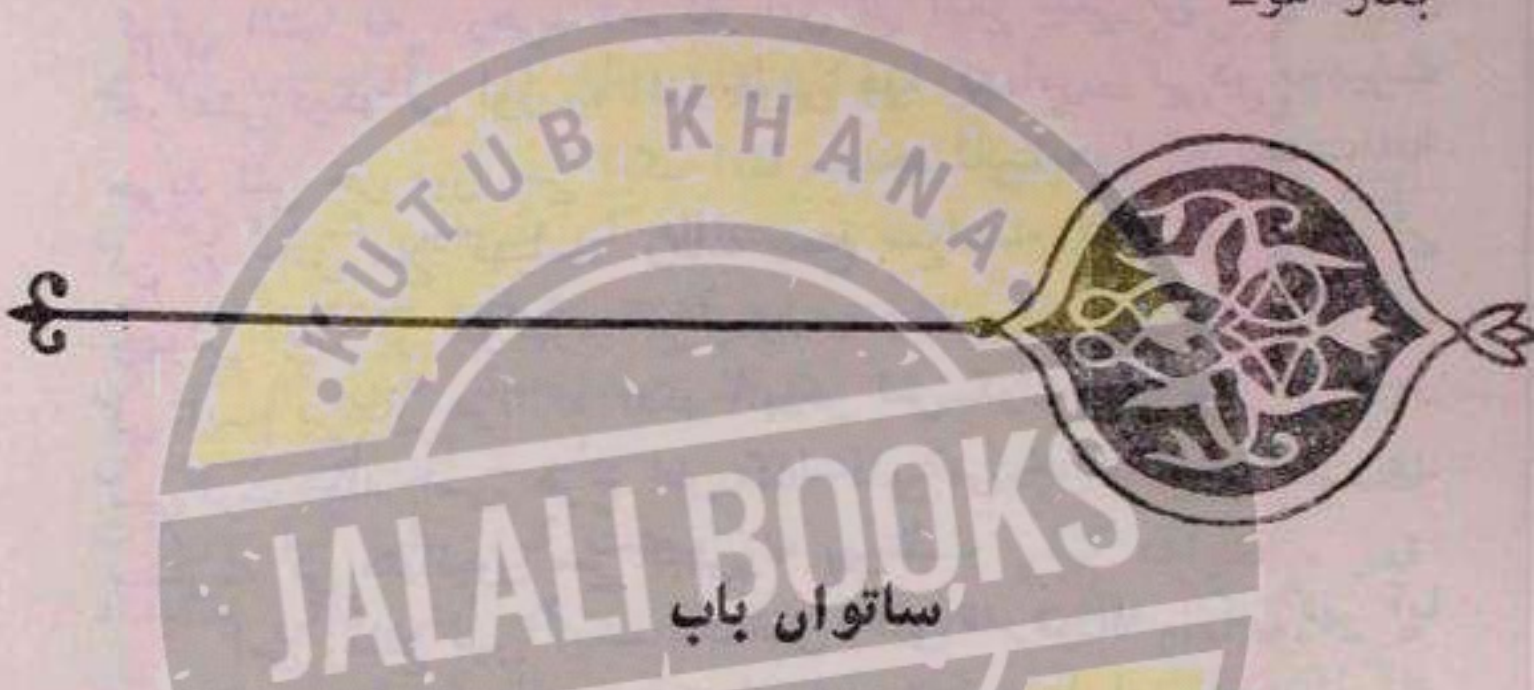
جب نصرت اللہ بچہ تھا تو گھر والے پیار سے اسے "میٹھا بابو" کہتے تھے، نیبو اور سنترے کی مٹھائیوں سے اس کے ہاتھ ہمیشہ چپ چپ کرتے رہتے تھے، گالوں پر ماں باپ کے بوسوں کی نمی چپکی رہتی تھی۔ ماں تو اسے بلی کی طرح چاٹتی رہتی تھی اور باپ اس زمانے میں کہتا: "یہ میرا پلوٹھی کا ہے، یہ میرا وارث ہے، جب گھر بھرا ہو مگر وارث نہ ہو تو اس دنیائے ناپائدار کی تمام دولت ہیچ ہے۔"

وہ اچھے دن تھے، ماں باپ دونوں کسی طرح بھی بس اپنے بچے کو خوش کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ اس کے دل میں کچھ آئے تو پہلے ہمیں پتہ لگ جائے! قدرت اللہ بڑی بےصبری سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا جب بچہ بات کرنے لگے گا، پھر چاہے وہ باپ کو دنیا کے اس سرے پر جاکر چڑیا

کا دودھ ھی لانے کو کیوں نہ کہے۔ خود اس کی طبیعت بھی فراخ تھی اور اپنے پیارے بیٹے پر ہونےوالے مصارف کے معاملے میں بخل سے کام نہ لے گا۔

ایک دن قدرت اللہ بیٹے کو گود میں لئے، کسی مہمان تاجر کو رخصت کرنے دروازے پر گیا۔ جب تاجر اپنی گھوڑا گاڑی میں بیٹھنے لگا تو ننھے نصرت اللہ نے گھوڑے کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ گھوڑے کے ماتھے پر چمکتے موتیوں کا جھومر سجا ہوا تھا اور شاندار ساز میں خوبصورت رنگین پھندنے اور جھبے لٹک رہے تھے۔ قدرت اللہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ آخرکار اس نے اپنے بیٹے کی ایک دلی خواھش دیکھ لی اور وہ اتنا خوش ہوا کہ اس نے دو بچھیڑے خرید لئے جن میں سے ایک اتنا سیدھا ثابت ہوا کہ نصرت اللہ دن بھر اس سے کھیلتا رہا۔ صبح سے شام تک وہ اس کے چھوٹے ایال پر گوکھرو کے پھول سجاتا رہا لیکن دوسرے ھی دن ایسا بےنیاز ہوا کہ آنکھ اٹھاکر اس کو نہ دیکھا۔ ھر چیز سے بہت جلد اسی طرح اس کا دل بھر جاتا، بس نیبو اور سنترے کی مٹھائیوں سے کبھی نہ بھرتا۔

اس زمانے میں ایک شخص اکثر قدرت اللہ کے گھر آیا کرتا تھا۔ وہ مدرسے کا ایک طالب علم تھا اور اس کا نام محمود نعیمی تھا۔ وہ مولوی کا بیٹا تھا۔ اکثر وہ نصرت اللہ کے شاندار مستقبل کے متعلق بڑی لمبی چوڑی باتیں کرتا، اسے نئے مشرق کی امید، قوم کا پھول اور نہ جانے کیا کیا کہتا۔ خاجاربی‌بی کو یہ باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ وہ طالب‌علم کی ان چکنی چپڑی باتوں کو شبھہ کے ساتھ سنتی۔ اور وہ خاص‌کر اس وقت ناراض ہوئی جب طالب‌علم نے تذکرہ کیا کہ اب لڑکے کو علوم سکھانے کا وقت آ گیا ھے۔

"میرے عزیز محمود نعیمی، تمھارا کچھ دماغ تو نہیں چل گیا ھے؟" اس نے بڑے غرور کے ساتھ کہا۔ "اس بچے کو علوم کی کیا ضرورت؟ کیا اس کے باپ کی دولت کافی نہیں ھے؟"

"ھمارے آج کل کے زمانے میں علوم کے ذریعے ھی تجارت میں ترقی ہو سکتی ھے" نعیمی اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"سائنس دولت کو ضرب دیتی ہے! کثیر دولت کو حساب کتاب اور جوڑ توڑ پسند ہے۔ بڑے تاجر وسعت اور بلندی کو پسند کرتے ہیں۔ قوم کے تاجروں کو اس وقت جس چیز کی ضرورت ہے اور جس کی ہمارے یہاں کمی ہے وہ یہ کہ وسیع پیمانے پر لین دین کیا جائے، دوردراز مقامات تک پہنچا جائے، دنیا دیکھی جائے..."

"بالکل بکواس" خاجاربی‌بی خفگی کے ساتھ بولی۔ "میرے بیٹے کے آس پاس کیا عقلمند لوگ نہ ہوں‌گے؟ تمہارے سائنس‌داں تو پیسے کے لئے میرے بیٹے کے سامنے تگنی کا ناچ ناچا کریں گے۔"

اور وہ غصے میں بھر کے اپنے بیٹے کو گود میں اٹھائے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بہرحال ایک صداقت نصرت‌الله کے دل میں شروع زندگی ہی سے بیٹھ گئی تھی اور وہ یہ کہ ہر شخص عموماً اور اس کے ماں‌باپ خصوصاً صرف اس لئے پیدا ہوئے ہیں کہ اس کی خدمت کریں اور اس کے اشاروں پر چلیں۔ اس لئے کسی کی قدر و منزلت کرنے یا کسی سے محبت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تمام اشیا اور تمام لوگوں کو اپنی ذاتی جائیداد سمجھتا تھا اور جہاں تک ماں باپ کا سوال تھا تو ان سے تو وہ بچپن ہی میں بیزار ہو گیا تھا کیونکہ وہ اسے اپنی محبت سے مسلسل عاجز کئے رہتے تھے۔

نصرت‌الله کے لئے زندگی کا مطلب یہ تھا کہ اکتاہٹ سے بچنے کی یا فرار کرنے کی مستقل کوشش کرتا رہے اور ایسا کرنے کے لئے اسے صرف ایک ہی راستہ معلوم تھا اور وہ یہ کہ روپیہ خوب خرچ کرو۔ چونکہ روپیہ باپ کا کمایا ہوا تھا اس لئے اس کو خرچنے میں جاتا بھی کیا تھا۔ مگر ایک دن ایسا آ ہی گیا جب اس کے باپ نے یہ فراموش کرنا شروع کیا کہ اس کی اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد صرف اپنے بیٹے کی تفریحات کے دام چکانا تھا۔ باپ نے حد سے زیادہ کنجوسی شروع کر دی اور اپنے بیٹے کو ایک مصیبت، بلکہ خدا کی ایک چھٹکار سمجھنے لگا۔

پھر نصرت‌اللہ کو یہ معلوم ہوا کہ اس کے اور حریف بھی تھے اور ان میں سب سے بدتر تھا، کالا قولمت جو بڑا مشہور پانسےباز تھا — اتنا مشہور کہ اس کے مقابلے کا دوسرا کوئی نہ تھا۔

بہت دنوں تک نصرت‌اللہ نے یہ خواب بےکار دیکھا کہ وہ کالے قولمت کا صفایا کر دے گا، کھیل کے کسی زبردست مقابلے میں اس کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دے گا لیکن ایسا تو کسی نے کبھی نہ کیا تھا۔ نصرت‌اللہ کو شادی کرنے کے تصور سے بھی مسرت حاصل ہوتی تھی اور آخرکار باپ نے اسے اپنی رضامندی دےکر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ اپنے فرض پدری کو یاد رکھتا تھا...

آج دو ہفتے سے گھر میں مسلسل ہنگامہ تھا۔

بڑے سے آنگن کے ایک سرے پر پچھلے سال ایک دو کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان بنایا گیا تھا۔ اس کی دیوار پر نماتگن کا حسین قالین لٹکایا گیا، اس چھوٹے سے گھر میں صندوق رکھے گئے جو کمبلوں سے بھرے ہوئے تھے، حوض کے کنارے عورتیں بیٹھی کمبلوں پر کشیدہ بنا رہی تھیں، ہڑیلا مقسوم بورے، تھیلے اور ٹوکریاں بھر بھرکر سامان لاتا اور پھر اور سامان لانے کے لئے دوڑ جاتا۔ خاجار بی‌بی خوشی کے مارے اتنی پاگل ہو رہی تھی کہ سارے گھر میں ناچتی پھرتی تھی۔ مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، ہر شام معمول سے بہت زیادہ مومی شمعوں کی ضرورت پڑتی تھی۔

دوپہر کی گرمی میں نصرت‌اللہ اپنے سجے ہوئے پرتکلف آرام‌دہ کمرے میں جاتا اور پہلو میں گاؤتکیہ دباکر ریشمی توشک پر دراز ہو جاتا، آہستہ آہستہ سوکھی خوبانیاں یا بادام چباتا جنہیں ہڑیلا مقسوم اس کے لئے لاتا تھا اور سوچتا: "میں دولھا ہوں!" توشک پر لیٹے لیٹے، میوے چباتے چباتے بس یہی سوچتا رہتا: "دولھا... دولھا۔"

ویسے ابھی تو وہ آدھے آنگن پر ہی قابض تھا مگر وہ وقت بھی تو آئے گا جب وہ اس ساری جائیداد کا مالک ہوگا۔ یہ

حویلی، صحن، باغ اور خود هڑیلا مقسوم بھی اس کے ہو جائیں گے — نصرت‌الله کے۔

اس کا جی چاھنے لگا کسی کو آواز دے کر کوئی حکم دے۔

"اے اماں" وہ چلایا۔ "ذرا میرے جوتے لا دیجئے۔"

هاتھ بڑھاکر اس نے فرش پر بچھے قالین کو سہلایا۔ "اب جلدی ھی... بہت جلدی ھی... میری بیوی ان قالینوں پر ننگے پیر چلے گی..." اور وہ تصور کرنے لگا کہ کیسے وہ شرمائی هوئی پاس آئے گی اور اس کی سریلی آواز سنے گا جب وہ کہے گی: "کہئے تو آپ کو مالش کر دوں؟"

اس نے کبھی بشارت کی صورت تو نہیں دیکھی تھی مگر اسے یقین تھا کہ وہ بشارت ھی سے عشق کرتا ھے۔ بہار کا موسم تھا جب گرمی سے پگھلا ھوا پانی پن‌چکی کی طرف بہہ رہا تھا اور اس نے دیکھا تھا کہ پانی کے کنارے دو لڑکیاں کھڑی ھیں۔ وہ اس وقت گھوڑا گاڑی میں بیٹھا ادھر سے گزر رہا تھا۔ چھوٹی لڑکی کے سر پر رومال نہیں تھا، اس کی چوٹیاں لمبی لمبی تھیں، ڈر کے مارے آنکھیں پھٹی ھوئی تھیں اور وہ پانی میں نشیب کی طرف بہتی ھوئی، ایک گیند کی طرف اشارہ کر کرکے زور زور سے چیخ رھی تھی:

"آپا، آپا! ھائے، وہ تو غائب ھو رھی ھے، ھائے ڈوب جائے گی!"

بڑی لڑکی جس نے اپنا جیکٹ سر پر باندھ رکھا تھا، فوراً پانی میں کودنے کو تیار ھو گئی، جلدی جلدی اس نے اپنے پاجامے کے پائینچے اوپر چڑھائے، قمیض کا دامن کمر میں کھونسا اور گیند کے پیچھے نشیب کے پانی میں کود گئی۔ نصرت‌الله کو اس کے طاقتور اکھرے جسم کی ایک جھلک اس کے جسم سے لپٹے گیلے کپڑوں میں دکھائی دی، پھر دھوپ میں چمکتی گیہواں پنڈلیاں — اور اس کے سارے جسم میں سنسنی سی ھونے لگی۔

بعد کو جب جوئے کے اڈے پر گفتگو لڑکیوں کے موضوع پر ھونے لگی تو شرابی عمر نے آنکھ ماری اور توردیمت بچولئے سے بشارت کے حسن کا ذکر کیا۔

"میں نے وہ مزدور صابر کی بیٹی بشارت کو دیکھا۔ عمر تو اس کی ابھی چودہ سال ھے مگر بھئی، کیا پکا سیب ھے! سرخ و سفید!.:. بس ایسی کوئی حسینہ ریشمی بستر پر ہو، سجی سجائی خوابگاہ ہو، قالینیں اور ریشم کے پردے اور اس حسینہ کو اپنے پہلو میں بٹھاکر اپنے سینے سے لگائیے... ... تو... آہ... کیا نعمت ملے!"

"میں سوچتا ہوں جانے وہ کسے ملےگی؟" بچولئے توردیمت نے خود بھی آنکھ مارتے اور ہونٹ چاٹتے ہوئے کہا۔

نصرت‌الله نے اس کو کھا جانےوالی نظروں سے دیکھا اور زور سے چیخا:

"منہ سے رال پونچھو!"

وہ اپنی ہونےوالی دلھن کے متعلق ابھی سے حسد اور جلن محسوس کرنے لگا تھا۔

لیکن اس وقت نصرت‌الله پرسکون تھا۔ اب تو بشارت اس کے ہاتھ میں آ ہی گئی سمجھو۔ جلدی ہی وہ اس کے لئے ایک خواب نہیں، حقیقت بن جائےگی اور جو کچھ وہ اسے حکم دےگا وہ بجا لائےگی۔

جب تک وہ بچہ تھا تو اس کی ماں اس کی ہر اچھی بری خواہش پوری کیا کرتی تھی، اب اس کی بیوی پوری کیا کرےگی۔ اس گھر میں ہمیشہ ایسا ہی ہوا تھا اور ایسا ہی ہوتا رہےگا۔

ابھی تک پیغام لےکر بچولیوں کو بھیجا تو نہیں گیا تھا کیونکہ عزت‌مآب بائے اور ان کی بیوی اسے ثانوی حیثیت کا معاملہ تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ابھی کافی وقت تھا، ان لوگوں کو انتظار کرنے دیا جائے۔ یہ دردسری ہونےوالی بہو کی ماں کی لئے تھی کہ شادی کے سلسلے میں جو للچانےوالی افواہیں اڑ رہی تھیں ان میں کہاں تک صداقت تھی۔ وہ مانگے رات دن دعائیں کہ بائے کہیں اپنا ارادہ نہ بدل دے، وہ تو قدرت‌الله کے یہاں سے پیغام لے جانےوالوں کو خدا کی بھیجی نعمت اور رحمت سمجھے گی۔

نصرت‌اللہ بھی اپنی ہونےوالی ساس پر ہنستا تھا۔ پیغام جائےگا تو کہیں بےچاری بیوہ خوشی کے مارے پاگل ہی نہ ہو جائے! مگر خدا رحمان و رحیم تھا اور اگر اس کی مرضی ہو کہ اے میرے بندے، یہ لے۔ تو پھر تو بندے کو وہی امید رکھنی چاہئے جس کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ پھٹیچر بیوہ اترانے ہی لگے کہ وہ اتنی اونچی اڑ گئی۔ قدرت‌اللہ خواجہ کا خاندان! بھلا کون اس سے رشتہ جوڑنا نہ چاہےگا! چلو بےچاری بھکمنگی کو خوش ہی ہو لینے دیں گے۔ بیوی نصرت‌اللہ کی ٹہل کرےگی، ساس نصرت‌اللہ کی ماں کی چاکری کرےگی۔

البتہ نصرت‌اللہ کو یہ فکر کھائے جاتی تھی کہ اور روپیہ کیسے حاصل کیا جائے۔ اسے جوئے کی ایک بازی میں قولمت سے مقابلہ کرنا تھا۔ اور یہ مقابلہ بڑے زوروں کا تھا۔ کافی روپیہ درکار ہوگا، فی‌الحال وہ اپنے باپ سے کچھ کہنا نہیں چاھتا تھا کیونکہ دھوم دھام سے شادی ہونے کا بھی خرچ سر پر کھڑا تھا۔ یوں بھی وہ جب روپیہ مانگتا تھا تو باپ کی خوشامد درآمد کرتا، اسے پریشان کرتا، طرح طرح کی جھوٹی سچی باتیں کہتا، ہزاروں جھوٹی کہانیاں گڑھتا، اس کی چھاتی پر سوار ہوکر اس کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر غراتا۔ تب کہیں روپیہ ملتا تھا...

اس چڈاگاخیرو نعیمی نے کہا تھا کہ روپیہ قرض دےگا۔ وہ اسے برابر نصیحتیں کرتا، مشورے دیتا رہتا تھا۔ وہ تو واقعی بڑا عذاب بن گیا تھا! پہلے تو شیخی بگھارتا رہا کہ اسکول کے لئے جو چندہ اکٹھا کیا جا رہا ہے اس میں سے دے دےگا، پھر یکایک اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور یہ اطلاع لےکر آیا، قسمیں کھا کھاکر بتایا کہ وہ روپیہ تو سارے کا سارا کوئی چالاک عورت لے گئی جس کا نام جوراخان تھا بلکہ خود وہی سستا چھوٹا، ورنہ اس کی جان نہ بچتی! دغاباز کہیں کا۔ بڑا ہی بزدل نکلا... ایسی کہانی تو نصرت‌اللہ نے کبھی سنی ہی نہ تھی! کسی عورت پر کہیں اتنی بڑی رقم صرف کی جاتی ہے! کیا بکواس ہے! اگر اس کے خود کے، نصرت‌اللہ

کے پاس کثیر رقم ہوتی تو وہ اس کلوٹے قولمت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتا۔

اساکا کا رہنے والا یہ قولمت خوب لمبا چوڑا تھا اور جوئے اور پانسےبازی میں تو کوئی اس کے برابر نہ تھا۔ اگر کوئی اسے ہرا دے تو ایک عالم میں مشہور ہو جائے۔

کالے قولمت کو لوگ ہر بڑے شہر میں جانتے تھے۔ نوجوانوں کی عزت اسی سے ناپی جاتی تھی کہ جب کالا قولمت ان کے شہر میں آئے تو وہ کیا کرتے ہیں۔ اگر مقامی لوگ قولمت کے چیلنج کو قبول نہ کریں تو وہاں کے نوجوانوں کو اپنے آپ کو مرد کہنے کا حق نہیں رہ جاتا تھا اور ان کی بڑی ہیٹی ہوتی تھی۔ اس لئے ہر بار جب کالا قولمت کسی شہر میں آ جاتا تو وہاں کے بانکوں کی قسمت کا فیصلہ ہوتا تھا۔

پچھلے ہفتے جب توردیمت بیان کر رہا تھا کہ قولمت تو بازو گھمائے بغیر پانسے کو چھت تک پھینک سکتا ہے تو نصرت‌الله نے سنا تھا کہ مشہور جواری نے نعمانچہ کے بائے کے بیٹے نصرت‌الله کا نام بھی لیا تھا اور اگر یہ بات سچ تھی تو اب اپنے شہر کو سخت بدنامی سے بچانے کی ذمےداری نصرت‌الله پر آ پڑی تھی۔ بھلا شہر میں کسی اور بائے کا ایسا عزت‌دار بیٹا اور کون تھا اور تھا بھی تو نصرت‌الله اس عزت کو اپنے ہاتھ سے کیوں جانے دے۔ خدا نہ کرے جو یہ خبر اڑ جائے کہ وہ بزدل تھا کہ وہ کالے قولمت سے دب گیا! اس سے زیادہ بےآبروئی اور کیا ہو سکتی تھی۔ نہیں، اس کالے جواری نے نصرت‌الله کا نام یوں ہی نہیں لیا تھا!

کالا قولمت وہ پہلا آزاد انسان تھا جس پر نصرت‌الله کو بےحد رشک آتا تھا۔ ویسے وہ عام طور پر لوگوں سے نہیں جلتا تھا لیکن یہ بات اسے کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی: "اس نعیمی نے، اس کتے نے مجھے دھوکا دیا۔ وقت پر ساتھ نہیں دیا!" نصرت‌الله اپنے چیچک کے داغوں‌والے چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے غرایا۔ "اب میں کیا کروں؟"

خاجار بی‌بی اپنے بیٹے کے جوتے اٹھا کے لائی۔ جب اس نے دیکھا کہ بیٹے کا مزاج بگڑا ہوا ہے تو ڈر اور دردمندی

سے کانپنے لگی، ظالم باپ کی سختیوں کا یہی نتیجہ ہونا تھا۔ وہ اپنے پیارے بیٹے کی خواہش میں حائل ہو رہا ہے۔

نصرت‌الله نے یوں زوروں سے اپنے جوتے پہننے شروع کئے کہ ان کی سیونیں ٹوٹنے لگیں، وہ منہ بنائے ہوئے اٹھا، چہرے پر طیش کے آثار تھے۔ خاجار بی‌بی سانس روکے، دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل گئی۔

نصرت‌الله گلی میں نکلا، حسب معمول بنولےوالے حمام کی طرف چلا۔

اس کے تمام ایسے یار دوست جو اپنے اپنے باپوں کے پیسے اڑانے میں فرد تھے، وہ اسے عموماً اسی راستے پر ملا کرتے تھے۔

وہ واقعی مرد تھے، بڑے ہی مزےدار لوگ، دلچسپ لوگ، ویسے تھوڑا ہی جیسے اس کے باپ سے ملنے آیا کرتے تھے، بڑے ہی بور، تھکا دینےوالے، اور ان کو کوئی بات ہی نہیں کرنی آتی تھی سوائے تجارت کے۔ کنجوس، مکھی‌چوس! دراصل وہ دل میں ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے اور اس کا باپ بھی یہی کرتا تھا۔ نصرت‌الله کو ان سے نفرت تھی، ان میں سے ہر ایک سے نفرت تھی۔ ان کی موجودگی میں تو ایسا بن جاتا جیسے گونگا بہرا ہے، اسے نہ اپنے باپ کے معاملات سے کوئی دلچسپی تھی، نہ اس کے ان فضول حاشیہ برداروں سے کچھ لینا دینا تھا۔

بائے قدرت‌الله کو نہ جانے کتنی بار یہ لگا تھا کہ اب خاتمہ نزدیک ہے۔ اس کا کلیجہ منہ کو آ گیا تھا، ادھر ادھر پاگلوں کی طرح دوڑتا، ہر ممکن بات جس میں اسے منافعے کا امکان نظر آتا، اس میں وہ ہاتھ ڈالتا، کوئی ایسا کاروبار نہ تھا جس میں وہ پھنس نہ چکا ہو۔ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا بیٹھتا، اپنے کو تباہ کر لیتا، دیوالہ نکل جاتا، مگر وہ پھر کہیں نہ کہیں پیر جما لیتا۔ نصرت‌الله اس سب کو معمول کے مطابق بات تصور کرتا تھا۔ چند سال پہلے قدرت‌الله خواجہ نے سوچا تھا کہ ترکستان ٹریڈنگ کمپنی میں شامل ہوکر اس نے جائے پناہ ڈھونڈ لی لیکن وہاں تو بڑے بڑے تاجروں نے اس کو روند ڈالا۔ نصرت‌الله کو ان سب باتوں کا کوئی علم نہ

تھا۔ بعد کو قدرت‌اللہ نے اپنی حالت کا احوال دوستوں سے کہا، ایسے دوستوں سے جیسے نعیمی، جن کو سپلائی کے محکمے میں اچھی محفوظ نوکریاں مل گئی تھیں۔ اور اس نے ان دوستوں کے وعدوں پر بھروسہ کیا کہ "ترکستان کی اس طرح ناکہ‌بندی کرکے وہاں سامان نہ پہنچنے پائے۔ اس کا گلا گھونٹ دیں گے!" لیکن ان بڑی بڑی امیدوں اور خوشیوں بھری آس کا بھی اسی طرح خاتمہ ہو گیا۔ بائے نے ایک بار آنکھ کھول کر جو دیکھا تو وہ پھر گھرے گڈھے کے پیندے میں، تاریکی میں پڑا ہوا تھا۔

بہرحال نصرت‌اللہ کو اس کی کوئی فکر نہ تھی۔ اس نے نہ باپ کی زندگی میں کوئی تبدیلی دیکھی، نہ اسے باپ کی پریشانیاں نظر آئیں۔ اسے یقین ہی نہیں تھا کہ حالات بدل بھی سکتے ہیں۔ زندگی تو ویسی ہی تھی جیسی اس کے دادا کے زمانے میں تھی اور ویسی ہی رہے گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایک نئی حکومت آ گئی تھی لیکن بائے لوگ تو موجود تھے اور روپیہ تو ابھی تک روپیہ ہی تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ سڑکوں پر نصرت‌اللہ کو بھی کچھ تبدیلی نظر آتی تھی اور ان میں سے ایک دو تو خاص تھیں، مثلاً یہ کہ عورتیں بغیر پرنجے کے منھ کھولے نظر آ جاتی تھیں لیکن نصرت‌اللہ کے لئے تو یہ سب مسخرےپن سے زیادہ اور کچھ نہ تھا، ان پر غور کرنے کے لئے بہت سوچنے کی ضرورت تھی اور سوچنے کی کوشش کون کرتا۔ غور کرتے رہنا، سوچتے جانا تو بڑا ہی بور کام تھا!

کبھی کبھار اس کے دوست بھی ایسی باتوں کا ذکر کرتے تھے جو دیکھی نہ سنیں، نصرت‌اللہ ایسے الفاظ جیسے "انقلاب"، "سوویت"، "غریبوں کی حکومت" وغیرہ اس کان سنتا، اس کان اڑا دیتا۔ اس کے باپ اور اس کے دوستوں میں فرق کافی تھا اس لئے دوستوں کا تو بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ بائے کے لڑکے کے دل پر کبھی کبھار خوف کی ایک پرچھائیں منڈلاتی تو ضرور تھی لیکن دوستوں کی صحبت میں تو فکریں اور پریشانیاں بہت جلد ہوا ہو جاتی ہیں۔ جہاں

آپ بنولےوالے حمام کے جوئےخانے میں داخل ہوئے اور آپ نے ہلکی پھلکی نوجوان آوازیں سنیں کہ آپ پھر وہی ہو گئے جو تھے، فکروں کا بار ختم! زندگی اسی طرح آزاد، مسرور، مزےدار اور نہ کوئی غم نہ پریشانی! بھلا ایسی زندگی پر کون حملہ کر سکتا تھا، بس آپ کو جو ضرورت تھی وہ نقد کی!.. شراب، رنگینی، صحبت احباب!.. پھر تو کوئی اندھا ہی ہوگا جو دوراندیشی کرے اور آگے کی سوچے... جوئےخانے میں چلیموں کے دھوئیں کی گرمی، دوستوں کی شراب سے مہکتی سانسیں... نصرت‌الله فوراً مسرت کے ایسے نشے میں ڈوب جاتا جو ہاؤہو اور کاہلی کے درمیان ہوتا۔ یہاں وہ خوب روپیہ خرچ کرتا، جو چاہتا بلا روک ٹوک کرتا۔

بنولےوالے حمام کئی تھے اور چاربازار کے الگ ہی حصے میں بنے ہوئے تھے۔ نصرت‌الله نے ادھر ادھر دیکھا اور ادھ کھلے کیواڑ سے یوں دبے پاؤں اندر گھسا کہ اس کے بوٹ نہ چرمرائیں۔

پھر اس نے کان لگاکر آہٹ لی۔ جوئےخانے میں مکمل خاموشی تھی۔ وہ خود پہلا شخص تھا جو وہاں پہنچا۔ گلیارے میں اسے توردیمت دلال ملا جو پٹرے کی طرح چپٹا تھا اور وہ ایک سوت اور ریشم ملے کپڑے کا جبہ پہنے تھا۔ دونوں ساتھ جوئے کے کمرے میں داخل ہوئے۔ دلال کمر سے دوہرا ہوکر جھکا اور اس نے "میدان جنگ" کی طرف اشارہ کیا جو کہ خالی تھا۔ ایک تنفس نہیں! ہائے لوگوں کے سب ہی لڑکے کترا گئے تھے کیونکہ انہیں خبر ملی تھی کہ کالا قولمت وہاں آنےوالا ہے۔ دو چار نے جھانک کر تو دیکھا تھا مگر اندر آنے کی ہمت کسی کی نہیں ہوئی۔ سب آس پاس چھپے چھپے منڈلاتے رہے!

نصرت‌الله بہت بددل ہوا مگر پھر اس نے سوچا کہ اچھا ہی ہے، اگر ہار جائیں گے تو اس ہار کو دیکھنےوالوں کی تعداد بہت ہی کم ہوگی۔

توردیمت نے کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ وہ دیوار کے پاس‌والا کونہ تو اتنا صاف ستھرا تھا کہ جگمگ جگمگ کر

رہا تھا۔ البتہ جوئے والے کمرے پر اسی طرح نحوست اور گھٹن چھائی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ جنھیں یہ لت تھی ان کو وہ اتنا پسند آتا تھا۔ اندھیرے میں اس کمرے کی چھت تو نظر ہی نہیں آتی تھی اور چھت سے بالکل نیچے ایک چھوٹا سا روشن‌دان تھا جس میں نیلے شیشے لگے ہوئے تھے۔ اور کھڑکی تو ایک ہی تھی جو زمین سے ذرا ہی اونچی تھی۔ وہ صحن میں کھلتی تھی جو بنولوں کے چھلکے سے بھرا ہوا تھا اور وہ ایندھن کے کام آتا تھا۔ بیچوں بیچ کمرے میں جہاں کھڑکی سے روشنی گرتی تھی، ایک اینٹ اتنا چمکتی تھی کہ جیسے نیا پالش کیا ہوا کسی پیٹی کا بکسوا۔ دیوار کے برابر برابر چٹائیاں اور پتلی پتلی توشکیں بچھی ہوئی تھیں، تکئے لگے تھے۔

"میں تو کہتا ہوں آپ نے کمال کر دیا! کس منہ سے آپ کی تعریف کی جائے" دلال توردیمت نے بڑے جوش سے کہا اور پھر اس نے بڑی ترکیب کے ساتھ چلم سلگائی جس میں افیون ملا تمباکو رکھا گیا تھا۔ "آپ نہ ہوتے تو ہمارے شہر کی سخت ذلت ہوتی۔"

ایک بار اس نے چلم گڑگڑائی اور پھر اسے نصرت‌اللہ کو دے دیا۔

"یہ سب کے سب اتنی تیزی سے بھاگے کہ آپ تو ان کی ایڑی تک نہ دیکھ سکتے تھے۔ جانتے ہیں نا کہ کالے قولمت کا کیا مطلب ہے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ وہ کسی کو پناہ نہیں دیتا، جب وہ داؤں لگاتا ہے تو ذرا جم کے کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ اس کی آنکھیں اس وقت لال انگارا ہو جاتی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ اس کے اندر کا جانور جاگ پڑا۔ ہاں، میں سچ کہتا ہوں۔"

توردیمت ابھی اپنے گاھک، کالے قولمت کے اور گن گاتا مگر ایک‌دم یہ سوچ کر رک گیا کہ آج جو یہ ایک ہی شکار پھنسا ہے، یہ چھوٹا سہی مگر کہیں ڈر کر بھاگ نہ جائے۔ کیا پتہ، یہ بائے کا بیٹا بھی خوف‌زدہ ہوکر نو دو گیارہ ہو جائے، تب کیا ہوگا۔ آج اسے کافی بخشش اور انعام اکرام ملنے کی

امید تھی، وہ تو گئی لیکن اگر احتیاط نہ کی گئی تو ہو سکتا ہے اس بھاگتے بھوت کی لنگوٹی بھی نہ ہاتھ آ سکے۔

اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے زانو پر ہاتھ مارا۔

"اور قولمت کے لئے آپ سے بہتر مدمقابل ہے بھی کون؟ ظاہر ہے کہ بازی میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جو کھیلا نہیں وہ جیتے گا کیا۔ آپ تو ہمارے مرغوں کے بیچ میں باز ہیں۔ اب جبکہ آپ نے قولمت کا چیلنج قبول کر لیا ہے تو سمجھ لیجئے کہ آپ جیت گئے، کالا قولمت کہتا پھر رہا ہے کہ اب وہ تاش کھیلے گا، سو ہر کوئی ڈر رہا ہے اور پھر زمانہ بھی خراب ہے، پانسہ پھینکنے کے تو دن ہی لدتے نظر آتے ہیں۔ کتنا بڑا فن ہے جو مر رہا ہے۔ اور جو یہ گپ چل گئی ہے نا کہ کالا قولمت کبھی ہارتا ہی نہیں تو اسے تو بالکل بکواس سمجھئے، جو کوئی بانکا ہوگا واقعی میں تو وہ اپنا سب کچھ لٹا دے گا مگر کھیل کا میدان چھوڑکر نہیں بھاگے گا۔ آپ جانتے ہیں، جب قولمت اپنا سب پیسہ، بٹوہ، جوتے، جبہ، ہار جاتا ہے تو وہ اپنے ہاتھ پاؤں، ناک کان اور یہاں تک سنا گیا ہے کہ اپنا سر بھی داؤں پر لگا دیتا ہے مگر کھیلتا برابر رہتا ہے پٹھا۔ جب کھیل زوروں پر آ جاتا ہے، تو نہ اس کو کچھ سنائی دیتا ہے، نہ دکھائی دیتا ہے، نہ محسوس ہوتا ہے۔ آپ خود ہی ملاحظہ فرما لیجئے گا! آپ کو معلوم ہے وہ کیا کہتا ہے — وہ کہتا ہے کہ "وہ تو جواری نہیں جو فطری موت مرے! میں آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں۔ اس کے صرف ایک کان ہے۔ اس کا ایک برابر کا تھا، اس کا مقابل — شااحمد، اب تو وہ مر چکا ہے۔ تو یہ دونوں ایک دوسرے سے کبھی ہار نہیں مانتے تھے۔ ایک دن قولمت اس سے ہار گیا اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس نے اپنا کان خود ہی کاٹ کر شااحمد کے سامنے پیش کر دیا... جی ہاں۔"

گلیارے میں پاؤں کی چاپ ہوئی۔ توردیمت کے کان کھڑے ہوئے اور ایک دم اچھل کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور اوپر بھاگ گیا۔

جوئے کے کمرے میں اندھیرا اور سناٹا تھا۔ بھٹیوں

میں سے جلتے ہوئے بنولوں کے چھلکے کی گھٹی گھٹی، چراهند بھری بو اٹھ رہی تھی لیکن نصرت‌اللہ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ خون کی بو ہے۔ وہ خوف‌زدہ ہو گیا، ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک چوہا تھا جو چربی کے ٹکڑے کی لالچ میں چوہےدان میں پھنس گیا! اسے دوڑنا چاہئے، یہاں سے نکل بھاگنا چاہئے! جھک کر وہ دلال کے پیچھے بھاگا۔

لیکن بہت دیر ہو چکی تھی!

ایک ناٹے قد کا آدمی، خوبانی کے پیڑ کے موٹے سے کندے کی طرح مضبوط اور گٹھیلا، اپنا سینہ آگے کو تانے ڈھالو سیڑھیوں سے اتر رہا تھا۔ وہ یوں چلا آ رہا تھا جیسے وہ کسی غیرمرئی رکاوٹ کو اپنے سر سے ڈھکیل کر پرے کر دے گا۔ نصرت‌اللہ ایک طرف کو دب گیا اور اسے گزر جانے کا راستہ دے دیا۔ نووارد کالا قولمت تھا!

وہ واقعی کوئلے کی طرح سیاہ تھا۔ اس کا نوکدار منڈا ہوا سر اس کے جسم پر بالکل سیدھا رکھا ہوا تھا۔ گردن تو جیسے تھی ہی نہیں، یہ جو کہا جاتا تھا کہ کوئی اس کا گلا نہیں گھونٹ سکتا تھا تو یہ بات سچ ہی تھی۔ سر کے بائیں طرف کے کان کی صرف لو تھی، اس لئے دھنا کان لگتا تھا کہ کچھ نکل آیا ہے، الجھی الجھی، کانٹے سی کھڑی بھنویں جن کی وجہ سے چڑیا کی سی چھوٹی چھوٹی گول گول آنکھوں سے نکلتی مکاری کی روشنی اس کے آگے نکلے ہوئے چھجے سے ماتھے کے نیچے اور بھی زیادہ شدید لگتی تھی۔ لمبے لمبے بازو جن میں شکسال کے پیڑ کی طرح گانٹھیں پڑی ہوئی تھیں، گھٹنے کے بھی نیچے پہنچتے تھے۔ اگر ایسا آدمی ایک بار آپ کو پکڑ لے تو آپ اپنے کو چھڑا نہیں سکتے تھے، کسی طرح بھی زمین سے اس کے قدم ہٹا نہیں سکتے تھے۔

کالا قولمت دھیرے دھیرے چلتا ہوا نصرت‌اللہ کے پاس سے گزرا اور اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ دلال توردیمت اس کے آگے جھکا اور پھر معزز مہمان کو لے جاکر بڑے ادب سے دیوار کے پاس بٹھایا۔

قولمت کے پیچھے پیچھے عمر، نشے میں دھت داخل ہوا،

وہ بالکل غین ہو رہا تھا! یہ ایک دوست تھا، سیدھا سادا، جس کا کام تھا گاڑی‌بانی اور شوق تھا شراب‌خوری۔ وہ جوئے میں شریک تو کبھی نہیں ہوتا تھا مگر جوئے‌خانے میں آتا روز تھا۔ اور بڑے شوق سے دوسروں کے پیسے کی پیا کرتا تھا۔ اس کے بغیر جوئے‌خانے کی فضا ویسی ہی بے‌کیف ہوتی جیسی کسی بادشاہ کے دربار کی فضا مسخرے کے نہ ہونے سے۔

عمر نے گھستے ہی نصرت‌اللہ کو گلے لگا لیا اور پرخلوص جذبات سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نشے کے مارے نہ تو ٹھیک سے کھڑا ہو سکتا تھا، نہ سر اٹھا سکتا تھا لیکن وہ سخت جھگڑالو موڈ میں تھا، اس قدر کہ دھانے کے کونوں پر جھاگ نکل رہا تھا۔

"بھائی نصرت‌اللہ، ذرا مجھے سہارا دئے رہو! میں تمہارے کسی بھی دشمن کو کچل کے رکھ دوں گا! ایک ایک کو جان سے مار ڈالوں گا... ایک ایک کو بلکہ اس کی سات پشتوں کو بھی... ک...! کس... کسی کو بھی، آخری آدمی تک! سنو تو، تم خفا تو نہیں ہو گئے... ایں...! خ... خف... خفا تو نہیں ہو گئے ہو مجھ سے؟"

نصرت‌اللہ کو کچھ سکون ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے کالے قولمت کی دبی ہوئی بے‌کیف سی آواز سنائی دی۔ اپنے تکیوں پر بیٹھے بیٹھے، کسی کی طرف دیکھے بغیر ایک کان‌والا وہ شخص یوں بولا کہ اس کے ہونٹوں کو مشکل ہی سے جنبش ہوئی۔

"کہو نوجوان چھیلا، تم نے ابھی تک جوا کھیلنا نہیں چھوڑا؟ میں نے سنا ہے کہ تمہارے پاس اتنے زیادہ پیسے ہیں جتنے کہ آسمان پر ستارے... برسات کی کسی رات میں۔"

عمر نے مڑکر قولمت کو دیکھا۔ پہلے تو سوچنے لگا کہ اس نے کیا کہا پھر ایک‌دم چیخنے کے انداز میں قہقہے لگاتا ہوا وہ نمدے پر لوٹ گیا۔

نصرت‌اللہ نے ان باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ کس قدر گستاخی! بدتمیزی! نہ سلام نہ دعا، نہ ایک نظر دیکھنا اور

اوپر سے اس کا مذاق اڑانا، اسے تو چاہئے کہ انتقاماً یہاں سے اٹھ جائے، چلا جائے لیکن دلال توردیمت نے خوش اخلاقی سے اسے بیٹھنے کو کہا اور وہ بیٹھ گیا۔

عمر نے منمنائی آواز میں اپنا پسندیدہ گانا شروع کر دیا:

دیکھو ذرا کوے اڑ رہے ہیں
مارغیلان کے راستے پر جا رہے ہیں...

پھر اس نے فلسفہ بگھارنا شروع کیا:

"ان ہی کو لے لو، یہ جو ہیں ہمارے سب سے معزز قولمت عظیم۔ یہ بھلا کاہے سے بنے ہیں؟" اور پھر عمر خی‌خی کرنے لگا اور نشے سے بوجھل آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں۔ "یہ تو بنے ہیں ہیروں سے! قیمتی جواہرات سے... اور اب ہمارے معزز توردیمت کو دیکھو ذرا۔ بھلا کوئی ان کے برابر کا ہے، کوئی ان کا بدل ہو سکتا ہے؟ تو گویا ایک ہی بات ہوئی! وہی خوشبو ان میں بھی آتی ہے... یہاں تک کہ میرا محبوب دوست اور بھائی نصرت‌الله..."

"یہ تو ابھی بالکل چھوکرا ہے" کالا قولمت اکھڑپن سے بڑبڑایا۔ اور پھر اس نے ایک ایسا کش کھینچا جیسے چلم کو کھا ہی جائےگا اور کڑوے دھوئیں کو نصرت‌الله کے منہ پر پھونک دیا۔ "ذرا یہ یاد رکھنا! میرا مقصد تمہارے باپ کے پیسے یا جائیداد کو حاصل کرنا نہیں کیونکہ اب اس کا کچھ بھروسہ نہیں۔"

نصرت‌الله غصے میں اچھل‌کر کھڑا ہونے ہی والا تھا کہ عمر نے ایک بار پھر اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا، اس کے کندھے پر ڈھے پڑا۔

"بھائی نصرت‌الله، تم میرے باپ اور میرے روحانی استاد ہو! میں تمہارے سب دشمنوں کو کچل ڈالوں‌گا! تم خفا تو نہیں ہو؟ ایں؟ ذرا ان سب کو بتا دو کہ تم کون ہو! بوزا*

---

* شراب۔ اڈیٹر۔

چاھئے تھوڑی سی؟ ابھی تمہارے لئے منگوا بھیجتا ہوں۔ تم تو میرے مالک ہو، آقا ہو، تمہارے لئے تو میں کچھ بھی کر دوں گا۔ توردیمت، ذرا دوڑ تو جا بازار، جلدی سے، اور تھوڑی سی بوزا لے کے آ۔ وھاں یہ برف کی جیسی ٹھنڈی ملتی ھے!"

دلال توردیمت دوھرا ھوکر دوڑتے ھوئے زینے چڑھنے لگا۔

"او ھو، ھو ھو" عمر نے بکرے کی شہوت بھری آواز میں کہا۔ "میں نے ایک حسینہ دیکھی، کیا متوالی چال جیسے تتلی پھڑپھڑاتی ھوئی اڑ رھی ھو۔ آہ۔ حسین پری، میری قسمت میں تو تیرا غلام ھونا لکھا ھے! اس ساحرہ کی آنکھوں نے میرے بھٹکے ھوئے دل میں تیر پیوست کر دئے، بالوں کی جڑوں تک میں اس پر عاشق ھوا، ناخنوں تک اس پر مر مٹا۔ آہ، مجھے کپکپی ھو رھی ھے، میرا دم نکل رھا ھے، میں مر رھا ھوں!" اس نے ایک زور کی چیخ ماری اور گھٹنوں کے بیچ میں سر دے کر اونگھنے لگا۔

نصرت‌اللہ کو ڈر کے مارے ٹھنڈے پسینے چھوٹ رھے تھے۔ اب وہ بالکل اکیلا تھا اور کالے قولمت کے بالکل سامنے۔ اس کی زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی، جبڑوں میں بائنٹے آ رھے تھے۔ کوئی ھنسی دل‌لگی کی بات کر کے بھی وہ خوف سے پہلو نہیں بچا سکتا تھا۔

"میری تجویز ھے کہ تم بھی عشق میں مبتلا ھو جاؤ" کالے قولمت نے زور سے جمائی لیتے ھوئے کہا۔ "کانپنا اور مر جانا... تم بس اسی بھر کے ھو!"

نصرت‌اللہ نے چپ‌چاپ غصے کی حالت میں کمر میں بندھا پٹکا نوچ کر کھول ڈالا اور اپنے ارد گرد غیرارادی طور پر نگاہ ڈالتے ھوئے اس رقم کو اینٹوں کے فرش پر بکھر جانے دیا جو اس نے اپنے باپ سے چرائی تھی۔

کالے قولمت نے ایک اچٹتی سی نظر پیسوں پر ڈالی اور بڑی تیزی کے ساتھ پلک جھپکتے میں مداری کی طرح فوراً پانسہ کہیں سے برآمد کر لیا۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے ھتھیلی سے پانسے نکالے یا اپنی آستین سے۔

خاموشی کے ساتھ جھومتے ہوئے اس نے آدھا روپیہ، چلم کی نے سے، نصرت‌الله کے سامنے کھسکا دیا:

"یہ گاڑی کے کرائے کے لئے ہے" اس نے اطمینان سے کہا۔ "سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے تم سب بانکے لونڈوں کا نام ہی کھیلنےوالوں کی فہرست سے خارج کر دیا ہے۔"

عمر جاگ پڑا۔ اس نے سوتے میں بھی روپئے کی خوشبو سونگھ لی تھی لیکن نصرت‌الله کے ہوش ابھی تک بجا نہیں ہوئے تھے اور وہ کھویا کھویا سا پانسے کو تک رہا تھا جو بالکل اس کے سامنے پھینکا گیا تھا اور ٹپا کھاکر یوں اس چکنی چمکتی اینٹ پر جا بیٹھا تھا جیسے اسے گوند لگاکر چپکا دیا گیا ہو۔

"تم جیت گئے" عمر بڑے جوش سے چیخا۔

پانسے پر سات دکھائی دے رہا تھا۔

کالے قولمت نے پانسے کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

"ارے، میں نے تو طے کر لیا تھا" وہ لاپروائی سے بولا۔ "روپئے کے لئے ان لونڈوں سے کھیلوں‌گا ہی نہیں۔"

پانسہ پھر اڑا، ٹپا کھایا اور پھر اسی چکنی اینٹ پر جاکے بیٹھا۔

نصرت‌الله پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ پانسے پر سے اپنی نگاہیں اٹھا ہی نہیں پا رہا تھا۔

"سات کوے" عمر گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ اور پھر ایک‌دم سنجیدہ سا ہوکر وہ گن گن‌کر نوٹوں کی گڈیاں جیبوں میں یوں رکھنے لگا جیسے یہ کوئی بڑا لذیذ کام ہو۔

نصرت‌الله کو اپنے جسم پر ٹھنڈے پسینے کی بہتی ہوئی دھاریں محسوس ہوئیں، سات کوے... اس کے معنی یہ تھے کہ اس کو گلے میں سات ہزار روبل ڈالنے ہوں‌گے۔ آج تو شیطان ہی اس کو جوئےخانے میں لایا مگر اب وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

پھر گلے میں رقم کا ڈھیر، چودہ ہزار روبل کے نوٹوں کی گڈیاں نظر آئیں اور اب کالے قولمت کے وجود میں بھی جیسے جان سی پڑ گئی۔ اب وہ چلم کی نے سے نوٹ نہیں سرکا رہا

تھا۔ اس نے یہ ظاہر کرنے کی جھوٹی کوششیں بھی ترک کر دیں کہ اسے اکتاھٹ سے جمائیاں آ رھی ھیں۔ اور پانسہ ھاتھ میں اچھالتا ھوا آلتی پالتی مار کے کولھوں کے بل بیٹھ گیا۔

اتنے میں دلال توردیمت بوزا بھری ایک چمڑے کی چھوٹی مشک لے آیا۔ عمر سے اس کی ملاقات سیڑھیوں پر ھوئی، اس نے وھیں ایک پیالہ بھر کے چڑھا لی اور پھر اپنی شور و غل والی حرکتیں کرنے لگا۔

عمر کی نشیلی چیخ پکار سے نصرت اللہ کو بےحد طیش آیا، اسے ویسے بھی متلی سی محسوس ھو رھی تھی مگر اس نے کالے قولمت پر نگاھیں جمائی رکھیں۔ قولمت بھی برابر نصرت اللہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رھا، اس کی چڑیا سی گول گول، چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں رفتہ رفتہ خون اتر رھا تھا۔

دلال توردیمت نے کھیلنے والوں کے آگے جھاگ دیتی ھوئی بوزا کے پیالے پیش کرنے شروع کئے۔ نصرت اللہ نے اپنا پیالہ ایک گھونٹ میں ختم کر دیا، اس کے ھاتھ کانپ رھے تھے۔ کانوں میں جیسے روئی ٹھنسی ھوئی تھی، آنکھوں کے سامنے سرخ دھند چھائی تھی۔

عمر کی آواز اسے دوسرے کمرے سے آتی ھوئی لگ رھی تھی۔

"آقا، مالک، دیکھئے آپ ھمارے نصرت اللہ کو ناراض نہ کر دیجئے گا... لوگوں کی ھتک کر دینا کوئی اچھی بات نہیں ھے..." اس کا ھاتھ میں تھاما ھوا پیالہ ٹیڑھا ھو گیا اور بوزا نصرت اللہ کے کالر کے اندر گر گئی۔ "میں نے سنا ھے، اس کی جلد ھی شادی ھونے والی ھے، باپ کی جائیداد اب اس کی ھونے والی ھے، میں قسم کھاتا ھوں، سچ کہتا ھوں اور تب پھر ھم لوگ کھیلیں گے اصلی کھیل۔ ھاں!"

پہلی بار کالے قولمت کے چہرے پر مسکراھٹ کی ایک پرچھائیں سی دکھائی دی۔

"ارے، ھم لوگ وہ بڑا کھیل تو تب کھیلیں گے جب اسے یہ جائیداد مل جائے گی! شادی ھونا ھے بڑی مزے کی بات!

اور تم عمر بائے، تم سچی بات نہیں کہہ رہے ہو، میں نے اس نوجوان چھوکرے کو ناراض کرنے کے لئے کیا کیا ہے بھلا؟ الٹے میں تو اس کو بہت پسند کرتا ہوں" قولمت کی بات میں بالکل طنز یا مسخرہ‌پن نہ تھا۔

اس نے پےدرپے بوزا کے کئی پیالے چڑھا لئے اور پھر جو پانسہ پھینکا تو توقع کے خلاف وہ ہار گیا...

اس نے گلے میں سے خود رقم اٹھائی، اسے ایک رومال میں باندھا اور نصرت‌الله کی طرف بڑھا دیا۔

بائے کے بیٹے کا سر چکرانے لگا۔ دلال توردیمت ٹھیک کہتا تھا، اگر اس آدمی کا ایک کان کٹ گیا تھا تو حیرت کیا، شیطان جو اس کے ہاتھ کی رہنمائی کرتا تھا، بس چوک ہی گیا! قسمت بھی تو پانسے کی طرح چھے رخ کی ہوتی ہے۔ ہاں، آدمی اس طرح کھیل سکتا ہے! اب تو نصرت‌الله اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کوئی خطرہ نہ مول لے۔ اتنے میں پانسہ نصرت‌الله کے ہاتھ میں آ گیا۔

"اچھا تو یہ رہا" اس نے سوچا اور اپنا سینہ کھول دیا۔

پانسہ پھینکتے ہوئے اس نے اپنے ننگے سینے پر زور سے ہاتھ مارا اور توہم بھرے خوف سے چلایا:

"گارت کم!"

"ارے واہ، وہ مارا تم نے!" عمر چیخا۔

نصرت‌الله نے پھر پانسہ پھینکا:

"گارت کم!"

"ارے واہ، وہ مارا تم نے!" عمر پھر چیخا۔

نصرت‌الله کے سامنے، گلے میں اب رومال سے تقریباً دوگنا روپیہ تھا تو وہ جیت رہا تھا، وہ کالے قولمت سے جیت رہا تھا!

عمر اور دلال توردیمت نے کن‌انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور سمجھ گئے: بلی چوہے کو بہلا بہلاکر بالکل اپنی ناک کے پاس لا رہی تھی، وہ چوہے کو یہ احساس دلا رہی تھی کہ اس کے پنجے مفلوج ہو گئے ہیں اور وہ اس کا شکار نہیں

کر سکتی لیکن دلچسپ منظر تو وہ ہوگا جب وہ ایک دم جھپٹے گی،...' اور تب چوھا بےچارہ کیسا دنگ رہ جائے گا۔

پانسہ چند منٹ اس ہاتھ سے اس ہاتھ میں آتا جاتا رہا۔ کالا قولمت اپنے پورے رنگ میں تھا۔ وہ پیاسوں کی طرح بوزا غٹاغٹ پیتا جاتا اور اپنے مدمقابل کی تعریفیں کرتا جاتا۔ توردیمت اور عمر بھی نصرت‌الله کی تعریفیں کرتے جاتے اور دیکھتے جاتے کہ اب کالے قولمت نے اپنا واحد کان کھجانا شروع کر دیا ہے۔

پھر شام ہو گئی، اندھیرا چھا گیا، دلال نے شمع روشن کی۔

آخرکار ایک کان‌والا اکتا گیا اور پھر جو اس نے کھیلنا شروع کیا ہے تو ایک گھنٹے کے اندر سارا روپیہ اس کے پاس واپس پہنچ گیا۔

نصرت‌الله گنگ ہوکر خلا میں گھورے جا رہا تھا، نہ اسے کچھ دکھائی دے رہا تھا، نہ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا۔ شروع تو یہ بازی یوں ہوئی تھی کہ اس کے بٹوے میں روپیہ تھا اور دل میں خوف کی یخ جم رہی تھی اور ختم یوں ہوئی کہ بٹوہ خالی تھا اور جسم یوں لرز رہا تھا جیسے بخار چڑھ رہا ہو۔ اور کالا قولمت ایسی حالت کو دھیمی آنچ پر کباب لگانا کہتا تھا۔

نصرت‌الله کو کچھ یاد نہ تھا کہ وہ کب یہاں آیا تھا اور کتنی رقم ہار چکا تھا۔ اسے تو بس وہ چھوٹی سی پالش کی ہوئی، چکنی، پیلے رنگ کی گوٹ نظر آ رہی تھی جو پانسہ کہلاتی تھی۔ ساری دنیا ہڈی کے بنے ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر ناچ رہی تھی مگر اب وہ اس کے ہاتھ کہاں آ سکتے تھے۔ وہ تو اس کالے، سیاہ آدمی کے بالوں بھرے پنجے میں پہنچ گئے تھے۔ وہ آدمی جسے نہ منت خوشامد متاثر کر سکتی، نہ کوئی دھمکی جس پر اثر ڈال سکتی تھی۔

وہ آدمی سارا روپیہ بٹورتے ہوئے بولا:

"میں باپ کی جائیداد پر نہیں کھیلتا" اس کی آواز پھر سپاٹ اور بےنیاز ہو گئی تھی۔

سب کچھ ختم ہو گیا۔ نصرت اللہ جوئےخانے کی زمین کھرچ رہا تھا۔ اس کے ناخن زخمی ہو گئے تھے۔ اس کے پاؤں ایسے سن پڑ گئے تھے کہ اٹھنے کی ہمت نہ تھی، شراب نے الگ دماغ کو گڑبڑا دیا تھا۔ ان سبھوں نے مل کر اسے نشے میں دھت کر دیا تھا۔

عمر کی طرف مڑ کر وہ ایک بار زور سے گرجا۔ عمر ہچک کر اس سے دور ہٹ گیا اور چلایا۔

"او۔ہو۔ہو۔ہو... تم سمجھتے ہو کہ بس جو ہونا تھا وہ ہو چکا؟ تم غلطی پر ہو، مالک! ہمارے باز نے تو ابھی پنجے ذرا ہی سے تیز کئے ہیں، دولت مند دولھا تو بس کچھ ہی کھیل کھیلا ہے۔ اگر ایسی ہی آن پر بن گئی تو وہ تو اپنی دلھن تک کو بازی پر لگا دے گا!"

لڑکھڑاتا ہوا نصرت اللہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے اندھادھند طیش کی چنگاریاں اڑ رہی تھیں، چیچک کے داغ پھول کر کالے ہو گئے تھے، سینے سے گڑگڑاتی ہوئی اگڑم بگڑم آوازیں اٹھ کر گلے میں پھنس رہی تھیں مگر اس سے نہ کچھ بولا جا رہا تھا، نہ کچھ کیا جا رہا تھا۔ بس اس نے زینے کے سہارے کو پکڑا اور اپنے آپ کو سیڑھیوں پر گھسیٹنے لگا۔

نہ اس کے ساتھ کوئی آیا نہ پیچھے۔ ٹھوکریں کھاتا، مٹی کی دیواروں کا ہاتھوں اور کہنیوں سے سہارا لے کر خود کو سنبھالتا وہ تاریک سنسان گلیوں میں گھومتا رہا۔ اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ کہاں جا رہا ہے۔ ایک گلی کے نکڑ پر رک کر اس نے ٹیلیگراف کے کھمبے پر اپنا سینا ٹیک دیا اور یاد کرنے لگا کہ اس بازی میں کیا ہوا تھا لیکن اسے کچھ یاد نہ آیا۔ اس کے دماغ نے کام کرنے سے بالکل انکار کر دیا۔ پھر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ کہاں تھا؟ مگر اسے اپنے سامنے صرف کالے قولمت کا چکنا، سیاہ، ایک کان والا سر دکھائی دے رہا تھا اور عمر کی آواز اس کے کانوں میں صاف سنائی دے رہی تھی: "وہ تو اپنی دلھن تک کو داؤ پر لگا دے گا..."

نصرت‌الله نے دانت پیسے۔

"ہاں، اگر ایسا کروں تو پھر! لگا دوں گا دلہن کو داؤ پر! تو کسی سے کیا مطلب ہے؟ شاید میں تو اپنے باپ کو بھی داؤ پر لگانا چاہوں... جھوٹے کہیں کے! سور... تم مجھے نہیں ڈرا سکتے، ٹھہر تو سہی، کالے شیطان! میں واپس آؤں گا... ابھی تجھ سے کشتی لڑتا ہوں... تیرے گلے میں اپنے دانت نہ گڑا دوں، تیرا خون نہ پی جاؤں تب ہی کہنا!"

اس درمیان کالا قولمت اس بات کی احتیاط کرتے ہوئے کہ اسے کوئی نہ دیکھے، مسلم محمد سعید کے یہاں جا رہا تھا، مسلم محمد سعید جو کم‌سخن اور خاکسار تھا اور چائے کا تاجر کہلاتا تھا۔

آٹھواں باب

اناخان کی قمری سے اس کے میٹنگ سے چلے آنے کے بعد سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اور اسے ان عورتوں کے موڈ کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ تھا جو اب بھی قدرت‌الله کے یہاں کام کر رہی تھیں۔

"ہم لوگوں نے ان عورتوں کو بالکل چھوڑ دیا ہے... یہ بات ٹھیک نہیں ہے" جوراخان نے اس سے شکایتی لہجے میں کہا۔ "تم ان کے گھروں کو جاؤ اور ان سے ملاقات کرو۔"

قمری نعمانچہ میں ایک ٹوٹے پھوٹے، چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی جو مٹی کی ایک کمزور دیوار سے گھرا ہوا تھا۔ اناخان کو وہ ایک برآمدے میں ملی جو سرکیوں کی ٹٹی سے گھرا ہوا تھا۔

قمری کے ہاتھ میں ایک لوہے کی، دھوئیں سے سیاہ کیتلی تھی، اس کے دونوں بچے ایک کھری چٹائی پر بیٹھے تھے اور بوڑھی عنظیرت ذرا دور پر، سائے میں بیٹھی تھی۔

جب اناخان برآمدے پر چڑھی اور پرنجے اتارا تو عنظیرت جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ "ارے اناخان، تم آئی ہو بیٹی؟" وہ بڑبڑائی اور پھر اپنے کندھے کے پیچھے ایک دو بار تھتکارا: "تھو تھو... شکراللہ... تھو تھو..."

اناخان نے افسوس کے ساتھ خالی صحن کو دیکھا جو دھوپ سے جھلس کر سفید ہو رہا تھا اور جس میں ایک بھی پیڑ نہ تھا، گھاس یا ہریالی کی ایک پتی نہ تھی۔ بیچوں بیچ صحن میں ایک بوجھ بھر پرانی روئی رکھی تھی اور اس کے پاس ایک ہلتا ہوا چرخا جسے جابجا سنلیوں اور چیتڑوں سے باندھا گیا تھا۔ ٹین کا ایک ٹکڑا بھی وہاں رکھا تھا جو کچھ پرانی تھالی یا سینی کی طرح لگتا تھا۔ اس پر دو چار پونیاں اور کچھ الجھا ہوا سوت رکھا تھا۔

صاف نظر آ رہا تھا کہ قمری پہلے سے بہت زیادہ دبلی ہو گئی ہے۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں، جھری پڑے ہونٹوں کے اندر سے بڑے بڑے دانت اور زیادہ نمایاں ہو گئے تھے، چھدرے بالوں میں سفیدی کی لکیریں تھیں!

"یہ کتنی اکیلی ہے، کوئی بےچاری کی خیر خبر رکھنےوالا نہیں ہے" اناخان نے سوچا اور اس کو اس خیال سے بہت ہی دکھ ہوا۔

"بہن قمری، کیا کام پر نہیں جاتی ہو؟"

"جاتی ہوں۔ مگر آج کچھ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، بیٹھو نا۔ تم نے بڑا اچھا کیا جو آئیں، تمھارا بہت شکریہ جو مجھے بھلایا نہیں۔ مہربانی کرکے بیٹھ جاؤ نا!"

"گھر پر بھی کام کرتی ہو؟"

"ہاں، جو ہو سکتا ہے وہ کرتی ہی ہوں۔ کارخانے میں تو اب کچھ کمائی ہوتی نہیں، لوگ بائے کا "متا" ہی نہیں خریدتے اور اب تو اس نے ہماری نگرانی بھی بند کروا دی

ہے اور جب کام ہی نہیں تو تنخواہ کا کیا سوال ہے۔ اچھا، میں چولھے پر چائے تو چڑھا دوں ویسے کھانے کو تو گھر میں کچھ ہے نہیں۔"

وہ اپنے "کاووش" ننگے پیروں سے پھٹ پھٹ کرتی چولھے کے پاس گئی۔

"ارے، جو کچھ ہے اس کے لئے شکر اللہ کا" دادی عنظیرت نے اپنے کرتے کی چوڑی آستینوں سے اپنے آپ کو پنکھا کرتے ہوئے چڑچڑےپن سے کہا۔ "تم تو ہمیشہ قسمت کو کوستی رہتی ہو بہو، یہ تو ہم عورتوں کا مقدر ہی ہے، اب جو کچھ ہے وہ بھی نہ رہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

اناخان بچوں کے پاس گئی، وہ دونوں چٹائی سے اٹھکر برابر برابر کھڑے ہو گئے۔ دو بیٹے دونوں پاجامہ نہیں پہنے تھے، پیٹ نکلے ہوئے جو میلی قمیضوں سے پورے ڈھکے بھی نہیں تھے، ان کے دھوپ سے سنولائے بغیر دھلے ہوئے منہ پسینے سے چمک رہے تھے۔

"بیٹے، تمہرا منہ اتنا گندہ کیوں ہے؟" اناخان نے بڑے لڑکے سے پوچھا۔

"اب یتیموں کے بارے میں کیا تمہیں یہ امید ہے کہ وہ صاف ستھرے ہوں‌گے، بیٹی!" عنظیرت نے لڑکے کی طرف سے جواب دیا۔

اناخان کے دل میں تیر سا لگا، اس کی بچیاں بھی بےباپ کے تھیں۔

"بچے تو نہ ہوں تو بدبختی اور ہوں تو بدنصیبی، جدھر سے بھی دیکھو مصیبت ہی مصیبت ہے" عنظیرت نے اپنی بات جاری رکھی۔ "عورتوں کے لئے تو بس مصیبت ہی مصیبت ہے۔"

"آپ شکایت تو نہیں کر رہی ہیں، دادی ماں؟ آپ تو کہئے شکر اللہ کا!" اناخان طنزیہ انداز میں مسکرائی۔

"میں کھوں‌گی بیٹی، ضرور کھوں‌گی۔ ایسے بھی لوگ تو ہیں جن کے حالات دس گنا زائد خراب ہیں۔ شکر اللہ کا۔"

اتنے میں قمری ایک سینی لئے ہوئے آئی اور بچوں میں سے ہر ایک کو ایک ایک ٹکڑا مکئی کی روٹی دی۔ پھر اس نے چٹائی اٹھائی اور اسے سرکنڈے کی دیوار سے لگاکر کھڑا کر دیا تاکہ جہاں اناخان بیٹھی ہے وہاں دھوپ نہ پڑے۔

دادی عنظیرت نے کپکپاتے ہاتھوں سے جلدی جلدی مکئی کی روٹی توڑی اور ایک ٹکڑا اپنے پوپلے مسوڑھوں سے چبلانے لگی۔

"میں تو تمہیں دیکھتی رہ جاتی ہوں، بیٹی" وہ اپنے کپڑوں پر سے بڑی احتیاط سے روٹی کے ذرے اٹھاتی ہوئی بولی۔ "میں تو بس دیکھتی ہی رہ جاتی ہوں اور مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہیں ہوتا، سنا تھا کہ جب تم نے بائے کا کارخانہ چھوڑا تو تم نے اپنا چچوان (چادر) اور پرنجے آگ میں جھونک دیا تھا اور حجام کے یہاں سے بال کٹوا لئے تھے اور ہونٹوں پر سرخی تھوپ کر گھومتی پھرتی تھیں۔ توبہ، توبہ... میں تو قبولتی ہوں کہ ہاں بھئی، میں نے تو یقین مان لیا تھا۔ اب میں تو بڑھیا ٹھہری، شکر اللہ، کہ وہ سب تمہارے بارے میں لوگوں نے جھوٹی کہانیاں گڑھی تھیں۔"

اناخان کا ماتھا ٹھنکا۔

"لیکن یہ سب کہانیاں اڑاتا کون ہے؟"

"وہ حضرت کی بیوی ہیں نا۔ وہی جو ہماری پاک بیبیوں میں سے ایک ہیں نا۔ تو انہوں نے اس دن چالیسویں روزے کے موقعے پر بڑی دریادلی دکھائی تھی، روزہ کھلنے کے بعد انہوں نے ضیافت کا انتظام کیا تھا، بڑے مزے کی چیزیں پکی تھیں اور بےشمار لوگ تھے۔ گیہوں کا اتنا دلیا پکا تھا کہ علاقے کے تمام لوگوں کے لئے کافی ہوتا۔ تم تو جانتی ہو کہ گیہوں کا دلیا متبرک غذا ہے تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں بھی چلی جاؤں، خاص کر اس لئے کہ میری نواسی بیمار تھی، وہ بس ایک دم ہی بیمار پڑ گئی تھی اور دو ہفتے میں بےچاری بالکل پیلی ہو گئی تھی۔ تو میں اسے بھی لیتی گئی، جیسے ہی ان پاک بی بی نے اس کو دیکھا وہ

بولیں: "یہ کسی بدروح کا سایہ ہے! یہ صرف بچی ہی کو پریشان نہیں کرتا، یہ تو اس کی ٹوپی تک میں سرایت کر جاتا ہے۔ اللہ، اللہ۔" پھر انہوں نے اس کی ٹوپی اتاری اور بولیں کہ دیکھو، دیکھ رہی ہو تعویذ بالکل سوکھ گیا ہے، تو مجھے یاد آیا کہ ہاں، رات بھر یہ ٹوپی اخروٹ کے پیڑ کے نیچے پڑی رہی تھی اور یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ اخروٹ کے پیڑ میں بدروحیں گھسی سوتی رہتی ہیں! پھر ان پاک بی‌بی نے وہ تعویذ نوچ کر وہیں کے وہیں آگ میں پھینک دیا اور فوراً ایک نیا تعویذ لکھ دیا اور اس کے بعد انہوں نے بچی کی زبان پر تھوکا۔ میں ان کے قدموں میں بیٹھی رہی۔ جب میں اٹھی تو کیا دیکھتی ہوں کہ سبحان تیری قدرت، بچی کے گالوں پر سرخی آ گئی تھی۔"

"پھر اس کے بعد کیا ہوا؟"

"پھر وہ پہنچی ہوئی عورت آ گئی۔ وہ تیشیک قاپ قاق والی اور اسے حال آ گیا تھا تو وہ کھیلنے لگی..."

"لیکن ان لوگوں نے کہا کیا؟" اناخان نے اپنی بےصبری کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"وہ عورت، وہ پہنچی ہوئی عورت گول گول چکر کاٹنے لگی۔ بہت ہی تیز، یہاں تک کہ لوگوں نے اس کو بازوؤں سے پکڑ لیا۔ وہ اتنی کمزور اور بےبس ہو گئی کہ وہ بےہوش ہوکر، فرش پر بیٹھی عورتوں کے بیچ میں جا گری اور اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ پھر اس نے گھوم کر ہم سب کو دیکھا اور پاک شیخ بہاؤالدین کے متعلق کچھ سرگوشیوں میں کہنے لگی۔ "آہ عورتو، کمزور عورتو" اس نے کہا۔ "بدمعاش لوگوں سے ہوشیار رہو، بدمعاش مردوں سے خبردار رہو، بدروحیں خاص کر بیواؤں کو بھکاتی ہیں۔"

"لیکن اس بات سے اس عورت کا مطلب کیا تھا؟"

"یہی کہ گناہ کوئی کرتا ہے اور بھگتان سب کو بھگتنی پڑتی ہے، عشق کی بیماری جوان بڈھے سب پر وہم کی طرح یکسان طاری ہوتی ہے۔ بیواؤں والی بیماری عورتوں کو ہوتی ہے اور وہ اس میں درد سے تڑپتی ہیں، بخار ہو ہو جاتا ہے اور

پھر شیطان اسی حالت میں ان کو مردوں کے پاس گھسیٹ لے جاتا ہے!... پتہ نہیں بیٹی، اب ہم لوگ تو جاہل ٹھہرے۔ اے پروردگار، تو ہمیں سب آفتوں سے بچا، اپنی پناہ میں رکھ" عنظیرت دعا مانگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اناخان کے لبوں پر ایک غمگین مسکراہٹ آئی۔

"مت روئیے دادی، مجھے بتائیے نا، شاید میں خود ہی کچھ نہیں سمجھتی اور نہیں جانتی کہ کدھر جا رہی ہوں۔"

عنظیرت نے حقیقی خوف کے ساتھ سرگوشی کی۔

"یہ جو بیواؤں والی بیماری ہے نا، یہ ایسا لگتا ہے کہ مردوں کو بھی پریشان کرتی ہے، اس کے اثر سے مرد لوگ اپنی بیویوں اور بچوں کو چھوڑ دیتے ہیں، انہیں بارکوں میں بھیج دیتے ہیں۔ اور اتنی زیادہ عورتوں کو یہ بیماری ہوتی جاتی ہے کہ حکومت نے ان کو آوارگی سے بچانے کے لئے کوآپریٹو کھول دئے ہیں، ان کوآپریٹوں میں ان کو کھانا ملتا ہے اور اب تو ساری دنیا ہی میں یہی ہو رہا ہے! ان پاک بی‌بی نے پیشین‌گوئی کی ہے کہ اب جلد ہی عورتوں کو مار پڑنی شروع ہونے‌والی ہے، جن مردوں پر بدروحوں کا اثر نہیں ہوا ہے وہ اپنی بیویوں کو پیٹیں گے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ تم لوگ حیران نہ ہونا اگر... اگر..." اور آگے دادی عنظیرت کچھ کہتے کہتے رک گئیں، بولیں: "اسی لئے میں کہتی ہوں، شکر اللہ، شکر اللہ۔"

پھر ایک عجیب تکلیف‌دہ خاموشی چھا گئی، قمری اپنی جگہ بیٹھی بیٹھی سر جھکائے رہی۔ اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اناخان سے نگاہیں ملائے۔ آگ پر رکھی لوہے کی کیتلی زور سے سنسنانے لگی، قمری اس کی طرف یوں بڑھی جیسے اناخان سے نظریں ملانے سے بچ گئی ہو۔ ایک چکنے، کالک بھرے کپڑے سے جو دیگچے صاف کرنے کے کام آتا تھا، قمری نے کیتلی آگ پر سے اٹھائی اور چائے بنانے لگی مگر وہ برآمدے میں واپس جاتے ہچکچا رہی تھی۔

"اف پروردگار، کتنی بری بات، کیسا فضیحتا!" دادی عنظیرت بڑبڑائی۔

"میری بات سنئے" اناخان اٹھی اور اپنا پرنجے سنبھالتی ہوئی بولی۔ "اگر آپ کو اس میں واقعی ذرا سا بھی یقین ہے تو پھر پیاری خالہ قمری، میں پل بھر بھی آپ کے گھر میں نہیں ٹھہر سکتی!"

"اناخان، میری بہن" قمری نے نگاہیں اٹھائے بغیر گھبرا کے کہا۔

"اب میں تو ایک جاہل عورت ہوں، بیٹی" عنظیرت نے بات ٹالنے کے لئے کہا۔ "مگر تعریف ہو خدا کی ہزار بار کہ میرا دل صاف ہے۔ میں کسی دوسرے کے متعلق کیا کہہ سکتی ہوں بھلا۔ چاہے وہ تم ہی ہو کہ جس نے کوآپریٹو کھولا تھا۔

"اور آپ میرے متعلق کیا کہتی ہیں خالہ قمری، آپ بتائیے، کیا آپ کو بھی مجھ میں وہ بیماری نظر آتی ہے۔ ہاں یہ سچ ہے، کوآپریٹو تو ضرور میں نے کھولا ہے، میں اس کی صدر بھی ہوں۔ مگر مجھے کس کا خیال تھا؟ اپنا؟ مردوں کا؟ اتنا تو آپ مجھے جانتی ہیں، آپ کو معلوم بھی ہے کہ میرے دل میں یتیم بچوں کا خیال تھا، اپنے اور آپ کے بچوں کا میں مذہب کے خلاف کچھ نہ کہوں گی دادی عنظیرت مگر یہ گندی ذلیل افواہیں اور بدنامیاں ان لوگوں کی پھیلائی ہوئی ہیں جو خدا پر یقین نہیں رکھتے جو غیرذمےدار ہیں۔ اگر آپ کو میری بات بری لگے تو میری صاف گوئی کو معاف کر دیجئے گا مگر میں نے جو راستہ اختیار کیا ہے اس پر سے ہٹنے والی نہیں ہوں۔"

"اناخان!" قمری اس کا راستہ روکتے ہوئے چیخ کے بولی۔ "اناخان، بیچاری نزاکت کو کل اس کے میاں نے مارا۔

اتنے میں لکڑی کا پھاٹک چوں سے بولا اور درزی مدرائم کی بہو شائستہ ہنستی ہوئی دوڑتی ہوئی آنگن میں آئی۔ اس کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔

"کہئے خالہ قمری! کہئے دادی شکر اللہ! اناخان، میری جان، میں نے تمہیں یہاں آتے دیکھا اور تمہارے پیچھے بھاگی:... مگر یہاں آپ سب لوگوں پر یہ قبرستان کا سا سناٹا کیوں طاری ہے۔"

"آؤ، آؤ شائستہ، آؤ بیٹی" قمری نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "تم کتنی خوش نظر آ رہی ہو، آؤ تم ہی کو دیکھکر ہم اپنی آنکھوں کو مسرت دیں۔"

"تمھارا بیٹا تو بڑا پیارا نکلتا آ رہا ہے" دادی عنظیرت نے اٹھکر بچے کو اپنی گود میں لیتے ہوئے کہا۔ "تھو تھو، خدا نظر بد سے بچائے! کیسا گلگوتھنا ہو گیا ہے! رنگ بھی صاف نکل آیا ہے، تھو تھو!"

شائستہ خوش ہوکر ہنسی، بچہ بھی ہنسا!

"ہاں، ہاں، ہم ایسے ہی ہیں" اس نے دادی عنظیرت سے بیٹے کو لیتے ہوئے بار بار کہا۔ "لوہے کے پلنگ پر سفید چادر اوڑھکر سوتے ہیں، ملائی والا دودھ پیتے ہیں، ٹب میں نہاتے ہیں! اور ایسے اڑتے ہیں! اس نے بچے کو سر سے اوپر کدایا اور بچہ جو ذرا بھی نہیں ڈرا تھا، کلکاری مارکے ہنسنے لگا۔

"ارے، تو اسے گرا دے گی! خدا تیری عمر دراز کرے... بیٹھ جا نا!"

"ان لوگوں کو بتا دے، بیٹا کہ ہم دونوں تو کام پر جا رہے ہیں" شائستہ بچے کو لپٹاتی ہوئی بولی۔

"تم اسے ساتھ لے جاتی ہو؟" قمری نے شک اور رشک کے ساتھ پوچھا۔

"ظاہر ہے! ان کو بتا دے، بیٹا کہ میں اور میری ممی تو ساتھ کام پر جاتے ہیں۔ ممی کوآپریٹو میں جاتی ہے اور میں کوآپریٹو کی نرسری جاتا ہوں۔" پھر شائستہ اناخان کی طرف مڑی: "بہن صدر صاحبہ، ہم دونوں ساتھ چلیں میں دوڑکر ذرا کپڑے بدل آتی ہوں۔"

اناخان آہستہ آہستہ برآمدے کے پاس سے گزری، بےچینی اور پریشانی سے اس نے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ آخرکار اس نے ارادہ کر ہی لیا، دھیرے سے بولی:

"میں نزاکت کے یہاں جاؤں گی بہن، اس سے ملنے۔"

قمری اور عنظیرت نے خوف سے گھبراکر ایک دوسرے کو دیکھا، پھر اناخان کی طرف، روتی ہوئی ہاتھ پھیلائے لپکیں:

"اللہ ھمیں اپنی پناہ میں رکھے! مت جاؤ وھاں، تم اس کے شوھر کو نہیں جانتیں، وہ تم سے بدتمیزی کرے گا..."

"ھاں بیٹی، تم کیوں کسی کے پھٹے میں پاؤں دو، آخر تم سے کیا واسطہ ھے میری بچی! الگ ھی رھو اس قضیے سے۔ اب تو نزاکت ٹھیک ھے، شکر اللہ۔"

"چیخو چلاؤ مت، میری بھولی بھالیو، اطمینان رکھو" اناخان نے سکون کے ساتھ جواب دیا اور اس نے جوراخان کے الفاظ دوھرائے: "تم اپنے دل کا کہا کیا کرو اور اسے خاموش رھنے پر مجبور نہ کیا کرو۔ خالہ قمری، میرا راستہ یہی ھے اور پھر جیسے تم لوگ امید لگائے بیٹھی تھیں کہ میں آؤں گی ویسے ھی نزاکت بھی تو میرے آنے کی امید لگائے بیٹھی ھوگی۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رھی ھوں نا؟"

بانکے نورمت کا مکان گلی کے ایک ایسے نکڑ پر تھا جہاں کافی بھیڑ بھاڑ رھتی تھی، اس کے مکان کے پاس ھی ایک سفیدے کا اتنا اونچا پیڑ سایہ کئے رھتا تھا جس کو اس علاقے میں کہیں سے بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ بزرگوں کو یہ سفیدے کا درخت اور اس پر سارس کا وہ گھونسلہ اپنے بچپن سے یاد تھا۔ ویسے تو بانکا نورمت ایک کاریگر تھا مگر وہ اپنے کرگھے سے زیادہ افیون سے بنے ایک نشے، کوک نار کو بیچ بیچ کر رئیس ھو گیا تھا۔

لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ نورمت کے مکان چھت پر رھنےوالے بوڑھے سارس کو بھی افیون کی لت تھی کیونکہ نورمت سوکھے ھوئے پوستے کے بیج جو بچ جاتے تھے ان کو چھت پر پھینک دیا کرتا تھا اور سارس ان کو کھا کھاکر پکا نشےباز بدمعاش بن گیا تھا۔ جب وہ چھت پر اترتا اور ادھر ادھر دیکھتا اور اسے اپنی پسندیدہ شے نہ ملتی تو غمگین ھوکر ایک ٹانگ پر کھڑا ھو جاتا۔

جوانی میں نورمت بڑا بانکا چھبیلا تھا اور اسی لئے اس کا یہ نام پڑ گیا۔ پھر قسمت سے اس کا اور سودخور قدرت‌اللہ کا ساتھ ھو گیا۔ دونوں دوست بن گئے اور بائے نے اس

کی شادی ایک یتیم لڑکی نزاکت سے کر دی جو نمانگن میں اس کے ایک دور کے رشتےدار کی بیٹی تھی۔ لوگ یہ افواہ بھی اڑاتے تھے کہ نورمت کوکنار بیچنے میں قدرت‌اللہ کی مدد کرتا ہے۔

اناخان اپنے سر پر چچوان ڈالے سیدھی اندر کے آنگن میں چلی گئی۔ نزاکت ہوا میں اپنے میاں کے کام کرنے کی جگہ کی چوکھٹ کے پاس، ایک سوتی دری پر لیٹی تھی۔ وہ ایک چندیا پر لگانےوالی ٹوپی کاڑھ رہی تھی۔ اناخان کو دیکھ‌کر اس نے ٹوپی تو الگ رکھ دی مگر اٹھی نہیں۔

"تم کیوں آئی ہو؟" اس نے غصے اور تندی سے پوچھا۔ پھر یکایک وہ رونے لگی اور سسکیاں بھرتے ہوئے بڑی بےچارگی سے بولی: "کیوں آئی ہو؟"

اس کا خوبصورت چہرہ جو ہمیشہ بےفکری سے کھلا رہتا تھا زرد ہو رہا تھا، آنکھیں اور ہونٹ سوجے ہوئے تھے، گالوں پر تمام اوسمہ پھیلا ہوا تھا۔ اناخان سمجھ گئی کہ نزاکت اٹھ نہیں پا رہی ہے، وہ اس کے پاس ہی بیٹھتی ہوئی بولی:

"اس نے کیوں تمہیں مارا؟"

نزاکت کے کچھ کہنے سے پہلے اس کا شوہر آنگن میں آ گیا۔

"خدا مجھے موت دے" نزاکت نے گھبراہٹ میں بہت آہستہ سے کہا۔

بانکا نورمت بطخ کی طرح پھٹ پھٹ چلتا تھا۔ اس کا قد ناٹا تھا، بھورا سا لٹکا ہوا چہرہ، اور سوجی آنکھیں جیسے ابھی سوکر اٹھا ہے۔ وہ نیا صاف ستھرا پتلون پہنے تھا جو اونچے چمکتے ہوئے لانگ بوٹ میں ٹھنسا ہوا تھا۔

غصے نے اناخان کی ہمت بڑھا دی۔ چچوان ڈالے بغیر اس نے اس مرد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال‌کر اسے گھورا۔ بانکا نورمت ایک‌دم رک گیا، اپنے گھر میں ابھی تک اس کی ملاقات یوں کسی اجنبی عورت سے نہیں ہوئی تھی کہ اس کا منھ کھلا ہو اور سامنا ہو جائے اور نہ کسی نے آج تک اس پر حقارت کی ایسی نظر ڈالی تھی۔

"مجھے بتاؤ تم نے اپنی بیوی کو کیوں مارا؟"
بانکا نورمت بھد سے شہتوت کے ایک پیڑ کے ٹھنٹھ پر بیٹھ گیا اور اپنے مردانہ وقار کو بچانے کے لئے اس نے منہ پھیر لیا۔ آج تک کسی عورت نے اتنی سختی اور آزادی کے ساتھ اس سے بات نہیں کی تھی۔ پرسوں تو اس نے خود ہی قدرت اللہ سے اسی قسم کا سوال کیا تھا۔
"میں کیوں اپنی بیوی کو ماروں؟"
قدرت اللہ نے نزاکت پر یہ الزام لگانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس کے یہاں کام کرنےوالی عورتوں کو بداطوار بنا رہی ہے لیکن بانکے نورمت نے نزاکت کی ہی طرفداری شروع کر دی اور کہا کہ وہ تو کارخانے میں کام کرتی اور قدرت اللہ کا حکم مانتی رہی ہے۔
"میں نے تمہیں یہاں اس لئے نہیں بلایا ہے کہ تم اپنی بیوی کے گن گانے لگو" بائے نے اپنا تھل تھل ماتھا سکوڑکر کہا۔ "تمہاری آنکھوں پر تو پردے پڑے ہیں، وہ تمہیں الو بنا رہی ہے لیکن تم یقین رکھو، مجھے معلوم ہے کہ اسے بیواؤں کی بیماری لگ چکی ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ اس وبا کو روکا جائے۔ میں جو تم سے کہتا ہوں، تم وہ کرو، تم ضرور اس کو مارو۔ وہ تمہاری بیوی ہے، میری بھتیجی ہے، بس ہاتھ میں ڈنڈا اٹھاؤ اور کام شروع کرو۔ جاؤ!"
بانکا نورمت بڑے مخمصے میں پھنس گیا۔ ظاہر ہے کہ اسے اپنے سے کسی بڑے کی بات تو ماننی ہی چاہئے تھی لیکن بلاوجہ، بےسبب، وہ اپنی بیوی کو کیوں مارے؟
اسے اس وقت بہانہ مل ہی گیا جب نزاکت بائے کے کارخانے کے متعلق بات کرنے لگی وہ تو سچ ہی کہہ رہی تھی کہ اب بائے کے واسطے محنت کرنا بالکل ہی بےکار تھا جبکہ کوآپریٹو میں عورتیں اچھا خاصہ کما رہی تھیں۔ نزاکت کا ارادہ کوآپریٹو میں شامل ہونے کا نہیں تھا لیکن اس نے بائے کی شکایت کی تھی۔ نورمت کے لئے اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو گیا اور صبح کو اس کا آنگن چیخ پکار، ہائے واویلا سے بھر گیا۔

نزاکت نے پہلے کبھی میاں کے ہاتھوں مار نہیں کھائی تھی اس لئے وہ بھی ہاتھاپائی کرنے لگی اور اس سے نورمت غصے سے پاگل ہو گیا اور جب تک اس کے اوسان درست ہوتے تب تک تو وہ اپنی بیوی کو اتنا مار چکا تھا کہ شاید بائے نے بھی اتنا نہ کہا ہوگا۔ اس نے اس خیال سے خود کو تسکین دینے کی کوشش کی کہ آخر یہ مار اس کی بیوی ھی کے حق میں تو مفید تھی کیونکہ اس نے مار مارکے وہ بھیانک بیماری اس کے جسم سے جھاڑ دی تھی، عورتوں کو تو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کیا بات ان کے حق میں مفید ھے۔

پھر بھی نورمت کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا، اسے اپنی بیوی پر بھی ترس آ رہا تھا اور دوسروں کے سامنے بھی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس ڈھیٹ اور خطرناک مہمان کو جو ایک مزدور کی بیوہ تھی، اپنے گھر سے نکال دے۔ اس کے سوال کے جواب میں بھی اس کے پاس کچھ کہنے کو نہ تھا۔

"بولتے کیوں نہیں ہو؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟" اناخان نے بڑی تلخی سے اپنا سر ہلایا۔ "جانتے ہو تم نے کس کو مارا؟ کس کو ذلیل کیا؟ تم نے اپنے آپ کو مارا، اپنے آپ ذلیل ہوئے۔ کیا تم میں بس دادی شکراللہ کے برابر عقل ھے؟ تم نے جھوٹ موٹ کی افواہوں اور گپ پر یقین کر لیا۔ یہ سب مولویوں کی اشتعال انگیزی ھے۔ کس نے تم سے کہا کہ ایسا کرو؟"

بانکا نورمت ایکدم گھبرا گیا۔ مولویوں کی اشتعال انگیزی؟ اشتعال انگیزی کیا ہوتی ھے؟ وہ اس لفظ سے ڈر سا گیا کیونکہ وہ اس کا مطلب بالکل نہیں سمجھا۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مزدور صابر کی بیوہ نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ اس نے کسی اور کے کہنے پر اپنی بیوی کو مارا تھا؟ یہ تو ایسی بات تھی جو نزاکت کو بھی نہیں معلوم تھی۔ بہرحال احتیاطاً اس نے سوچا کہ بھاگ لو، جواب ھی مت دو، ورنہ تو پھنسنے کا ڈر ھے۔

"وہ قانوناً میری بیوی ہے" وہ ٹھنٹھ پر سے تیزی سے اٹھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "پھر کسی کو ہم دونوں کے بیچ میں بولنے کا کیا حق ہے؟"

اناخان بس اس سے اتنا ہی کہلوا سکی کیونکہ اس کے بعد وہ رفوچکر ہو گیا۔ لیکن نزاکت کے شوہر نے جو کچھ کہا اور جس طرح کہا تھا اس سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ دفاعی رویہ اپنا رہا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دونوں میں سے کس بات پر زیادہ حیرت کرے — اپنے شوہر کی ندامت پر یا اس عورت کی ہمت پر جس نے اس کے شوہر کو نادم کر دیا تھا۔

"میں تمہارا شکریہ کس طرح ادا کروں؟" اس نے دھیرے سے کہا اور پھر یوں بولی جیسے اپنی وکالت کر رہی ہو۔ "تمہارے بغیر اب کارخانے کی فضا بڑی بے کیف لگتی ہے، تمہارے اور خالہ رضوان کے بغیر۔"

"ہاں، اکیلا ہونا سب سے بڑی مصیبت ہے بہن نزاکت، تم ہم لوگوں سے علاحدہ مت رہو" اناخان نے کہا۔ "یاد رکھو، ہم تمہارے دوست ہیں۔"

"کیا تم اتنی جلدی جا رہی ہو؟"

"کوئی میرا انتظار کر رہا ہے۔"

"تمہاری بچیاں؟"

"نہیں بہنیں۔"

"یہ بات سچ ہے کہ تم صدر بن گئی ہو؟"

"آؤ نا وہاں۔ تمہیں خود نظر آ جائے گا۔"

"اتنی زور سے نہ بولو" نزاکت نے گھبرا کر سرگوشی کی۔

"نہیں بہن، ایسا نہ کہو، میں تو جتنی زور سے میرا جی چاہے گا اتنی زور سے بولوں گی۔"

"خفا نہ ہو، میں تمہاری طرف سے ڈرتی ہوں۔"

"دل میں تو تم مجھ سے رشک کرتی ہوگی" اناخان جانے کے لئے تیار ہوتے ہوئے بولی۔ "لیکن یاد رکھو کہ تم مجھ سے زیادہ جوان ہو... اور پھر میں تو بیوہ ہوں۔"

نزاکت اداس نظروں سے جاتے ہوئے مہمان کو پھاٹک تک دیکھتی رہی

سورج نصف النہار پر تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب لوگ بازار سے لوٹ رہے تھے اور پرانے شہر کی پتلی گلیوں میں خاصی بھیڑ بھاڑ تھی۔ کچھ لوگ بازار سے مویشیوں کو ہنکاتے آ رہے تھے، ایک عورت ہاتھ میں ایک رنگین پنگورا لئے جا رہی تھی، ایک بوڑھا آدمی گدھے پر سوار، دونوں طرف لٹکی لدی ہوئی بوریوں پر اپنا پورا بوجھ ڈالے چلا جا رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے اور نرکل کی سیٹیاں بجا رہے تھے، کچھ محتاج آوارہ گرد یوں ہی ٹہل رہے تھے۔ لسی بیچنے والی، برابر ان تھک صدائیں لگا رہے تھے، قسمیں کھا کھا کر پکار رہے تھے کہ برف کی طرح ٹھنڈی ہے لسی! ادھر ادھر، یہاں وہاں، کٹھ پتلی والی بھی نظر آ جاتے تھے جو مختلف شہروں کا دورہ کیا کرتے تھے۔

اناخان ان دکانوں کے پاس سے ہوتی ہوئی، لوہاروں والی گلی سے نکلی اور ایک بڑے سے تہ ہونے والے لوہے کے پھاٹک کے سامنے رک گئی۔ وہاں ایک خانہ ساز سائن بورڈ بغیر رنگے ہوئے کھمبے پر لگا تھا جس پر لکھا تھا: "لال اکتوبر* ۔ پرانے شہر کی عورتوں کی کوآپریٹو"۔ اناخان جب بھی پھاٹک سے گزرتی تھی تو ایک بار اس سائن بورڈ کو ضرور پڑھ لیتی تھی۔

پھاٹک ایک بڑے سے صحن میں کھلتا تھا جس کے طول اور عرض میں رسیاں بندھی ہوئی تھیں، صحن میں اندر کی طرف نیچی نیچی سفید سفید تعمیرات تھیں جن میں چمکدار نئی مگر بغیر شیشوں والی کھڑکیاں صحن میں کھلتی تھیں۔ ان کھڑکیوں میں سے کرگھوں کی گھوں گھوں اور عورتوں کی باتوں کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔

صحن میں پہنچ کر اناخان نے اپنا پرنجے اتارا اور بالاخانے کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ پھاٹک کے پاس جو مکان تھا اس کی چھت پر یہ ہلکا پھلکا سا بالاخانہ بنا ہوا تھا۔ اسی میں کوآپریٹو کا دفتر تھا۔

---

* اکتوبر ١٩١٧ء کے انقلاب کا مختصر نام۔ اڈیٹر۔

صوفیہ اسے دروازے پر ھی ملی۔

"ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے" اس نے کہا۔

صوفیہ کے بچہ ہوئے ایک ھی ماہ گزرا تھا مگر وہ کام پر آنے بھی لگی تھی۔ پہلے تو کوآپریٹو کی نرسری میں صرف اس کی بچی ویرا ھی تھی، پھر شائستہ اپنے بیٹے کو لے آئی، کوآپریٹو اپنی سب سے زیادہ توجہ نرسری اور کینٹین کی طرف دیتا تھا۔ کئی ایک پلنگ، چادریں اور بڑے بڑے تام‌چینی کے ٹب نرسری کے لئے منگوا لئے گئے تھے، کھانے کے کمرے میں پلیٹیں اور ڈونگے وغیرہ مہیا کئے گئے تھے۔ بہت جلد یہ واضح ہونے لگا کہ یہ سب ٹھیک ہو رہا تھا کیونکہ جو عورتیں کوآپریٹو میں شامل ہوئی تھیں وہ اس کی شدید حمایتی ہو گئی تھیں، شروعات نہایت امیدافزا تھی۔

"تو کہو بھئی، نعمانچہ کا کیا حال چال ہے؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"نعمانچہ میں جوش پھیلا ہوا ہے، ہمارا کوآپریٹو ایک حقیقت ہے اور یہی اس کا سب سے موثر پروپیگنڈا ہے۔ قمری بھی‌جلد ہمارے یہاں آنے‌والی ہے۔"

"کیا اس نے خود یہ کہا ہے؟"

"نہیں، خود تو اس نے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ دراصل اس نے کچھ بھی نہیں کہا مگر میں بھانپ گئی ہوں کہ وہ آئے گی ضرور۔"

"دیکھا تم نے؟ اب اگر میں جاتی تو ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ تم لوگ ایک دوسرے کو سمجھتی ہو۔"

"کل میں اپنے ساتھ رضوان خالہ کو بھی لے جاؤں گی۔"

"بہت ٹھیک ہے، ضرور لے جاؤ۔ وہ تمہارے ساتھ جائے گی تو یہاں کرگھا چلانے سے زیادہ مفید کام وہ نعمانچہ میں انجام دے سکے گی۔ یاد رکھو، جوراخان نے کیا کہا تھا کہ بس "متا" ھی بننے میں نہ لگی رہو، اپنے چاروں طرف جو لوگ ھیں ان کو نہ بھول جاؤ۔ اس وقت ضروری بات یہ نہیں ھے کہ ہم کتنا "متا" بنتے ھیں بلکہ یہ ضروری ہے کہ ہم کتنی عورتوں کو اپنے کوآپریٹو کی طرف گھسیٹتے ھیں۔"

پھر صوفیہ نے غور سے اناخان کی صورت پر چھائی پریشانی کو دیکھا۔

"اچھا اب مجھے بتاؤ، ہوا کیا؟"

"بات یہ ہے" اناخان اداسی سے مسکراکر بولی۔ "لوگوں کو جتنا میں سمجھتی ہوں اتنا ہی تم بھی سمجھتی ہو۔"

پھر اس نے صوفیہ کو وہ "پاک بی‌بی" والی باتیں اور پیشین‌گوئی کا حال سنایا اور بتایا کہ بیچاری نزاکت پر کیا گزری۔

"ہم کو تو اس کی توقع ہی کرنی چاہئے تھی" صوفیہ نے کہا۔ "یہ بہت بھونڈا کام ہے، یہ تیر صرف جاہل لوگوں پر ہی بیٹھ سکتا ہے۔"

"لیکن عورتوں کو مار سے زیادہ بدنامی سے ڈر لگتا ہے۔ نزاکت سب کچھ جاننے کے لئے تڑپ رہی ہے مگر ہم لوگوں سے ملنے یہاں آنے کی ہمت نہیں کر پا رہی ہے۔"

"کوئی بات نہیں، ہم بہت جلد اس کو باور کرا دیں‌گے کہ سچائی کیا ہے۔ اچھا سنو، ابھی ابھی میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔ اگر ہم لوگ نعمانچہ ہی میں اپنی کوآپریٹو کی دکان کھول لیں تو کیسا رہے؟ عورتوں کی دکان۔ ذرا سوچو؟ صرف عورتوں کے لئے دکان۔ آخر قرآن میں عورتوں کے لئے یہ تو منع نہیں ہے کہ وہ خریداری کرنے جائیں اور نہ ہی ان کو بازار جانا منع ہے۔"

اناخان بڑی دلچسپی سے بات سننے کے لئے صوفیہ کے اور قریب جھکی۔

"مجھے یقین ہے، جوراخان اس خیال کو بہت پسند کریں‌گی" صوفیہ نے اپنی بات جاری رکھی - "عورتوں کی دکان ضرور ہو، وہاں کوئی مرد نہ آئے اور عورتیں بےتکلف، بےجھجھک وہاں جا سکیں، ٹھیک ہے نا؟ دکان ہی میں عورتیں اپنی سہیلیوں سے ملیں، پرنجے اتارکر آزادی سے بات‌چیت کریں، اطمینان سے ادھر ادھر کی گپ شپ ہو۔ اسی میں ہمارے "متا" کی عمدگی کا ذکر بھی آ جائے اور چلتے چلاتے یہ ذکر بھی کہ کوآپریٹو میں کیا کیا کچھ ہو رہا ہے۔

یہ سب خبریں سن کر عورتیں گھر جائیں۔ ایک زمانے سے لوگ یہ کہتے آئے ہیں کہ جب کوئی عورت اپنے گھر سے کسی کی چھلنی مانگنے نکلتی ہے تو دو لفظ ساتھ لےکر نکلتی ہے اور جب وہ واپس آتی ہے تو پچاس لفظ ساتھ لاتی ہے۔ ازبیکوں میں یہی مثل مشہور ہے نا؟ ظاہر ہے کہ اس درمیان ہم بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرکے نہیں بیٹھے رہیں گے، دکان میں عورتوں کی ملاقات تم سے، مجھ سے اور جوراخان سے ہوگی، ہم لوگ پوسٹر اور تصویریں ٹانگیں گے اور عورتوں کو بتائیں گے کہ بچوں کی نگہداشت کیسے کی جائے، ان کو نہلانا دھلانا، صفائی رکھنا وغیرہ۔ ہم لوگ دکان میں ایک سامان بیچنےوالی لڑکی کو بھی رکھ لیں گے جو ان کو ہر بات سلیقے سے سمجھائےگی۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟"

"صوفیہ میری پیاری، تم تو بڑے کمال کی ہو! کیا خوب سوجھی!"

"تو پھر کس کو رکھیں؟"

"ہم حاجیہ کو رکھیں گے" اناخان نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کہا۔ "وہ بہت اچھی لڑکی ہے، کلب میں اس نے پڑھنا لکھنا بھی سیکھ لیا ہے۔ اب وہ ایرگاش کے نام خط مجھ سے نہیں لکھواتی بلکہ خود لکھتی ہے..."

"وہ ذرا زیادہ کمسن نہیں ہے؟" صوفیہ کچھ شبہہ کے ساتھ بولی۔

"اب جہاں تک کاروبار کا سوال ہے ہم سب ہی ناتجربےکار ہیں" اناخان نے کہا۔ "اگر بہن جوراخان مجھ پر اعتبار کر سکتی ہیں تو میں حاجیہ پر بھروسہ کر سکتی ہوں۔"

صوفیہ نے بڑے پیار سے اناخان کے بالوں کو کنپٹیوں پر برابر کیا۔

"تم اتنا زیادہ بدل گئی ہو آنیا* کہ میں تمہیں پہچان نہیں پا رہی ہوں۔"

---

* وہ اناخان کو پیار سے آنیا کہہ کر پکارتی ہے۔ اڈیٹر۔

"تم خود ہی تو کہتی تھیں صوفیہ بہن کہ کوآپریٹو کا ایک دن گھر میں بند ہوکر گزری ہوئی تمام عمر سے بھی زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔"

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ‌کر مسکرائیں اور ساتھ نکل‌کر کوآپریٹو کی کارگاہوں کی طرف چلی گئیں۔
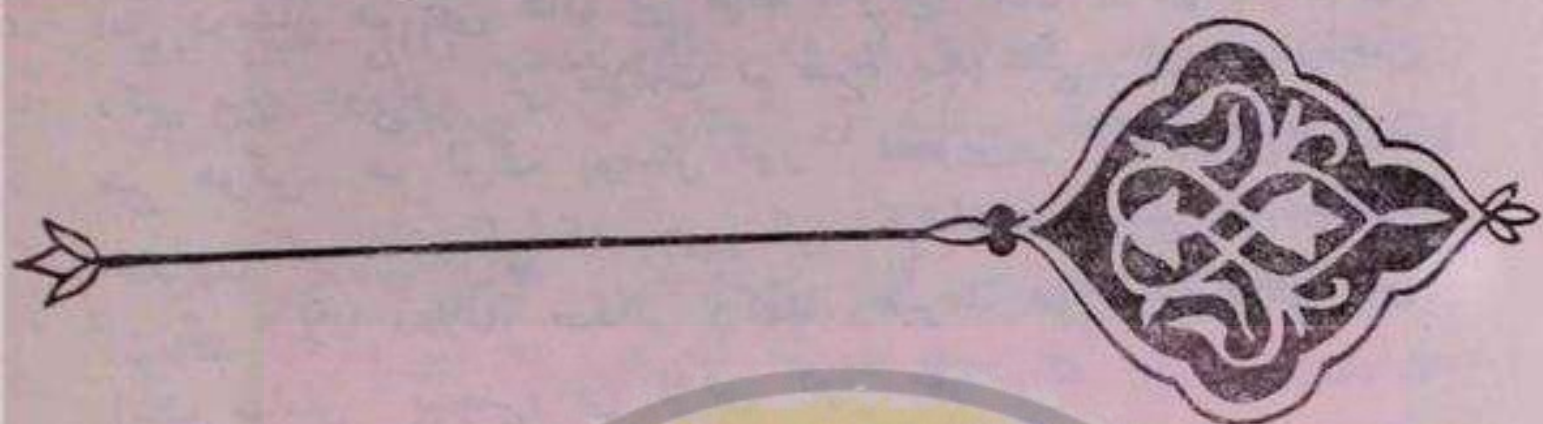
نواں باب

ادھر کچھ دنوں سے نعیمی، قدرت‌اللہ کے یہاں صرف رات گئے آتا تھا۔ بائے کی فیاضانہ مہمان‌نوازی اور اس سے اور اس کے دوستوں سے قوم کے مستقبل اور اسلام کے متعلق جوشیلی بات‌چیت سے خود کو بالکل محروم رکھنا مشکل تھا لیکن احتیاط بہرحال ضروری تھی۔ نعمانچہ میں اب ایسے لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی جو بائے کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے تھے اور اس سے تعلقات رکھنے‌والے کسی بھی شخص کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

خود بائے کے گھر کا ماحول بھی زیادہ تاریک ہوتا جاتا تھا، عالی جناب قدرت‌اللہ خواجہ صاحب جلباتی اور چڑچڑے بھی کچھ زیادہ ہی ہو گئے۔ وہ کنجوسی کرنے لگا تھا اور دھیرے دھیرے وہ اپنے حاشیہ‌برداروں اور تعریف کرنے‌والوں سے محروم ہوتا جاتا تھا۔

بیوہ اناخان کی بیٹی سے نصرت‌اللہ کو شادی کی اجازت دے دینے کی حیرت‌انگیز تجویز بھی ایک ایسا سوال بن گئی تھی کہ خود ہڑیلے مقسوم کو بھی اس فیصلے کے صحیح ہونے میں شک تھا اور یہ بات قدرت‌اللہ کے لئے بدنامی کا باعث بنتی

جا رہی تھی۔ یہ تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اناخان تک اس فائدہمند شادی کی افواہیں پہنچی تھیں کہ نہیں، لیکن وہ اپنی سی کئے جا رہی تھی۔ مغرور بائے شادی کا پیغام بھجوانے میں تاخیر کر رہا تھا اور اس اثنا میں وہ اپنا کام کئے جا رہی تھی۔ وہ جو نعمانچہ کا کبھی مالک تھا، آج اس کی جگ ھنسائی ہو رہی تھی، دوست پیٹھ پیچھے اس کا مذاق اڑاتے اور وہ کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔

نصرتاللہ کو حسب دستور یہ سب کچھ نظر نہ آتا۔ وہ خود کو دولھا تصور کئے گھومتا، مزے کرتا پھرتا اور کنوارپنے کے دن شراب پی پی کر گزارتے ہوئے ایک مسرت بھری زندگی، ایک شادی شدہ آدمی کی زندگی بسر کرنے کی تیاری کرتا رہتا۔ خاجار بیبی نے بھی اپنے بیٹے کی شادی بخیر و خوبی انجام پا جانے کی امید نہیں چھوڑی تھی تاکہ وہ خوشی کے ساتھ مر سکے۔ چپکے چپکے وہ بچولیوں کو بھی تیار کرتی رہتی اور وہ بس انتظار میں تھی کہ کب اس کا شوہر اشارہ کرے اور وہ دلھن کے یہاں پیغام بھیجے لیکن بائے روز بروز زیادہ پریشان اور اداس ہوتا جاتا۔

ایک روز، کافی رات گئے جب نعیمی بھی قدرتاللہ کے یہاں موجود تھا، بائے کی بیٹھک کے دروازے پر ہڑیلا مقسوم نظر آیا اور پٹے ہوئے کتے کی سی مسکین، خوشامد بھری نظروں سے اس کو دیکھنے لگا۔

"کیوں؟ اب اور کیا ہوا؟" قدرتاللہ طیش کے مارے حواس کھوتے ہوئے چیخا۔

"حضور، آپ خفا نہ ہوئیے، ہمارے کارخانے میں سات عورتیں کام کرتی ہیں لیکن آج صرف دو ھی کام پر آئی ہیں۔"

"کیا! کیوں؟"

"مالک، وہ جو کھپٹ بڑھیا ھے نا قمری، وہ ان سب کو عورتوں کے کوآپریٹو میں لے گئی۔"

بائے اپنا سر پکڑکر پیچھے کو تکیے پر ڈھے پڑا۔ آخر اس کی غیرت کو کیا ہوا تھا؟ اب تو وہ دوسروں کے آگے اپنے جذبات کے اظہار میں تامل بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

ھڑیلا مقسوم دہلیز پر ہی کھڑا کھڑا ایسا غمگین منھ بنائے تھا جیسے وہ ان باتوں اور اس واقعے سے بےحد پریشان اور ملول تھا، جیسے سب کچھ قصور اسی کا تھا۔

"اب کھڑا کھڑا منھ کھولے میری صورت کیا تک رہا ہے" قدرت‌اللہ اس پر پھر چیخا۔ "ختم ہی کروا دے قصہ! اٹھا دے میرا جنازہ، پڑھ دے مجھ پر فاتحہ!"

"مجھ پر ناراض نہ ہوئیے، مالک، وہ ایک آدمی تیشیک‌قاپ‌قاق سے آیا تھا نا اور پھر ایک لڑکا چاربازار سے آیا۔ یہ دونوں کہتے ہیں کہ دکانوں میں کچھ بک نہیں رہا ہے، پچھلے چند دنوں میں وہ لوگ گز بھر "متا" بھی نہیں بیچ پائے ہیں اور آپ کا دکاندار متقوزی بھی چلا گیا، اب وہ کوآپریٹو میں کام کرتا ہے..."

"بس کر، دور ہو" بائے گھونسہ تان‌کر ایک‌دم کھڑا ہو گیا۔ "نکل یہاں سے۔ احسان فراموش، ذلیل خوشامدی ہیں سب کے سب۔"

ھڑیلا مقسوم جھک‌کر آداب بجا لاتے ہوئے الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی قدرت‌اللہ اکڑوں بیٹھ گیا، اس پر بالکل سکتہ طاری ہو گیا تھا، پھر مایوسی کا بخار نکالنے کے لئے وہ بڑبڑ کرنے لگا۔

"بھائی محمود خواجہ، اب تو مجھ میں بالکل دم نہیں رہا، ان سب نے مل‌کر مجھ کو مار لیا۔ بالکل مار لیا۔"

نعیمی اپنی چھڑی میں لگے، ھڈی کے موٹھ سے کھیلنے لگا کیونکہ اسے قدرت‌اللہ کو تسکین دینے کے لئے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

"اس کا تو مطلب ہے تباہی۔ تمہارا بائے قدرت‌اللہ ختم ہو گیا، سنتے ہو مسلمانو! قدرت‌اللہ ختم ہو گیا۔" ایک پل کے لئے اس کا فطری طیش اس کی رنجیدہ نظروں میں لپکا اور پھر بجھ گیا۔

لیکن مصیبت جب آتی ہے تو تنہا نہیں آتی، بہت سی پریشانیاں ہمیشہ ایک ساتھ آتی ہیں...

چوں کرکے دروازہ کھلا اور نصرت‌الله دھڑ سے اندر داخل ہوا۔ سر سے ٹوپی غائب تھی۔ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں، سینے پر سے قمیض پھٹی ہوئی تھی، وہ بمشکل کھڑا ہو پا رہا تھا۔ اس کے چہرے اور سینے پر پسینہ بہہ رہا تھا۔

"ابا" اس نے گھٹتے ہوئے گلے سے، بےاختیار آتی ہوئی سسکیوں کو بمشکل روک کر کہا۔ "مجھ سے میری دلہن چھن گئی..."

بائے کے ہاتھ میں سیپی اور مونگے کی جو تسبیح تھی وہ یکایک اس کے ہاتھ سے چھٹ کر زمین پر گر گئی اور پھر بائے نے اپنے پیلے رنگ کے بوٹوں کی اونچی ایڈی سے اسے کچلا تو چکناچور ہو گئی۔ نصرت‌الله اپنا سینہ پیٹتا، سر پیٹتا، لڑکھڑاتا باپ کے پاس سے ہوکر گزرا۔

پیشانی اور گھٹنے سے دھکا دےکر پاس‌والے کمرے کا دروازہ کھولا اور اس میں گھس کر فرش پر ڈھے پڑا۔

"ہائے، وہ کالا ناگ، ارے وہ ایک کان‌والا کتا..." نصرت‌الله زور سے چیخا۔

خاجار بی‌بی آنکھوں میں آنسو بھرے تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا جھریوں‌دار چہرہ سوکھے سکڑے خربوزے کا جیسا تھا۔

"دور ہو، نکل یہاں سے" بائے اس پر چیخا۔

نصرت‌الله کی ماں سکتہ کے عالم میں دروازے سے ہوتی غائب ہو گئی۔ نعیمی جلدی سے اس کے پیچھے لپکا اور اسے زنان‌خانے میں لے گیا۔ وہاں اسے تسلی دینے کے لئے سمجھانے لگا کہ نصرت‌الله صرف شراب کے نشے میں ہے اور کوئی بڑی خطرناک بات نہیں ہوئی ہے، اگر اسے نیند آ جائے گی اور سو جائے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا...

نعیمی اسے پہنچاکر بیٹھک میں آیا۔ اسے کافی ڈر محسوس ہو رہا تھا، دیکھا کہ بائے آلتی پالتی مارے ایک

قابل رحم حالت میں بیٹھا ہوا ہے جس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ بےحد خوفزدہ ہے۔

"بھائی محمود خواجہ، تم جلدی سے نصرت‌الله کے پاس چلے جاؤ۔ سن رہے ہو کیسا چیخ رہا ہے۔ خدا نہ کرے کوئی سن لے۔ ویسے ہی اس بیوہ نے مجھے اتنا شرمندہ کر دیا ہے اور اوپر سے بیٹا بھی ذلیل کرے! میری مدد کرو، میرے بھائی! کسی طرح اس کمبخت کا منہ بند کرو، اسے سمجھاؤ نا، اگر لوگوں کو پتہ چل گیا تو میں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں‌گا۔"

نعیمی سنبھل سنبھل‌کر دہلیز پر سے ہوتا ہوا پاس‌والے کمرے میں داخل ہوا۔

بائے کا لڑکا قالین پر اوندھے منہ لیٹا تھا۔ دھاڑتے دھاڑتے وہ بالکل پست ہو چکا تھا اور اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ نعیمی نے نرمی کے ساتھ اس کا شانہ چھوا۔

"ارے بھائی، ذرا ہوش میں آؤ میرے عزیز، اب جو گیا سو گیا، وہ تو مل نہیں سکتا۔ جب انسان جوان ہوتا ہے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ لو آؤ، اٹھو۔"

"جب انسان جوان ہوتا ہے؟ میں اس مردود کو دکھا دوں‌گا کہ وہ کتنا جوان ہے، کالا کلوٹا بدمعاش! میں اس کی ایسی تیسی کر دوں‌گا!"

"اب یہ سب دھمکیاں دینے سے تو کوئی فائدہ نہیں، آپ پریشان زیادہ ہو گئے ہیں، ہم لوگ اس معاملے کو دبا دینے کی کوشش کریں گے۔ سب ٹھیک ہو جائےگا، اب اس کی قسمت اچھی تھی تو کیا کیا جائے بھئی۔"

"قسمت اچھی؟ اچھا دیکھیں گے اور آپ بھی دیکھ لیجئےگا کہ کون کس کی کھال ادھیڑتا ہے۔"

نعیمی غیرارادی طور پر جھجھکا اور اسے یہ محسوس ہوا کہ وہ ناحق ہی اس خطرناک اور ناخوشگوار معاملے میں پھنس رہا ہے۔

"ہوش میں آؤ، میرے بھائی، تمہاری عقل کیا بالکل ہی گم ہو گئی ہے۔ کیا یہ اتنی جلدبازی اور پھوھڑپنے سے

کام کرنے کا وقت ہے؟ میری بات سنو اور اس بےوقوفی اور حماقت کو اپنے دماغ سے نکال ڈالو۔ ذرا دانت بھینچے رہو اور تھوڑا صبر اور تحمل دکھاؤ، ہم لوگ اس معاملے کو کسی نہ کسی طرح طے کر ہی دیں گے۔"

نصرت اللہ کے چہرے پر ایک مکار سی مسکراہٹ آئی۔

"تم کالے قولمت کو نہیں جانتے، کہتے ہو سب ٹھیک کر دوگے... ارے بھائی، ہم لوگوں نے کیا مٹھائیاں لپٹنےوالی کاغذ کی بازی تھوڑی ہی لگائی تھی، وہ آئے گا اور مجھے اس کا سامنا کرنا ہی پڑےگا۔" نصرت اللہ نے کانپتی انگلیوں سے فرش پر بچھے نمدے کے نیچے ٹٹولا اور ایک خنجر نکالا جو سیاہ رنگ کی نیام میں تھا۔ "اب آنے دو ذرا اس کو مگر وہ ساتھ ہی اپنا کفن لیے آئے تو ٹھیک ہے۔ عزرائیل کی طرح اگر ناخنوں سے اس کا کلیجہ باہر نہ نکال لیا تو کہنا۔"

نعیمی چونک کر پیچھے ہٹ گیا اور جلدی جلدی سرگوشی کی:

"کیا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ارے میرے بھلے آدمی، تمہاری مراد کس سے ہے؟ کچھ اپنے ماں باپ کا تو خیال کرو، مسلمانوں کو کیا ایسی حرکت کرنی چاہئے، ایسا سوچنا بھی مت، بھلا اصیل بانکے کہیں ایک دوسرے کے ساتھ ایسا کرتے ہیں اور اگر بات اتنی ہی بڑھ گئی تو چھوڑو، لے لینے دو اسی کو وہ لڑکی چاہتا تو۔ بس یہی ہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے، بدنامی نہ ہو۔ اور قصہ ختم۔"

نصرت اللہ نے اپنی پوری طاقت سے قالین میں چھرا مارا۔

"میں ہرگز لڑکی اس کو نہیں دوں گا۔ وہ اسے زندہ تو لے نہیں سکےگا، ہاں اس کا مردہ چاہے پا جائے، اگر مجھے نہیں ملےگی، وہ تو اسے بھی نہیں ملےگی۔"

نعیمی گنگ رہ گیا، اس کا منہ ایسا کھلا رہ گیا جیسے سانس لینے کے لئے ہانپ رہا ہو، یہ تو معاملہ بہت ہی زیادہ گڑبڑ تھا، ایسا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اب یہاں

سے غائب ہونا چاہئے اور جتنا ہی جلد ہو سکے اتنا ہی بہتر رہے گا۔

خوش قسمتی سے نصرت‌الله جلد ہی غین ہو گیا، اس کے تھل تھل منھ کے کونوں کے پاس جھاگ دکھائی دے رہا تھا اور وہ قالین پر آنکھیں بند کئے سیدھا لیٹا تھا۔

"اب ٹھیک ہے، بہت ٹھیک ہے" نعیمی نے بڑی مٹھاس کے ساتھ کہا۔ اس نے اپنی آواز اتنی اونچی کی تھی کہ دوسرے کمرے میں بھی سنائی دے اور پھر وہ پنجوں کے بل چلتا ہوا جلدی سے دروازے پر پہنچ گیا۔

بائے اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔

"کیوں؟ تم اس کی کھوپڑی میں کچھ عقل گھسا سکے؟"

"وہ سو گیا ہے، خدا چاہے تو ٹھیک ہو جائے گا۔"

"لیکن وہ یہ ہنگامہ کر کیوں رہا تھا؟ سڑی کہیں کا۔"

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا" نعیمی نے تسکین دینے‌والی آواز میں کہا۔ "کل صبح میں پہلا ہی کام یہ کروں گا کہ اس چائے کے تاجر سے بات کر لوں گا۔ میرا خیال ہے وہ اس ٹھگ قولمت کو جانتا ہے۔ اس درمیان آپ اپنے بیٹے سے ذرا صاف بات کر لیجئے گا، وہ بہت مایوس اور جان پر کھیل جانے کو آمادہ ہے اور سچ پوچھئے تو مجھے بھی اس بیچارے لڑکے سے بےحد ہمدردی ہے۔"

ایک منٹ بعد نعیمی بائے کے گھر کا لکڑی‌والا پھاٹک بند کر کے نکلا۔ لیکن جب وہ دس بارہ قدم آگے بڑھ گیا تب ہی اس نے اطمینان کی ٹھنڈی سانس بھری۔

اس کا چائے کے تاجر کے یہاں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، وہ ان سب سے جتنا ہی دور رہے اتنا ہی اس کے حق میں فائدہ مند تھا۔ الله پناہ میں رکھے! کمبختوں نے کیسا ڈرایا۔ ان لوگوں سے پریشانی اور گڑبڑ ہاتھ آنے کے علاوہ اور کیا امید ہو سکتی ہے۔ نہ جانے کب یہ کمبخت خود ڈوبیں اور دوسروں کو بھی لے ڈوبیں۔

مگر اب وہ کس کا سہارا ڈھونڈے؟ کون سی وہ جائےپناہ ہو جہاں راز کی باتیں کر سکے؟ کیا اب شہر میں کچھ بھی لوگ ایسے باقی رہ گئے ہیں جو ٹیچر نعیمی کے عزیز خوابوں سے ہمدردی رکھتے ہوں - ایک عظیم مسلم ترکستان کا خواب! کیا واقعی کچھ طاقتیں، کچھ ذرائع ایسے تھے جو اس خواب کو حقیقت بنا سکیں؟

گلی میں اندھیرا تھا، خاموشی تھی، نعیمی کو دیواروں، درختوں اور مکانوں کے سایوں میں مشکل سے فرق نظر آ رہا تھا۔ ہوا کا نام نہ تھا، پتہ تک نہیں ہل رہا تھا، اس کو اپنے قدموں کی بھی چاپ سنائی نہیں دیتی تھی، وہ خاموش تھی۔

کسی چیز نے ٹیچر کو پیچھے دیکھنے پر مجبور کیا۔ اس نے مڑکر دیکھا اور جو کچھ اس نے دیکھا اس سے اس کے گھٹنے کانپنے لگے کیونکہ وہ شخص دبے پاؤں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

کالا قولمت...

بیچارہ ٹیچر خرگوش کی سی پھرتی کے ساتھ اچک کر سڑک پر ایک طرف کو ہو گیا اور بچاؤ کے لئے ہڈی کے موٹھوالی چھڑی کی آڑ کر لی۔

"ڈرئیے مت، میں آپ کو گھر تک پہنچا دیتا ہوں" وہ شخص اس کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔ اور اس کی آواز سے نعیمی نے پہچانا کہ وہ چائے کا تاجر ہے۔

پھر نعیمی نے ایک بار اور اپنے اطمینان کے لئے اندھیرے میں جھانکا، واقعی وہ قولمت نہیں تھا۔ توبہ، اندھیرے میں بھی انسان کیا کیا تصور کر لیتا ہے۔

"مبارک ہے آج کا دن! کہتے ہیں کہ جب انسان خوفزدہ ہوتا ہے تو اپنے سائے کو بھی ملک‌الموت سمجھ بیٹھتا ہے" نعیمی نے کہا۔ "میرے عزیز محمد سعید، میں تو آج آپ ہی کی تلاش میں نکلا تھا۔"

"اور میرے عزیز ٹیچر، میں آپ ہی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ کیسا عجیب اتفاق ہے" چائے کے تاجر نے نعیمی کے سے ہی لہجے میں جواب دیا۔

اب نعیمی کافی حد تک سنبھل گیا، ایک اس قسم کی خوداعتمادی یا ڈھٹائی سی اس میں آ گئی تھی جو ڈر لگنے سے آتی ھے اور اسی لئے وہ جلدی جلدی باتیں کرنے لگا۔ اس نے بیان کیا کہ بائے کے بیٹے نے کیا حرکت کی تھی، کتنی نازیبا اور قابل نفرت تھی اس کی حالت۔ نیز یہ کہ اس نے کس چیز سے ایک مقتدر شخص کو دھمکی دینے کی جرأت کی تھی جو چائے کے معزز تاجر کا قریبی دوست تھا۔

"ارے بھائی ٹیچر، یہ سب جوانی کا کیا دھرا ھے" چائےفروش نے لاپرواھی سے کہا۔ "اب آپ جوانی کا کیا بگاڑ لیجئےگا! چلئے ھوگا، کرنے دیجئے اسے عیش، خوش ھو لینے دیجئے۔"

"لیکن وہ بےوقوف اس لڑکی کو قتل کر دے گا۔"

"ارے، اس جیسی بہت لڑکیاں ھیں، نصرت‌الله جانے اور اس کا کام جانے کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا کرتا ھے" چائےفروش نے بےنیازی سے جواب دیا۔ "تمہیں اور مجھے اس سے کیا لینا دینا ھے۔ تم اس بارے میں کچھ کہوگے؟ نہیں، تو بس ختم ھو گئی بات۔ ھے نا؟"

ٹیچر کو گفتگو کا یہ موڑ اچھا لگا، جوش میں آکے اس نے سر ھلاکے خامی بھری۔

"مجھے امید ھے" چائےفروش کہنے لگا۔ "آپ نے اس کو اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش نہ کی ھوگی؟ آخر نوجوانوں کے جنون میں دخل دینا کونسی عقل کی بات ھے؟"

"استغفرالله! ظاھر ھے، ایسا کرنا تو بےکار وقت ضائع کرنا ٹھہرا۔"

چائےفروش طنز کے ساتھ ھنسا، نعیمی کو اس کے سانولے چہرے میں اس کے سفید دانت چمکتے دکھائی دئے۔ پھر اس نے بڑے احترام و ادب سے ٹیچر کا بازو تھاما اور اندھیری سڑک پر احتیاط سے اس کے ساتھ ساتھ چلتا ھوا بولا:

"ویسے آپ اس بات سے تو اتفاق کریں گے کہ ہمارے زمانے میں خنجر کا وار اب شاذ و نادر ہی کہیں کیا جاتا ہے اور آج کوئی بھی نوجوان اگر اس اعلا اسلحہ کا استعمال کر سکتا ہے تو ضرور اس کا احترام کرنا چاہئے۔ اور یہ بھی عقل کی بات ہے کہ وار وہیں لگے جہاں اس کو لگنا چاہئے۔ کیا آپ ایسا نہیں سوچتے؟"

نعیمی کے گھٹنے پھر کانپنے لگے۔ لیکن چائےفروش اس کا بازو مضبوطی کے ساتھ پکڑے تھا۔ یہ اجنبی ہمیشہ ہی بہت زیادہ مودب رہتا تھا۔

"اچھا میرے عزیز ٹیچر، یہ بتائیے کہ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو وہ اسکول میں ادھر کچھ دنوں سے آتی ہے نا؟"

"آپ کی مراد کس سے ہے؟" نعیمی نے ایک بےآواز آہ بھری۔

"اگر میں غلطی پر نہیں ہوں" چائےفروش نے پھر کہا۔ "تو وہ اپنی ماں کا پرتجے پہنتی ہے، آپ نے کیا اس بات پر غور نہیں کیا ہے؟ اور سر شام جب اندھیرا ہو جاتا ہے تب تو ماں بیٹی میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔"

نعیمی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس نے گہری سانس لی، اپنے چاروں طرف دیکھا اور بازو چھڑانے کی کوشش کی لیکن چائےفروش نے تو اسے جیسے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔

"ارے ٹھہرئے تو، رہئے تو ذرا" دھیرے سے ہنستے ہوئے وہ بولا۔ "عورتوں کی بغاوت کے ہیرو، میں نے سنا ہے، آپ نے کس طرح عورتوں کے کلب میں اپنا نام روشن کیا ہے۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مجھے آپ سے ایسی کسی بات کی امید نہ تھی لیکن ہمیں الفاظ کی نشتریت کی قیمت بھی معلوم ہے اور آپ تو جانتے ہیں کہ میں ہر اس چیز کو پسند کرتا ہوں جس میں دھار ہو۔"

"میں... میں تو... بالکل نہیں چاہتا کہ... کہ..." نعیمی نے ایک ایسی قوت ارادی سے جواب شروع کیا جو اس کا معمول نہیں تھی۔

"میں سمجھتا ہوں، میں سب سمجھتا ہوں" چائےفروش نے اس کو خوش‌مزاجی کے ساتھ روکا۔ "آپ زیادہ نمایاں نہیں ہونا چاہتے، آپ نہیں چاہتے کہ لوگ معلوم کر لیں کہ آپ کیا ہیں اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ لوگ یاد کریں کہ آپ ٹھیک کرتے ہیں اور میں آپ کی بات سمجھتا ہوں۔ آپ کی طرح میں بھی اس کے متعلق گفتگو نہیں کرنا چاہتا، یقین مانئے میں آئندہ کبھی آپ کو کچھ بھی یاد دلانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسا کرنے کے لئے کافی سلیقہ رکھتا ہوں، مجموعی طور پر میں آپ کو ایک دوست کی حیثیت سے پسند کرتا ہوں۔"

نعیمی کی جیسے جان نکل گئی تھی، وہ اپنی چھڑی پر جیسے ڈھے پڑا تھا۔

"ہمیں اپنے دوستوں سے محبت کرنی چاہئے" چائےفروش شکایت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ "یاد کیجئے کہ آپ نے آج مجھے کیوں تلاش کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ آپ ایک پریشان‌حال باپ کی مدد کرنا چاہتے تھے جو کہ ہم دونوں ہی کا دوست ہے۔ یہ بات آپ کی نہایت قابل‌تعریف ہے، نہایت شریفانہ خیال‌وعمل۔ تو پھر ہم دونوں ہی مل‌کر اس کی مدد کیوں نہ کریں، آخر ہم دونوں ہی خداترس لوگ ہیں۔"

نعیمی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا مزاج جوڑ توڑ کرنےوالا مزاج تھا اور اس لئے وہ بےموقع بحث مباحثہ کبھی نہیں کرتا تھا۔

"کل شام اسکول کے بعد" چائےفروش نے نرمی کے ساتھ اپنی بات جاری رکھی، "اگر مجھے ٹھیک سے یاد ہے تو آپ اپنے ادبی حلقے کے لوگوں کو جمع کر رہے ہیں؟ ہاں،

اب تو مجھے بالکل یاد آ گیا: کل شام ہی تو۔ تو پھر ایسا ہونا چاہئے کہ آپ کافی دیر تک پڑھاتے رہئے حالانکہ وہ بالکل اتفاق لگنا چاہئے۔ بے شک آپ کا کلاس دیر تک جاری رہے گا! وہ لڑکی جتنی دیر میں ممکن ہو سکے، گھر واپس ہو۔ اور اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔"

"میں... میں..." نعیمی پھر بڑبڑایا۔

"بس بس، ٹھیک ہے، بھلے چائے فروش نے ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ "بات تو یہ ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے۔ کیا کوئی سچا مسلمان خدا کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ پھر آپ تو ایک نیک اور پرانے ٹیچر ہیں، آپ کا کام یہ ہے کہ آپ اپنے حلقے میں جوش کے ساتھ عمدہ تعلیم دیجئے، ایسی تعلیم، ایسے سبق جو آپ کے سامعین کو روحانی فیض عطا کریں اور وہ اپنی جگہ پر سنتے بیٹھے رہ جائیں۔ اس بات کے سلسلے میں تو آپ پر کوئی کیا الزام عائد کر سکتا ہے؟ اور جہاں تک باقی باتوں — طرح طرح کی افواہوں، تفتیش اور پوچھ گچھ کا تعلق ہے ان سے ہم کو کوئی سروکار نہیں۔ کیا اس کے متعلق کچھ کہیں گے؟ نہیں؟"

اور آخر چائے فروش نے نعیمی کی کہنی چھوڑ دی۔ جب بیچارہ پرانا، سیدھا سادہ ٹیچر ہوش میں آیا اور اس نے ادھر ادھر دیکھا تو اپنے کو گلی میں اکیلا پایا۔ اب وہ اپنے گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اور چاروں طرف ویسا ہی اندھیرا اور سناٹا تھا جیسا بائے کے گھر کے آس پاس۔

"کیا میں اس کے متعلق کچھ کہوں گا؟ نہیں۔ ہرگز نہیں" نعیمی نے اپنے آپ سے سرگوشی کی اور رات کی ٹھنڈک سے اسے ایک جھرجھری آئی۔

اس رات محمود نعیمی کی پلک سے پلک نہیں لگی اور ہنوز پو بھی نہیں پھٹی تھی کہ وہ قدرت‌الله کے گھر کی

طرف دوڑا۔ اسے گھبراہٹ تھی کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔ وہ بائے کے گھر اس مستحکم ارادے سے جا رہا تھا کہ اس کے بیٹے کو اس کے ان جلدباز، مجنونانہ منصوبوں سے باز رکھ سکے۔

نعیمی اور نصرت‌الله سب سے الگ تھلگ اس چھوٹے مکان میں بیٹھ گئے جو نوجوانوں کے اٹھنے بیٹھنے کے لئے بنوایا گیا تھا۔ قدرت‌الله نے اپنی بیوی کو سختی سے منع کر دیا کہ ان کو اکیلا ھی چھوڑ دے اور وھاں بالکل نہ جائے، وہ خود بھی ھٹ گیا۔ اسے نعیمی پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ لڑکے کے کان میں اتنی بک‌بک کرے‌گا کہ وہ بےوقوف بھول جائے‌گا کہ کب اس نے جوا کھیلا، کون جیتا، کون ھارا، یہاں تک کہ یہ سب کس دور حکومت میں ھوا تھا۔

نصرت‌الله ایک وادکا کی بوتل سے برابر چسکیاں لگاتا جا رہا تھا اور ایک بوتل ابھی صندوق کے پیچھے رکھی تھی۔ یہ شراب کی ان بوتلوں میں سے تھی جو اس نے اپنی شادی کے موقعے پر پینے کے لئے بچا رکھی تھیں۔ نعیمی نے اسے پینے سے نہیں روکا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ نشہ بھری کھوپڑی میں عقل کی بات گھسانا بعض اوقات آسان‌تر ھوتا ھے۔

البتہ تعجب کی بات یہ تھی کہ اگرچہ نعیمی خود نہیں پی رہا تھا اور پکا ارادہ بھی کئے تھا کہ جس کام سے آیا ھے اسے پورا کرکے ھی رھے‌گا مگر اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رھی تھی۔ اس کے ذھن میں چائےفروش کے الفاظ گونج رھے تھے، "ھمارے زمانے میں تو شاذ و نادر ھی خنجر چلتا ھے،... دنیا کی ھر بات خدا پر منحصر ھے، ظاھر ھے آپ ایک پریشان‌حال رنجیدہ باپ کی مدد کرنا چاھتے تھے جو ھم دونوں کا دوست ھے..." وہ کتنی ھی کوشش کرتا پر یہ الفاظ اس کے ذھن سے نہیں ھٹتے۔ خدا اس کا گواہ تھا کہ جو کچھ وہ

کہنے آیا تھا وہ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ چنانچہ اس نے یہ گفتگو شروع کی کہ کسی بانکے کی عزت کتنی بڑی چیز ہے اور کبھی کبھی تو وہ اپنی مرضی کے خلاف، اپنا خود معترف ہو جاتا – وہ کس قدر عمدہ الفاظ استعمال کر رہا تھا، زبردست خطابت! جو کچھ بھی وہ کہہ رہا تھا وہ کتنے جوش اور شوکت کے الفاظ سے پر تھا۔ وہ بیان کر رہا تھا کہ آج ہماری اس زمین پر، زیر آسمان عزت و آبرو کے ایسے نڈر نگہبان کس قدر کم تعداد میں رہ گئے ہیں نیز یہ کہ مسلمان ابن مسلمان کو ہر قیمت پر اپنی آبرو بچانی چاہئے اور باتوں ہی باتوں میں وہ یہ بھی کہہ گیا کہ مسلمان کی دلھن کس قسم کا پرنجے پہنتی ہے۔

اس مرتبہ نصرت اللہ نے نعیمی کی بات کو بڑے غور سے سنا، بس یہاں وہاں وہ نشے کی آواز میں اپنے دشمنوں کو گالیاں کوسے دیتا، اور خنجر اٹھاکر کمرے میں چاروں طرف یوں بھاگ بھاگ کر ٹکرانے لگتا جیسے پنجرے میں بند کوئی درندہ۔

آخر کار نعیمی بالکل تھک گیا اور اپنی مجبوریوں کے احساس سے اس پر سخت مردنی اور مایوسی چھا گئی – آہ، قسمت کبھی کیسے کیسے راستوں کا انتخاب کرتی اور کہاں سے کہاں پہنچاتی ہے اور پھر وہ قدرت اللہ کے گھر سے باہر نکلا۔

بائے اس کا بے حد مشکور تھا، اپنے دوست کو پہنچانے وہ لکڑی کے پھاٹک تک گیا اور اپنی خوشی کے اظہار کے طور پر اس نے اپنے بیٹے کو خود جاکر کچھ رقم دی۔

نصرت اللہ آدھی رات تک پیتا رہا اور اس کے ماں باپ دونوں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ وہ دونوں ہی سمجھتے تھے کہ آخر بیچارے کو اپنی پریشانیاں بھولنے کے لئے کوئی تو سہارا چاہئے۔
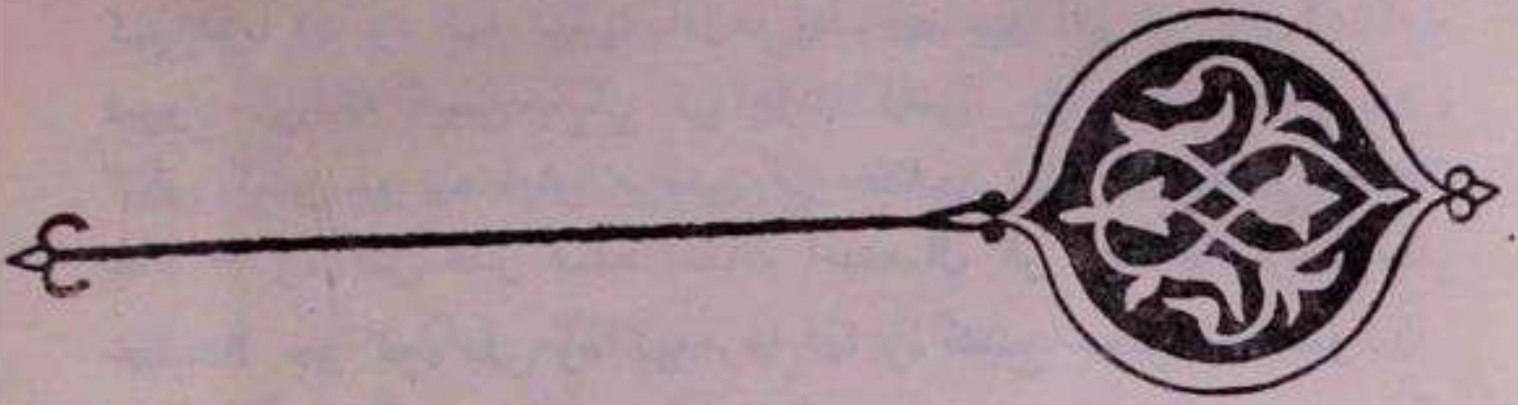
دسواں باب

اس شام کلب میں تورسنائی کا گانا ہونےوالا تھا اور موقع یہ تھا کہ ریلوے مزدوروں کے لئے کنسرٹ کا انتظام کیا گیا تھا۔ بشارت بھی کنسرٹ میں جانا چاھتی تھی مگر ٹیچر نے اسے ادبی حلقے کے سبق سے چھٹی نہیں دی پھر بھی بشارت کسی نہ کسی طرح عین اس وقت کلب پہنچ گئی جب تورسنائی اسٹیج پر نمودار ھوئی۔ کتنے افسوس کی بات ھو گئی کہ امی اور خالہ صوفیہ اور چچا یفیم وھاں نہیں تھے ورنہ تو وہ بھی دیکھتے اور سنتے کہ تورسنائی کے لئے کیسی تالیاں پیٹی گئیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ واقعی کوئی بڑی ایکٹرس ھو۔

کنسرٹ کے بعد عبدالصمد نے تورسنائی کو ایک چھوٹا سا مگر بہت ھی خوبصورت گلدستہ پیش کیا۔

"یہ کومسومول کے سیل کی طرف سے ھے" اس نے کہا۔ "اور اس کو پیش کرنے کا فیصلہ اتفاق رائے سے ھوا، ایک بھی مخالف نہیں تھا! ھم چاھتے تھے کہ یہ تمہیں اسٹیج پر پیش کیا جاتا مگر تم تو وھاں سے بھاگ لیں۔ سوال یہ ھے کہ اب تک تم کہاں چھپی تھیں۔" وہ اتنے جوش اور زور سے اپنے بازو ھلا رھا تھا کہ اس کی قمیض پر لگے ھوئے متعدد بلے جھنجھنا رھے تھے۔

تورسنائی گھبراھٹ سے لال ھو گئی اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ اس کی لمبی لمبی چوٹیاں جن میں رنگین فیتے بندھے تھے، اس کے گھٹنوں تک پہنچ رھی تھیں۔ بشارت

بھی لال ہو گئی مگر رشک سے۔ بھلا سوچئے ذرا، عبدالصمد نے کہا تھا: "پورے کومسومول کی جانب سے"۔

"واقعہ تو یہ ھے کہ بوڑھے پروفیسر صاحب بھی تم کو ڈھونڈ رہے تھے" عبدالصمد نے کہا۔

تورسنائی ایک دم خوش ہو گئی۔

"ھیں، کہاں ھیں وہ؟"

"وہ گھر چلے گئے، تمہیں اپنے یہاں آنے کو کہہ گئے ھیں۔"

"وہ بڑے اچھے بزرگ آدمی ھیں" تورسنائی نے کہا۔ "میں ان سے ملنے جا چکی ہوں، ان کے پاس گانوں کا ایک بڑا سا سیاہ بکس ھے اور انہوں نے اس کو میرے لئے بجایا تھا۔ اتنا اچھا تھا کہ کیا کہوں، اپنی جوانی میں وہ بھی گاتے تھے، ہر کوئی ان کو جانتا تھا۔ وہ اس شہر میں گایا کرتے تھے جہاں چچا یفیم رہتے تھے نا اور اس وقت زار بھی تھا۔ پھر یہ وہاں بیمار ہو گئے، ڈاکٹر نے ان کے گلے کا علاج کیا، ٹھیک تو ہو گئے مگر پھر گا نہیں پائے۔ جب مجھے وہ یہ قصہ سنا رہے تھے تو رو پڑے تھے۔ مجھے بھی ان سے بڑی ہمدردی ہوئی، بڑا ترس آیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا: "بیٹی، اپنی آواز کی بہت حفاظت کرو، اس کا بہت خیال رکھنا۔ تمہارے پاس اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی جو سب سے قیمتی چیز ھے وہ تمہاری آواز ہی ھے۔" پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ ایک بہت بڑا شہر ھے اور اس کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا تھیٹر ھے جو دنیا میں سب سے بڑا ھے اور وہاں صرف گانے ہی گائے جاتے ھیں۔ ایکٹر لوگ مکالمے نہیں کہتے، صرف گانے ہی گاتے ھیں... لو میں تو بھول ہی گئی اس کا کیا نام ھے۔"

"ارے، وہ تھیٹر تھوڑی ہی ھے بیوقوف لڑکی، تم جس کے بارے میں بات کر رہی ہو اسے تو کنسرٹ کہتے ھیں" بشارت نے کہا۔ وہ چاھتی تھی یہ ظاھر ہو کہ وہ بھی ان سب چیزوں کے بارے میں کچھ تو جانتی ہی ھے۔

"نہیں تھیٹر ھے، ان بزرگ پروفیسر نے تو یہی کہا

تھا" تورسنائی نے احتجاج کیا اور پھر اپنی بات کو وزنی بنانے کے لئے بولی: "میں بھی اسکول میں پڑھوں‌گی اور کومسومول بھی بنوں‌گی!"

"تورسنائی کو کومسومول میں لے لیا جائے گا؟" بشارت نے ایک‌دم عبدالصمد سے پوچھا۔

"ھاں، ھاں، کیوں نہیں۔"

"صوفیہ خالہ تو کہتی تھیں کہ کومسومولوں کے لئے ضروری ھے کہ وہ فیکٹریاں بنائیں اور دشمنوں کے خلاف لڑیں۔ لیکن تورسنائی تو گائے گی۔ باقی سب لوگ کام کریں‌گے، تعمیر کریں‌گے، جدوجھد کریں‌گے اور یہ صرف گانے گائے‌گی؟"

عبدالصمد ھنسنے لگا۔

"گیتوں کے بغیر لوگ نہ کام کر سکتے ھیں نہ دشمن سے لڑ سکتے ھیں، گیتوں کے بغیر تو زندگی ھی نہیں ھو سکتی۔"

"ھاں، ھاں، پھر بھی۔ میں تو بھئی ان بزرگ موسیقی‌داں کی طرح رونا پسند نہیں کرتی۔ میں تو امی کی طرح ھونا چاھتی ھوں اور خالہ صوفیہ اور خالہ جوراخان کی طرح۔ میں تو جدوجھد کرنا چاھتی ھوں۔"

اور پھر اس نے سب ھی نوجوان لڑکے لڑکیوں کے چھروں پر جو پسندیدگی کے آثار دیکھے تو اس کی ھمت اور بڑھ گئی۔ اپنی بات کو جاری رکھتے ھوئے بولی:

"امی کے کوآپریٹو میں جیسا ھے ویسا قدرت‌اللہ کے کارخانے میں بالکل نہیں تھا۔ امی کے یھاں سب عورتیں کتنی مل جل‌کر رھتی ھیں اور اسی طرح خوش رھتی ھیں جیسے ریلوے کی مرمت وغیرہ کی کارگاھوں میں سب مزدور خوش رھتے ھیں - آپ کو پتہ ھے ایسا کیوں ھے؟ اس لئے تھوڑی ھے کہ سب گانے گاتے رھتے ھیں بلکہ اس لئے کہ وہ جدوجھد کرتے ھیں اور وہ سب کے سب اب محنت‌کش طبقے کا ایک حصہ بن چکے ھیں۔"

عبدالصمد اور اس کے دوستوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"اچھا بشارت" اس نے کہا۔ "ہم تمہیں ایک ضروری کام سونپنا چاہتے ہیں۔ ویسے وہ ہے تو بہت ہی اہم کام مگر ہمارا خیال ہے کہ تم اسے انجام دے سکوگی۔"

بشارت اچانک خوشی کے مارے لالوں لال ہو گئی۔

"میرے لئے؟ ایک اہم کام، ضروری کام؟"

"ہاں، میں تمہیں ایک کتاب دوں‌گا، چھوٹی سی کتاب مگر وہ سب کچھ اس میں لکھا ہے جو کسی کومسومول کو ساری زندگی یاد رکھنا چاہئے۔"

عبدالصمد نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی کتاب نکالی جو دیاسلائی کی ڈبیہ سے بس ذرا ہی سی بڑی تھی۔ یہ کومسومول کے ضوابط کی کتاب تھی۔

"پہلے تو تم اس کتاب کو خود پڑھو، جو کچھ تمہاری سمجھ میں نہ آئے وہ ہم سے پوچھو، ہم لوگ تمہیں سمجھا دیں‌گے۔ پھر اپنے اسکول میں لڑکیوں کو پڑھ‌کر سناؤ اور سمجھاؤ بھی۔ جو کوئی بھی تمہاری بات سنے اس کو سمجھاؤ۔ شہری کومسومول کمیٹی کی طرف سے تمہارے پاس کوئی بھیجا جائے‌گا، اگر کمیٹی مجھے بھیجےگی تو میں ہی آ جاؤں‌گا، پھر ہم مل‌کر تمہارے اسکول میں کومسومول کی ایک سیل قائم کریں‌گے۔ تو یہی کام ہے۔"

بشارت نے دونوں ہاتھ بڑھاکر جلدی سے کتاب لے لی۔

"میں تو اسے زبانی یاد کر لوں‌گی۔"

عبدالصمد نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بشارت نے بڑے فخر سے اپنی بہن کی طرف دیکھا۔ اب وہ اپنے اور اس کے، دونوں ہی کے لئے مسرت محسوس کر رہی تھی۔

پھر دونوں بہنیں جلدی جلدی گھر کی طرف روانہ ہو گئیں۔

شام کے وقت سڑکوں پر مٹی میں ٹھنڈک آ گئی تھی اور اس پر ننگے پاؤں چلنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

تورسنائی ہاتھ میں گلدستہ اور ہلکی سلیپریں اٹھائے ہوئے تھی اور اس کی چوٹیوں میں وہی فیتے بندھے تھے اور

یہ سب اسے کلب کی طرف سے ملے تھے۔ آج تو واقعی اس کے پاس امی کو دکھانے کے لئے بہت ہی کچھ تھا!

بشارت نے اپنی ماں کا نیا پرنجے پہن کر اس کو نیچے سے اڑس لیا کیونکہ وہ اس کو ذرا لمبا پڑتا تھا۔ اب بشارت کافی بڑی ہو گئی تھی اور اسے رات بھر نیند نہیں آئی۔ امی بھی تو جب صدر ہوئی تھیں تو رات بھر سو نہیں پائی تھیں۔

آسمان پر ستارے روشن تھے لیکن بشارت کی خوشی پر فکرمندی کی پرچھائیاں منڈلا رہی تھیں، شاید امی بھی ان دونوں کے انتظار میں جاگ ہی رہی ہوں گی، بیٹھی ہوں گی۔ آج کل امی کا وزن کافی گھٹ گیا تھا دبلی ہوتی جا رہی تھیں غالباً اسی وجہ سے کہ ان پر کام بہت تھا۔ روز صبح کو وہ تڑکے ہی کوآپریٹر چلی جاتی تھیں اور رات کو دیر سے آتی تھیں تو اتنی تھکی ہوئی کہ کھانا کھانے کے لئے بھی ان کی خوشامدیں کرنی پڑتی تھیں لیکن آج کل وہ پہلے کی طرح روتی نہیں تھیں۔ کاش کہ وہ بیمار نہ پڑیں... ورنہ پھر بشارت کیا کرے گی۔ اس سے تو اچھا ہو کہ وہ خود ہی بیمار پڑ جائے۔ امی کتنی اچھی تھیں، عورتوں کے لئے، بلکہ ہر ایک کے لئے وہ کتنا کچھ کرتی تھیں، لوگ ان سے اتنی محبت کرتے تھے تو ٹھیک ہی تھا۔

دونوں لڑکیاں نعمانچہ کی جانی پہچانی تنگ گلیوں میں مڑیں، پرنجے میں بشارت کا دم گھٹ سا رہا تھا اس لئے اس نے نقاب اٹھائی۔ اندھیرا کافی ہو گیا تھا اور آس پاس کوئی متنفس نہ تھا، بھلا یہاں اسے کون دیکھے گا۔

بشارت نے اپنی بہن سے تیز چلنے کو کہا۔ تورسنائی ہانپنے لگی مگر پیچھے نہیں رہی۔ دونوں ہی کو جلدی سے جلدی ماں کے پاس پہنچنے اور اس کے سینے سے لگ جانے کی بیتابی تھی۔ کھانا تو خیر انہوں نے ان دونوں کے بغیر کھایا ہی نہیں ہوگا اور انہوں نے آج اکیلے ہی دسترخوان وغیرہ لگایا ہوگا۔

اپنے گھر کے پاس دونوں لڑکیاں پل بھر ٹھٹھک گئیں، لکڑی کے جنگلےدار پھاٹک کے پاس انہیں ایک عجیب سایہ دکھائی دیا: کوئی زمین پر پڑا تھا۔ کیا وہ کوئی شرابی تھا؟ تورسنائی کو شرابیوں سے بےحد ڈر لگتا تھا، بشارت کا بھی کوئی خاص ہیاؤ نہیں پڑ رہا تھا۔ اب دونوں کیسے اندر جائیں؟

پھر انہوں نے دیکھا کہ زمین پر پڑا سایہ ذرا سا ہلا۔ دونوں سکتہ میں کھڑی رہیں۔ پھر انہیں ایک موہوم سی کراہ سنائی دی اور دونوں لڑکیاں ایک دوسرے کو لپٹ گئیں، ان کا خون جیسے جم گیا تھا۔

سایہ ساکت ہو گیا مگر لڑکیاں اسی طرح جمی کھڑی رہیں جیسے مسحور ہوگئی ہوں، انہیں کھسکتے بھی ڈر لگ رہا تھا، چیختے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔

یکایک جیسے بشارت کے اندر سے کسی آواز نے اس سے کہا کہ وہ اس سائے کی طرف لپکے، اس نے بہن کو پیچھے چھوڑکر لکڑی کے پھاٹک کی طرف ایک قدم بڑھایا اور پھر اندھیرے میں آنکھیں گڑوتے ہوئے اس نے یکایک اپنی ماں کا پرنجے پہچان لیا۔

"امی!" وہ جان چھوڑکر بھرپور آواز سے چیخی۔

"امی، امی پیاری!" تورسنائی نے اس کی آواز کی گونج کی طرح چیخ بلند کی۔ ہول کی ماری دونوں بچیاں اپنی ماں کے بےحس و حرکت، ساکت جسم سے یوں لپٹنے لگیں جیسے بلی کے ننھے بچے جن کی ابھی آنکھیں نہ کھلی ہوں۔

پھر پڑوس کے مکان کے احاطے سے کچھ آوازیں آنے لگیں اور کوئی لالٹین لےکے دوڑا ہوا آیا۔ بشارت نے دیکھا کہ بانکا نورمت لالٹین ہاتھ میں لئے اس کے اوپر جھکا ہوا ہے اور یکایک کسی عورت کے بین کرنے کی آواز ابھری۔ اس عورت کی نظر بشارت کے ہاتھوں پر پڑ گئی تھی جو خون سے تر تھے۔

"ارے مار ڈالا! دوڑو، بچاؤ! دوڑو!"

بہت سی عورتیں اکٹھی ہو گئیں، سب نے مل کر بےہوش اناخان کو گود میں اٹھایا اور گھر کے اندر لے گئیں، نہ جانے کس نےچراغ جلایا۔

"پانی لاؤ، جلدی پانی لاؤ۔ زندہ ہے، زندہ ہے..."

نعمانچہ میں رات ڈھلتی رہی اور صبح بھی ہو گئی مگر کوئی نہیں سویا۔ گھروں میں، صحنوں میں روشنی رہی، چراغ جلتے رہے اور اناخان کے گھر کے پاس مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک ہجوم اکٹھا رہا۔

رضوان، حاجیہ اور قمری نے اناخان کو پل بھر کے لئے بھی اکیلا نہیں چھوڑا۔ ان لوگوں نے اس کے کپڑے بدلے، دھنے کندھے پر جو زخم تھا اسے دھویا اور جس طرح بھی بن پڑا اسے باندھا۔ خون رک گیا۔

بانکے نورمت کو روسی ڈاکٹر کو بلانے کے لئے چاربازار بھیجا گیا۔ پہلے تو وہ اندھیرے کے ڈر سے جا ہی نہیں رہا تھا پھرعورتوں نے اسے بےحد شرم دلائی اور پھاٹک پر کھڑے ایک اور آدمی کو اس کے ساتھ جانے پر راضی کیا، بعض مردوں نے خود ہی پیشکش کی کہ وہ جاکر یفیم دانیلووچ اور جوراخان کو بلا لاتے ہیں۔

نزاکت پھاٹک پر کھڑی ہو گئی کہ فضول آنے جانےوالوں کی اور تماشائیوں کی بھیڑ کو اندر صحن میں نہ آنے دے۔

دادی عنظیرت تو سجدے سے سر ہی نہیں اٹھا رہی تھیں، برابر نمازیں اور دعائیں پڑھے جا رہی تھیں اور خدا کا ہزار شکر ادا کر رہی تھیں کہ اتنے ہی پر آفت ٹل گئی، اگر خدا نخواستہ زیادہ ہی کچھ ہو جاتا تو کیا ہوتا، شکر اللہ، شکر اللہ...

اناخان کو بس ذرا سی دیر کو ہوش آیا۔ وہ بہت ناتوان لگ رہی تھی، عورتوں نے اسے پانی پلایا، بمشکل اپنے زرد ہونٹ ہلاکر اس نے سرگوشی کی:

"میری بچیاں کہاں ہیں؟..."

تورسنائی اور بشارت کو فوراً اس کے پاس لے جایا گیا، اس نے دونوں پر ایک دھندلی سی نگاہ ڈالی اور پھر بےہوش ہو گئی۔

بانکا نورمت کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس بھی آیا تو اکیلا، چاربازار میں اسے روسی ڈاکٹر ملا ہی نہیں حالانکہ اس نے ایک ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔

یفیم دانیلووچ اور جوراخان کو لینے جو لوگ گئے تھے وہ بھی واپس نہیں آئے تھے۔

اناخان کے کندھے پر بندھی پٹی پھر خون سے بھر گئی، دادی عنظیرت مکڑی کا جالا لے کر آئیں اور مطالبہ کرنے لگیں کہ یہ زخم پر رکھ دیا جائے۔ اناخان نے ایک پل کے لئے آنکھیں کھولیں، رضوان نے اس کا نام لےکر پکارا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے ہاتھ برف کی طرح سرد تھے!

اناخان کو جو عورتیں گھیرے کھڑی تھیں، وہ بہت پریشان ہونے لگیں، بشارت اور تورسنائی نے پھر رونا شروع کر دیا اور حاجیہ اور قمری کی گودوں میں مچلنے لگیں۔ نزاکت کو زبردستی پھاٹک کے پاس سے الگ ڈھکیل دیا گیا۔ پڑوسیوں کا مطالبہ تھا کہ ہم کو اندر جاکر اناخان کو الوداع کہنے کی اجازت دی جائے۔

آخرکار جوراخان اور صوفیہ وہاں پہنچیں، ان کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی جو عینک لگائے ہوئے تھا اور اس کے سرخ نوکیلی داڑھی تھی اور سفید لمبے لمبے بال جو کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ وہ اناخان کے پاس گیا، اس کے دل کی حرکت سنی اور پھر انجکشن کی سوئی تیار کرنے لگا۔ دادی عنظیرت نے ایک لمبی آہ بھرکر اپنا منھ دوسری طرف پھیر لیا اور پوری طاقت سے چلا چلاکر دعائیں پڑھنے لگیں۔ لوگ انہیں پکڑکر صحن کے دوسرے کونے میں لے گئے۔

"ان پر چاقو سے حملہ کیا گیا ہے" بوڑھے آدمی نے زخم کا جائزہ لیتے اور سر ہلاتے ہوئے روسی میں کہا۔ "ظاہر ایسا ہوتا ہے کہ باورچی خانے میں استعمال ہونےوالی چھری

تھی۔ خون تو بہت نکل گیا ھے مگر ان کے دل کی حالت بالکل ٹھیک ھے، تقدیر اچھی تھی که وار اوچھا پڑا اور زخم اتنا خطرناک نہیں ھے۔ قاتل نے پیچھے سے ان پر حمله کیا تھا۔ گردن ھی کاٹ دینے کا ارادہ تھا قصائی کا۔"

رضوان بوڑھے کے سامنے پہنچ کر جھکی۔

"ڈاکٹر صاحب، ہم لوگوں کو صحیح صحیح بتائیے، یه کیسی ھیں؟ کیا یه مر رھی ھیں؟"

"نہیں، یه جی جائیں گی" اس نے ازبیک میں جواب دیا۔ "بچوں کو البته یہاں سے ھٹا دو۔"

پھر پانی ابالا گیا۔

اناخان کو ھوش آ گیا اور وہ کراھنے لگی۔

"درد ھو رھا ھے؟" بوڑھے ڈاکٹر نے زخم کو دھوتے ھوئے پوچھا۔ "اچھی بات ھے۔"

پھاٹک پر لوگ شور مچانے لگے: "اناخان زندہ ھو رھی ھے، ڈاکٹر کہتا ھے، وہ زندہ رھے گی۔"

اتنے میں یفیم دانیلووچ بھی آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک اجنبی نوجوان مغربی کپڑے پہنے ھوئے آیا۔

"کس جگه ھوا تھا یه واقعه؟" نوجوان نے پوچھا۔

"باھر لکڑی کے پھاٹک کے پاس۔"

اس آدمی نے ذرا مایوسی کے ساتھ بھنویں سکوڑیں۔

"یہاں زمین پر تو سب لوگ چلے پھرے ھیں۔ ان کا پته کس کو چلا تھا؟"

"ان کی بچیوں نے انھیں سب سے پہلے دیکھا۔"

"اور بڑوں میں سے سب سے پہلے کون پہنچا تھا؟"

بانکا نورمت اس کے پاس لے جایا گیا۔

"تمھیں کچھ ملا تھا؟ جیسے چاقو وغیرہ؟"

"نہیں، چاقو تو نہیں تھا۔ ویسے مجھے معلوم بھی نہیں۔ میں تو ڈاکٹر کو لینے چلا گیا تھا۔"

پھر کچھ عورتیں آگے آئیں۔

"اس نے کچھ کہا تھا؟"

"نہیں" رضوان بولی۔

"ایک لفظ بھی نہیں؟"
"بس اتنا ہی کہا تھا کہ میری بچیاں کہاں ہیں؟"
"اور کچھ؟"
"کچھ نہیں۔"
نوجوان نے اناخان کے پرنجے کا معائنہ کیا، پھر ڈاکٹر کو بلاکر الگ لے گیا۔
"کیسی ہے؟"
"ہوش آ گیا مگر اسے نیند کی ضرورت ہے، میں آپ کو اس سے صرف ایک سوال کرنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔"
نوجوان اناخان پر جھکا۔
"آپ نے دیکھا تھا کہ کس نے آپ کو چاقو مارا؟"
اناخان نے کمزوری کے ساتھ سر ہلاکر انکار کیا۔
"آپ کو کسی پر شک ہے؟"
"نہیں... میں کچھ نہیں جانتی..."
پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور لوگ اسے دالان سے اٹھا کر اندر گھر میں لے گئے۔
یفیم دانیلووچ اور وہ نوجوان بھی رخصت ہو گئے۔
اناخان صبح تک سوتی تو رہی مگر اس کی نیند بہت گڑبڑ تھی اور بار بار وہ براتی تھی لیکن صوفیہ اور جوراخان دونوں میں سے کوئی بھی سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ صرف خالہ رضوان کو یہ خیال تھا کہ انہوں نے یہ الفاظ سنے تھے۔ "نہ میں نہ تم..." صبح تڑکے اناخان نے پانی مانگا اور پھر سو گئی، اس بار وہ ویادہ سکون کے ساتھ سوئی۔

صبح کو سارے نعمانچہ کی عورتیں اناخان کے گھر میں اکٹھی ہو گئیں، سب ہی اس کی مزاج‌پرسی کو آئی تھیں اور صحن میں، زمین پر بیٹھی، برآمدے کے پاس انتظار کرتی رہیں۔

ان میں سے کئی عورتیں اناخان اور اس کی بچیوں کے لئے کھانے کا سامان لائیں۔ برآمدے میں دیگچیوں، ڈونگوں اور بنڈلوں کا ڈھیر لگ گیا۔ گھر میں جو آتا یا جاتا وہ

فوراً چاروں طرف سے گھر جاتا اور سوالات شروع ہو جاتے کہ اناخان کیسی ہے اور حملہ آور پکڑا گیا کہ نہیں۔

اناخان کی طبیعت اب بہتر تھی۔ اس کا اندازہ صحن میں جمع عورتوں کو اناخان کی بچیوں کا موڈ دیکھ کر بالکل صحیح طور پر ہو رہا تھا۔ کیونکہ اب بچیاں رو نہیں رہی تھیں بلکہ بار بار صحن میں جھانک کر دیکھ لیتی تھیں کہ کیا ہو رہا ہے۔

جب اناخان کو بتایا گیا کہ صحن میں کیا ہو رہا ہے تو وہ بہت متاثر ہوئی اور اس نے کہا کہ یا تو اسے برآمدے میں لے جایا جائے یا عورتوں کو کمرے میں آنے کی اجازت دی جائے۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے میری جان، تمہیں آرام کرنا چاہئے اور اپنی طاقت بحال کرنی چاہئے" جوراخان بولی۔ "میں ان لوگوں سے خود بات کر لوں گی۔"

"میں بھی سنوں گی..."

"ہم کھڑکیاں کھول دیں گے اور تم سب کچھ سن سکو گی۔"

کھڑکیاں کھول دی گئیں اور جوراخان اور صوفیہ برآمدے میں نکل آئیں، سب عورتیں کھڑی ہو گئیں اور برآمدے کے سامنے مجمع لگ گیا۔

"بہنو، میرا خیال ہے" جوراخان نے کہا۔ "تم لوگ سمجھتی ہو کہ ہماری اناخان پر کس نے قاتلانہ حملہ کیا۔"

"اس بدمعاش کو پکڑا جانا چاہئے" سب عورتیں ایک ساتھ چلائیں۔ "اور پکڑ کر ہمارے حوالے کیا جانا چاہئے! ہم اسے بتائیں گے کہ لوگوں کو کیسے چھرا مارتے ہیں... ہم اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا بدبودار دل سینے سے باہر نکال لیں گے۔"

"آج دادی شکر اللہ کی آواز نہیں سنائی دے رہی ہے" جوراخان نے صوفیہ سے سرگوشی کی۔

"شکر اللہ کا کہ ہم ان کی آواز نہیں سن رہے ہیں" صوفیہ مسکرا کے بولی۔

جوراخان نے سب عورتوں کو اپنے ارد گرد نیم دائرے میں بٹھایا اور جب خاموشی چھا گئی تو ان کو قوندوز سلیمانووا کا واقعہ سنایا۔

"یہ بخارا کا واقعہ ھے جو ریگستان چوک میں سوویتوں کی پہلی کانگریس کے موقعے پر ہوا تھا۔

فروری کی ایک رات تھی، پانی برس رہا تھا اور استیپی میں، ریت کے تودوں کے آس پاس گیدڑ ہاؤھو کر رہے تھے۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں اور کبھی کبھی کوئی چیل خاموشی سے پر ہلاتی گزر جاتی تھی۔ آسمان کی دھندلی نیلاھٹ پر وہ سیاہ سیاہ منڈلاتی نظر آتی۔ سڑک پر ایک اکیلی بیل گاڑی جا رہی تھی۔ اس کے پہیوں کی چوں چوں استیپی میں دور تک سنائی دیتی تھی اور اس میں سوار تھی قوندوز سلیمانووا جسے عورتوں نے اس کانگریس میں اپنا ڈیلی گیٹ چنا تھا۔ وہ اپنے علاقے کی عورتوں کی طرف سے سوویت حکومت کو پیغام تہنیت دینے کے لئے بخارا جا رہی تھی۔

تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ کوئی مشرقی عورت اتنی بڑی کانگریس میں تقریر کرنے جا رہی تھی لیکن اس زمانے میں کسی دیہاتی علاقے سے قوندوز سلیمانووا کا بخارا کے لئے سفر کرنا، حد درجہ کی بےحیائی اور ڈھٹائی سمجھا گیا۔ اس زمانے میں مردوں کو ساتھ لئے بغیر استیپی سے رات میں سفر کرنا بڑا ھی مشکل کام تھا — جان جوکھم کا کام۔

لیکن اس کانگریس کے ڈیلی گیٹوں کے لئے دلیر قوندوز سلیمانووا کی آواز سننا نہیں بدا تھا۔ استیپی میں اس پر بھیڑیوں اور چیلوں نے نہیں حملہ کیا بلکہ ایک چوراھے پر، بخارا کے پھاٹک کے پاس انسانی درندوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ اس کو ۲۳ مرتبہ خنجر بھونکا گیا اور بسماچیوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اسے گیدڑوں کے سامنے پھینک دیا۔

"یہ وھی ھاتھ ھیں جنھوں نے اناخان پر حملہ کیا ھے" جوراخان نے کہا۔ "اور یہ تو آپ سمجھ ھی سکتی ھیں کہ

یہ بےایمان لوگ ہمیں ڈرانا چاہتے ہیں۔ اب آپ لوگ مجھے بتائیے کہ کیا ہم ڈریں گے؟ بتائیے، اناخان آپ کی بات سن سکتی ہیں، ان کو بتائیے۔"

سب عورتیں پھر کھڑی ہو گئیں اور ساری آنکھیں کھڑکی کی طرف مڑ گئیں۔ ایسا سناٹا چھا گیا کہ لوگوں کو اپنے دل کی دھڑکن خود سنائی دینے لگی۔

بشارت ایک‌دم گھر کے اندر دوڑ گئی، جوش کے مارے اس نے ماں کی دونوں ٹانگیں اپنی آغوش میں بھر لیں مگر احتیاط کے ساتھ کہ ماں کو تکلیف نہ ہو۔ باہر صحن میں اس کی سرگوشی صاف سنائی دے رہی تھی:

"امی پیاری، میں تمہیں بہت چاہتی ہوں، میں تمہیں کتنا چاہتی ہوں۔"

پھر اناخان کی کمزور آواز کھڑکی سے آئی:

"میری بہنو، میری پیای دوستو..."

اس سے زیادہ کہنے کی طاقت اس میں نہیں تھی مگر پھر بھی اس کی آواز صحن میں سنائی دی۔

"اناخان، تم ہم پر اعتماد کرو! جلدی سے اچھی ہو جاؤ! ہم لوگوں کو کوئی نہیں ڈرا سکتا!" رضوان اور قمری نے پکار کر اس سے کہا۔

نزاکت جو اب تک پیچھے کھڑی تھی، برآمدے کی طرف آگے کو بڑھی اور اس نے صوفیہ کا ہاتھ پکڑا۔

"میرا بھی نام لکھو بہن، میں کوآپریٹو میں شریک ہونا چاہتی ہوں۔"

صوفیہ نے فطری طور پر ذرا بےاعتباری سے کہا:

"تم؟ تم کوآپریٹو میں شامل ہوگی؟"

نزاکت نے بےچینی سے مٹھیاں بھینچ لیں۔

"ھائے، مجھے اتنا ڈر لگ رہا ھے، میں گھر میں اکیلی نہیں رھوں گی۔ میں تو تم لوگوں کی طرف ہوں، میں تمھاری طرف رھوں گی۔"

"اناخان!" صوفیہ نے آواز دی، "نزاکت بھی ھمارے کوآپریٹو میں شامل ھو رھی ھے۔"

"مجھے یہ سن کر کتنی خوشی ہوئی" اناخان نے جواب دیا۔

پھر ایک عورت ننگے پاؤں، چتھڑا، تار تار پرنجے پہنے جوراخان کے پاس پہنچی۔

"تمہارا نام بھی لکھ لیں کوآپریٹو کے لئے؟" جوراخان نے پوچھا۔

"نہیں، آپ مجھے نہیں جانتیں اور آپ میرا نام نہیں لکھیں گی۔"

"ذرا ٹھہرو۔ میں نے تمہیں اس سے پہلے کہاں دیکھا تھا؟"

جوراخان نے غور سے عورت کی صورت دیکھی اور پھر اسے ایک دم یاد آ گیا: ایک گدھا، عمدہ ساز سے آراستہ، موتیوں سیپیوں سے سجا.. ایک موٹا آدمی میٹھے دلیے کی پلیٹ چاٹتا ہوا... ایک پرانا مرجھایا ہوا سا شہتوت کا پیڑ... ایک بچہ جس کی لال ٹوپی سے اس کی چٹیاں نکلی ہوئی... ہاں، یہی تھی وہ ماں، مجبور، تنہا، کچلی ہوئی۔

"تمہارا شوہر کون ہے؟"

عورت نے ادھر ادھر دیکھا اور پل بھر کو جھجھکی۔

"آپ وہی ہیں نا جو جج ہیں، میں نے آپ کے متعلق سنا ہے پھر آپ کو میں نے ڈھونڈا تو مجھے بتایا گیا کہ آپ یہاں ہیں۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں... ایک شکایت کرنی ہے۔"

صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سب کے سامنے کچھ کہنا نہیں چاہتی، جوراخان اس کا ہاتھ پکڑ کر برآمدے کی طرف لے گئی۔

"مجھے بہت خوشی ہے کہ تم آئیں، میں بھی تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔"

"خدا آپ کا اقبال بلند کرے، آپ کی عمر دراز ہو" عورت جوراخان کے سامنے جھکی پھر اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی بولی۔

برآمدے کے ایک کونے میں وہ دونوں بڑی دیر تک باتیں کرتی رہیں۔
جب جوراخان اور صوفیہ اناخان کے پاس واپس آئیں تو اس نے کچھ فکرمند ہوکر کہا:
"مجھ سے کل رات کچھ پوچھا گیا تھا؟"
"ہاں، ہاں۔"
"تو مجھے یاد آ گیا..."
"کیا؟"
"جب میں گری تو میں نے کسی کو کہتے سنا تھا "نہ میں نہ تم"۔ ہاں اگر میں غلطی نہیں کر رہی ہوں تو یہی سنا تھا۔"
"ہاں، تم بےہوشی میں بھی یہی برا رہی تھیں۔"
"ہاں، لیکن مجھے یاد ہے، مجھے یاد آ گیا، بھاری آواز تھی اور اس نے کہا تھا: "نہ تو میں نہ تم"۔
"اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟"
"کون جانے، مجھے نہیں معلوم۔"

گیارھواں باب

جب اناخان کی طبیعت بہتر ہونے لگی اور بوڑھے ڈاکٹر کو بالکل یقین ہو گیا کہ اب کوئی خطرہ نہیں ہے تو خالہ رضوان گھر چلی گئی اور وہاں اس کے لئے ایک نہایت مسرت‌بخش حیرانی انتظار کر رہی تھی۔
اس نے دیکھا کہ آنگن میں کوئی اجنبی فوجی وردی پہنے گلاب کی بیل کے نیچے بیٹھا ہے اور اس کا بیگ پاس ہی

زمین پر رکھا ہے۔ پہلے تو رضوان کی ہمت نہیں پڑی کہ نقاب اٹھائے پھر وہ یکایک چیخ مارکر دوڑی۔ نقاب اس کے سر سے کھسک کر بیچ صحن میں گر پڑی۔

"بیٹے!"

ایرگاش نے اپنی ماں کو گلے لگا لیا اور اس کے سفید بالوں پر نرمی سے ہاتھ پھیرنے لگا۔

"مت روؤ امی۔"

ایرگاش کا قد لمبا تھا، جسم مضبوط، اس کی سرخ فوج کی وردی کا رنگ پیٹھ پر سے اڑ گیا تھا اور نمکین پسینے نے اس جگہ کو سفیدی مائل کر دیا تھا۔ بڑے بڑے، موٹے موٹے بوٹ مٹی سے اٹے تھے اور چہرہ استیپی کی گرم ہوا سے تپ کر تانبہ سا ہو گیا تھا جس سے اس کی شخصیت نہایت وجیہہ اور مردانہ لگ رہی تھی۔

چار سال فوجی خدمت کرکے وہ پورا مرد ہو گیا تھا مگر اس کی ماں نے فوراً دیکھ لیا کہ اس کی حرکات و سکنات ویسی ہی تھیں جیسی بچپن میں — وہی تیزی اور بےصبری۔ اسے دیکھکر ایسا لگتا تھا کہ بس اٹھکر کہیں بھاگ لے گا۔

دیسی تمباکو کا ایک ٹین جیب میں سے نکالتے ہوئے وہ ایک سگریٹ بنانے لگا اور رضوان چولہے کے پاس مصروف ہو گئی۔

"یہ سب کیا میں خواب دیکھ رہی ہوں" اس نے کہا اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ "تم کتنے بڑے، کتنے وجیہہ ہو گئے ہو۔"

"امی" ایرگاش ذرا سختی سے بولا۔ "بس کیجئے، کیا میری غیرحاضری میں آپ نے جو آنسو بہائے ہوں‌گے وہ کافی نہیں ہیں؟"

"وہ آنسو ایسے تھوڑی ہی تھے، لعنت ان آنسوؤں پر... یہ تو خوشی کے آنسو ہیں، میرے بیٹے..."

جب تک ماں نے چائے بنائی ایرگاش نے بوٹ اتارے، منہ ہاتھ دھویا پھر وہ "سوپہ" (آنگن میں چھاوں کی جگہ پر

مٹی کا لپا ہوا چبوترہ) تک گیا اور اس پر آلتی پالتی مارکے بیٹھ گیا۔

"میں یہاں چبوترے پر بیٹھا ہوں!" اس نے چاروں طرف گھورتے ہوئے کہا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ صحن میں کسی نے صفائی اور مرمت نہیں کی ہے۔ چھپر بارش سے خراب ہو گیا تھا، آتش‌دان، نعمت‌خانہ اور سائبان کو مرمت کی سخت ضرورت تھی، چاروں طرف لٹھے اور پرانی چٹائیاں بکھری تھیں۔ اس کی ماں نے تنہائی کے یہ چند سال کس مشکل سے گزارے تھے۔

"امی، آپ کو مجھ پر غصہ تو آیا ہوگا کہ میں آپ کو یوں چھوڑکر چلا گیا" ایرگاش نے کہا۔ "لیکن جب آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ مجھ پر کیا بیتی ہے اور میں نے کیا کیا ہے تب آپ کو خوشی ہوگی۔ میں جہاں کہیں بھی ہوتا تھا اور جو کچھ بھی کرتا تھا، مجھے آپ کا خیال برابر رہتا تھا اور سوچتا رہتا تھا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اسے آپ کے خیال میں کس طرح کیا جانا چاہئے تھا۔ اور ہمیشہ یہی ہوگا، میں وہی کروں‌گا جو آپ چاہیں‌گی۔"

"تم سلامت رہو بیٹے، تمہارا شکریہ، میں بھلا کب تم سے ناراض ہوئی ہوں۔ حکومت کے لوگ میری عزت کرتے ہیں، خدا انہیں خوش رکھے اور وہ مجھ کو سرخ سپاہی کی ماں سمجھ کر میرا بہت احترام کرتے ہیں۔ جب تم چلے گئے تھے تو حکومت کی طرف سے دو نوجوان آئے تھے اور انہوں نے میرا حال چال پوچھا تھا۔ اس کے بعد سے میں کوئی سات بار نئے شہر گئی اور ان لوگوں نے ہر بار مجھے رقمیں دیں۔ پھر میں نے قدرت‌الله کے لئے بھی کام کیا۔ سب ملا جلاکر کام چلتا رہا۔"

"آپ... آپ نے قدرت‌الله کے یہاں کام کیا!" ایرگاش غصے سے بولا۔ "ایک سرخ سپاہی کی ماں ہوکر آپ نے ایسا کیا!"

ویسے یہ بات اس کو اپنی ماں کے خطوں سے بھی معلوم

ہوتی رہی تھی لیکن نہ تو یہ بات اس کی سمجھ میں آئی تھی اور نہ وہ اسے قبول کر سکا تھا۔

"مگر اب تو ہم لوگوں نے اپنا کوآپریٹو کھول لیا ہے" اس کی ماں نے جواب دیا۔ "لیکن بدمعاش لوگوں نے ہمارے کوآپریٹو کی صدر پر قاتلانہ حملہ کیا، وہ ہمارے نعمانچہ کی سب سے بہادر عورت کو جان سے مار ڈالنا چاہتے تھے۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا؟" ایرگاش چیخا۔

"یہ تو میں کیا جانوں، البتہ یہ ضرور ہے کہ بدمعاش لوگ نہیں چاہتے کہ عورتیں بھی ترقی کریں۔"

"بدمعاش لوگ؟ ارے، یہ تو ہمارے دشمن ہیں، چار سال میں ان ہی سے تو لڑتا رہا ہوں!"

خالہ رضوان کا چہرہ تاریک پڑ گیا، اس کی آنکھوں میں خطرہ جھلکنے لگا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اتنی مدت بعد بیٹے سے ملاقات کی خوشی پر کوئی سایہ منڈلائے لیکن اس کے آنے سے کچھ ہی دن پہلے نعمانچہ میں جو سب سے بڑا واقعہ ہوا تھا اس کے متعلق اسے بتاتی نہ تو کیا کرتی۔

ایرگاش کود کے چبوترے پر سے اترا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب تک اس شہر میں خون چوسنے والے بائے لوگوں کو کیوں برداشت کیا جا رہا ہے۔ اور قدرت اللہ کو جس نے اس کے باپ کی جان لی تھی، کیوں معاف کر دیا گیا ہے۔ کیا ان لوگوں نے، اس نے اور اس کے سرخ فوج کے ساتھیوں نے محاذ پر جو لڑائی بسماچیوں سے لڑی تھی وہ یہاں ابھی جاری تھی؟

ایرگاش سلطانوف ۱۹۲۱ء میں، والینٹر کی حیثیت سے سرخ فوج میں شامل ہوا تھا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۹ سال تھی۔ یہ قدم اس نے اس لئے اٹھایا تھا کہ اسے قدرت اللہ اور اس کے جیسے لوگوں سے نفرت تھی۔ اپنے باپ کا گھر چھوڑ کر اور بوڑھی ماں سے جدا ہو کر وہ بڑی مشکلوں سے تاشقند پہنچا تھا۔ وہاں وہ سرخ گارڈوں کے ہیڈ کوارٹر پر گیا جہاں اس کو ایک بندوق اور کارتوس کی دو پیٹیاں دی گئیں لیکن آندین اسٹیشن کی لڑائی کے بعد ہی اس کی

تقدیر نے یاوری کی۔ اور وہ باقاعدہ سرخ فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔

وہ کئی جھڑپوں میں شریک ہوا مگر اس کا جوش ٹھنڈا نہیں ہوا، ازبیک رجمنٹ میں شریک ہونے کے بعد ایسیق کول کے کناروں پر اس نے ان بسماچیوں کا مقابلہ کیا جو عوام کی جیتی ہوئی آزادی کو بیچنے پر آمادہ تھے۔ وہ ڈٹ کے لڑا، جان کی بازی لگا دی، نہ آگ اور خون سے ڈرا، نہ کبھی دشمن کو پیٹھ دکھائی۔ اور اس کا خیال تھا کہ عقب میں بھی لوگوں کو یہی کرنا چاہئے تھا۔ انہوں نے خود اس کے قصبے کے امیروں کا، بائے لوگوں کا قلع قمع کیوں نہیں کر دیا؟ یہاں تو وہ لوگ اسی طرح رہ رہے تھے، تجارت کر رہے تھے، پہلے کی طرح روپیہ بٹور رہے تھے یہاں تک کہ عوام پر چاقوؤں سے حملے بھی کر رہے تھے...

اس کی ماں نے کوشش کی کہ ان پریشان خیالات کی طرف سے اس کا دھیان ہٹ جائے اور کوئی دل خوش کن بات چھیڑی جائے۔

"تم کو وہ خط ملے تھے؟" اس نے ایک پراسرار سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ بات کرتے میں وہ میزپوش کا کنارا نچوڑتی جا رہی تھی۔

ایرگاش ایسا بن گیا جیسے جانتا ہی نہیں وہ کس چیز کے بارے میں بات کر رہی ہے۔

"کون سے خط؟"

لیکن اس کی ماں نے اسے کچھ ایسی مسرت بھری نگاہوں سے دیکھا کہ اسے محسوس ہوا کہ وہ ماں سے کچھ چھپا نہیں سکتا۔

"کیا وہ آپ کو اپنے خط دکھاتی تھی، امی؟"

"نہیں، وہ تو نہیں دکھاتی تھی مگر یہ بوجھنا کیا مشکل تھا کہ آخر اسے پنسل کاغذ کس لئے چاہئے ہوتا تھا؟ یہاں لوگ کہتے ہیں کہ عشق نے حاجیہ کو پڑھنا لکھنا سکھایا۔"

"ہاں، آخر کے خط تو اس نے خود ہی لکھے تھے"

ایرگاس نے کہا اور اس کے سنولائے ہوئے چہرے پر نرمی آ گئی۔ "لیکن وہ تو بہت چھوٹے خط تھے، بس اس سے زیادہ نہیں" اور اس نے آدھی ہتھیلی پر لکیر کھینچی۔

"ارے بیٹے، اس کی شکایت نہ کرو، بھلا خط کے سائز سے کیا فرق پڑتا ہے، اگر ان میں عقل ہے، احساس ہے تو سب کچھ ہے... میں تو حاجیہ کو اپنی بیٹی سمجھنے لگی ہوں۔ عورتیں کہتی ہیں یہ دوسری اناخان نکلےگی، نعمانچہ میں ہم نے جو دکان کھولی ہے نا اس کی نگراں وہی تو ہے۔"

"دکان؟ کیسی دکان؟ "پھر تجارت" اس نے بلمزگی سے سوچا۔ "یہاں بھی وہی خریدنا بیچنا!"

"وہ ہے نا، عورتوں کے لئے مخصوص دکان" اس کی ماں نے جیسے اپنی بات کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

ایرگاش نے حیران ہوکر کندھے اچکائے۔

"میرا خیال ہے قدرت‌الله نے آپ کو یہ خرید و فروخت سکھائی ہے۔ وہ تو لوگوں کی کھال کھینچنے میں کمال رکھتا ہے نا۔"

اس کی ماں ناراض ہو گئی۔

"واہ، یہ تم کیا کہتے ہو، جوراخان نے تو یہ نہیں کہا تھا۔ ہماری دکان پر کام کرنےوالے ہر شخص کو لینن کے بارے میں، سوویت اقتدار کے بارے میں جاننا ہوتا ہے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سی معلومات ضروری ہوتی ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ لوگ جن باتوں کو نہیں سمجھتے وہ انہیں کیسے سمجھائی جائیں۔ حاجیہ یہ کام انجام دے سکتی ہے۔"

شاید وہ مجھے بھی ان باتوں کو سمجھا سکےگی" ایرگاش نے بڑے طنزیہ انداز میں سوچا۔

"وہ بڑی سمجھدار ہے" اس کی ماں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "بہت ہی تیز اور ذہین۔ خدا اس کی صحت اچھی رکھے۔ تم خود ہی دیکھ لینا۔"

ایرگاش اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی ماں نہیں سمجھتی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ مگر خود اسے بھی تو فوج میں بہت

سی باتوں کو سمجھنا پڑا تھا جن کے بارے میں وہ نہیں جانتا تھا۔ اسے مختلف باتوں کی نوعیت کے متعلق اندازہ لگانا اور انہیں سمجھنا پڑا تھا۔

اگلی صبح کو ایرگاش گھر کے کاموں میں جٹ گیا، چار سال سے اس گھر میں کوئی مرد نہ تھا۔ پرانے بید مجنون کی اس نے ایک لمبی سی شاخ کاٹی جو اندر کو سایہ بھی نہیں ڈالتی تھی اور اس کی تھونی بناکر چھپر کے نیچے لگائی تاکہ جھکتا ہوا چھپر سیدھا ہو جائے۔ پھاٹک کی بائیں طرف جہاں اس سال پھولوں کے پودے نہیں لگائے گئے تھے، وہاں اس نے ایک چھوٹا سا گڈھا کھودا، اس میں مٹی گھولی اور مکان کے اس گوشے میں جو برساتی پانی بہنے کے پرنالے کے نیچے تھا، مٹی لگائی۔ پھر صحن کی روشوں کا جھاڑ جھنکاڑ صاف کرکے راستے کو درست کیا۔ وہ مقام بھی صاف کر دیا جہاں باپ کا کرگھا رکھا تھا۔

یہ سب کرکے جب وہ نالی کے پاس سگریٹ پینے بیٹھا تب اس نے دیکھا کہ ایک عورت جو چچوان تو نہیں پہنے تھی مگر پرنجے ڈالے، کھڑی اس کو دیکھ رہی ہے اور پھر وہ دبے پاؤں جھجھکتی ہوئی آگے بڑھی اور پرنجے کے پھندنوں کو کھینچنے لگی۔

"بھائی ایرگاش، خدا کرے آپ کے ہاتھ پاؤں کبھی نہ تھکیں، آپ کیسے ہیں؟ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے نا؟" اس نے کہا اور آنکھیں جھکا لیں۔

ایرگاش نے پہچانا تو نہیں مگر اندازہ لگا لیا کہ نازک ہاتھوں والی یہ لڑکی کون ہے۔ اتنے دنوں میں جبکہ ایرگاش نے اسے نہیں دیکھا وہ کیسی کھل گئی تھی جیسے کلی پھول بن گئی ہو۔ اگر کوئی اس کے خطوں سے اندازہ لگاتا تب تو سمجھتا کہ وہ چھوٹی سی بچی ہوگی مگر اسے دیکھتے ہی یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ وہ اب بچی نہیں رہی تھی۔ بے شک اس وقت ایرگاش سے ملنے آنے کے لئے اس نے خاص اہتمام سے کپڑے پہنے تھے۔ ایرگاش بھی بوکھلاکے اٹھ کھڑا ہوا اور کدال کا سہارا لیا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اپنے

پیروں، ہاتھوں کو کیا کرے؟ آستینیں بھی الٹی ہوئی تھیں، پتلون کے پائینچے بھی۔ کہنیوں اور گھٹنوں تک کیچڑ میں بھی سنا ہوا تھا!

"تمہارا شکریہ حاجیہ" وہ دھیرے سے بولا۔ "اور تم کیسی ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ لڑکیوں کا تو یہی مانا ہوا طریقہ تھا البتہ اس کی سانس تیز چل رہی تھی، جس سے معلوم ہو رہا تھا کہ جلدی جلدی چلتی ہوئی وہ اس کے گھر آئی تھی۔

"خالہ رضوان نے آپ کو ذرا بھی فرصت نہیں دی؟ ایں؟ آتے ہی کام میں جٹا دیا" حاجیہ نے ایسے لہجے میں کہا جس میں ہمدردی بھی ہو سکتی تھی اور تعریف بھی۔

"اسے تم کام کہتی ہو؟" ایرگاش نے جواب دیا۔ "میں نے تو سنا ہے کہ کام بس اب تم کرتی ہو۔ اس میں، وہ جو عورتوں کا کوآپریٹو ہے۔"

"اچھا تو خالہ رضوان آپ کو بتا بھی چکی ہیں؟"

لیکن میں امید کرتا ہوں کہ تم خود مجھے بتاؤگی کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"ہمارے معاملات تو بہت سیدھے سادے ہیں، آپ کو ان سے کیا دلچسپی ہوگی۔ آپ سرخ سپاہی ٹھہرے، ہیرو..."

ایرگاش نے سوچا یہ اپنی دکان کے متعلق مجھے بتاتے ہوئے گھبراتی ہے اور بڑے جوشیلے جذبات کے ساتھ بولا:

"مگر میں تمہارے متعلق تو سب کچھ جاننا ہی چاہتا ہوں۔"

"کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہماری مدد کریں گے؟"

"میں تو ہمیشہ تمہاری مدد کو تیار ہوں، حاجیہ" ایرگاش نے نرمی سے کہا۔

"مگر صرف میری نہیں..." حاجیہ بولی حالانکہ وہ یہی جواب سننا چاہتی تھی اور اس نے تو کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اپنا من‌چاہا جواب اتنی جلد اور ایسی سادگی کے ساتھ سن لے گی۔

اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا، چہرہ جو لال ہو گیا تھا اور پھر مدھم سی آواز میں جو تقریباً سنائی نہیں دی، اس نے پوچھا:

"خالہ رضوان گھر پر ہیں؟" گویا کہ وہ کوآپریٹو میں خالہ رضوان سے ملی ہی نہیں تھی اور گویا خود خالہ رضوان نے اسے نہیں بتایا تھا کہ ایرگاش واپس آ گیا ہے۔ "واہ آپ نے بتایا بھی نہیں کہ گھر پر کوئی نہیں ہے، آپ کو شرم نہیں آتی!"

وہ جانے لگی مگر ایرگاش نے اس کو روک لیا۔

"ٹھہرو حاجیہ۔"

پھر اس نے جلدی جلدی ہاتھ دھوئے، دوڑکر گھر کے اندر گیا اور ایک ہی منٹ بعد ایک نیا ریشمی رومال لئے ہوئے آیا۔ نیلے رنگ کا جس پر ننھی ننھی سفید برف سی روئی کی گیندوں کا نمونہ بنا ہوا تھا۔

"تم تو اب دکان کی مینجر ٹھہریں، ایسی چیزوں کی عادی ہو گئی ٹھہریں، بہرحال، پھر بھی میری درخواست ہے کہ اسے قبول کرو۔"

"نہیں، نہیں ایرگاش، میں نہیں لے سکتی۔"

"کیوں نہیں لے سکتی ہو؟ بالکل ایسا ہی ایک رومال میں نے امی کو بھی دیا ہے۔"

"ہائے، میں ابھی کی ابھی مر جاؤں۔ پھر تو سب کو پتہ چل جائے گا کہ آپ ہی نے مجھے بھی یہ رومال دیا ہے۔"

"تو چل جائے پتہ... مجھے... تو اس بات پر بڑا فخر ہوگا، حاجیہ۔"

کہنا تو وہ یہ چاہتی تھی کہ مجھے بھی فخر ہوگا مگر اس کے بجائے بولی:

"ارے، آپ نے کیوں اتنی زحمت اٹھائی؟"

حاجیہ کو پتہ بھی نہیں چلا کہ وہ نازک، ملائم، مہکتا ہوا رومال کب اس کے ہاتھ میں پہنچ گیا اور اس نے اسے اپنے سینے سے بھی لگا لیا۔ ایرگاش کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اسے ہی اپنے سینے سے لگا رہی ہے، گھر سے دور،

استیپی اور پہاڑوں میں، کھلے آسمان اور لپ لپ کرتے ستاروں تلے اس نے جانے کتنی بار اس لمحے کا خواب دیکھا تھا۔

حاجیہ کچھ جھکی اور پھر رومال اپنے ساتھ لئے ہوئے تیزی سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ ایرگاش کی مسرت اور حیرت سے بھری نظریں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

صاف ستھری، استری کی ہوئی، کمر میں ایک پتلی سی فوجی پیٹی سے کسی ہوئی وردی میں ملبوس ایرگاش اپنے قصبے کی سڑکوں سے گزر رہا تھا۔ اس کے بھاری فوجی بوٹ اس زور سے زمین پر پڑ رہے تھے کہ گونج سی اٹھتی تھی۔

ایک دو گھوڑوں کی گاڑی دھول کے بادل اڑاتی اس کے پاس سے گزر گئی۔ لوگ ہاتھوں میں بریف کیس لئے بہت زیادہ مصروف ہونے کا تاثر دیتے ہوئے تجارت کے مرکز کی طرف جا رہے تھے، بوڑھی عورتیں ننھے بچوں کی انگلیاں پکڑے چلی جا رہی تھیں۔ عورتیں ہاتھ میں پھل کی ٹوکریاں اٹھائے بازار سے واپس ہو رہی تھیں۔ سعیدی چونا اور پالش کرنےوالے، دھبےدار، سفید اپرن پہنے بالٹیاں اور لمبے لمبے برش لئے سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر چل رہے تھے، سب ہی کہیں نہ کہیں پہنچنے کی جلدی میں تھے اور اپنے اپنے کاموں میں جٹے تھے۔ قصبے کی پرامن زندگی جاری تھی۔

ان طویل مہینوں میں جب ایرگاش اس قصبے سے باہر تھا، جب مسلسل گھڑسوار دستے کے ساتھ مارچ کرتا رہتا تھا، جب وہ لوگ سرپٹ گھوڑے دوڑاتے دیہاتوں سے گزرتے تھے، جب وہ لوگ، آگ کے الاؤ کے چاروں طرف اس ریت پر سوتے تھے جو دن کی گرمی کے بعد رات میں سرد ہو جاتی تھی — تو ہر لمحے اسے یہاں کی، اس پرسکون زندگی کی یاد آتی تھی لیکن وہ آرام کا متلاشی نہ تھا، اس کی یہ فطرت ہی نہ تھی کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے چبوترے پر بیٹھا رہے، وہ کام کرنے، تعمیر کرنے کے لئے بنا تھا۔

بازار کے قریب پہنچ کر اس نے ایک تیز آواز سنی، ایک روٹی بیچنےوالے کی آواز:

"گرم روٹیاں! گرم نان، منہ میں گھل جائیں گی! اس سے بہتر آپ کہیں نہ پائیں گے!"

ایک نانبائی جس کا منہ لال تھا اور سفید قمیض کے بٹن سینے پر کھلے ہوئے تھے، سر پر ایک بڑی سی ٹوکری اٹھائے تھا جس میں گول گول، قیمہ اور پیاز کے ورقی سموسے، برابر برابر لگے ہوئے تھے۔

ہوا میں بھنے گوشت کی خوشبو رچی ہوئی تھی، لوہے کے لوبان‌دانوں میں جلنے‌والی خوشبودار گھاس، لال مرچ اور پھل کی مہک بسی ہوئی تھی۔

"چالیسوں مزے! نہ کھاؤگے تو پچھتاؤگے!" ایک سیخ کباب بیچنے‌والا انگیٹھی سے اٹھتے ہوئے دھوئیں سے بچنے کے لئے آنکھیں بھینچ کر چلایا۔

قاشغر کے باورچی ہاتھوں پر زرد زرد سویوں کا آٹا دور دور تک پھیلاتے۔

"بہترین! بہترین کے سوا کچھ نہیں!"

ایک کارواں سرائے کے پھاٹک کے سائے میں ایک گٹھیلا سا قصاب جس کے ہاتھ منہ پر خون کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے ایک مینڈھے کے دھڑ سے اس تیزی اور صفائی سے کھال وغیرہ الگ کر رہا تھا کہ اس کے ہاتھوں اور چھری کی رفتار پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔

ایرگاش ایک عمدہ سی دکان کے سامنے ٹھہرا جس میں رنگ برنگے سوتی کپڑوں کے تھان بھرے ہوئے تھے، کھونٹیوں پر سوت کی لچھیاں ٹنگی تھیں اور سفید و سیاہ چیونگ گم، اوسمہ اور مہندی وغیرہ بکسوں میں سجے تھے۔

دکاندار جو غیرمعمولی طور پر موٹا تھا، آلتی پالتی مارے دکان میں بیٹھا تھا، اس کا چہرہ لال اور تھل تھل، پل پل تھا، ایک کان پر ناپنے کا فیتہ اٹکا تھا اور دونوں ہاتھ بڑے مزے میں پیٹ پر ٹکے ہوئے تھے جو کسی پھولے ہوئے تکیے کی طرح لگتا تھا۔

"ارے یہ تو متقوول دکاندار ہے" ایرگاش نے دل میں

13—2710

سوچا۔ "ہاں وہی ہے اور ویسا ہی موٹا تازہ جیسا وہ چار سال پہلے تھا۔ مگڑا کہیں کا..."

دکان کے پاس چتھڑے لگائے ایک بھک‌منگا ہاتھ میں کدو کا تونبہ لئے اس میں بھیک کے پیسے مانگ رہا تھا اور جھک جھک‌کر اللہ‌یار* کے شعر گنگناتا جاتا تھا۔ خوشبودار گھاس "ایسیریق" کے دھوئیں کی مہک پھیلی تھی جو نظربد کا اکسیر توڑ سمجھی جاتی تھی۔

ایرگاش نے تھوکا اور آگے بڑھ گیا۔

پھر اس کی توجہ ایک بڑے سے گھر کی کھڑکی سے آتی ہوئی ایک‌تارے کی تیز آواز کی طرف مبذول ہو گئی۔ اس گھر کی ہر کھڑکی پر پردہ پڑا تھا۔ یہ عمارت پہلے ایک ہوٹل تھی جسے ایک امیر بائے چلایا کرتا تھا، اب یہاں کیا ہے؟ صدر دروازے کے سامنے برساتی پر بورڈ لگا تھا: "پرائیویٹ کافی شاپ، مینگالیئف برادرز"۔

پہلے تو ایرگاش کو محسوس ہوا کہ یہ سائن‌بورڈ ماضی کی باسی روٹی کا ایک ٹکڑا ہے مگر پھر اس نے دیکھا کہ کھڑکیوں کے شیشوں پر "مینگالیئف برادرز" آڑا، ترچھا لکھا ہے۔ اور اسے یاد آیا کہ نئے شہر میں کبھی ایک بڑا ہوٹل اور شراب‌خانہ ہوا کرتا تھا اور اس پر بھی یہی سائن بورڈ تھا، یہی نام لکھا تھا۔

اپنی کمرپیٹی کے پاس وردی ٹھیک کرتا ہوا ایرگاس کافی کی دکان میں داخل ہوا۔

بےحس آنکھوں اور لال گردنوں‌والے لوگ میزوں پر بیٹھے شور و غل مچا رہے تھے، بحث کر رہے تھے اور چیخ چیخ‌کر ایک دوسرے کی آوازوں کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے، ملائم چمڑے کے جوتے پہنے ایک موٹا نوجوان آدمی کنڈوں کی طرح ایسی گندی گندی گالیاں بک رہا تھا جیسے اس کے ارد گرد اور کوئی تو موجود ہی نہیں ہے۔

* اٹھارھویں صدی کا ایک ازبیک صوفی شاعر۔ مترجم۔

غین ہنسی کے ساتھ اس نے اپنی میز پر سے کچھ خالی بوتلوں کو ہاتھ مارکر پھینکا، بوتلیں چکناچور ہو گئیں اور وہ مطالبہ کرنے لگا کہ اس کے سامنے دوسری بوتلیں پیش کی جائیں۔ چھوٹے سے اسٹیج پر یکہ و تنہا، ایک‌تارہ بجانےوالا، جھوم جھوم‌کر، گھٹنے موڑ موڑکر ایک‌تارہ بجا رہا تھا۔ اسٹیج کے پاس دو نوجوان آدمی، بڑی ہی خوبصورت کڑھی ہوئی، چندیا ٹوپیاں پہنے بیٹھے تھے اور ان دونوں کے درمیان چیختا ہوا، بھڑکیلا میک‌اپ کئے، سیاہ بالوں‌والی ایک عورت بیٹھی تھی جس نے اپنی بھنویں سرخ رنگ رکھی تھیں۔ تینوں نشے میں دھت تھے، ایک نوجوان عورت کا کندھا سہلا رہا تھا اور دوسرا اس کے کان میں کچھ سرگوشی کر رہا تھا۔ ان کے سامنے رکھی ہوئی میز، بوتلوں کے بوجھ سے چرچرا رہی تھی۔

عورت نے سرگوشی کرتے مرد کو ڈھکیلتے ہوئے ایرگاش کو آنکھ ماری۔ ایرگاش حیران و ششدر ہوکر اسے تکنے لگا، وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسی جگہ اس کی ملاقات کسی عورت سے بھی ہو سکتی ہے۔

"آپ کے لئے کیا لاؤں؟" ایک سن‌دار ویٹر نے جو دوڑا ہوا ایرگاش کے پاس پہنچا تھا، ادب سے جھک‌کر پوچھا۔ ایرگاش ہچک‌کر ایک‌دم پیچھے ہٹا اور تیزی سے چلتا ہوا سڑک پر نکل آیا۔

وہ کہاں پھنس گیا تھا؟ اپنے ہی شہر میں وہ نکموں کے وہی شور مچاتے، جمگھٹے اور تاجروں کی وہی گرم‌بازاریاں دیکھ رہا تھا؟

ضروریات زندگی سے محرومی اور خطرے کے وہ چار سال... بسماچیوں سے مسلسل جنگ کے وہ چار سال ۔ آخر اس نے وہ چار سال کس کام میں صرف کئے تھے؟ ایسا لگتا تھا وہ سارا وقت گزرا ہی نہیں، وقت جہاں تھا وہیں ہے۔

پھر وہ ایک شراب کی دکان کے پاس سے گزرا، شراب کے پیپوں کی بھیڑ بھاڑ اتنی تھی کہ راستہ چلنا مشکل تھا۔ بڑے چھوٹے پیپے ایک کے اوپر ایک رکھے ہوئے تھے۔ پھر ان

کی آڑ سے ایک چہرہ جھانکا، دکاندار کا سیاہ چہرہ۔ وہ ایرگاش کو دیکھکر یوں مسکرایا کہ اس کا پوپلا منھ اس کان سے اس کان تک پھیل گیا۔

"کہو نوجوان، تمھارے لئے کیا پیش کروں؟ وائن، وادکا، بیر، بوزا، شراب، مسلس*؟"

جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے جھاگ دیتی ہوئی بوزا کا ایک پیالہ بھرا اور اس کو بدتمیزی سے خوشامدانہ مسکراہٹ کے ساتھ تقریباً ایرگاش کے منھ سے لگا دیا۔

"کون ہو تم؟" ایرگاش نے دکاندار کو گھورتے ہوئے ڈپٹ کر پوچھا۔

"اس سے تمھیں کیا مطلب؟"

"میں پوچھتا ہوں، کون ہو تم؟ کس کی ہے یہ دکان؟ کس کی ہے یہ شراب؟ تمھاری جیب میں کس کی رقم ہے؟"

دکاندار کے ہاتھ میں تھاما ہوا پیالہ ڈگمگانے لگا۔

"م... م... میری ہے جناب، لیجئے، پیجئے نا۔ یہ تو میری طرف سے ہے، لیجئے نا، مہربانی ہوگی۔"

ایرگاش مزید ایک لفظ کہے بغیر چل دیا۔ "اسے خوب معلوم ہے کہ اصلی مالک کون ہے" اس نے دکاندار کے متعلق سوچا۔ "مگر یہاں ان تن‌آسانیوں کی اس طرح اجازت کیوں ہے؟" اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے جیسے وقت پیچھے کھسک کر وہیں پر رک گیا ہے۔

"نہیں، بس کافی ہو چکا، میں کافی دیکھ چکا" وہ نئے شہر کی طرف مڑ گیا۔

ڈاک‌خانے کے قریب پہنچا تو اسے نظر آیا کہ ڈاک‌خانے پر نیا رنگ ہو گیا ہے۔ نیلا رنگ اور اس کی مرمت بھی ہو گئی ہے لیکن پڑوس کی عمارت پر اب بھی گولیوں کے نشانات باقی تھے۔

ایرگاش کبھی نہیں بھول سکتا تھا کہ جب وہ لڑکا سا تھا تو ڈاک‌خانے سے دشمن کی گولیوں کی بوچھار میں کس

---

* بوزا، مسلس— مقامی کھٹی شراب۔ مترجم۔

طرح بھاگتا ہوا قلعے تک گیا تھا۔ ان دنوں وہ ریلوے مزدوروں والے دستے میں پیک کا کام کرتا تھا، گال کے اندر پیغامات دبائے وہ چچا یفیم سے چچا صابر اور چچا صابر سے چچا یفیم کے بیچ میں بھاگتا رہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ انقلاب کی قسمت اور اس لڑائی کا انجام، بہت کچھ اس بات پر منحصر تھا کہ وہ یہ پیغامات پہنچا سکے گا کہ نہیں۔ چچا صابر آخری لڑائی میں ایسے زخمی ہوئے کہ جانبر نہ ہو سکے۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ آخری لڑائی تھی... لیکن چچا یفیم... وہ ان سے ملے گا۔ وہی اس کے ان تمام سوالات کا جواب دے سکیں گے، اس نے بازار میں جو کچھ دیکھا تھا اس کی وضاحت وہی کر سکیں گے۔

ریلوے کے مرمت والے کارخانے کے پاس اسے دھات کی جھناجھن سنائی دی، پہلی ہی نظر میں اس نے دیکھ لیا کہ کارخانہ وسیع تر ہو گیا ہے اور یہاں مزدور اب ایک نئی اور مصروف تر زندگی گزار رہے ہیں۔ اس نے پہلے کبھی یہاں اتنے لوگ یوں ساتھ کام کرتے نہیں دیکھے تھے، ایسی چہل پہل کبھی نہیں دیکھی تھی۔ جدھر نظر اٹھاتا، تیز رفتار سے باقاعدہ کام چالو تھا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ کام کی اتنی مقدار اور اس کا یہ انتظام پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

یہ سب دیکھ کر وہ کچھ مرعوب سا ہو گیا اور جب ٹریڈ یونین کمیٹی کے دفتر میں یفیم دانیلووچ سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس کا رویہ اتنا جارحانہ نہ تھا جتنا کہ ریلوے کی مرمت کی کارگاہوں کو آتے وقت راستے میں تھا۔ اب اس نے اپنے جذبات پر کسی حد تک قابو پا لیا تھا۔ پھر بھی اس کا دل مسرت اور اطمینان سے خالی تھا۔

اس نے دیکھا کہ یفیم دانیلووچ بالکل نہیں بدلا تھا، وہ ہمیشہ کی طرح خوش مزاج دوست نواز اور آسودہ خاطر نظر آیا۔ شاید اسی آسودہ خاطری کے باعث چچا یفیم نے جو ایرگاش کے پہلے رہنما اور دوست تھے، ان حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا جنھیں ایرگاش نہیں قبول کر سکا؟

یفیم دانیلووچ نے ایرگاش کے دل میں، اپنے نوجوان دوست کے دل میں اٹھتے طوفان کو فوراً بھانپ لیا۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟" جب دونوں ہاتھ ملا چکے تو اس نے پوچھا: "لگتا ہے تم مجھے دیکھ کر کوئی خاص خوش نہیں ہوئے۔ صحت تو ٹھیک ہے تمہاری؟"

"مجھے اپنی صحت سے کوئی شکایت نہیں ہے" ایرگاش نے جواب دیا۔ "لیکن آج میں نے جو کچھ دیکھا اس سے میں خوش کیسے ہو سکتا ہوں۔ میں نے شہر کا ایک چکر کاٹا، بازار میں گھومتا رہا اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی آنکھوں پر یقین کروں کہ نہ کروں۔ پھر وہی متقوول جیسے دکاندار، وہی مینگالیئف برادرز۔ یفیم دانیلووچ، مجھے بتائیے کہ اس سب کا کیا مطلب ہوا؟ یہ ماجرا کیا ہے؟"

یفیم دانیلووچ ایک قدم پیچھے ہٹا، ایرگاش کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور قہقہہ مار کے ہنس پڑا۔

"ہم کس لئے لڑے تھے؟ یہی نا؟"

"جی ہاں، بھلا ہم کس لئے لڑے تھے؟ کس لئے ہم نے خزاں کی پگھلتی ہوئی برف سے گزرتے ہوئے دشمن کا پیچھا کیا تھا جبکہ ہمارے پیروں میں بکری کی کھال کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ استیپوں میں کیوں ہم اپنا گلا گھٹواتے رہے؟ ریت ہمارے دانتوں تلے کرکراتی رہی، دھول کے بادل ہماری آنکھیں پھوڑتے رہے لیکن ہم مشین گنوں کے آگے سینہ سپر بڑھتے ہی رہے؟ کس لئے؟ اور آپ؟ آپ کس لئے جلاوطنی سے نکل بھاگے تھے؟ کس لئے آپ نے قلعے پر ہونے والے حملے کی رہنمائی کی تھی؟ میں... میں نے تو ہمیشہ آپ کی عقل پر بھروسہ کیا ہے، یفیم دانیلووچ۔ آپ ہی مجھے بتائیے۔ مجھ سے کچھ نہ چھپائیے گا، شاید اب آپ نے ہر چیز کی طرف سے منہ موڑ لیا ہے، شاید آپ تھک گئے ہیں، اور پیچھے ہٹ گئے ہیں؟"

"بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ، میں تم سے کچھ نہ چھپاؤں گا" یفیم دانیلووچ نے اپنی مونچھوں میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور اگر تمہارا سر ابھی تمہارے کندھوں پر سلامت ہے تو تم ضرور میری بات سمجھ جاؤ گے۔"

ایرگاش میز کے پاس لگی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ اسے کچھ تو اطمینان سا محسوس ہو ہی رہا تھا، آخر اس نے یفیم دانیلووچ پر ہمیشہ ہی اعتماد کیا تھا۔

"تو تم مجھ سے کہتے ہو کہ تم نے شہر کا ایک چکر لگایا اور یہ کہ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اپنی آنکھوں پر، اپنے دیکھے پر یقین کرو کہ نہ کرو۔ مگر تم نے کچھ زیادہ نہیں دیکھا۔"

"میں نے دشمن کو دیکھا" ایرگاش نے تڑ سے جواب دیا۔

"ہاں ٹھیک ہے، میں تم سے اتفاق کرتا ہوں مگر تمہیں یہ بھی تو آنا چاہئے کہ اسے کیسے دیکھو، ہمیشہ دشمنوں پر نظر رکھو مگر کیا تم نے دوستوں کو بھی دیکھا؟ ہمارے مضبوط نکتوں اور مقامات کو بھی دیکھا؟ تم نے یہ دیکھا کہ کپاس صاف کرنے کے کارخانے میں پوری شدت کے ساتھ کام ہو رہا ہے اور اس کا دائرکٹر ہمارا ایک پرانا وفادار دوست ہے جو ایک تربیت‌یافتہ کارکن بھی ہے اور ہمارے واسطے لڑنےوالا بھی یعنی عبدالکریم۔ اور لینن اسٹریٹ پر جو سرکاری بینک ہے وہاں بھی ہمارا قبضہ ہے، ہم ہی مالک ہیں۔ مختلف اشیا پیدا اور تیار کرنےوالوں اور ان اشیا کے صارفین کے جو کوآپریٹو بن گئے ہیں ان کو کیا کہوگے؟ تم نے شہر میں ان کو بھی دیکھا؟ اور عورتوں کا پہلا کوآپریٹو؟ تم نے اسے دیکھا؟ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اس کی کیا اہمیت ہے؟ اور ہمارے مرمت کرنےوالے کارخانے... تمہارے دیکھتے دیکھتے یہ گاڑیوں کو مرمت کرنے اور بنانے کے ایک بڑے کارخانے میں تبدیل ہو جائیں گے۔ کیا تم نے اس بات کو محسوس کیا؟ ایں سپاہی!"

"یہ سب تو میں سمجھتا ہوں" ایرگاش نے کہا۔

"اگر سمجھتے ہو تو ہاتھ میں ہتھوڑا اٹھاؤ، فٹر کا سامان سنبھالو، کیا تمہارے ہاتھ میں ان اوزاروں کو پکڑنے کے لئے کھجلی نہیں ہو رہی ہے؟"

"میں... میں... میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ شاید میں نے اپنی بندوق ذرا جلدی رکھ دی۔"

"نہیں بھائی، بندوق کو تو جو کچھ کرنا تھا کر چکی۔ یاد رکھو کہ ہر مسئلہ بندوق سے حل نہیں ہوتا۔ ہم اپنا سب سے اہم کام ہتھوڑے ہی سے انجام دے سکتے ہیں۔ ہتھوڑے سے، میرے گرمجوش بھائی۔ ہمارے سرکاری نشان پر ہنسیا اور ہتھوڑا یوں ہی تو نہیں بنا ہوا ہے، ہم اپنی محنت ہی سے انقلاب کی کامیابیوں کو مستحکم بنائیں گے، ترقی دیں گے۔ ہم نے فتح ایسی محنت سے کام کرنے کے لئے حاصل کی ہے جیسی کبھی کسی نے کہیں نہیں کی ہے۔"

"کام؟" ایرگاش نے کہا۔ "یوں کہئے تجارت، خرید و فروخت۔"

"ہمیں سب کچھ کرنے کے قابل ہونا چاہئے" یفیم دانیلووچ نے اس کی بات کاٹی۔ "اور ہم سے پہلے جو مالک تھے ان سے کہیں بہتر کرکے دکھانا ہوگا۔ اب قدرت اللہ خواجہ کی ہی مثال لے لو۔ برسوں ہاتھ پیر مارتا رہا، ادھر ادھر تکڑم بازی کرتا رہا اور اب نتیجہ کیا ہے، ٹائیں ٹائیں فش۔ ہمارا کوآپریٹو نعمانچہ کی عورتوں کے لئے زیادہ نفع بخش، زیادہ دلچسپ اور کہیں زیادہ دلکش ثابت ہوا۔ اور دیکھو کہ صدیوں پرانی روایات اور تعصبات کے باوجود، دشمن کے لالچ دینے سے لےکر پیٹھ میں چھرا گھونپنے تک کے باوجود عورتیں کام کر رہی ہیں، جدوجہد کر رہی ہیں۔ ایرگاش، یہ فتح اس فتح ہی کی جیسی بڑی اور اہم ہے جو ہم نے قلعے کو سر کرکے حاصل کی تھی۔"

"ہاں، آپ تو یہی کہیں گے" ایرگاش بولا لیکن اسی لمحے سے اسے پشیمانی ہونے لگی، اپنی بات، اپنے الفاظ، اپنے لہجے پر پشیمانی۔ وہ بولا: "یفیم دانیلووچ، میں خود اپنی ماں کو نہیں پہچان سکا، میں نے دراصل دھیان سے سنا ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ رہی تھیں، اب تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مجھے پھر سے ان کی بات سننی ہوگی۔"

"ہاں، یہ مردانہ قول ہے" یفیم دانیلووچ نے پسندیدگی کے ساتھ کہا۔ "عورتیں جو کچھ کر رہی ہیں اس کو بہت غور سے دیکھو، عوام جو کچھ کر رہے ہیں اس پر دھیان دو۔ تم

عوام کا گوشت پوست ہو، ہر بات کو سمجھ لوگے۔ مجھے تم کو سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے کہ طبقاتی جدوجہد کیا چیز ہے اور کس طرح اس کو بندوق سے، ہتھوڑے سے اور جہاں ضرورت پڑے وہاں پرخلوص اور پرجوش الفاظ سے بھی لڑا جاتا ہے۔"

ایرگاش بڑے جوش کے ساتھ اچھل کر بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں بھی کتنا بےوقوف ہوں، یفیم دانیلووچ۔ میں نے آپ کو ٹھیک سے سلام بھی نہیں کیا۔"

"کوئی بات نہیں" یفیم نے روسی زبان میں کہا۔ "چلو، اب مل لیتے ہیں گلے۔"

دونوں بڑی گرمجوشی سے گلے ملے۔

"ارے، کیا کر رہا ہے، کیا میری ہڈی پسلی توڑے گا" یفیم چیخا۔ "بڈھے آدمی پر ترس کھا، بھائی۔"

دونوں لمبے مضبوط آدمی ایک دوسرے کو یوں بھینچ رہے تھے جیسے وہ ایک دوسرے سے علاحدہ ہی نہ ہو سکتے ہوں۔

"یفیم دانیلووچ، کیا آپ یہاں کی فیکٹری کمیٹی کے صدر ہیں؟"

"ہاں، تم خود ہی دیکھ لو۔"

"میں نے تو سوچا تھا کہ آپ کم از کم شہر کے میئر یا شہر پارٹی کمیٹی کے سکریٹری ہوں گے۔ یعنی کوئی بڑے آدمی، کوئی اہم آدمی ہوں گے۔"

یفیم دانیلووچ سوچنے لگا، پھر بولا:

"جب آپ عوام کے لئے کام کرتے ہیں تو پھر آپ جو کام بھی کریں وہ بڑا اور اہم کام ہوتا ہے۔ ایک روسی مثل ہے کہ منصب سے انسان کی بڑائی نہیں ہوتی بلکہ انسان سے منصب کی ہوتی ہے۔ ایمانداری سے زندگی گزارو، عوام کی خدمت کرو، تم خود ہی اہم اور بڑے بن جاؤ گے۔"

"میں اب زیادہ دن کام کا انتظار نہیں کر سکتا۔ فوراً شروع کر دینا چاہتا ہوں" ایرگاش نے جوش کے ساتھ کہا۔

"آؤ" دانیلووچ نے ایرگاش کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے

مذاق کے لہجے میں کہا۔ "آو، میں تمہیں دکھاؤں ہم کہاں سے بندوقیں چلاتے ہیں۔"

دونوں نکلے اور مرمت والے کارخانوں کے ایک سرے سے اس ریلوے لائن پر چلنے لگے جو اس سرے تک جاتی تھی۔ کارخانوں کے پاس زمین کا جو بہت بڑا قطعہ تھا وہاں ایک عمارت تعمیر ہو رہی تھی۔ زمین سے ایک نئی اونچی عمارت کی سرخ اینٹوں کی دیواریں سر اٹھا رہی تھیں۔ ان کے بغل میں وہ پرانی، دھوئیں سے سیاہ عمارت ایسی چھوٹی اور گھٹیا لگ رہی تھی جیسے مرغی کی ڈھابلی۔ ڈھیروں تختے، لوہے کی چھڑیں چھتوں پر ڈالنے والے فولادی چھپر، پکی اینٹیں — ان سب کے اونچے اونچے ڈھیر لگے تھے۔ لکڑی کے بڑے بڑے بکسوں میں نئے نئے مشینی اوزار اور دو ڈائنمو، اس انتظار میں رکھے تھے کہ کب تعمیر مکمل ہو اور وہ اس میں اپنی جگہ پائیں۔ ایرگاش نے تو ایسا سامان کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔

"کہو؟" چچا یفیم نے پوچھا۔

"عظیم" ایرگاش نے خوش ہوکر جواب دیا۔

بارھواں باب

"میں تمہیں کچھ اور دکھاؤں گا" اگلے دن یفیم دانیلووچ نے ایرگاش سے کہا۔

دونوں، عورتوں کے کلب گئے۔ وہاں اتنی بھیڑ تھی کہ دھکے دے دے کر گھس پل کر کسی طرح وہ لوگ ہال میں پہنچے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔

اسٹیج کے سامنے پہلی بنچ پر صرف ایک آدمی بیٹھا تھا، ایک موٹا آدمی، دھاری‌دار عبا اور نوکدار ٹوپی پہنے اور اس کے پاس ایک نوجوان فوجی سپاہی کھڑا تھا جس کی وردی کے بازو پر سرخ پٹی بندھی تھی۔ اس کی رائفل کی کئی پہل‌والی سنگین اس کے دائیں کندھے کے اوپر جھلملا رہی تھی۔

بنچ پر بیٹھا آدمی اپنے دونوں ہاتھ اپنی توند پر باندھے تھا اور اس کی دھندلی آنکھیں بس یوں ایک ہی طرف کو گھورے جا رہی تھیں جیسے باقی تمام چیزوں سے بے‌نیاز ہو۔

"پہچانتے ہو اسے؟" یفیم دانیلووچ نے ایرگاش سے سرگوشی کی۔

"شرطیہ۔"

"ہمارے ہاتھوں نے بڑھ‌کر اسے بھی گرفت میں لے لیا ہے اور اتفاقاً وہ مخصوص ہاتھ جوراخان کا ہے۔"

"ہاں، امی نے مجھ سے ان کی دلیری کا ذکر کیا تھا۔"

"اور واقعہ تو یہ ہے کہ جوراخان بھی بڑی اور اہم شخصیتوں میں سے نہیں" یفیم دانیلووچ نے کہا۔

ایرگاش ندامت سے مسکرایا۔

"شہری متقوول ولد مردان‌قل" میز کے پیچھے سے ایک آواز آئی جس پر سرخ کپڑا بچھا تھا۔

دکاندار متقوول اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

"جب عدالت تم سے مخاطب ہو تو تمہیں کھڑا ہونا چاہئے۔"

دکاندار بھد سے پھسلا اور کھڑا ہو گیا۔

"کیا تم اقرار کرتے ہو کہ مسماۃ خالنسا دختر شادمان کا بچہ تمہارا بیٹا ہے؟"

متقوول نے کوئی جواب نہیں دیا، بس کھنکارا، پھر اپنے موٹے ہونٹ ہلائے اور آخرکار ایسی سنجیدگی سے بولا گویا کوئی بڑی ہی پتے کی بات کہہ رہا ہو:

"مرد کے لئے عورت بیوی ہوتی ہے اور بیوی کے بچے پیدا ہی ہوتے رہتے ہیں۔"

جج نے بات جاری رکھی۔

"کیا تم تسلیم کرتے ہو کہ خالنسا دختر شادمان تمہارے گھر میں نوکرانی تھی؟"

متقوول نے پھر کافی دیر سوچا پھر یکایک زانو پر ہاتھ مار کے بولا:

"بیوی ہمیشہ اپنے شوہر کی خدمت کرتی ہے..."

جوراخان نے جو جج تھی پوچھا:

"کیا تم یہ قبول کرتے ہو کہ خالنسا کو تم نے ایک کنیز، ایک لونڈی کی حیثیت سے خریدا تھا؟"

جوراخان نے اپنا سوال دوھرایا، متقوول نے اسے پھر دوھرانے کو کہا، جج نے بڑے تحمل سے اسے سوال کا مطلب سمجھایا۔

"تاجر کا کام ہی بیچنا اور خریدنا ہے" متقوول نے اپنے گول گول کندھے ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

ہال بھر میں غصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"عدالت کو ٹھیک سے جواب دو، اپنا جرم تسلیم کرتے ہو؟" جج نے پوچھا۔

"ہر مسلمان" متقوول نے جواب دیا، "خدا کے آگے مجرم اور گناہگار ہے۔"

بہرحال وہ اپنی حماقت یا اللہ پر ایمان کے پردے کی آڑ لینے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

قصبے کے تمام علاقوں سے عورتیں کلب میں جمع ہوئی تھیں اور انہوں نے دم سادھے، جوراخان کی بات سنی۔ جوراخان جو ایک جج عورت تھی اور دکاندار متقوول سے سوالات کر رہی تھی حالانکہ متقوول بازار کا سب سے رئیس تاجر تھا اور لوگ اس کا بےحد احترام کرتے تھے۔ جب خالنسا سے سوالات ہونے لگے تو عورتیں رونے لگیں۔ وہ پرنجے پہنے تھی اور اس کی باتوں میں بےربطی بھی تھی لیکن اس نے ایک ایک لفظ جو کہا وہ سچائی کے جوش سے لبریز تھا۔

بہت سی عورتوں کا خیال تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ

ہوا وہ کوئی غیرمعمولی بات نہ تھی۔ یہ تو ہمیشہ سے عورتوں کی تقدیر ہے اور سدا رہےگی... لیکن جب جوراخان نے اپنی تقریر شروع کی تو عورتیں اپنے اس قسم کے خیالات پر بےحد شرمندہ ہوئیں۔

ان میں کئی ایک صرف جوراخان کی تقریر سننے کے لئے آئی تھیں، مائیں اپنی بیٹیوں کو لائی تھیں اور بیٹیاں اپنی ماؤں کو۔ عورتوں کو خود مقدمے سے یا سزا سے زیادہ دلچسپی نہ تھی، ان کو تو اس سے دلچسپی تھی کہ دیکھیں جوراخان کیا کہتی ہے۔ جب عورتیں اس کی تقریر سن‌کر اپنے گھروں کو واپس ہوئیں تو ان کے دل نئی امیدوں سے بھر گئے تھے اور انہیں یہ یقین ہو چلا تھا کہ اب وہ پہلی سی زندگی سے چھٹکارا پا سکیں گی۔

ایرگاش بھی وہاں سے یہی احساس لےکر اٹھا۔

"یہ عورت عوام کو جانتی ہے، سمجھتی ہے، اسے معلوم ہے لوگ کیا چاہتے ہیں" اس نے بڑے جوش کی کیفیت میں سوچا۔

خالنسا کی ماں ایک بائے کے یہاں نوکرانی تھی جو یرمزار گاؤں میں رہتا تھا۔ یہ بچی بھی ماں کے ساتھ لگی کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی لیکن ماں ضعیف اور کمزور تھی اور بیمار رہتی تھی اس لئے بائے اس فکر میں تھا کہ اس کو چلتا کرے مگر وہ ایسا ہونے سے پہلے ہی مر گئی۔ لوگوں کو نظر آتا تھا کہ وہ دن بدن زیادہ کمزور ہوتی جاتی تھی اور گویا اس کی موت کا بےچینی سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ پھر ایک بھیانک رات وہ اپنی بچی کی گود میں ہی ٹھنڈی ہو گئی، اس وقت خالنسا اور اس کی ماں اصطبل کے پاس ایک کوٹھری میں تھیں۔ کئی دن تک وہ گونگوں کی طرح چپ ادھر ادھر گھومتی رہی، اسے کوٹھری میں جاتے ڈر لگتا تھا، آخرکار وہ اس گھر ہی سے بھاگ نکلی جس سے اسے نفرت تھی، بغیر کچھ کھائے پئے، تن پر جو کچھ پہنے تھی وہی پہنے وہ نکل کھڑی ہوئی۔

پھر اس نے اپنے آپ کو ایک بڑے شہر میں پایا، اس کے پرنجے میں پیوند تھے، ننگے پیر تھی اور اسے بس صرف یہی آتا تھا کہ کسی دیہاتی نوکرانی کی طرح کمرتوڑ کام کر سکتی۔ نوکری کی تلاش میں وہ بازار میں ادھر ادھر ماری ماری پھر رہی تھی کہ ایک چالاک بڑھیا کی نظروں نے اسے بھانپا۔ بڑھیا کی کمر دوھری تھی اور وہ دیکھنے میں بالکل کسی تیز چونچوالے کوے کی طرح لگتی تھی۔

لڑکی نے شاید دسویں مرتبہ اپنی مصیبت کی داستان جو اس سے قبل وہ اوروں کو سنا چکی تھی، اس عورت کو سنائی۔ بڑھیا نے اوروں سے زیادہ اس پر مہربانی کی، اوروں سے زیادہ توجہ کے ساتھ اس کی بات کو سنا، سوالات کئے اور ہمدردی ظاہر کی۔ پھر اس نے اپنی ہڑیلی انگلیوں سے خالنسا کی بانہہ پکڑی اور اس کو کپڑے کی دکان میں لے گئی۔

دکان میں ایک ایسا موٹا آدمی بیٹھا تھا جیسے روئی سے کوئی بورا کساکس بھرا ہو اور وہ اپنی توند پر اپنے انگوٹھ بجا رہا تھا۔

عورت نے مدھم آواز میں اس سے بات کی اور پھر لڑکی کی نقاب اٹھاکر اسے اس کا چہرہ دکھایا۔ لڑکی کو پہلے تو وہ موٹی ناک اور تھل تھل گالوں‌والا، موٹے ہونٹوں کا مرد، نیک اور بےضرر محسوس ہوا مگر جب اس نے اس کے کان کھینچ‌کر اسے بات کرنے کو کہا تو خوف سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس وقت تو انسان کو ڈر ہی لگتا ہے جب وہ سوچ نہ سکے کہ اب کیا ہوگا۔

"مالک، میں صرف گھر کا کام کاج کر سکتی ہوں" لڑکی نے اپنے بڑوں کو دھوکا نہ دینے کے خیال سے سچ بات کہہ دی۔

دکاندار نے موٹے موٹے ہونٹ چباتے اور پھلاتے ہوئے بڑی شان سے کہا:

"ہاں، ہاں، نوکر کو کام کاج تو جاننا ہی چاہئے۔"

وہ عورت پھر دکاندار سے کانا پھوسی کرنے لگی:

"تمہاری جو وہ سب نازک لہریں ہیں نا..." اس نے

کہا (اس کا مطلب تھا دکاندار کی بیویاں)۔ "ان سب سے کام تو ہوتا نہیں، ہر وقت نخرہ کرتی ہیں، شکایتیں کرتی ہیں اور تمہاری جان عذاب کئے رہتی ہیں۔ سو میرے مالک، اس لڑکی کو رکھ لیجئے اور ان لوگوں کی خدمت میں لگا دیجئے۔ اس سے بہتر آپ کو کوئی نہیں ملے گا، یقین مانئے، آپ بہت خوش رہیں، یہ تو سمجھئے قسمت ہی سے مل گئی ہے۔ بس آپ کے ہی لئے لائی ہوں کیونکہ میں آپ کو اتنا مانتی ہوں..."

دکاندار نے اس کے ہاتھ پر کوئی رقم رکھ دی اور عورت بہت خوش اور مشکور ہوکر، چلاکے خالنسا سے بولی:

"یاد رکھنا، کس نے تجھ پر احسان کیا ہے، متچان بووی (یہ اس احسان کرنے والی بڑھیا کا نام تھا) کے حق میں دعا کرنا اور محنت سے اپنی مالکنوں کی خدمت کرنا۔ اچھا، اور اس کے عوض میں تجھے روٹی کپڑا ملے گا۔ آمین۔"

پھر متچان بووی وہاں سے چلی گئی۔

موٹا دکاندار اپنی جگہ سے اٹھا تو خالنسا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ اس کے بازو اور ٹانگیں چھوٹی تھیں اور کمزور بھی، کمرپیٹی تولیہ جتنی چوڑی تھی، غالباً اس کی توند کو پوری طرح دباکے رکھنے کے لئے...

کارواں‌سرائے سے متقوول نے خوبصورت ساز کسا ہوا ایک گدھا لیا، باعزت دکاندار جب بھی ہو سکتا پیدل چلنے سے کتراتا ہی تھا۔ غیرمتوقع پھرتی کے ساتھ وہ زین پر سوار ہو گیا اور خالنسا ننگے پاؤں اس کے پیچھے پیچھے چلی۔

اسے لے کر وہ اپنی بیویوں کے پاس پہنچا اور اسے زنان‌خانے میں ڈھکیل‌کر یوں ہاتھ جھاڑے جیسے وہ کوئی جھاڑو بازار سے لائی ہوئی کوئی ٹوکری تھی۔

"اسے کام دو اور ذرا نگرانی رکھو کہ یہ کام کرے" مڑکر چلتے وقت وہ گردن گھماکر بھونکا۔ "مفت میں نہیں لایا ہوں اس کو۔"

خالنسا اس کے ان الفاظ کا یہ مطلب سمجھی کہ وہ لوگ اسے کچھ تنخواہ بھی دیں گے کیونکہ نوکروں کو تنخواہیں ملتی تھیں مگر وہ غلطی پر تھی۔

منقوول کے دو بیویاں تھیں۔
بڑی بیوی تو تقریباً اپنے میاں کے ہی برابر موٹی تھی۔ ابھی تک وہ جامہ‌زیب تھی حالانکہ چاندی کے تار اس کے بالوں میں نظر آنے لگے تھے، اس کی جتنی ہی عمر بڑھتی جاتی تھی اتنا ہی زیادہ وہ لباس اور سنگار پر زیادہ دھیان دیتی جاتی تھی لیکن اس کی آنکھیں اس کی حماقت کا پول کھولتی رہتی تھیں۔ خالی خالی احمقانہ آنکھیں۔ وہ جو چیز دیکھتی اس پر لڑکیوں کی طرح کھی کھی ہنستی، شاید وہ سوچتی تھی کہ ایسا کرنے سے وہ کمسن معلوم ہوگی، فکروپریشانی اس کے پاس نہ پھٹکتی تھیں۔
چھوٹی بیوی صورت اور جسم سے ایک بیمار، کمزور اور کمسن سی لڑکی معلوم ہوتی تھی حالانکہ اس کے رخساروں، پیشانی اور ہونٹوں کے آس پاس باریک باریک جھریاں تھیں۔ اس کے کندھوں اور پیٹھ کی ہڈیاں گنی جا سکتی تھیں، چھاتیاں سوکھی، مرجھائی، غالباً اس کی ازدواجی زندگی اس وقت شروع ہو گئی تھی جب وہ بارہ سال سے زیادہ کی نہ رہی ہوگی اور اسی عمر سے وہ کھلنا شروع ہو گئی ہوگی اور اب اس عمر میں بڑھیا لگتی تھی جبکہ اسے لڑکی سی لگنا چاھئے تھا۔ خوش نہ رہنےوالی، مسنح شخصیت کی یہ عورت مزاجاً کسی سانپ کی جیسی زہریلی تھی۔
یہی تھیں وہ مالکنیں جن کی خدمت خالنسا کو انجام دینی تھی۔
ان دونوں نے اسے یوں پاس بلایا جیسے شہر کے امیر شرفا کی بیگمات کسی دیہاتی بھکارن کو بلائیں۔ خالنسا نے انہیں جھک‌کر سلام بھی کیا مگر انہوں نے اس کی طرف ذرہ برابر توجہ نہ کی، صرف حقارت بھری حیران نگاھوں سے اس کا جائزہ ضرور لیا۔ بڑی عورت یوں ڈرتے ڈرتے اس کے پاس گئی جیسے وہ کوئی گائے ھے اور دو انگلیوں سے چچوان اٹھایا، چھوٹی بھی یوں ہی پاس گئی اور اپنے کینہ‌پرور ہونٹوں کو بھینچے رکھا۔ پھر دونوں بیویوں نے غصہ بھری نگاھیں ایک دوسرے پر ڈالیں – نوکرانی جوان تھی۔ بڑی‌والی

ایک دم کھی کھی کرنے لگی اور چھوٹی نے نفرت اور کدورت کے ساتھ تھوکا۔

پھر دونوں کچ کچ کچ کرنے اور بیچاری لڑکی کا مذاق اڑانے لگیں۔

"گونگی معلوم ہوتی ہے۔"

"آنکھیں تو زمین ہی میں چپک گئی ہیں۔"

خالنسا اتنی گھبرا گئی تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہاں جائے، کیا کہے اور کدھر دیکھے۔ ہاں بےشک وہ تھی تو ایک گنوار اور جاہل لڑکی اور اس لئے وہ ضرور عجیب ہی لگ رہی ہوگی۔

"تمہاری شادی ہو گئی ہے؟" چھوٹی بیوی نے سوال کیا۔

خالنسا نے سر ہلاکر انکار کیا۔

"تمہیں لوگوں کے پیر دھونے آتے ہیں؟"

"میں گھر کا کام کر سکتی ہوں..."

بڑی نے کھی کھی کرتے ہوئے چیخ کر کہا:

"اچھا جاؤ، ہاتھ منھ دھوؤ، پھر دیکھتے ہیں۔"

لیکن خالنسا جب ہاتھ منھ دھوکے صاف صوف ہوکر آئی تو وہ دونوں انگشت بدنداں رہ گئیں، اس کی خوبصورتی اور جوانی نے انہیں دنگ کر دیا تھا۔

دونوں نے بغیر کہے ایک دوسرے کے جذبات کو بھانپ لیا، دونوں جو کل تک آگ اور پانی کی طرح ایک دوسرے کی رقیب تھیں، آج وہ اس نوکرانی پر غصے اور ظلم کے معاملے میں متحد ہو گئیں۔ بےشک دونوں خیال رکھیں گی کہ وہ کبھی بیکار نہ بیٹھنے پائے۔ دونوں نے اس کے لئے بھاگ دوڑکے کام سوچتے سوچتے خود کو ہلکان کر ڈالا۔ لیکن خالنسا کو کام سے تو کوئی گھبراہٹ ہوتی ہی نہیں تھی اس لئے وہ غیرمعمولی طور پر محنتی ثابت ہوئی اور جو کچھ اس سے کہا جاتا وہ فوراً بخوبی انجام دے دیتی۔ کام سے وہ کبھی نہ تھکتی اور تابعدار بھی تھی، ساتھ ہی سب گالیاں اور تمسخر بھی بڑے صبر سے سہتی، نوچنا، کاٹنا، تھپڑ سب

14—2710

برداشت کرتی۔ وہ اپنی زیادہ عمروالی مالکن پر دل ہی دل میں ہنستی جبکہ وہ اپنے کو حنا اور غازہ سے رنگتی ہوئی گھنٹوں آئینے کے سامنے گزار دیتی۔

ایک بات ایسی ہوئی جس سے دونوں بیویوں کو کچھ دن تک سکون ملا۔

ایک دن جبکہ متقوول کہیں باہر گیا ہوا تھا دو اجنبی نوجوان گھر آئے۔ ایک روسی اور ایک ازبیک اور انہوں نے متقوول کو پوچھا۔ ان کے ساتھ فائیلیں تھیں جن کو انہوں نے کھولا اور پنسلیں نکالیں۔

"تو آپ کے یہاں ایک لڑکی نوکرانی ہے؟" روسی نوجوان نے کاغذات دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں" بڑی نے پرنجے کے اندر کھی کھی کرکے جواب دیا۔

"پہلا نام اور ولدیت؟"

"متقوول بائے..."

"نہیں۔ میں اس لڑکی کا نام پوچھتا ہوں۔"

"خالنسا ہے میرے خیال میں..."

"اور دوسرا یعنی باپ کا نام، خاندانی نام؟"

بڑی نے چھوٹی کو پکارا۔

"ائے، چلو، بڑی قابل بیگم، اس چھوکری کا خاندانی نام کیا ہے؟"

چھوٹی نے زنان‌خانے کے اندر سے جواب دیا:

"کہیں نوکرانیوں کے بھی خاندانی نام ہوتے ہیں۔"

"تو کہاں ہے وہ لڑکی؟ ذرا اسے بلائیے گا" ازبیک نوجوان نے کہا۔

بڑی بیوی اندر زنانے صحن میں گئی، خالنسا حوض کے پاس روش پر جھاڑو دے رہی تھی، بڑی مالکن نے کھی کھی کرتے ہوئے اس کے پہلو میں ایک ٹھوکا مارا۔

"جا باہر، وہ لوگ تجھے دیکھنے کو کہہ رہے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ تیرا پیغام لےکر آئے ہیں اور ہم کو تو تو نے بھنک بھی نہیں دی۔ انہہ، ناگن کہیں کی، جھوٹی مکار، نگوڑی، تیری انتڑیاں نکلیں۔ جا نا۔"

خالنسا نے منھ ڈھکا، باہر گئی، وہ لوگ محکمۂ مالیات سے آئے تھے۔

خالنسا نے انہیں اپنا خاندانی نام تو بتا دیا لیکن اس میں اور مالک میں کیا معاہدہ ہوا تھا یہ وہ نہیں بتا سکی۔ اسے یہی نہیں معلوم تھا کہ معاہدہ کیا ہوتا ہے۔

دونوں مردوں نے کاغذ پر کچھ لکھکر بڑی بیوی کو دیا اور اس سے کہا کہ نوکرانی کی خدمات حاصل کئے جانے سے متعلق معاہدے کی رجسٹری کرائی جانی چاہئے اور اگلے دن سے زیادہ اس کام میں دیر نہ ہونی چاہئے۔

جب وہ چلے گئے تو بیویوں نے خوشی کی سانس لی کیونکہ اب خالنسا فہرست پر آ گئی تھی اور اس لئے وہ خطرناک نہیں تھی، حکومت نے خود ہی اس کے لئے ایک ذلیل دستاویز دےکر تصدیق کر دی تھی کہ وہ نوکرانی ہے۔ اب اگر وہ سو گنا زیادہ بھی خوبصورت اور جوان ہو جائے تو بھی متقوول کی بیوی نہیں بن سکتی تھی۔

لیکن متقوول پر اس واقعے کا بالکل ہی مختلف رد عمل ہوا، بڑی بیوی نے اسے محکمۂ مالیات کا وہ کاغذ دیا تو وہ غصے کے مارے تھل تھل ہلنے لگا جیلی کی طرح — چیخا، چلایا، اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پیر پٹکے اور اس کا چہرہ، ہاتھ اور پیٹ تھرتھرانے لگے۔

ٹیکس... محنت‌کشوں کی کمیٹی کو ۳ فی‌صدی، محکمۂ مالیات کو ۵ فی‌صدی۔ یہ نوکرانی تو اسے واقعی بہت مہنگی پڑ رہی تھی۔

وہ یہ کیسے بھول سکتا تھا کہ اس نے متچان بووی کو بھی تو خاصی رقم دی تھی اور اب اس لڑکی کو بھی تنخواہ دینی پڑےگی؟ ٹیکس؟ کیا واقعی ایک آدمی کی اتنی قیمت؟

لیکن وہ آدمی کہاں تھی — وہ تو عورت تھی، صرف ایک عورت... واہ، یہ خوب سوجھی۔ آخر جو عورت گھر میں ہوتی ہے وہ کیا گھر کے مرد کی بیوی نہیں ہوتی؟ بیویوں پر تو ٹیکس ادا نہیں کیا جاتا، بیوی کو اجرت بھی نہیں ادا کی جاتی تو پھر بیوی سے زیادہ سستی کیا چیز ہو سکتی ہے؟

ویسے تو متقوول میں غور و فکر کی صلاحیت نہیں تھی مگر وہ اپنا کاروبار بڑی چالاکی سے کیا کرتا تھا، یہاں تک کہ بعض اوقات تو عقلمند لوگ بھی یہ نہ بھانپ سکتے تھے کہ وہ دراصل کس قدر کھوکھلا تھا اور پھر اس کے اپنے رسوخ بھی تھے، پھر اگر قدرت اللہ جیسے بھیڑیوں کے پھنس جانے کے بعد متقوول ایسے گیدڑ سلامت تھے تو تعجب کیا۔

اس نے اپنی بیویوں کو حکم دیا کہ نوکرانی کو عمدہ کپڑے پہنائیں اور پھر وہ گدھے پر سوار ہوا اور خالنسا اس کے پیچھے پیدل چلی اور یوں دونوں کہیں شہر کے لئے روانہ ہو گئے۔ یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ دونوں محکمۂ مالیات میں نہیں گئے اور نہ ہی معاہدے کا رجسٹریشن کرانے گئے کیونکہ متقوول بائے کو اپنی جیب کی حفاظت کرنا خوب آتا تھا۔

گھر واپس آکر تاجر نے اپنی بیوی کو ایک اور کاغذ دیا۔

"اگر اب وہ لوگ آئیں اور معاہدہ دکھانے کو کہیں تو کہنا ہمارے یہاں نوکرانی نہیں ہے، اور ان کو یہ کاغذ دکھا دینا۔"

"یہ کیا ہے، صاحب؟"

"یہ؟ یہ شادی کا سرٹیفکٹ ہے۔ اس پر ٹیکس نہیں لگ سکتا۔"

کند ذہن، سرخی پاوڈر سے پتی بیوی پہلے تو عادتاً کھی کھی کرنے لگی پھر ایک دم رونے پیٹنے لگی:

"ہائے، ہائے میری قسمت پھوٹ گئی، ارے میں کیسی بدبخت عورت ہوں!"

چھوٹی بیوی دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی اور وہ بھی لگی رونے چلانے۔

"کون؟ ارے اس نوکرانی سے؟ ارے اس کمینی سے؟ ہم نے اسے اپنی تقدیر ہی پھوڑنے کو رکھا تھا کیا؟"

"چپ رہو" بائے ان پر زور سے چیخا۔

وہ دونوں نہیں چپ ہوئیں، پھر وہ ان کو سمجھانے کی

بےسود کوشش کرنے لگا کہ خالنسا اس گھر میں نوکرانی ہی کی حیثیت سے رہےگی اور اس پر کچھ خرچ بھی نہیں کرنا پڑےگا لیکن دونوں بیویوں کو یقین نہیں آیا۔

خالنسا کے لئے زندگی عذاب ہو گئی۔

تاجر کی بیویاں تو بالکل ہی ہوش حواس کھو بیٹھی تھیں۔

"ارے کمبخت تیرا ستیاناس ہو! تیری گردن ٹوٹے! تیری قبر کو آگ لگے!" وغیرہ سب کچھ خالنسا کو دن بھر سننا پڑتا تھا۔

دن رات اس کی چوکی‌داری بھی کی جاتی تھی، دونوں نکمی عورتیں جنھیں حسد کرنے اور جلنے کے سوا کوئی کام نہ تھا، بس اسی پر نگاہ جمائے رہتیں، اسے پیٹتیں یہاں تک کہ خود ان کے بازو شل ہو جاتے اور خالنسا جس میں نہ جانے کتنا صبر اور کتنی برداشت تھی، اب اکثر و بیشتر رویا ہی کرتی۔

"اری نامراد، تیری آنکھیں پھوٹ جائیں، چپ ہو جا!" دونوں بیویاں اسی پر جھپٹتیں۔ "باہر مردانے میں مرد تیری آواز سنتے ہوں‌گے بےحیا، ڈوب نہیں مرتی!"

جب خالنسا کپڑے دھونے لگتی اور مالک کی قمیض ٹب میں بھگوتی تو ہمیشہ ہی اس میں کچھ نہ کچھ "خرابی" ہو جاتی، فوراً اس کو برا بھلا کہا جاتا، پیٹا جاتا، جب وہ آفتابے میں پانی لےکر مالک کا ہاتھ دھلاتی تو بیویاں اس سے اس بری طرح آفتابہ چھینتیں کہ جیسے اس کے ہاتھ ہی نوچ کر پھینک دیں گی۔

چھوٹی بیوی زیادہ غصہ کرتی، خالنسا کو کسی کونے میں دباکر، اپنی ہڑیلی انگلیوں سے اس کے چٹکیاں کاٹتی۔

"ہو، تو تجھے خصم چاهئے، تیری ایسی کتیا کو خصم کا تصور تک کرنے کی کون اجازت دے سکتا ھے؟"

خالنسا کے لئے وہ بڑے مبارک اور غنیمت لمحات ہوتے تھے جب اسے گالیاں نہ سننی پڑیں اور وہ اکیلی ہو لیکن دونوں بیویاں اسے پل بھر کو چین نہ لینے دیتیں، خود بکتے

جھکتے تھک جاتیں، کراھنے لگتیں لیکن پھر بھی اس کے پیچھے پڑی رھتیں جیسے کسی جنگلی جانور کا تعاقب کرنےوالے کتے اپنی پروا نہیں کرتے۔

پھر خالنسا پر ایک نئی آفت ٹوٹی، تاجر نے اپنی بیویوں کے حسد اور جلن کی کچھ اور ھی تعبیر کی، وہ دونوں اس لڑکی پر جتنا ھی زیادہ غصہ کرتیں، جھنجھلاتیں، کھسیاتیں وہ اس پر اتنا ھی مہرباں ھوتا جاتا، خالنسا اس کی نظریں پہچانتی اور مستقل خوف کے عالم میں زندگی گزارتی، رات کو پتا بھی کھڑکتا تو وہ بھڑکتی، جاگ پڑتی، بستر سے کود نکلتی کہ شاید یہ مالک کے پاؤں کی چاپ ھے، اس کی سانسوں کی، اس کی ھونٹ چاٹنے کی آواز ھے۔

وہ امید و بیم کی حالت میں شدید ذھنی پریشانی کی زندگی بسر کر رھی تھی اور مدد کے لئے دعائیں مانگتی تھی لیکن اس کی آواز سننےوالا کوئی نہ تھا۔ وہ ان لوگوں کو تلاش کرنا چاھتی تھی جنھوں نے اس کا خاندانی نام دریافت کیا تھا لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ انہیں کہاں ڈھونڈے۔ ویسے وہ ان لوگوں سے ڈرتی بھی تھی۔ کوئی بھی ایسا نہ تھا جس سے وہ مدد مانگتی۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کی ماں جب دم توڑ رھی تھی تو اس کی مدد کرنےوالا کوئی نہ تھا۔

خالنسا تنہا تھی اور ایک رات وھی ھوا جس کا اسے ڈر تھا۔ مالک اسے اپنے کمرے میں گھسیٹ لے گیا۔

اور اس نے کس سے شکایت کی؟ کس سے ھمدردی چاھی؟ ان ھی دونوں پرانی بیویوں سے جو اس سے نفرت کرتی تھیں اور دنیا میں اس کا تھا بھی کون؟ وہ ان کے پیروں پر گر پڑی، ان کے لباسوں کو بوسے دئے، ھاتھوں کو چوما اور ان کی منت خوشامد کی کہ اس پر ترس کھائیں۔

وہ یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس واقعے کے بعد بائے کی بیویوں نے اسے پیٹا یا اس کے ساتھ کیا سلوک کیا کیونکہ وہ ھوش میں نہیں تھی، اعصاب کے بخار نے اسے آ دبوچا اور وہ بےھوشی اور بےبسی میں بھٹکتی رھی، یہ بھی اسے ٹھیک سے

اندازہ نہیں تھا کہ اس کی یہ حالت کب تک رہی۔ ایک گھنٹہ، ایک دن یا ایک ہفتہ۔

پھر اس کی جوانی اس کے کام آئی، دھیرے دھیرے اس کی قوت بحال ہوئی اور وہ اس صدمے سے نجات پا سکی۔ متقوول کا خوف بھی ختم ہوا جو اس کی حالت دیکھ کر اپنی ہی خیر منا رہا تھا، بلکہ شروع میں تو اس نے اپنی بیویوں سے خالنسا کی تیمارداری بھی کروائی۔

بعد میں گھر کے حالات اپنے معمول پر واپس آ گئے۔ بیویوں نے بھی خود کو اس حقیقت کے برداشت کرنے پر آمادہ کر لیا کہ وہ ان کے میاں کی تیسری بیوی ہے لیکن انہوں نے اس بات کا بہرحال خیال رکھا کہ وہ کام کاج میں جتی رہے بس اتنی مہربانی ان کی کافی تھی کہ اب وہ اسے مالک کے لئے آفتابہ بھر کر پانی لے جانے اور اس کے سوجے ہوئے پیر کی مالش کرنے کی اجازت دے دیتی تھیں۔

دکاندار اپنی جگہ غرور اور خوشحالی سے پھولا نہیں سماتا تھا، اس نے ایسے ٹیڑھے معاملے کو کیا خوبصورتی سے سنوارا اور نبٹایا تھا، اس نوکرانی کو نہ بیوی کا حق حاصل تھا اور نہ وہ تنخواہ مانگ سکتی تھی، وہ اب بھی گھر کی ایک کنیز تھی اور پہلے کی طرح بےچون و چرا سب خدمات انجام دیا کرتی تھی۔

پھر ایک لڑکا پیدا ہوا اور خالنسا گی زندگی مشکل‌تر ہو گئی۔ اب اسے اپنی دوسری مشکلات کے علاوہ اپنے بچے کو بھی بڑی بیویوں کی نفرت سے بچانا تھا۔ ماں بننے کے بعد بھی گھر میں اس کی کوئی عزت نہ تھی بلکہ اب تو وہ نوکرانی کا کام بھی اتنی توجہ اور محنت سے انجام نہیں دے پاتی تھی۔ کیونکہ ننھے بچے کو بھی تو دیکھنا ہوتا تھا۔ اور ان سب پر طرہ یہ کہ مالک کو اب اسے اور اس کے بچے دونوں کو کھانا کھلانا غیرمنفعت‌بخش معلوم ہو رہا تھا۔

بڑی بیویوں نے مالک کے کان بھرنے شروع کئے اور اب کی بار ان کا اندازہ درست نکلا، متقوول کنجوس اور لالچی تو تھا ہی، وہ اپنے آپ کو تباہ کیسے ہونے دیتا؟ جب اس نے

دیکھا کہ نوکرانی پر پہلے سے زیادہ رقم خرچ ہو رہی ہے تو اس کو خالنسا اور اس کے بچے کو کسی خاص ھچکچاھٹ کے بغیر گھر سے نکال دیا۔

اور یہی اس نے غلطی کی۔ خالنسا کی سمجھ ھی میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے لیکن بےگھر، بےدر لڑکی کو آخر کار ایک پناہ مل گئی... اور وہ پناہ تھی جوراخان۔

... یہاں تک بیان کرکے جوراخان نے اپنی فرد قرارداد جرم ختم کی۔ اس نے بتایا کہ خالنسا اس سے کس طرح ملی، ٹھوکریں کھاتی اس بدنصیب عورت کو حق اور انصاف کیسے حاصل ھوا۔

"کہو، اب کچھ سمجھ میں آیا؟" جب جج لوگ فیصلے پر غور کرنے اندر گئے تو یفیم دانیلووچ نے ایرگاش سے پوچھا۔ "کچھ سمجھے تم کہ ھمارا اور تمہارا فرض آج کیا ھے؟"

"میں تو آپ کو اپنی رائے بتا چکا" ایرگاش نے مٹھیاں بھینچتے ھوئے جواب دیا۔ "ھمیں ان بائے لوگوں کے گھونسلے اجاڑنے ھی پڑیں گے۔ یہ گھونسلے جہاں عورتوں کی عصمت‌دری کی جاتی ھے، جہاں نادرشاھی حکم چلتے ھیں، جہاں محنت‌کشوں کا خون چوسا جاتا ھے۔"

"صرف اتنا کافی نہیں ھے ایرگاش، صرف اتنا کافی نہیں ھے" یفیم دانیلووچ نے اس کی بات کاٹی۔ "بےشک تم بڑے جوش سے بات کرتے ھو مگر غصے نے تمہیں اندھا کر دیا ھے۔ اور تم زیادہ آگے نہیں دیکھ پا رھے ھو، کچھ اور آگے دیکھنا، زیادہ واضح طور پر دیکھنا سیکھو۔"

"اور دیکھنے کو کیا ھے؟"

"یہ دیکھو کہ وقت اب تم سے مزید باتوں کا مطالبہ کر رھا ھے، خالنسا کو متقوول سے بچانا ھی کافی نہیں ھے، ھمیں خالنسا کے لئے ایک نئی زندگی بھی تعمیر کرنی ھے، سو میرے عزیز ایرگاش، اس نئی زندگی کی تعمیر کرو، یوں

که جیسے هم مکان بناتے هیں، ایک ایک اینٹ کرکے۔ هم اگر کمیونسٹ هیں تو هم میں یه کر سکنے کی قوت هونی چاهئیے۔"
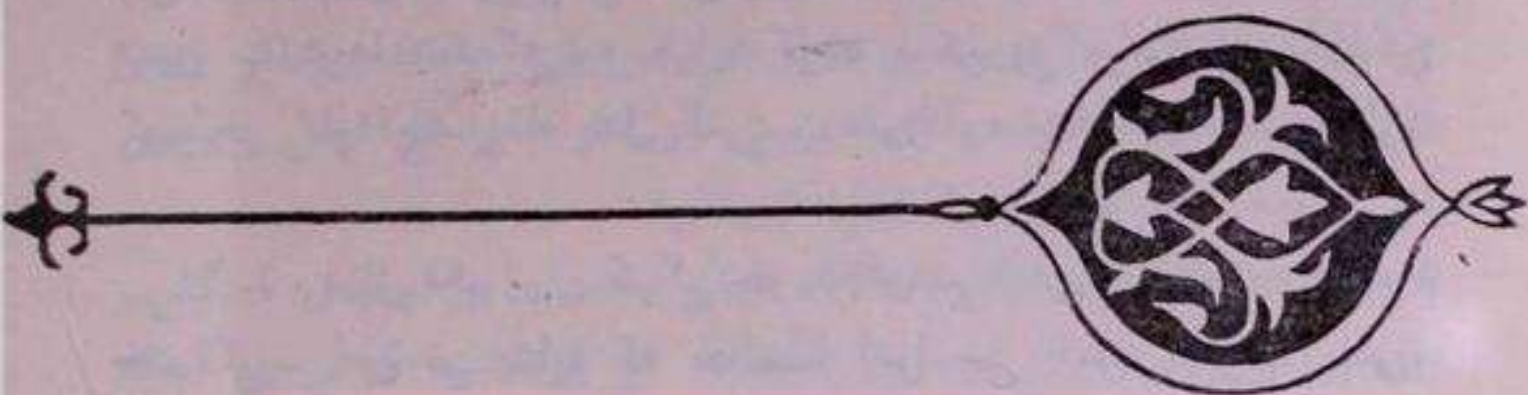
تیرهواں باب

ٹیچر نعیمی کو سخت کوفت هو رهی تھی، وه جهاں بھی جاتا اسے ایسا لگتا که وه چائے کا تاجر اس کے ساتھ ساتھ چل رها هے اور اس کی کهنی اور بازو کو اپنی آهنی گرفت میں لئے هوئے هے، جهاں اندھیرا شروع هوتا که نعیمی تصور کرنے لگتا که لکڑی کے هر جنگلےدار پھاٹک کی آڑ میں کسی نوجوان بدمعاش کا سایه دکھائی دیتا هے جو کسی عورت کی پیٹھ میں خنجر بھونک رها هے۔ ایسے لمحات میں ٹیچر کے دل میں خود اپنے هاتھوں کو دیکھنے کی نهایت هی شدید خواهش پیدا هوئی... لیکن اس کے هونٹ غیرارادی طور پر دھیرے دھیرے یه الفاظ یوں دوهرانے لگتے جیسے که یه کوئی دعا هوں۔

"کیا تم کچھ کھوگے؟ نهیں..."

اسے اپنی تنهائی کاٹے کھاتی تھی، قدرت‌الله کے گھر جانے کی اس کی همت نهیں پڑتی تھی، جو لوگ خود هی کچے دھاگے سے کنویں میں لٹک رهے هوں ان پر اپنی موجودگی کا بھی بوجھ بڑھانے سے فائده هی کیا تھا۔ متقوول کی دکان پر تو تختے جڑ دئے گئے تھے، مقدمے کے بعد، نوکرانی کو متقوول سے چار سال کی تنخواه ادا کروائی گئی تھی۔ اس کی تو تقدیر کھل گئی لیکن نعیمی ایک اور ٹھکانے سے

محروم ہو گیا جہاں وہ چائے پی سکتا تھا اور مزے لے لےکر، اسلام کے مستقبل پر بات چیت کر سکتا تھا۔

اسکول میں بھی اسے چین نصیب نہ تھا۔ پہلے تو شاگردوں ہی کے سامنے چرب‌زبانی کر کرکے، اترا اتراکے، اپنے دل کی بات کہہ‌کر اپنا بوجھ ہلکا کر لیا کرتا تھا جیسے کہ وہ کبھی مسلمانوں کے مجمعے کے سامنے کر چکا تھا ویسے اپنے کلاس میں نہایت ہی جوشیلی اور لچھےدار تقریریں کیا کرتا تھا۔ جو جی چاہتا کہتا لیکن ادھر کچھ دنوں سے کلاس میں اس کی بات ذرا زیادہ دھیان سے نہیں سنی جاتی تھی۔ نعیمی کو لڑکیوں کی طرف سے دبی دبی سی، خاموشی سی، مخالفت محسوس ہوتی تھی۔ ویسے یہ سوچنا تو ایک مذاق ہی کی بات تھی کہ اسکول کی لڑکیوں کو بھی اس کی اصلیت کا پتہ چل گیا ہو مگر پھر بھی اسے محتاط تو رہنا چاہئے تھا۔

کھیل کے وقت میں اور اسکول کے بعد لڑکیاں بشارت کے آس پاس منڈلایا کرتی تھیں اور وہ کبھی اکیلی نہ ہوتی تھی۔ لڑکیاں ایسا اس کی بات سنتی اور مانتی تھیں جیسے وہ ان سب کی رہنما ہو۔ وہ کوآپریٹو کی صدر کی بیٹی تھی اور کوآپریٹو کی صدر کے اختیارات اور شہرت میں یوں اضافہ ہوتا جاتا تھا جیسے کہ کسی کہانی میں ہوتا ہے۔ اس عورت کی جان لینے کی کوشش کے باوجود اسکول کی لڑکیاں ڈرکر اس سے الگ نہیں ہوئیں بلکہ اس واقعے کے بعد سے تو لڑکیاں بشارت سے اور بھی قریب آ گئی تھیں۔ یہ تمام باتیں سمجھ سے بالاتر تھیں!

اور خود بشارت نے ادھر کچھ دنوں سے ایسے پر پرزے نکالے تھے کہ نعیمی کو اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ بالکل اپنی ماں کے نقش‌قدم پر چل رہی تھی۔ جب نعیمی کو معلوم ہوا کہ بشارت روسی بھی بول اور پڑھ سکتی ہے، تب تو وہ لرز گیا۔ اس نے متعدد بار دیکھا تھا کہ وہ کس جوش و خروش اور استقلال کے ساتھ ایک چھوٹی سی کتاب میں سے اپنی اسکول کی دوستوں کو کچھ نہ کچھ سمجھاتی رہتی تھی۔ یہ

کتاب وہ کسی کو نہیں دیتی تھی اور نعیمی جانتا تھا کہ وہ کتاب ھے "کومسومول کے ضوابط"۔ اس کے علاوہ ایک اور کتاب بھی وہ اکثر بشارت کے ھاتھ میں دیکھتا تھا - گورکی کی "ماں"۔ افوہ، کیا زمانے آ گئے تھے...

ٹیچر اس شرمناک اندیشے سے سخت ذھنی اذیت میں مبتلا رھتا کہ اس لڑکی کی وجہ سے اسے خراب حالات کا سامنا کرنا پڑےگا اور وہ اسے تباہ کرکے رھےگی۔ اور ھوا بھی ایسا ھی۔ قسمت کو اس کی توقع سے بہت پہلے ھی اس کی بربادی منظور ھوئی۔

عام طور پر سبق کے وقت نعیمی کی میز اور لڑکیوں کے درمیان سفید "متا" کا ایک پردہ پڑا رھتا تھا جسے لڑکیاں "ٹیچر کا نقاب" کہتی تھیں! اس وقت بھی پردہ پڑا ھوا تھا اور بظاھر سبق نہایت شائستگی کے ساتھ شروع ھوا۔

حاضری لینے کے بعد نعیمی خاص کر بشارت سے مخاطب ھوا اور اس کی امی کی خیریت پوچھی۔ واقعہ تو یہ تھا کہ وہ ھر سبق میں محترمہ بہن اناخان کی خیریت ضرور پوچھ لیتا تھا اور جب اناخان کی بیٹی اس کا شکریہ ادا کرتی تو وہ اطمینان کی سانس لیتا۔

لیکن آج بشارت نے اچانک پردے کے پیچھے سے جواب دیا:

"دشمنوں نے تو میری ماں کی جان ھی لینی چاھی تھی۔"

"تمھاری آواز میں" نعیمی نے پدرانہ شفقت کے ساتھ اسے فہمائش کرتے ھوئے کہا، "مجھے غصے اور نفرت کی لہر محسوس ھوتی ھے۔ کیا یہ تمھیں زیب دیتا ھے؟"

بشارت نے جیسے اس کا سوال سنا ھی نہیں۔

"پھر بھی" اس نے فخر سے کہا۔ "مزدور طبقے کے لوگ کسی چیز سے نہیں ڈرتے کیونکہ مزدور طبقے سے زیادہ مضبوط کوئی نہیں ھوتا!"

کمرے پر ایک ناخوشگوار سی بےچین سی خاموشی چھا گئی۔ نعیمی نے صبر سے کام لینے کی کوشش کی۔ کسی لڑکی سے بحث شروع کر دینا تو بےوقوفی ھوگی اور... اور

وہ گھبرا کیوں رہا ہے؟ اسے گھبرانا نہ چاہئے، وہ اس کو اور دوسری لڑکیوں کو اپنی بات سناکے رہےگا اور جو کچھ چاہےگا ان کو ذہن‌نشیں کرائےگا۔

"پچھلے سبق میں" اس نے پردے کے پاس ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ اس کے قیمتی زرد جوتے چوں‌چر، چوں چر بول رہے تھے۔ "ہم نے تمہیں اپنے عقلمند عالم اور عظیم شاعر قل خواجہ احمد یساوی* کی بےمثال و نایاب خوبیوں کے متعلق بتایا تھا۔ وہ ایک نہایت شریف اور پارسا مسلمان تھے جو غریبوں اور یتیموں پر رحم کرتے تھے، ان کی ضرورتوں اور دکھوں سے ان کو ہمدردی تھی اور خود بھی ان کی ساری زندگی روتے اور آہیں بھرتی گزری۔ جب لوگوں کو تکلیف پہنچتی تو وہ بےنیاز نہیں رہ سکتے تھے اور لوگوں کو پاک و پاکیزہ مشورے دیتے۔ لیجئے، میں ان کی ایک نظم سناتا ہوں:

تمام دکھ برداشت کرو، تلخ‌ترین ہتک پی جاؤ
تنہا سب بھگتو،
دہنے رخسار پر طمانچہ لگے تو بایاں پیش کر دو
زبان نہ کھولو
ظالم ظلم کرے تو اس سے اور ظلم کرنے کو کہو
محرومی کو قسمت بنا لو۔

نعیمی نے یہ مصرعے بڑے جوش کے ساتھ دوہرائے، اس کی آواز میں منمناہٹ اور گڑگڑاہٹ تھی۔ پھر اس نے کان لگاکر آہٹ لی، لڑکیاں مصرعوں کو قلم‌بند کر رہی تھیں،

---

* قل خواجہ احمد یساوی (پیدائش تقریباً ۱۱۰۵—موت ۱۱۶٦) — ایک دیندار صوفی شاعر جو بدی کا مقابلہ نہ کرنے اور قسمت کو تسلیم کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ مترجم۔

ایک مکار سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اپنی بات پھر جاری کر دی:

"عظیم خواجه احمد نے فرمایا: کاش میری آنکھیں نه دیکھیں که دنیا میں لوگ ایک دوسرے کو کس طرح دکھ پہنچاتے ھیں۔ اور جب وہ عمر بعثت کو پہنچے تو تحت الثری میں اتر گئے جو زمین کے سات طبقات کے نیچے ھے اور وھاں وہ تنہائی کی زندگی بسر کرتے تھے، آپ صرف ایک انگور ھر سال نوش فرماتے تھے اور بس۔ اور آپ نے لکھا:

"اے مسلمان بھائیو، میں سات طبقات کے نیچے پہنچ گیا ھوں۔۔۔"

"کیا میں ایک سوال کر سکتی ھوں؟" بشارت نے یکایک پوچھا۔

نعیمی چونک پڑا۔ اس لڑکی کی آواز کتنی اونچی تھی۔ گستاخ، بدتمیز۔

"پہلے ھم اختتام لکھ لیں" ٹیچر نے دھیرے سے سانس لیتے ھوئے کہا۔ "لکھو: قل خواجه احمد یساوی، مرشد مرشدین ساری دنیا کے غریب لوگوں کے زبردست حامی تھے اور وہ ھمارے سب سے بڑے مصنف اور صاحب قلم ادیب تھے۔"

"یه صحیح نہیں ھے!" بشارت نے ایک دم زور سے کہا۔ "میں تو یه نہیں لکھوں گی، سب سے عظیم ادیب میکسم گورکی ھے!"

کلاس روم لڑکیوں کے شور سے گونجنے لگا۔

نعیمی کو ایسا لگا که اس کی سانس گھٹ گئی۔ ھوش درست کرنے کے لئے وہ ذرا سا کھانسا۔

"لڑکیو، لڑکیو، ھیں، ھیں، ھیں۔ بری بات۔ تمہارا پہلا فرض یه ھے که ادب لحاظ کا خیال رکھو، مدرسه علم و نور کا معبد ھے اور تمہیں یاد رکھنا چاھئے که تمہارے لئے بزرگوں کی رائے اور استاد کے الفاظ ھی قانون ھیں۔ میں جب

اسکول جاتا تھا تو توجہ سے سنتا تھا اور وہی لکھتا تھا جو مجھ سے کہا جاتا تھا اور پھر میں تو تمہیں پبلک ایجوکیشن کی کمیساریت کی ھدایت کے مطابق ھی پڑھا رھا ھوں، سوویت حکومت مجھے ھدایت دیتی ھے۔"

درجے میں خاموشی چھا گئی۔

"ھاں، میکسم گورکی نام کا ایک ادیب ھے تو سہی" نعیمی نے تیوری پر بل ڈال کر کہنا شروع کیا۔ "ضرور ھے ایسا ایک ادیب لیکن پھر ھمیں اس سے کیا لینا؟ وہ ھم سے بہت دور رھتا ھے اور اس نے ھمارے متعلق کچھ نہیں لکھا، وہ ترکستان کے رھنےوالوں اور یہاں کے غریب لوگوں کی زندگی کے متعلق نہ کچھ جانتا ھے اور نہ جان سکتا ھے۔ وہ ان کے دکھوں اور ان کے آنسوؤں کو کیسے سمجھ سکتا ھے؟"

پھر ٹیچر کی سمجھ میں یہ تو آیا کہ بالآخر وہ ایک فضول سی لڑکی سے بحث میں الجھ گیا تھا مگر اب تو بہت دیر ھو چکی تھی، تیر کمان سے نکل گیا تھا۔ بڑی خطرناک بات ھو گئی! بےکار کی غلطی جس سے صرف کوفت ھو، اس نے پردے کی آڑ سے دیکھا کہ بشارت اپنی جگہ پر اچھل کر کھڑی ھو گئی۔

"یہ سچ نہیں! یہ صحیح نہیں ھے" اس نے بےباکی کے ساتھ چیخ کر کہا۔ "میکسم گورکی نے ھمارے باپوں کے بارے میں لکھا ھے کہ وہ کیسے لڑے تھے..."

"صابر کی بیٹی" نعیمی غصے میں آپے سے باھر ھوکر زور سے چلایا۔ اس کی آواز ایسی تھی کہ وہ خود اس پر حیران رہ گیا۔

پردے کے آگے رک کر اس نے طنز بھرے بہلاوے کے ساتھ کہا:

"میں تمہارے طور طریقوں پر حیران ھوں۔ تمہاری یہ کہنے کی ھمت ھوئی کہ "ھمارے باپوں..." لیکن اگر میں غلطی پر نہیں ھوں تو تم تو ھمارے ناقابل فراموش دوست ملا صابر کی بیٹی ھو۔ اور میکسم گورکی نے تو روسیوں کے

متعلق لکھا ہے۔ تم یہ بھول گئی ہو کہ تم ایک ازبیک کی بیٹی ہو۔ ہاں، اگر تم غلطی سے کسی روسی کی اولاد ہو تو وہ دوسری بات ہے...“

”ہائے“ پردے کے پیچھے سے لڑکیوں نے شرم اور خوف سے چیخ ماری۔

بشارت نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا، پیٹھ یوں جھکا لی جیسے کسی نے اسے زور کا تھپڑ مار دیا ہو اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ٹیچر نعیمی کی زبان بند ہو گئی، وہ حد کو پار کر گیا تھا۔ اور گھنٹہ ختم ہونے سے اس کی جان بچ گئی، سبق ہو چکا تھا۔

”فوراً کامن روم میں جاؤ“ اس نے اپنی پریشانی چھپانے کے لئے بشارت کو حکم دیا اور خود سر اٹھائے، سینہ تانے باہر نکل گیا۔

جو کچھ وہ کر بیٹھا تھا اس سے خود اس پر سخت دہشت طاری تھی۔ یہ بحث کلاس کے باہر تو نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے انتہائی بے احتیاطی کی... اب جلد از جلد اس لڑکی پر شفقت اور محبت جتانی چاہئے۔ اس کا غصہ ٹھنڈا کیا جانا چاہئے۔

چند منٹوں کے اندر اندر کامن روم نعیمی کی شاگرد لڑکیوں سے بھر گیا، بشارت انہیں بلا کے لائی تھی۔

”میں نے تو صرف صابروا کو بلایا تھا“ نعیمی نے سختی سے کہا۔ وہ دوسری لڑکیوں کو گھر بھیج دینا چاہتا تھا مگر الفاظ حلق میں پھنس کر رہ گئے۔

بشارت آگے آئی اور اس نے اپنے آنسوؤں سے تر چہرے سے نقاب نوچ کر الٹ کر دی۔

”میری بیٹی، میری بچی“ نعیمی نے کہا۔ ”تمہیں اپنے اوپر شرم آنی چاہئے!“

”نہیں، شرم آپ کو آنی چاہئے“ بشارت اس سے برابر والوں کی طرح مخاطب ہوئی۔ ”شرم تو آپ کو آنی چاہئے کہ آپ نے میری ماں اور میرے باپ کے متعلق اس طرح کی باتیں کیں۔ میرے باپ مزدور طبقے کے تھے! اور یفیم دانیلووچ

اور خالہ صوفیہ بھی مزدور طبقے کے ہیں اور وہ دنیا کے بہترین لوگوں میں سے ہیں اگرچہ وہ ازبیک نہیں ہیں، ان کے متعلق میری ماں سے پوچھئے اور میں تو اپنی ماں سے ضرور کہوں گی کہ آپ نے کس طرح ان کی توہین کی ہے۔ آپ نے جو کچھ کہا سب غلط ہے، سب جھوٹ ہے۔"

اور پھر مزید بدنصیبی یہ ہوئی کہ اسی وقت ہیڈ مسٹرس اور اس کے پیچھے پیچھے دوسرے ٹیچر کمرے میں آ گئے، نعیمی کو محسوس ہوا کہ اب تو وہ بالکل ہی گھر گیا چاہے جتنی کوشش کرے اس مشکل سے بچ کر نہیں نکل سکتا، گواہوں کی بھرمار ہو گئی تھی۔

سب لڑکیاں بڑی مضبوطی کے ساتھ ایک دوسرے کا ساتھ دے رہی تھیں، بشارت منھ کھولے بول رہی تھی اور اس کی اس حرکت پر اس کی دوستوں کو نہ ندامت تھی نہ ڈر لگ رہا تھا، سب ڈٹی ہوئی تھیں۔ نعیمی نے زندگی میں کبھی ایسا منظر دیکھا ہی نہیں تھا۔

اس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اس کی توہین کی گئی ہے تاکہ لڑکیاں گڑبڑا جائیں۔ اس نے ٹیچروں کے احترام کی، ڈسپلن اور باقاعدگی کی اور کلاس روم کے آداب کی باتیں کیں۔ لیکن اس کی یہ کوشش رائیگاں گئی۔ لڑکیوں نے اس کی تمام مدافعتی حرکات کا بس ان ہی الفاظ میں جواب دیا: "یہ صحیح نہیں ہے، یہ غلطبیانی ہے۔" چاپلوسی سے بھی وہ انہیں رام نہ کر سکا، لڑکیوں نے اسے ہرگز معاف نہیں کیا۔

"اچھا اب مجھے بتائیے" ہیڈ مسٹرس نے سب کے چلے جانے کے بعد تنہائی میں نعیمی سے پوچھا۔ "آپ استاذ ہیں کہ اشتعال دلانےوالے تخریب کار؟"

لڑکیوں کی ہنستی کھیلتی پوری ٹولی، بشارت کو اس کے گھر پہنچانے گئی، اب وہ سب دوستی اور سچی رفاقت کے ایسے رشتے میں بندھ چکی تھیں جو ایک مشکل آزمائش سے گزر چکا تھا۔ بشارت کو اب اس امر میں کوئی شک نہ تھا کہ عبدالصمد نے کومسومول کا جو کام اسے سونپا تھا اسے وہ پورا کرے گی۔

اس نے سڑک پر بھی پرنجے نہیں پہنا بلکہ اسے لپیٹ کر بغل میں دبائے گھر پہنچی۔

اناخان کھڑکی کے پاس بچھے پلنگ پر لیٹی تھی۔ اس کے کندھے پر پٹی کس کر بندھی تھی اور نئی پٹی دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر ابھی آکے گیا ہے۔ تورسنائی برآمدے میں بیٹھی حلقے میں گانے کے لئے ایک گیت کی مشق کر رہی تھی۔

بشارت نے جلدی جلدی کھانا گرم کیا جو ایک پڑوسن پکاکے رکھ گئی تھی اور چمچے سے ماں کو کھلانے لگی۔

"امی، اب آپ کی طبیعت بہتر ہے نا؟ آپ کی آنکھیں چمک رہی ہیں..."

"ہاں بیٹی، بہتر ہوں، جلد ہی چلنے پھرنے لگوں گی" اناخان نے جواب دیا۔ "مجھے اپنا کوآپریٹو بہت یاد آتا ہے، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہاں کچھ غیرمعمولی باتیں ہو رہی ہیں جو یہ لوگ مجھے نہیں بتا رہے ہیں، تم بھی مجھے اپنے حالات نہیں بتاتی ہو مگر میں محسوس کرتی ہوں کہ تم اپنی امی سے کچھ چھپا رہی ہو۔ ایسا کیوں؟"

"نہیں امی، میں کچھ چھپا تو نہیں رہی ہوں پر یہ وعدہ کیجئے کہ اگر میں بتاؤں تو آپ پریشان تو نہیں ہوں گی" بشارت نے کہا اور اس کا چہرہ لال ہو گیا۔

اناخان آہستہ آہستہ اس کا سر سہلانے لگی۔

تب بشارت نے اسکول میں جو کچھ ہوا تھا وہ سب اپنی ماں سے کہہ سنایا۔

اناخان نے حیرت اور بےاعتباری کے ملے جلے جذبات سے اسے دیکھتے ہوئے اس کی باتیں سنیں۔ اس نے بشارت کی کہی بعض باتوں کو دوہرایا۔

"کیا؟ تم نے اس سے کیا کہا؟"

اور بشارت نے بار بار وہ الفاظ دوہرائے جو اس نے جماعت میں اور کامن روم میں نعیمی سے کہے تھے۔

"ٹھہرو، ٹھہرو! تم نے اپنا منھ کیسے کھولا؟ اس کے سامنے بےنقاب ہو گئیں؟" ماں نے پوچھا۔ اس کی آواز میں ناپسندیدگی کی جھلک تھی۔

"لیکن امی، پرنجے کے بغیر بحث کرنا بہت آسان جو تھا"

لڑکی نے جواب دیا جیسے کہ اپنے اقدام کے لئے جواز پیش کر رہی ہو۔

اسی لمحے اسے ماں کی آنکھوں میں آنسو دکھائی دئے اور وہ ڈر سی گئی۔

"دیکھئے نا، وہی ہوا نا، آپ پریشان ہو گئیں نا، ناحق ہی میں نے آپ کو یہ سب بتایا۔"

اناخان نے جذبات کے ساتھ بیٹی کو ایسا بھینچ کر گلے لگایا کہ کندھے کا زخم دکھا اور وہ کراہنے لگی۔

"میری جان، میری ننھی ٹیچر" اس نے سرگوشی کی۔ "اس سبق کے لئے تمہارا شکریہ، تم ٹھیک کہتی ہو، جب ہم بات کریں تو ہمارا چہرہ کھلا ہونا چاہئے۔ یہ پرنجے ہم دونوں کے استعمال میں رہتا تھا اور اب ہم دونوں مل کر اسے دور پھینک دیں گے۔"

"میری امی! کیا آپ واقعی ایسا ہی کریں گی؟"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تم سے پیچھے رہ جاؤں گی تو مجھے شرم نہ محسوس ہوگی؟ میں تو اسے بارہ سال کی عمر سے استعمال کر رہی ہوں۔ میرے لئے اسے اتار پھینکنا تمہاری بہ‌نسبت کہیں زیادہ مشکل ہے لیکن جس روز پرنجے پر میرا خون گرا وہ اس کے استعمال کا آخری دن ہونا چاہئے۔ تمہارے ابا زندہ ہوتے تو وہ ہم دونوں کی تعریف کرتے۔"

"تورسنائی!" بشارت جوش میں آکر چلائی۔ "تورسنائی! تم نے سنا؟"

... اس روز اناخان کو حیرت میں ڈالنے والی ایک اور بات ہوئی۔ جوراخان، صوفیہ اور یفیم دانیلووچ اس سے ملنے آئے اور اپنے ساتھ ایرگاش سلطانوف کو بھی لائے۔ جیسے ہی انہوں نے دھلیز پار کی اناخان سے "سویونچی" مانگنے لگے۔

"کامریڈ صدر صاحبہ، آپ کے کوآپریٹو کی زندگی کے آخری دن آ گئے ہیں" یفیم دانیلووچ نے کہا۔ "وہ اپنا کام پورا کر چکا اور اب ہم اور آگے بڑھ رہے ہیں۔"

"کیسے؟ کہاں؟"

"بہت آگے، حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمارے شہر

تعمانچہ میں ایک سوتی مل بنے گی۔ ایوانوو وازنیسنسک سے مشینیں آئیں گی۔"

"میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں جس شہر کی رہنےوالی ہوں اس کے متعلق اتنی جلدی کچھ سنوں گی" صوفیہ نے کہا۔ "لیکن اس نے تو اپنا ہاتھ ہم تک بھی پہنچا دیا۔"

اناخان نے بشارت کو بلاکر اس کی آنکھوں میں متجسس نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا:

"سمجھتی ہو بیٹی، اس سب کے کیا معنی ہیں؟ جانتی ہو کون اپنا ہاتھ ہم تک بڑھا رہا ہے؟"

بشارت نے خوشی سے تالی بجائی:

"کل اسکول میں سب لڑکیوں کو اس کے متعلق بتا دوں گی۔ میں اور سب کے سامنے کلاس میں ٹیچر سے بھی کہوں گی۔"

"تم اسے کلاس میں دیکھوگی ہی نہیں" جوراخان نے کہا۔ "آج کا سبق تمہارے اسکول میں اس کا آخری سبق تھا۔ تمہیں اور ٹیچر دئے جائیں گے، اس سے کہیں بہتر ٹیچر۔"

اسی شام ایک نوجوان اناخان سے ملنے آیا جو مغربی لباس پہنے تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو اس رات بھی آیا تھا جب اناخان پر حملہ ہوا تھا۔ اس نے لڑکیوں کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا، اناخان نے دونوں کو باہر صحن میں بھیج دیا۔

"آپ کو اچھی طرح یاد ہے کہ آپ کے حملہ‌آور نے کیا کہا تھا؟" نوجوان نے پوچھا۔

"ہاں... "لہ تم نہ میں"۔"

"آپ کے خیال میں ان الفاظ کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟"

"میں اس کے متعلق کافی سوچتی رہی ہوں مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔"

"معاف کیجئے گا" نوجوان نے اپنی آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے آپ سے ایک ذرا ویسا سوال کرنا ہے۔ آپ بیوہ

ہیں نا، تو آپ نے کبھی یہ محسوس کیا کہ کوئی مرد، اور عورتوں کے مقابلے میں آپ پر زیادہ توجہ دے رہا ہے؟"

اناخان کے چہرے پر ایک تھکی سی مسکراہٹ آئی، نوجوان نے اپنی بات جاری رکھی:

"مہربانی کرکے یہ نہ سمجھئے گا کہ میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کی زندگی پر حملے کی تہہ میں کوئی رقابت کا یا اسی قسم کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ آپ کو سمجھنا چاہئے کہ دشمن اکثر کمزور اور بدچلن لوگوں کو اپنا آلۂ کار بناتا ہے اور ان کو کوئی شک نہیں ہوتا۔"

"نہیں، میں نے کسی شخص کو کبھی ایسا کرتے نہیں محسوس کیا" اناخان نے جواب دیا۔ نوجوان نے ذرا سا سر ہلایا۔

"کیا یہ بات صحیح ہے کہ آپ کی بڑی بیٹی نے اس دن آپ کا پرنجے پہنا تھا؟"

"ہاں، صحیح ہے۔"

"وہ اکثر پہنتی ہے؟"

"ہاں۔"

"وہ بالغ لڑکی ہے نا، شادی کے لائق عمر ہے اس کی۔"

"ٹھیک ہے" اناخان نے جلدی سے جواب دیا مگر ایک دم اس پر کچھ گھبراہٹ سی طاری ہو گئی۔

"ذرا مجھے بتائیے وہ کس وقت اسکول سے آتی ہے؟"

"چار بجے۔"

"ہمیشہ چار بجے آتی ہے؟"

"کبھی کبھار تو دیر ہو جاتی ہے مگر ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے۔"

"اور جس دن آپ پر حملہ ہوا اس دن آپ کو معلوم ہے کہ وہ کہاں تھی؟"

"وہ عورتوں کے کلب میں تھی۔ نہیں، نہیں، مجھ سے غلطی ہوئی، وہ وہاں تھی ریلوے ملازمین کے کلب میں۔"

"اکیلی تھی؟"

"نہیں، اپنی بہن کے ساتھ۔"

"آپ پورے یقین سے یہ بات کہہ رہی ہیں؟"

"ھاں، ھاں، اس دن اس کی بہن نے کنسرٹ میں گانا گایا تھا پھر دونوں ساتھ ساتھ واپس آئی تھیں۔"

"کیا کبھی آپ کی بیٹی آپ کی اجازت کے بغیر بھی، آپ کو بتائے بغیر بھی گھر کے باھر رھی ھے؟"

"نہیں، کبھی نہیں، ایسا تو کبھی نہیں ھوا۔"

"آپ کو اس پر کسی قسم کا کوئی شبھہ تو نہیں ھے؟"

"نہیں، بشارت ایک دلیر لڑکی ضرور ھے مگر وہ فرمانبردار ھے، بگڑی ھوئی نہیں ھے۔"

"معاف کیجئے، یہ ذرا ویسی بات ھے مگر کیا آپ مجھے یہ اجازت دیں گی کہ میں آپ کی بیٹی سے بھی ایک ویسا ھی سوال کروں جیسا میں نے آپ سے کیا تھا؟"

اناخان ھنسنے لگی۔

"وہ سمجھے گی ھی نہیں کہ آپ کیا پوچھ رھے ھیں۔"

"ھو سکتا ھے لیکن دیکھئے نا، ایسے بھی تو لوگ ھوتے ھیں جو اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ کوئی لڑکی یا عورت ان کے ارادوں کو جانتی ھے یا نہیں۔ بشارت نے اپنے متعلق کوئی مشکوک بات کبھی دیکھی؟"

"معلوم نہیں، مجھ سے تو اس نے کبھی ایسا کوئی ذکر نہیں کیا۔"

"اور آپ؟ آپ نے اس کے متعلق کبھی کسی پر شبھہ کیا؟"

"نہیں۔"

"آپ مجھ سے بالکل صحیح بتا رھی ھیں نا؟"

"لیکن میں آپ سے کوئی بات چھپاؤں گی کیوں؟"

نووارد چپ ھو گیا، سوچنے لگا، پھر ایک دم بولا:

"تو کیا آپ کا مطلب یہ ھے کہ آپ کو اس بات کا بالکل علم نہیں تھا کہ کوئی آپ کے پاس آپ کی بیٹی کا پیغام لے کر آنے والا ھے؟"

"میں تو پہلی بار یہ ذکر سن رھی ھوں" اناخان نے گھبراھٹ میں کہا۔ "کیا آپ مذاق تو نہیں کر رھے ھیں؟ میرے پاس کون لانے والا تھا پیغام؟"

"قدرت اللہ۔"

اناخان اتنی حیران اور خوف‌زدہ ہو گئی کہ اس سے ہنسا بھی نہیں گیا۔

"آپ کو یہ خیال کیسے آیا؟"

"دادی شکر اللہ سے پوچھئے گا۔ جب بھی آپ کو موقع ملے تو اس سے پوچھئے، یا مناسب نہ سمجھئے تو نہ پوچھئے، البتہ یہ ذکر کسی سے نہ آئے، بہتر تو یہی ہے کہ آپ اپنا شبہہ کسی پر ظاہر نہ کریں۔"

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میری بچی خطرے میں ہے؟"

"نہیں، اب تو نہیں ہے۔ نہیں، میرا خیال ہے اب ایسا نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ خطرے میں تھی؟"

"مجھے اس میں شک ہے۔ نشانہ دراصل آپ تھیں۔"

"پھر آپ بشارت کا نام بیچ میں کیوں لا رہے ہیں؟"

"کیونکہ وہ آپ کی بیٹی ہے۔"

"لیکن شادی کے اس بے‌تکے پیغام اور مجھ پر چھرے سے حملہ ہونے کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"ابھی تک تو میں صرف اندازہ ہی لگا سکتا ہوں۔"

اناخان نے لیٹ کر تکئے پر سر رکھ دیا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا تھا!

"میں نے آپ کو تھکا دیا" نوجوان نے اس کی طرف ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر مضبوطی کے ساتھ بولا:

"مگر میں آپ کو جھوٹی تسلیاں نہیں دینا چاہتا کیونکہ مجھے آپ کی ہمت اور جرأت پر بھروسہ ہے۔ آپ جلد سے جلد تندرست ہو جانے کی پوری کوشش کریں... اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ کو یہ چیز پہنچا دوں" نوجوان نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

اناخان لرز گئی۔ اس کی ہتھیلی پر ایک چھوٹا سا پستول رکھا تھا۔ اناخان کو یاد آیا کہ جب اس نے پہلی بار یفیم دانیلووچ کے ہاتھ میں پستول دیکھا تھا تو وہ کس قدر سہم گئی تھی اور اب اسے وہی چیز اپنے ہاتھ میں اٹھانی تھی۔

"لیکن میں تو اسے چلانا بھی نہیں جانتی" اس نے کہا۔

"اور آپ اس سے ڈرتی بھی ہیں" نوجوان نے کہا۔ "لیکن

آپ کو سیکھنا ہوگا۔ جوراخان آپ کو سکھائے گی، اس کے پاس بالکل ایسا ہی ایک پستول ہے۔"

اور نوواردنے وہ پستول اناخان کے برابر میں، کمبل پر رکھ دیا۔

چودھواں باب

کئی سال سے، بلکہ تقریباً اسی وقت سے جبکہ اس نے پیٹرزبرگ یونیورسٹی سے سند لی تھی، انجینیر سرگئی لووچ کو اپنی زندگی بےمقصد اور بےکار معلوم ہوتی تھی۔

"میں تعمیر کے لئے پیدا ہوا تھا، میں نے تعمیر کرنے کے لئے تعلیم پائی تھی مگر قسمت دیکھئے کہ بھیانک تخریب کے اس زمانے میں زندگی گزارنی پڑ رہی ہے، یہی میری زندگی کا المیہ ہے" وہ اپنے جمود کو حق بجانب قرار دینے کے لئے اکثر اپنے آپ سے کہتا۔

کس تلخی کے ساتھ وہ ان خوابوں کو یاد کرتا جو اس نے طالب علمی کے زمانے میں دیکھے تھے، سچ ہونا ان خوابوں کی قسمت نہ تھی۔ اس کے والدین انووگورود کے ایک نچلے متوسط طبقے کے لوگ تھے اور ایک زمانہ تھا کہ اس کے رہ بوڑھے ماں باپ اپنے سرگئی کو مستقبل میں گرجاگھر، مشہور پل اور فتح کے محراب بناتے تصور کرتے تھے۔ وہ کیسے سیدھے سادے، نیک‌دل لوگ تھے... سرگئی کو تو اب ان کی قبروں پر جاتے ڈر لگتا تھا کہ کہیں وہ اپنے بوسیدہ کفن پھاڑکر نکل نہ آئیں اور اس کی شرمندگی اور نکمےپن کی قلعی کھول دیں۔

اس کی زندگی میں دو نہایت زبردست بدنصیبیاں ایک

ہی زمانے میں آئیں: ایک تو، اس کی شادی اور ایک، عالمی جنگ۔

اس نے ایک وکیل کی بیٹی سے شادی کی، اس وکیل کا نام وارنوسکی تھا اور وہ جنگ شروع ہوتے ہی امیر ہو گیا تھا۔ ریما خوبصورت لڑکی تھی اور دلھن بن‌کر تو قابل رشک لگ رہی تھی۔ سرگئی اس سے اپنے خواب بیان کرتا تو وہ بھی مسحور سی ہو جاتی لیکن جلد ہی یہ ظاہر ہو گیا کہ سرگئی کی نہ تو ریما سے پٹ سکتی تھی اور نہ وہ اس کے خاندان میں کھپ سکتا تھا۔

اس کی بیوی اس سے نفرت کرنے لگی کیونکہ سرگئی فوج سے اس کے باپ کے منفعت‌بخش ٹھیکوں میں نہ تو حصہ لے سکا تھا اور نہ اس میں حصہ لینے کی صلاحیت تھی۔ ریما کا بڑا بھائی فوج کا ایک بڑا افسر تھا اور وہ اور اس کا باپ مل‌کر ڈھیروں پیسہ بناتے تھے، سپاہیوں کے خون کا سودا کرکے ان لوگوں نے گھر بھر لیا تھا اور خمیری آٹے کی طرح پھول گئے تھے لیکن سرگئی اپنی بیوی کے جہیز میں ایک پیسے کا بھی اضافہ نہ کر سکا اور ریما بھی اپنے باپ بھائیوں کی طرح اسے حقارت کی نظر سے دیکھنے لگی۔ وہ سب اسے انسان‌دوست اور امن‌پسند کہتے اور ان الفاظ میں طنز کا زہر بھرا ہوتا تھا۔

"تم لوگ غارت‌گر ہو، بربریت‌پسند ہو" وہ غصے میں کانپتا ہوا جواب دیا۔

"تم نے روس کی یہ کیا گت بنا دی ہے؟ ملک کھنڈر ہو گیا ہے، راکھ ہو گیا ہے، اف خدایا، میں اس تمام عرصے میں ایک مکان بھی نہ بنا پایا جہاں لوگ رہتے اور اپنے بال بچوں کی پرورش کرتے۔"

وارنوسکی خاندان کے لوگ اس پر چھپ چھپ کے ہنستے اور یوں ایک دوسرے کو دیکھتے جیسے کہتے ہوں "بیچارہ!" سرگئی کی باتیں سن‌کر اس کے سسر یوں ہاتھ ملنے لگتے جیسے انہوں نے اپنی تعریف میں کوئی قصیدہ سنا ہو۔

انقلاب نے ان تاجروں کو اچانک آ لیا مگر اس نے ان کو تباہ نہیں کیا، وہ پہلے ہی سے محتاط تھے اور فرانس

کے ایک بینک میں انہوں نے بڑی رقم رکھ چھوڑی تھی، اب بس انہیں صرف اتنا کرنا تھا کہ کسی طرح پیرس پہنچ جائیں۔ ۱۹۱۸ء میں وارنوسکی خاندان نے روس سے بھاگ نکلنے کا منصوبہ بنایا تھا اور انہیں یقین تھا کہ سرگئی تو ان کے ساتھ جائے گا ہی، اس بدبخت فلسفی کے لئے اور کرنے کو تھا بھی کیا جو اپنے طالب علمی کے خوابوں کی لاش اپنے کندھے پر لئے مارا پھرتا تھا۔ ہو سکتا ہے پیرس اور یورپ جاکر ہی عقل کچھ ٹھکانے آ جائے...

سرگئی کے لئے نووگورد میں اکیلے رہ جانا بہت مشکل تھا کیونکہ اس نے وارنوسکی خاندان میں بےشغلی کے جو سال گزارے تھے انہوں نے اس کو زندگی سے بالکل الگ تھلگ کرکے رکھ دیا تھا۔ اس کا نہ کوئی دوست تھا، نہ رشتےدار پھر بھی وہ وارنوسکی خاندان کے ساتھ نہیں گیا، اس کا خیال تھا کہ ایسے موقع پر بھاگ جانا روس کے ساتھ غداری تھی چاہے روس میں جو کچھ بھی ہوا ہو۔ جدائی کے وقت ریما پھوٹ‌کر رونے لگی لیکن سرگئی نے اسے نفرت کے ساتھ اپنے پاس سے ڈھکیل دیا۔ آخری بات جو سرگئی نے اس خاندان سے کہی وہ یہ تھی کہ وہ بدمعاش ہیں۔ انہوں نے آخری بات جو سرگئی سے کہی وہ یہ تھی کہ وہ بےوقوف ہے! بس ایک دوسرے سے رخصت ہوتے وقت یہی گفتگو ہوئی۔

وارنوسکی خاندان یوں غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ان کی باقیات کے طور پر سرگئی کے پاس کچھ ڈرائینگ سیٹ تھے جو اس کی بیوی اور سسر نے اس کی سالگرھوں کے موقوں پر اسے تحفے میں دئے تھے۔ یہ سیٹ کبھی استعمال نہیں ہوئے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے اس کا منہ چڑھا رہے ہوں۔ دراصل یہ سیٹ اس کی زندگی کے جمود اور کاہلی کو نمایاں کرنے کے لئے اسے دئے گئے تھے۔

سرگئی جب بھوکے ننگے مزدوروں کو دیکھتا جو محتاجی کے مارے ہوئے تھے تو وہ لرز اٹھتا تھا، اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ لوگ بند کر دی جانےوالی فیکٹریوں کی عمارتوں، رھائشی مکانوں اور شہر کی گلیوں میں بےمقصد مارے پھر رہے ہیں، لکڑی کی بنی جو بھی چیز ھاتھ آ جاتی وہ ایندھن

کے لئے گھسیٹ لے جاتے، سرگئی کو ان سے ایک عجیب قسم کی یگانگت محسوس ہوتی مگر وہ ان کو سمجھ نہیں پاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ لوگ اس زبردست تباہی کے لانےوالے بھی ہیں اور شکار بھی جسے انقلاب کہا جاتا تھا۔

مزدوروں نے دھیرے دھیرے منہدم کر دی جانےوالی فیکٹری کو پھر سے بنانا شروع کیا۔ انھیں یقین تھا کہ وہ اسے اس کھنڈر پر نئی فیکٹری تعمیر کر لیں گے، ویسے تو ان کو یہ یقین تھا کہ پورے ہی روس کو وہ تباہی کے گڑھے سے کھینچ نکالیں گے۔ اس یقین نے سرگئی کو بےحد متاثر کیا اور اسے اپنے اجڑے خوابوں کی ایک بار پھر شدت سے یاد آئی۔ وہ بھی ان مزدوروں کی طرح یقین کرنا چاھتا تھا کہ زندگی بہتر اور روشن‌تر ہو جائے لیکن اپنے متعلق وہ یہی سوچتا تھا کہ اب وہ یقین و امید کی منزل کھو چکا ھے۔

پھر یکایک اس نے یہ حقیقت اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے دیکھی کہ شہر کے بازار میں اب مزدور لوگ خانہ‌ساز سگریٹ لائٹر نہیں بیچ رہے ھیں بلکہ فیکٹری میں زور و شور سے کام شروع ہو گیا ھے، روز بروز وھاں جمع ہونےوالوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی اور دوبروخوتوف اپنی شک‌پرستی کے باوجود ان کی طرف کھنچنے لگا۔

ایک دن دو آدمی اس سے ملنے آئے اور ان میں سے ایک کو سرگئی نے پہچانا — وہ کبھی سگریٹ لائٹر بیچتا تھا۔

"لوگ کہتے ھیں آپ انجینیر ھیں؟"

"میں انجینیر تھا۔"

"تو پھر اب کیا آپ اندر اندر انقلاب کی جڑ کاٹ رہے ھیں؟ کیا آپ پرانے آقاؤں کے آنے کا انتظار کر رہے ھیں"

"نہیں، میں کسی کے آنے کا انتظار نہیں کر رہا ہوں۔"

"تو پھر آپ اپنے اس بھٹ میں دبکے کیوں زندگی ضائع کر رہے ھیں؟"

"پھر اور میرے لئے کرنے کو بھی کیا ھے؟ آپ ھی بتائیے۔ میرے نقشے نمونے بنانے کے اوزاروں کو تو زنگ لگتا جا رہا ھے اور مجھے بھی زنگ لگتا جا رہا ھے۔"

"ھمیں ٹیکنیکل باتوں کو دیکھنے کے لئے کسی کی ضرورت ھے۔ آپ ھمارے ساتھ آئیں گے؟"

"اف خدا! بے شک، میں ضرور چلوں گا۔"

مزدور دوبروخوتوف کو اپنے ساتھ لوا لے گئے۔

مزدوروں کے ساتھ مل کر وہ زمین کھودتا، لکڑوں اور ٹوٹے پھوٹے لوھے کو سمیٹتا، اٹھاتا اور اسے احساس بھی نہ ھوتا کہ وہ کتنا تھک گیا ھے، دراصل اسے تھکن محسوس کرکے مسرت ھوتی۔ اب تو وہ اپنے کو پہچان بھی نہ پاتا تھا۔ اسے اس راشن پر ایک عجیب سا فخر ھوتا جو سب مزدوروں کے برابر اس کو ملتا۔ مزدور سب بہت جلد اس سے بےتکلف ھو گئے اور وہ اس بات سے بےحد خوش رھتا۔

لیکن جب کام زیادہ پیچیدہ ھوا اور اس نے محسوس کیا کہ اب اسے مینیجر کا رول ادا کرنا ھے تو معاملات بگڑنے لگے۔ اس کا ماضی دم کی طرح اس کے ساتھ لگا ھوا تھا اور اس نے یکایک محسوس کیا کہ جہاں تک مزدوروں کا تعلق ھے وہ ایک "ماھر" بن گیا ھے۔ اس لقب سے اسے شبہہ اور غیریت رنگ جھلکتا دکھائی دیتا، ایک بار پھر ایک ناقابل عبور دیوار اس کے اور اس کے نئے دوستوں کے درمیان کھڑی ھو گئی۔ وہ انھیں پسند کرتا تھا کیونکہ کسی حد تک غیرروادار ھونے کے باوجود وہ نیک اور ایماندار لوگ تھے۔

اب اسے اپنی وہ پہلی سی اذیت‌ناک اور قابل نفرت تنہائی کسی قیمت پر قبول نہ تھی لیکن وہ اس کا تعاقب کئے جا رھی تھی، فیکٹری میں لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ انجینیر صاحب کے سسر اور ان کی بیوی تو سفید تارکین وطن تھے۔ سرگئی خوف اور شرم سے کٹ کٹ جاتا، اسے مستقل یہ ڈر رھتا کہ اگر کسی نے وارنوسکی خاندان کے متعلق اس سے صاف صاف پوچھ لیا تو وہ کیا جواب دے گا کیونکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کچھ بھی ھو وہ جھوٹ کبھی نہیں بولے گا۔

اسے راتوں کو نیند نہ آتی، اس نے وارنوسکی خاندان کا گھر تو مدتوں پہلے چھوڑ دیا تھا لیکن اپنے آپ سے بھاگ کر وہ کہاں جاتا؟ اس کا دل مزدوروں، ان تمام بےلوث مشقت

کرنےوالوں اور گمنام دلیروں کے لئے محبت اور احترام سے لبریز تھا جو قحط اور سردی، دنیا بھر کی بےاعتباری اور نفرت کے باوجود اپنی منزل کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ بالکل فطری طور پر ان کو بھی اپنے دشمنوں سے نفرت کرنے کا حق حاصل تھا۔

دوبروخوتوف کو ہر روز، ہر گھڑی یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب وارنوسکی خاندان سے اس کی رشتےداری کو اس کے منہ پر مار دیا جائے، اس پر ان سے مجرمانہ تعلقات کا الزام لگا دیا جائے۔ اسے اس رشتےداری سے خود ہی نفرت تھی، وہ تو اسے اپنی یادداشت سے، اپنے دماغ سے کھرچ کر نکال دینا چاہتا تھا لیکن کون اس بات کا یقین کرےگا کہ وہ گرگٹ نہیں ہے، اس نے رنگ نہیں بدل رکھا ہے، نیز یہ کہ وہ غدار نہیں ہے؟

آخرکار اس کے اعصاب بالکل جواب دے گئے۔ اس نے اپنے ڈرائنگ سیٹ، کچھ کپڑے اور اپنی پسندیدہ کچھ کتابیں ایک پرانے سوٹ کیس میں رکھیں اور نووگورد سے چل دیا حالانکہ اسے اپنے آباؤاجداد کے شہر اور اس فیکٹری کو چھوڑتے وقت انتہائی غم ہوا جو روندے ہوئے، سدا بہار، خودرو پودوں کے درمیان، لوہے کے ٹکڑوں اور اینٹوں کے ملبے اور لکڑی کی پیلی چھیلن کے ڈھیروں سے حیرت انگیز طور پر سر اٹھا رہی تھی۔

وہ جنگلوں کے اندر چلتا چلا گیا، جتنی دور ممکن ہو سکا، وہ اس علاقے کو وسط ایشیا تصور کرتا تھا لیکن اس کو اطمینان حاصل نہیں ہوا۔ بار بار وہ اپنے آپ کو بزدل گردان کر کوستا، آخر کیوں اس نے ان چیزوں کو چھوڑا جو اس کے وجود کا ایک ناگزیر حصہ بن چکی تھیں۔

سال بھر تک شہر کے ایک میونسپل صنعتی ادارے میں وہ ایک نقشہ‌نویس اور نقل‌نویس کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔

جلد ہی اسے پتہ چلا کہ وہاں بھی ایک انجینیر کی ضرورت تھی۔ یہ بات نووگورد سے بھی زیادہ غیرمتوقع اور حیرت‌انگیز تھی۔

ایک صبح جبکہ وہ اپنے پھٹیچر پرانے صوفے پر لیٹا،

کھڑکی کے اوپر ایک گوشے میں ایک مکڑی کو بڑی تندھی سے جالا بنتے دیکھ رہا تھا، ایک سانولے ھاتھ نے اس کی کھڑکی پر پہلے تو دستک دی پھر کاغذ کی ایک پتلی سی چٹ روشن‌دان کے کھلے شیشے سے اندر پھینکی۔ یہ ایک سمن تھا جس کے ذریعے شہری پارٹی کمیٹی میں فوراً اطلاع کرنے اور پہنچنے کو کہا گیا تھا کیونکہ وھاں بہت ضروری کام تھا۔ دوبروخوتوف کو سب سے پہلے یہ خیال ہوا کہ کوئی غلطی ہو گئی ھے۔

کمیٹی میں ایک درازقد، مضبوط خطوخال‌والی عورت نے اس کا استقبال کیا۔ اور اوپر سے یہ عجیب بات ہوئی کہ وہ ازبیک تھی۔

"سرگئی لووچ دوبروخوتوف؟" اس نے اٹھتے اور اس کی طرف دوستانہ انداز میں ھاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ کیسے ھیں انجینیر صاحب؟"

"سابق انجینیر" سرگئی لووچ نے طنز اور تلخی سے جواب دیا۔

"اور اب؟"

"کلرک، صرف ایک کلرک۔"

"اس صورت میں تو آپ کو ایک نیا پیشہ سیکھنا پڑے گا" جوراخان نے مسکرا کے کہا۔

ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے بیٹھنے کو کہتے ھی وہ اس کی صحت کے متعلق یوں پوچھنے لگی گویا یہی وہ ضروری بات تھی جس کے لئے اس کو یہاں بلایا گیا تھا۔ وہ جاننا چاھتی تھی کہ اس کی کیا مدد کر سکتی ھے۔ اس کی آنکھوں میں اتنی ھمدردی اور یگانگت تھی کہ اس نے یہ سوچے بغیر کہ کیا کر رہا ھے، اس عورت کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ کوئی سرگئی سے پوچھتا تو وہ کبھی بھی یہ نہ بتا پاتا کہ اس نے چھوٹتے ھی اس عورت سے کیوں اپنے دل کی بات کہنی شروع کر دی۔ شاید اسے توجہ کی ضرورت تھی، شاید وہ اپنی تنہائی سے عاجز آ چکا تھا۔ بہرحال سبب جو بھی رہا ہو، سرگئی نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو اس کے دل پر گزر رہا تھا۔

"مجھے معلوم ھے، میں سب جانتی ہوں" جوراخان نے

نہایت تحمل سے اس کی پوری بات سننے کے بعد سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے سے کہا۔

وہ اس کے ان الفاظ پر حیران رہ گیا۔ "آپ؟ آپ بھلا کیسے جان سکتی ہیں؟" اس نے سوچا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہ خود بھی اس عورت کے ان الفاظ پر یقین کرنا چاہتا تھا۔ اس ازبیک عورت کے علاوہ کسی نے آج تک اس سے اس طرح بات نہیں کی تھی، وہ اس کی عقلمندی، سوجھ بوجھ اور اس کی صاف گوئی کا قائل ہو گیا۔

"میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ بہت پریشان ہیں" اس نے اپنی جگہ سے اٹھکر اس کے بالکل پاس آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "دراصل آپ ایسے کام کی تلاش میں ہیں جو واقعی کام ہو، کیا آپ اپنے علم کو واقعی کسی ایسے کام میں لگانے کے لئے تیار ہیں جو کرنے کے لائق ہے، جو عوام کی واقعی مدد کرے؟ کیا آپ اسی مقصد کے لئے بےقرار ہیں؟ مجھ سے صاف صاف کہئیے۔"

"خواب تو میرا یہی تھا" دوبروخوتوف نے جواب دیا۔ "لیکن وہ تو صرف خواب ہی رہا میری محترم رفیق، آپ کہتی ہیں میں پریشان و بےقرار ہوں، یہ بات تو ٹھیک ہے مگر اب غم نہیں صرف داغ باقی ہے کیونکہ اب میں کوئی خواب نہیں دیکھتا، کوئی نہیں۔"

"سنئے انجینیر صاحب، جو کچھ برباد ہو چکا ہے ہم اسے پھر سے تعمیر کر رہے ہیں، ہم خوابوں میں جان ڈال رہے ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ کمیونسٹوں نے کبھی بھی خواب دیکھنا بند نہیں کیا۔"

"آپ مجھے انجینیر کہتی ہیں، یہ بھی ایک مضحکہ‌خیز بات ہے۔"

"اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ اپنی قدر جانیں یا نہ جانیں مگر ہم آپ کی قیمت جانتے ہیں۔"

"آپ غلطی کر رہی ہیں۔"

"میں تو ایسا نہیں سمجھتی، بہرحال جو کچھ بھی ہو، ہم آپ کو انجینیر بناکے رہیں گے۔"

"آپ؟"

"ھاں، ھم۔"

جوراخان کے پاس سے جو شخص اٹھا وہ ایک اور ھی سرگئی تھا، اسے محسوس ھو رھا تھا کہ اس یادگار دن کو اس کی جوانی واپس لوٹ آئی۔

"سوتی مل... وہ مل" اس نے اپنے ارد گرد کے لوگوں پر توجہ دئے بغیر اپنے آپ سے سرگوشی کی۔ "وہ میرے سپرد کی جا رھی ھے! ھاں، وہ خاتون یہی تو کہہ رھی تھیں، خدا، اف خدایا.. اگر یہ مذاق نہیں ھے، اگر یہ ایک دکھ بھرا خواب نہیں ھے تو پھر کیا ھے یہ؟ انجینیر، ھم آپ کو انجینیر بنا کے رھیں گے!"

گھر پہنچ کر وہ فوراً اپنی کتابیں سوٹ کیس سے نکال کے بیٹھ گیا، کتنی خوش‌قسمتی کی بات ھوئی کہ جب نووگورود سے نکلا تو اس نے یہ کتابیں ساتھ لے لی تھیں! اور اس وقت وہ اس کی وفادار دوست، جن کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ کیا واقعی وہ انہیں غم کے جذبے کے سوا اور بھی کسی جذبے کے ساتھ کھول سکے گا۔ اور بھی کوئی جذبہ جس کے کبھی اپنے اوپر طاری ھونے کی ساری امیدیں ختم ھو چکی تھیں۔

بڑے پیار سے وہ ایک کے بعد دوسری کتاب کھولتا رھا، ان کے ورق الٹتا رھا، پڑھتا رھا ان فارمولوں کو، دیکھتا رھا ان نقشوں، ان خاکوں کو جو اسے بھول سے گئے تھے۔ بھول سے گئے تھے؟ نہیں، وہ تو سب اسے یاد تھے کیونکہ وہ ان سے عشق کرتا تھا، بس ایک نظر ڈالنے کی دیر تھی کہ وہ تمام سال بیچ میں سے ھٹ گئے جب وہ انہیں بھلانے کی کوشش کرتا رھا کہ وہ اس کے ضمیر پر بار نہ بنیں۔ اور وہ صاف صاف اسے یاد آ گئے جیسے ابھی اس نے ان کو دوھرایا ھو۔

اس کے دل میں ایک جنون سا اٹھا۔ ابھی ان کتابوں کو لئے، دوڑتا ھوا جوراخان کے پاس شہری کمیٹی میں جائے، چیخ چیخ کر کہے، میں کسی بھی آزمائش سے گزرنے کو تیار ھوں، شہر کی کسی بھری پری سڑک پر کھڑا ھوکر راہ‌گیروں سے پوچھے: "تم دوبروخوتوف کو جانتے ھو؟ وھی جو کلرک

تھا، پتہ ہے اب وہ ایک مل تعمیر کرنےوالا ہے، ملک کے دوردراز اور سب سے پچھڑے ہوئے کونے میں، وہ بالشویکوں کے ساتھ مل‌کر یہ کام کرےگا جنہیں دنیا تھذیب کا غارت‌گر کہتی ہے...“

چھوٹے سے کمرے میں ادھر ادھر چکر کاٹتے ہوئے وہ نوجوان کے جیسے جوش سے آھستہ خود ھی بات کرنے لگا: ”کہئے مسرس وارنوسکی صاحبان! مادام ریما! اب فرمائیے، نووگورد کے پیرسیو، اب دیکھنا تم اور میں مل‌کر اب ”سا ایرا“* کے معنی سمجھیں گے۔“

پھر اس نے اپنے اس ”کنواروں کے پھٹیچر کوارٹر“ پر چاروں طرف نگاھیں ڈالیں۔ ایک چھوٹا سا صوفہ تھا جس کے اسپرنگ ٹوٹے ہوئے تھے، کھڑکی پر ایک ملی دلی پلنگ کی چادر پردے کا فرض انجام دے رہی تھی... اس نے جوراخان سے کوئی شکوہ نہیں کیا تھا کہ اس کی قیام‌گاہ کتنی پھٹیچر ہے مگر معلوم یہ ھوا کہ وہ جانتی تھی۔ اس نے جھاڑو اٹھائی اور کمرے کے کونے میں سے مکڑی کے موٹے جالوں کو صاف کر دیا۔ جالے کا خاتمہ ہو گیا۔ اب اسے انجینیر کی جیسی باکمال مہارت سے جالے بنتی ہوئی مکڑی کی گھورتے رھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ چند گھنٹوں تک بڑی محنت سے کمرے کو جھاڑتا صاف کرتا رہا۔ لانڈری لے جانے کے لئے گندے کپڑے اکٹھا کئے، کھڑکی کے تھڑے پر اپنی کتابیں یوں جمائیں جیسے وہ بک شیلف تھا، اپنے ڈرائنگ کے آلات صاف کئے اور بار بار یہ بھی سوچتا رھا کہ یہ سب کرکے اس کو کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ ایسی خوشی تو مدتوں سے محسوس نہ کی تھی۔ پھر وہ کافی دیر تک چھوٹے سے آئینے کے سامنے جما رہا اور اپنے چھلے ہوئے سے چہرے اور ناک کے بانسے کے آس پاس اور لبوں کے ادھر ادھر نمایاں جھریوں کو دیکھتا رہا۔ ”کہو دوست، ھاں ھاں، بڑے میاں، ہم زندہ رھیں گے! ہم کریں گے!“

---

* سا ایرا — فرانسیسی لفظ جس کا مطلب ہے سب کام ٹھیک ہو رہا ہے۔ اڈیٹر۔

اگلی صبح وہ عین وقت مقررہ پر پارٹی کمیٹی پہنچ گیا۔ ویٹنگ روم میں اسے ایک لڑکی ملی جسے اس نے پہلے بھی اس میز کے پاس بیٹھے دیکھا تھا جس پر اخبارات رکھے تھے۔ وہ اس کے سامنے جھکا اور بتایا کہ جوراخان سے وقت مقرر کرکے ملنے آیا ہے۔

"وہ نہیں ہیں، وہ ابھی تک نہیں آئی ہیں" لڑکی جھنجھلاکے دھڑ سے بولی۔ اس نے سرگئی کے جھکنے وغیرہ کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

دوبروخوتوف کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ یہ پوچھتے بھی اسے ڈر لگا کہ کیا اسے انتظار کرنا چاہئے۔ اس کا دل ڈر کے مارے بیٹھنے لگا کہ کہیں یہ لوگ اسے بھول ہی تو نہیں گئے یا شاید انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا؟ اس کی دنیا میں بھونچال سا آنے لگا۔

ویٹنگ روم کے ایک کونے میں جاکر وہ یوں ہی دیواروں پر نظر ڈالنے لگا جن کی غالباً عرصے سے صفائی اور مرمت نہیں ہوئی تھی، جگہ جگہ پیلے پیلے دھبے تھے۔ اسے بیٹھتے بھی گھبراہٹ ہو رہی تھی اور غصے میں بھری اس لڑکی سے نظریں ملاتے ڈر لگ رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے لڑکی سے نظر ملائی تو وہ فوراً نکال باہر کرے گی۔

پھر گلیارے میں بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی، ویٹنگ روم کے ادھ کھلے دروازے کو کسی نے اس زور سے دھکا دیا کہ ایک پٹ کھل‌کر دھڑ سے دیوار سے ٹکرایا ایک سانولی صورت‌والا نوجوان، گلے کے پاس سے بٹن کھلی فوجی وردی پہنے، میز پر بیٹھی لڑکی کے پاس یوں قدم اٹھاتا پہنچا جیسے وہ اپنے بوٹوں کی ایڑیوں سے فرش میں کیل ٹھونک رہا ہو۔

"کہاں ہیں وہ؟ آ گئیں؟"

"کامریڈ سلطانوف، میں آپ کو بتا تو چکی ہوں..."

ایرگاش نے اپنے کندھے اچکائے۔ غصے کے مارے اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"مجھے کیا پتہ تھا کہ یہاں یہ نوکرشاہی قسم کے لوگ جم

جائیں گے، جڑ پکڑ گئے یہ سب اور نکالے نہیں نکلتے، میزوں پر یوں ڈٹے ہیں گویا قلعہ‌بند ہو گئے ہوں، یہ تو مشین‌گن کے ہٹائے بھی نہیں ہٹیں گے، توپ کی ضرورت ہے، توپ کی!"

"کامریڈ سلطانوف، اتنے زور سے مت چلائیے" لڑکی نے کہا۔

ایرگاش نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور کوریڈور کی جانب مکا گھومایا۔

"ذرا ٹھہرو نوکرشاہیو، سست‌الوجود! ہم تمہیں نوچ پھینکیں گے تمہارے گھونسلے سمیت!"

"کامریڈ سلطانوف، یہاں شور مت مچائیے" لڑکی نے دوہرایا۔

"تم بھی یہ یقین دلانے کی کوشش ختم کرو کہ کوئی بڑی معصوم فاختہ ہو تم!" ایرگاش نے اس پر آنکھیں نکالیں۔ "دیکھ رہی ہو تمہارے چاروں طرف ہو کیا رہا ہے مگر تمہیں کیا پرواہ۔ نہ کچھ دیکھتی ہو نہ سنتی ہو، سب دکھاوے کے لئے ہے۔ ہونہہ!"

برا مان کر شدید غصے کی حالت میں لڑکی چپ چاپ اٹھی اور ویٹنگ روم سے باہر چلی گئی۔

اب ایرگاش دوبروخوتوف کی طرف مڑا، اسے کوئی تو چاهئے تھا کہ اپنا بخار اتارتا۔

"دیکھا آپ نے... شاید آپ اس لمبی داڑھی‌والے دربان سے ٹکراکر یہاں پہنچے ہوں گے... داڑھی لئے پھرتا ہے ہاتھ بھر کی! پہلے تو آپ اس کو سب کچھ بتائیے، کیوں آئے ہو، کیا کام ہے، ورنہ تو وہ اندر ہی نہیں آنے دے گا۔ میرا سا آدمی اور دربان کو بتاتا پھرے کیوں آیا ہوں! میں نے اس بوڑھے کو ایک طرف ڈھکیل دیا اور اندر گیا اور دیکھتا کیا ہوں کہ ایک آدمی کرسی پر بیٹھا ہے جیسے گدے تکئے لگائے کوئی بائے ہو۔ نفیس بانات کا سوٹ پہنے، اس کی میز پر بھی بانات جڑی ہوئی، کمبخت کا دل بھی تو شاید بانات کا بنا ہوا ہوگا! آخر اسے اتنی بانات کہاں سے ملی؟ کہتا ہے "مختصر بات کیجئے، میں ذرا مصروف ہوں"۔ میں اس سے پوچھتا ہوں مل کی تعمیر کے لئے کتنا روپیہ ہو گیا ہے (دوبروخوتوف چونکا) اور جواب میں پتہ ہے وہ کیا کرتا ہے، بھنویں اٹھاکے

حیران ہوکے پوچھتا ہے: کون سی مل؟ کیسا روپیہ؟ سارا شہر اس بات کے علاوہ کوئی گفتگو ہی نہیں کر رہا ہے، بچہ بچہ مل کے متعلق جانتا ہے اور یہ جو باناتوالا ہے اس کو کوئی مطلب ہی نہیں — یہ جو سونارخوزوالا* ہے نا مصروف ہے وہ! اس کا بس یہی کام ہے کہ میز کرسی لگا کے بیٹھ جائے اور بڑا افسر دکھائی دے۔ اسے کچھ واسطہ نہیں ہے کہ عوام کو تو اب تک اتنا وقت نہیں ملا ہے کے وہ غور کرے۔منظوری کیا سوچتے ہیں، کیا محسوس کرتے ہیں اور صنعتی بیورو** کے لئے پلان داخل کرے! میں نے اس سے کہا "میں آپ کے صنعتی بیورو ویورو کو نہیں جانتا" تو مجھ سے کہتا ہے: میں بھی آپ کو نہیں جانتا۔ میں نے کہا: "جناب، میں کوئی اپنا ذاتی یا خاندانی شکوہ لے کر نہیں آیا ہوں، یہ پبلک کا کام ہے!" تو بولا: "تحریری شکل میں دیجئے..." دیکھا آپ نے، بات کو یوں پلٹ دیا، آپ کے دل کی بات تو کبھی سنے گا ہی نہیں، کاغذ چاہئے، تحریر چاہئے، سمجھے آپ؟"

"جی، آپ بجا فرماتے ہیں" دوبروخوتوف ہکلا ہکلاکے بولا۔

وہ بڑی ہیجانی دلچسپی سے ایرگاش کی باتیں سن رہا تھا اور اسے اس نوجوان کا جوش، توانائی اور خوداعتمادی اچھی لگ رہی تھی۔ لیکن کیا وہ ذرا زیادہ منہ پھٹ نہیں تھا؟ کاش اسے یہ معلوم ہوتا کہ وہ یہ صاف‌گوئی کس سے کر رہا ہے! تب اس کا لہجہ جانے کیا ہوتا؟

ایرگاش نے دوبروخوتوف کی گھبراہٹ کے اور ہی معنی سمجھے۔

---

* ایک مقامی تنظیم جو قومی معیشت کی ہدایت‌کاری کے لئے بنائی گئی تھی۔ یہ ادارے ۱۹۱۷ء کے آخری اور ۱۹۱۸ء کے ابتدائی دنوں میں قائم ہوئے اور ۱۹۳۰ء کے بعد کے چند برسوں تک چلتے رہے۔ مترجم۔

** صنعتی پارٹی کے لیڈروں سے مراد ہے۔ یہ ایک انقلاب دشمن تنظیم تھی جو چپکے چپکے انقلاب کی جڑ کاٹنے اور جاسوسی کا کام کرتی تھی۔ مترجم۔

"مجھے لوگوں کی بےنیازی بالکل پسند نہیں ھے" اس نے گویا اپنے رویے کی صفائی دیتے ہوئے کہا۔ "ھر کسی کو معلوم ھے کہ یہ مل کوئی چھوٹا موٹا، کوئی معمولی صنعتی ادارہ نہیں ھے، ایسے معاملے میں چیخنے چلانے سے کام نہیں چلتا۔ آپ کو سمجھنا ہوگا کہ اسے کیسے تعمیر کیا جائے، کیسی شروعات ہو تاکہ بعد کو شرمندگی اور پشیمانی نہ ہو، ھمیں ایک ایسا آدمی چاھئے جس کی کھوپڑی میں مغز ہو، ایک تربیت‌یافتہ آدمی۔ اور رہ گئے ھم اور آپ۔ ھم لوگ تو معمولی لوگ ھیں، ھماری تعلیم ھی کتنی، اتنا ھی غنیمت ھے کہ پڑھ لکھ لیتے ھیں۔ (دوبروخوتوف شرماکے مسکرایا لیکن سلطانوف کی بات کے بیچ میں بولنے کی ھمت نہ کر سکا)۔ ھمیں تعلیم دیتا بھی کون... وہ جو تھے سفید داڑھیوں‌والے، گھڑا سا پیٹ لےکے گھومتے تھے، ان کو تو اپنے مالک‌زادوں ھی کو پڑھانے سے فرصت نہیں تھی اور وہ... ھم ایسے لوگوں کو تو گدھوں کے اصطبلوں سے آگے ھی نہیں جانے دیتے تھے۔ خیر کوئی بات نہیں، کوئی ڈر نہیں، ھم اپنے قدموں پر کھڑے ہو سکتے ھیں، ھمیں جتنے پڑھے لکھوں کی ضرورت ھے ان کو کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ ھی لیں گے، اگر وہ خود نہ آئے تو ان کی گردن میں ھاتھ دےکر کھسیٹیں گے اور ان کی لیاقت سے عوام کا فائدہ کروائیں گے، کسی شریف آدمی کو، کسی ماھر کو آمادہ کریں گے اور پھر وہ خوشی خوشی ھماری گاڑی کھینچے گا۔ اس کو ادھر ادھر دیکھنے تک کی مہلت نہ ہوگی۔"

دوبروخوتوف نے کچھ جھینپ کر کھنکارا اور اپنے خشک لبوں پر زبان پھر کر ان کو تر کیا - ایک ماھر، ایک اچھا، شریف آدمی... یہ سب الفاظ اس نے بار بار سنے تھے۔ صرف حوراخان ھی ایک ایسی تھی جس نے اس سے ایک اور ھی لہجے میں کچھ اور ھی الفاظ میں بات کی تھی۔ لیکن جو کچھ یہ آدمی کہہ رہا تھا اس میں اتنا درد اور خلوص تھا، کام کی ذمے‌داری کا اتنا شدید اور سچا احساس تھا کہ دوبروخوتوف کو بالکل برا نہیں لگا۔ اس آدمی کے پاس دماغ بھی تھا اور

جسم بھی قوت سے بھرپور، اور اس کا دل بھی بانات کا نہیں تھا۔ اس کا جی چاھا کہ وہ اس آدمی سے باتیں کرے تاکہ اس کو اچھی طرح جان جائے۔

"میں سمجھتا ھوں کہ" دوبروخوتوف نے کچھ اس قوت ارادی سے بات شروع کی کہ وہ خود حیران رہ گیا۔ "دوسری تمام باتوں کے باوجود اگر کسی تربیت‌یافتہ آدمی سے کچھ رائے لے لی جائے اور دو چار باتیں پوچھ لی جائیں تو ایسی کوئی بری بات نہ ھوگی..."

"ارے بھائی" ایرگاش نے مسکراتے اور غیرارادی طور پر بےتکلف ھوتے ھوئے جواب دیا۔ "معلوم ھوتا ھے آپ زیادہ چوکنے نہیں ھیں۔"

پھر کوریڈور سے آوازیں آنے لگیں، دوبروخوتوف اور ایرگاش نے ان میں سے ایک آواز کو فوراً پہچان لیا اور دونوں بیک وقت دروازے کی طرف مڑے۔

جوراخان تیز تیز چلتی ھوئی اندر داخل ھوئی۔ وہ کسی ھلکے کپڑے کا لباس پہنے ھوئے تھی، ھاتھ میں ایک ریشمی رومال تھا۔ اس کے پیچھے گھٹے ھوئے سر کا ایک گٹھیلا آدمی، قدم بڑھاتا، تقریباً دوڑتا آ رھا تھا، اس کا پتلون، جیکٹ اور ٹوپی جو وہ ھاتھ میں لئے تھا، سب بانات کے تھے۔

"یھی لگتا ھے وہ سونارخوز کا بانات" دوبروخوتوف نے سوچا۔

جوراخان کی سیاہ بھنویں تنی ھوئی تھیں لیکن ایرگاش اور دوبرخوتوف کو دیکھتے ھی اس کے چھرے پر نرمی آ گئی۔

"میں آپ دونوں کو دیکھکر بہت خوش ھوئی" وہ دونوں سے ھاتھ ملاتی ھوئی بولی۔ "لگتا ھے آپ ایک دوسرے سے مل چکے ھیں۔"

ایرگاش اور دوبروخوتوف نے خاموشی سے ایک دوسرے کو یوں دیکھا جیسے واقعی وہ ابھی ملے ھیں، دونوں ذرا متعجب اور گھبرائے ھوئے بھی تھے۔

جوراخان قہقہہ لگاکے ہنسنے لگی۔
"ہاں، ہاں... آپ دونوں کو ساتھ مل کر کام کرنا ہوگا، ہاتھ میں ہاتھ دے کے۔ میں آپ دونوں کا تعارف کرائے دیتی ہوں: آپ ہیں اپرگاش سلطانوف، مل پروجیکٹ کے صدر اور نوکرشاہیوں کے لئے قہر کا سامان۔ اور آپ ہیں سرگئی لووچ دوبروخوتوف، انجینیر یعنی وہی ماہر جس کی ہم لوگوں کو تلاش تھی۔ اور جہاں تک میں سمجھتی ہوں یہ کام سے قطعی نہیں ڈرتے۔ تو آپ لوگ ایک دوسرے سے مہربانی اور محبت سے پیش آئیے۔ ایں؟ روسی لوگ یوں ہی کہتے ہیں نا؟ کیوں؟ بھئی، ہاتھ تو ملائیے آپ لوگ۔"
دونوں ہنسنے لگے، ایرگاش نے پہلے اپنا ہاتھ بڑھایا۔
جوراخان دونوں کو اپنے دفتر میں لے گئی، ویٹنگ روم والی لڑکی اندر آئی۔
"وہ کہاں ہے، ندیژدین؟" جوراخان نے پوچھا۔
"آ رہا ہے" لڑکی نے ایرگاش کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔
"ٹھیک ہے، اچھا تو وہ لوگ تمہارے کام میں روڑے اٹکا رہے ہیں، کام کرنے کا موقع نہیں دے رہے ہیں تمہیں؟" جوراخان نے کہا، اس کی ابروئیں پھر تن گئی تھیں۔ وہ سب جانتے تھے وہ کس سے مخاطب ہے۔
سونارخوز سے آئے ہوئے آدمی نے اپنا وہ ہاتھ اٹھایا جس میں ٹوپی لئے ہوئے تھا۔
"کامریڈ جوراخان" اس نے کہا۔ "میں آپ کو سرکاری طور پر یہ جتائے دے رہا ہوں کہ جب تک میرے پاس ٹیلی‌فون نہ آئے میں محکمے میں ہونے‌والی باتوں کے لئے جواب‌دہ نہیں ہو سکتا..."
"لیکن آپ اس وقت کر کیا رہے ہیں؟ کس چیز میں مصروف ہیں آپ؟" جوراخان نے اس کی بات کاٹی۔
"جی؟ کون، میں؟"
"سونارخوز۔"
"میں آپ کے سامنے رپورٹ لے کر آ سکتا ہوں کہ..."

"آپ تو یہاں موجود ہی ہیں تو یہیں پیش کیجئے رپورٹ!"

"آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہمیں صرف بعض مخصوص کام انجام دینے ہیں، کوآپریٹوں اور کارگاہوں میں جو سامان ہے اس کی فہرست ہم نے بنا لی ہے..."

"وہ تو سب ٹھیک ہے مگر مل کے منصوبے کا گوشوارۂ اخراجات آپ نے تیار کیا ہے؟"

"جی، میں پھر عرض کروں گا کہ ہم صرف ان امور کے ذمےدار ہیں جو ہمارے دائرۂاختیارات میں آتے ہیں۔ صنعتی بیورو کی ہدایات کے بغیر ہمیں کوئی حق نہیں ہے کہ..."

"صنعتی بیورو کی بات تو ہم بعد میں کریں گے! آپ اپنی کہئے، آپ کیا کر رہے ہیں؟ اپنے مخصوص، نہایت مخصوص میدان میں آپ کیا کریں گے؟"

"جی، ہمارا فرض یہ ہے کہ صنعتی بیورو کے احکام کو پورا کریں۔"

ایرگاش سے طنز کے ساتھ یہ کہے بغیر نہ رہا جا سکا: "یعنی مختصر یہ کہ ہوا کو پھینٹتے رہئے اور... کاغذوں کے ڈھیر میزوں پر لگاتے رہئے۔"

"اے نوجوان!" سونارخوز کا افسر اچانک باریک آواز میں زور سے چیخا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ "تم ذرا اپنے ہوش میں رہو، سونارخوز کو ایک مقدس فرض انجام دینا ہے، املاک عامہ کی حفاظت کرنی ہے۔ میں تمہاری شکایت کروں گا، میں ان حالات میں کام نہیں کر سکتا، بالکل نہیں کر سکتا۔"

"ہاں، یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ آپ کام نہیں کر سکتے" جوراخان بڑے سکون سے بولی۔ "بہرحال ذرا یہ اندازہ لگائیے کہ مقامی آمدنی میں سے کتنا ہم مل کو دے سکتے ہیں، ذرا ادھر ادھر کھوجئے، چاروں طرف تلاش کیجئے اور کہیں سے روپیہ نکالئے چاہے وہ ایک ایک کوپک کرکے ہو، شروع کرنے کے لئے تو تھوڑی رقم بھی کافی ہوگی۔"

"لیکن کامریڈ جوراخان، آپ اپنے آپ کو میری جگه تصور کرکے ذرا سوچئے تو که..."

"تو یه که ورنه تو عزیز کامریڈ، اگر ٹیلیفون بھی آ جائے تو وہ بھی آپ کو نہیں بچا سکتا، مجھے یه کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔"

سونارخوز کا آدمی باہر چلا گیا۔

جوراخان نے دوبروخوتوف اور ایرگاش سے بیٹھنے کو کہا۔

"آپ لوگوں کا جی چاہے تو سگریٹ پی لیجئے" اس نے کہا۔ "ہو سکتا ہے تمباکو سے ہمارے ہوش کچھ درست ہوں... خیالات جو منتشر ہیں کچھ سمٹ جائیں۔"

ایرگاش نے اس کا اشارہ پاکر ہنستے ہوئے جیب سے دیسی تمباکو کا ایک ڈبه نکالا، ایک سگریٹ بنایا اور ڈبه دوبروخوتوف کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے جھک کر سگریٹ کے لئے تمباکو قبول کیا (یه اس کی دانشوارانه حرکت تھی!)، اس نے مہارت کے ساتھ اپنا سگریٹ بنایا، ایک گہرا کش ایا اور کھانسا نہیں...

"صورت حال" جوراخان نے بات شروع کی۔ "یه ہے که ہمیں اگست میں کام شروع کر دینا چاہئے اور تیاری کے لئے ایک ماہ سے بھی کم ہے اور آپ سے سچ کہنا چاہئے که روپیه ہمارے پاس ہے نہیں، مزدور بھی کافی نہیں ہیں، نه ہی مشینیں ہیں اور ہم محض اس بات پر بھروسه نہیں کر سکتے که یه ہمیں مل جائیں گی۔ مل کھڑی ہو تب ہی ہمیں کرگھے ملیں گے..."

"لیکن میں سمجھا نہیں" دوبروخوتوف نے کہا۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسا رنگ تھا جیسے کسی نے کوئی بہت ہی فضول سا مذاق اس کو سنایا ہو۔ "یعنی که پھر آپ کے پاس ہے کیا اور آپ کس برتے پر یه سب منصوبے بنا رہی ہیں؟"

جوراخان نے ایرگاش کی طرف دیکھا، وہ بےاعتباری کے ساتھ، کن‌انکھیوں سے دوبروخوتوف کو دیکھ رہا تھا۔

"سرگئی لووچ، آپ کے ارد گرد جو لوگ ہیں، جو کچھ

ہو رہا ہے اسے ذرا غور سے دیکھئے" جوراخان نے جواب دیا۔
"اور اپنے دل کی بھی آواز سننے کی کوشش کیجئے، تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے پاس کیا کچھ ہے اور ہم کس برتے پر یہ سب کر رہے ہیں۔ ابھی یہاں ایک شخص آئے گا، ایک بہت ہی اچھا انسان، وہ آپ کو سکھائے گا کہ اس زبردست قوت میں یقین کیسے کیا جاتا ہے جو ان تمام مشکلات پر قابو پائے گی، جو ہماری تباہی، ہماری مفلسی سب پر، ہماری تمام دشواریوں پر فتح پائے گی۔"

"وہ شخص حاضر ہے" یفیم دانیلووچ نے بڑے مزے میں آفس کے دروازے پر کھڑے ہوکر اپنی آمد کا اعلان کیا۔
"مگر یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ جو قصہ ہے کہ روپیہ فراہم نہیں ہو سکتا تو ہم اس کے آگے ہار مان لیں گے۔ ہرگز نہیں! آپ سب کو ہی اپنی تھیلیوں کی ڈوریاں ڈھیلی کرنی پڑیں گی، ہم تو حلق سے نکال لیں گے رقم۔ کیوں، تمہیں اتفاق ہے نا؟" وہ ایرگاش سے مخاطب ہوا۔

ایرگاش اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔
"آپ ٹھیک کہتے ہیں، بالکل ٹھیک۔"

"اچھا، ذرا طبیعت کو روک کے، ذرا سکون سے" یفیم دانیلووچ نے اسے پکڑکر پیچھے کیا۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے دھمکی کے انداز میں کہا: "دیکھنا ہے کہ میں کتنا اچھا شخص ہوں۔"

پھر یفیم دانیلووچ نے اپنے سرخ مونچھ پر تاؤ دیا جو تمباکو کے اثر سے سیاہی مائل ہو گئی تھی اور انجینیر کی طرف مڑا۔

"آپ دوبروخوتوف ہیں نا؟ ٹھیک، میں نے آپ کے متعلق سنا ہے لیکن ایک بات میں آپ سے فوراً کہہ دوں، میٹھے لفظوں پر یقین مت کیجئے گا، غصہ کرنا سیکھئے، ہم ایک دشوار کام شروع کر رہے ہیں اور ملک کے اس حصے میں تو اس کی مثال ہی نہیں ملتی۔ اس لئے اس کے دشمن بھی بہت ہیں، اس لئے میں شروع ہی سے آپ کو اتنا ڈرا دینا چاہتا ہوں کہ آئندہ آپ کسی چیز سے نہ ڈریں۔ ہمیں اس

مل کو صرف بنانا ہی نہیں ہے، ہمیں اس کے لئے لڑنا بھی ہے۔ ایرگاش سلطانوف نہایت مشہور جنگجو ہیں، چنانچہ یہ اپنے کو چیف آف اسٹاف سمجھتے ہیں...“

جوراخان اٹھ کر یفیم دانیلووچ کے پاس گئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا:

”اور یہ کامریڈو! یہ ہمارے کمیسار ہیں!“

دوبروخوتوف چپ رہا، وہ بیک وقت پریشان بھی ہو رہا تھا اور ساتھ ہی اس کا دل بھی چھوٹا ہوتا جا رہا تھا۔ ویسے وہ یفیم دانیلووچ کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ سمجھ پا رہا تھا مگر اس کی بھی یہ دھمکیاں اسے عجیب لگ رہی تھیں۔ یہ سب ہی لوگ بےحد بھولے بھالے تھے۔

جوراخان نے یکایک موضوع گفتگو سے بالکل الگ ایک اعلان کیا:

”شہری کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ بیس بنکروں کو تعلیم پانے کے لئے ماسکو بھیجا جائے گا، وہ تریوخ گورنایا مل میں تربیت حاصل کریں گے۔“

پھر ایرگاش، یفیم دانیلووچ اور جوراخان میں بات ہونے لگی کہ نعمانچہ سے کسے بھیجا جائے گا۔

”یہ آخر ہے کیا؟ بچوں کی جیسی بےفکری؟“ دوبروخوتوف نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ”ان لوگوں نے مل تو اب تک بنائی نہیں اور سوت نہ کپاس جلاھے سے لٹھم لٹھا!“

پندرھواں باب

سارے دن دھوپ تیز پڑتی رہی تھی، آسمان اتنا چمکدار تھا کہ آنکھیں چندھیاتی تھیں لیکن شام سے کچھ قبل نعمانچہ

پر اچانک بادل گھر آئے اور اندھیرا چھا گیا۔ ھوا کے تیز جھونکے چلنے لگے اور پاپلر کے نیچے سے گھنے اور اوپر کو پتلے ھوتے ھوئے درخت کے بل کھاتے ھوئے پتے گرج چمک کے ساتھ ھونے والی بارش سے قبل کے جھٹپٹے میں چمکنے اور کھڑکھڑانے لگے۔ قریب ھی کھیں زور سے بجلی چمکی اور کان کے پردے پھاڑ دینےوالی گرج سے آسمان گونج اٹھا۔ بارش کچھ فاصلے پر ھو رھی تھی مگر آس پاس کی پھاڑیوں سے تیزی سے بھتا ھوا گدلا گڑگڑاتا پانی آکر گڈھوں اور جوھڑوں میں اکٹھا ھونے لگا۔

تورسنائی کو طوفان برق و باراں سے ھمیشه ڈر لگتا تھا لیکن آج وہ بالکل خوفزدہ نه تھی، اس کی پیاری امی آج پھلی بار پلنگ کو لات مارکے اٹھ کھڑی ھوئی تھیں اور کوئی بھی طوفان، گرج، بارش تورسنائی کی خوشیوں پر اندھیرا نھیں کر سکتی تھی۔

اس نے دونوں ھاتھ آسمان کی طرف پھیلائے، برآمدے سے نیچے کودی اور بارش کو بلانے کے لئے دوڑتی ھوئی گلی میں نکل آئی جھاں اسے اپنی کچھ سھیلیاں دکھائی دیں۔

"لڑکیو، لڑکیو" اس نے چیخ کر آواز دی: "آؤ جلدی، آؤ بال بڑھائیں!"* پھر اس نے شلوار کے پائینچے اوپر چڑھائے اور بھتے ھوئے برساتی پانی کے چھوٹے سے دھارے میں اتر کر ننگے پیر چلنے لگی۔

اس کی سھیلیاں اس کے پیچھے بھاگیں اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں دوڑنے لگیں، پانی کے چھپاکے چاروں طرف بکھرنے لگے اور ان کی چیخوں اور کلکاریوں کی گونج گلی بھر میں پھیل گئی۔ لڑکیاں گانے لگیں۔

برساتی پانی مٹی کی نیچی دیواروں سے لگا لگا، راکھ اور کوڑے کو ساتھ لئے بھتا جا رھا تھا۔ تورسنائی بال کھولے

---

* یه روایت ایشیا بھر میں عام ھے که بارش کے پھلے پانی سے بال بڑھتے ھیں۔ اڈیٹر۔

سب لڑکیوں سے آگے، اپنی صاف، گھنٹیوں کی سی آواز کی گونج سناتی دوڑتی جا رہی تھی۔

پھر بوندیں پڑنے لگیں۔ لڑکیوں نے اور بھی زوروں کی چیخیں ماریں، سر اٹھا دئے کہ بارش کے قطرے بالوں پر گریں اور ہاتھ پھیلاکر قطروں کو ہتھیلیوں پر گرانے لگیں۔

تورسنائی نے سب سے پہلے بنکر سلیم کی سوتیلی بیٹی، عدالت کو دیکھا، وہ مٹی کی ایک ٹوٹی پھوٹی دیوار پر بیٹھی تھی جو ایسا لگ رہا تھا کہ اب بس گرےگی اور پانی کے بہاؤ میں جا پڑےگی۔ عدالت نے اپنی سہیلیوں کو آواز دی اور ہاتھوں سے اشارہ کرکے ہوشیار کیا۔

لڑکیاں دیوار کی طرف بھاگیں۔

"چپ چپ، بند کرو گانا، شور مت کرو" عدالت نے خوفزدہ نظروں سے دیوار کے ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

چونکہ عدالت ان میں سب سے بڑی تھی اس لئے لڑکیاں خاموش ہو گئیں۔

تورسنائی پانی کے کنارے پر چڑھ گئی جس کے آس پاس پودینے کی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ پھر وہ اکڑوں بیٹھ گئی اور آنکھیں پھاڑکے بولی:

"کیوں؟ کیا بات ہے؟ ادھر کیا ہو رہا ہے؟"

عدالت نے پھر مڑکر ادھر دیکھا اور سرگوشی کی:

"چچی خالبووی جو ہیں نا ان کے یہاں برسی کے سلسلے میں فاتحہ‌خوانی ہو رہی ہے، یہ مدعمر قپچاق کا گھر ہے۔ یاد ہے نا وہی جو پچھلے سال مر گیا تھا!..."

"تو تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"میں اپنی اماں کے ساتھ فاتحہ خوانی میں آئی ہوں، آؤ، ادھر آ جاؤ، بڑا مزہ آ رہا ہے اور چڑھ آؤ، یہاں ہمیں کوئی نہیں دیکھےگا۔ لو، میرا ہاتھ پکڑو۔"

تورسنائی نے اپنی اور سہیلیوں کو بھی آنے کا اشارہ کیا اور خود دیوار پر گئی مگر وہ سب پیچھے رہ گئیں۔ عدالت اور تورسنائی نیچے صحن میں کود گئیں اور ایک گھنے ناشپاتی کے پیڑ کی آڑ میں ہوتی ہوئی برآمدے کے نزدیک پہنچ گئیں۔ ایک

دوسرے کا ہاتھ پکڑے وہ بالکل ڈیوڑھی کے پاس پہنچ کر دہلیز پر اکڑوں بیٹھ گئیں۔ وہاں کچھ ربڑ کے جوتے رکھے تھے۔

برآمدہ عورتوں سے بھرا تھا جن کے چہرے سفید ململ کے رومالوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ تورسنائی نے دیکھا کہ وہ ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھے، ہتھیلیوں کو اوپر کئے، دعا کے بعد "آمین" کہنے کے لئے تیار تھیں۔ وہ اسی طرح دیر تک خاموش بیٹھی رہیں۔ آخرکار ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے جس کے ہونٹ موٹے اور ناک باریک تھی اور جو اپنے طور طریقوں میں اوروں سے زیادہ بےتکلفی اور آزادی دکھا رہی تھی، اپنے منہ پر دونوں ہاتھ پھیرے، سب عورتوں نے بھی فوراً ویسے ہی کیا۔ پھر سب میں جیسے جان پڑ گئی، ادھر ادھر چلنے پھرنے، ہنسنے بولنے، ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگیں، دہلیز پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی بھی کچھ ہمت بندھی۔ عام شور و غل کی اس فضا میں وہ اس خوف کے بغیر کہ کوئی ان کی باتیں سن لے گا، سرگوشیاں کر سکتی تھیں۔

"بیچ والی اس عورت کو دیکھ رہی ہو" عدالت نے ایک پراسرار طریقے سے آنکھیں پھاڑیں اور بولی: "یہی تیشیک قاپ‌قاق کی میلاد پڑھنے والی عورت ہے۔ کاش تم نے سنا ہوتا وہ کتنی تیزی سے دینی کتابیں پڑھتی ہے۔ بڑی اداسی کی فضا تھی، سب عورتیں بیٹھی سسکیاں بھرتی رہیں۔ تمہیں یقین نہیں آتا؟ اگر میں جھوٹ بولتی ہوں تو اللہ میاں مجھے ابھی کے ابھی موت دیں۔"

"تو یہ کس کی ماں ہے؟" تورسنائی نے اپنی عقلمند، عقل کل سہیلی کے پاس کھسکتے ہوئے پوچھا۔

"اوہو، تیری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا، ماں کس کی ہوتی؟ کسی کی بھی ماں نہیں ہے... بتایا تو تجھے کہ پہنچی ہوئی عورت ہے، یہ جنات سے اور بھوتوں، چڑیلوں، بدروحوں سے بات کر سکتی ہے، یہ ان سے ایسے بات کرتی ہے جیسے ہم تم باتیں کر رہے ہیں۔"

"بھوت، چڑیل کچھ نہیں ہوتے ہیں۔ امی نے بتایا ہے کہ یہ سب ڈھکوسلا ہے اور بشارت کہتی ہے کہ..."

"مگر کتاب میں تو لکھا ہے۔"
"تو وہ کتاب غلط ہے۔"
"تمہیں پتہ ہے وہ ہمارے گھر کے پاس جو قبرستان ہے نا اس میں بہت سی بدروحیں رہتی ہیں - چڑیلیں اور سائے، شیطان اور بھوت..."
"پر تم سے کس نے کہا؟" تورسنائی نے جس کا رنگ اڑ گیا تھا، ہمت کرکے پوچھا۔
"کسی سے بھی پوچھ لو، کوئی بھی بتا دے گا..."
یکایک عدالت ٹانگیں ٹیڑھی کرکے مینڈک کی طرح اچھلی۔
"دیکھ دیکھ، اب کیا ہوتا ہے۔"
تورسنائی نے لرزکر ادھر دیکھا جدھر عدالت اشارہ کر رہی تھی۔
پہنچی ہوئی عورت کھڑی ہو گئی تھی اور گرہیں پڑی ہوئی ایک چھڑی کے سہارے، آہستہ آہستہ برآمدے کے دوسرے سرے پر سے سیڑھیاں اترکر ایک چھوٹی سی جھونپڑی کی طرف جا رہی تھی۔ ایک سفید ہوتے ہوئے بالوں والی عورت اس جھونپڑی کی طرف اپنے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کر رہی تھی۔
عدالت نے تورسنائی کی آستین پکڑی اور اسے کھینچتی ہوئی لے چلی، مٹی کی دیوار سے لگی لگی دونوں صحن کا چکر کاٹ کر اس جھونپڑی کے پیچھے پہنچ گئیں اور کھڑکی تلے کھڑی ہو گئیں۔ پہلے عدالت اور پھر تورسنائی نے بڑی احتیاط سے کھڑکی کے اندر جھانکا۔ صحن کے مقابلے میں یہاں اندھیرا تھا اور لڑکیوں کو بس ململ کا وہ سفید رومال نظر آیا جو پہنچی ہوئی عورت سر پر باندھے تھی۔
وہ عورت جس کے سر کے بال سفید ہوتے جا رہے تھے، آگے بڑھی۔ اس نے کوٹھری کے دروازے کی عقبی بلی لگاکر دروازہ مضبوطی سے بند کیا اور برآمدے میں بیٹھی ہوئی عورتیں اچانک بالکل خاموش ہو گئیں۔
"یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" تورسنائی نے خوفزدہ ہوکر سرگوشی کی۔

"ابھی دیکھنا، وہ یاد ہے ٹیڑھی ٹانگوں والا لڑکا جو گلیوں میں مارا پھرتا تھا نا؟ یاد ہے نا؟ اس کا منہ بھی گھوما ہوا تھا؟ سب اسے پاگل مناب کہتے ہیں۔ دیکھو وہی تو پڑا ہے فرش پر..."

"کیا؟ تو کیا یہ پہنچی ہوئی عورت اس کا علاج کر رہی ہے؟"

"وہ اس کا بھوت اتار رہی ہے۔ یہ عورت تو جادو سے درد دور کر سکتی ہے، جادو کر سکتی ہے، ٹونا کر سکتی ہے، وہ بھوت کی زبان بند کر سکتی ہے..."

"مگر وہ ہے کہاں؟"

"کون؟"

"وہی ب... ب... بھوت" تورسنائی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"کیا وہ وہاں ہے، اس لڑکے کے پاس۔"

"ٹھہرو تو، اپنے آپ ہی دیکھ لینا۔"

"ہائے، مجھے تو ڈر لگ رہا ہے" تورسنائی نے کہا۔ اس کی آواز اتنی دبی ہوئی تھی کہ بمشکل سنائی دی۔

"ابھی تو تم کہہ رہی تھیں بھوت کچھ نہیں ہوتا، اب دیکھ لو کہ تم کتنا جانتی ہو، ڈر تو سب ہی کو لگتا ہے۔"

نعمانچہ میں بارش نہیں ہوئی اور مغرب کا وقت ہو گیا۔ بوندا باندی سے گرمی کی تپش کچھ دیر کے لئے ضرور کم ہو گئی لیکن اس جگہ، جھونپڑی اور دیوار کے بیچ میں کافی گھٹن تھی۔

چاروں طرف ایسا سناٹا تھا کہ دم گھٹا جاتا تھا۔

یکایک جھونپڑی سے ایک ایسی عجیب سی، پھنسی ہوئی آواز آنے لگی جیسے دور کہیں کوئی گیدڑ بول رہا ہو۔ تورسنائی خوف کے مارے کودکر پھر دیوار پر پہنچ گئی مگر عدالت نے اپنا منہ کھڑکی پر جما دیا۔

پہنچی ہوئی عورت بیمار لڑکے کا طواف کر رہی تھی اور کچھ کچھ بدبداتی بھی جا رہی تھی، کچھ دعائیں عربی میں، خنخناتی ہوئی آواز میں پڑھتی جا رہی تھی۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم – تعریف خدا کی، لاالہ الااللہ...

ائے غفورالرحیم، تیرے اور تیرے قرآن کے نام پر... اے عقل کل کے دست قدرت، او اولیاؤ، پیغمبرو، مقبول بندو، مقدس المقدس، شیطان کو دور کر... بیمار کو شفا دے، مقدس و پاک خوشبو پھیلا..."

تورسنائی بار بار دیوانہوار چیخیں سنتی "خی، خی، خی..."

"وہ کر کیا رہی ہے؟" تورسنائی نے لرزتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھو نا، اس لڑکے کے سر پر بدروحیں منڈلا رہی ہیں اور وہ پاک دعائیں پڑھ پڑھکر انہیں بھگا رہی ہے۔ اگر یہ روحیں نہ بھاگیں تو بڑی مشکل ہوگی کیونکہ پھر وہ ایسے ایسے بھیانک لفظ پڑھ پڑھکر ان پر جادو کرےگی جو صرف بھوتوں کی ہی سمجھ میں آتے ہیں۔"

پہنچی ہوئی عورت کوٹھری میں چاروں طرف یوں بھاگ رہی تھی جیسے کوئی پاگل کتا اس کو دوڑا رہا ہو۔ بار بار ہوا میں جست بھرتی، بار بار اپنا عصا گھماتی، چاروں طرف تھو تھو کرکے تھوکتی اور چیختی اور روتی۔ رومال اس کے سر سے گر گیا اور بال کھل گئے پھر وہ ایک ہی جگہ کھڑی ہوکر ایسا چکرانے لگی جیسے اس نے زہر کھا لیا ہو۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔

تورسنائی نے کپکپاتے ہوئے فوراً عدالت کا لباس پکڑ لیا۔

"اب کیا ہو رہا ہے؟"

"اس کا دم گھٹ رہا ہے..."

"کون گھونٹ رہا ہے اس کا دم؟ شیطان؟ تم کو دکھائی دے رہا ہے؟"

"نہیں، وہ خود اپنا دم گھونٹ رہی ہے، وہ مناب کی روح کو شیطان کے پنجے سے چھڑا رہی ہے۔"

"اور اگر وہ نہ چھڑا پائی تب کیا ہوگا؟ مناب مر جائےگا؟"

"پتہ نہیں۔ ٹھہرو ذرا..."

"چلو، یہاں سے چلیں۔"

"ایک منٹ ٹھہرو، اب تو سب سے مزےدار بات ہوگی، وہ دیکھکے چلیں گے۔ دیکھو، دیکھو۔"

"نہیں، نہیں، میں نہیں دیکھوں گی۔"

"پر تم کس بات سے اتنا ڈر رہی ہو؟ میری اماں تو یہیں ہیں۔ دیکھو وہ رہیں، دیکھا؟"

عدالت ہی صرف ایک ایسی تھی جو ڈر نہیں رہی تھی ورنہ برآمدے میں بیٹھی سب ہی عورتوں کو ڈر کے مارے چپ لگ گئی تھی، ایک لفظ ان کے منھ سے نہیں نکل رہا تھا اور ان کی نگاہیں جھونپڑی پر چپکی ہوئی تھیں۔

اس اثنا میں پہنچی ہوئی عورت نے یوں زمین پر لوٹنا، تڑپنا، مچلنا شروع کیا جیسے اسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ وہ فرش پر سر دے دے مار رہی تھی، زمین کو اپنے ناخنوں سے کھرچ رہی تھی اور ساتھ ہی اپنے عصا کو بھی فرش پر مار مار کر بیٹھی ہوئی آواز میں چیختی جاتی تھی۔ اس کے بال یوں منھ پر بکھر گئے تھے کہ وہ خود ہی چڑیل لگ رہی تھی۔

تورسنائی نے ہمت کرکے کھڑکی سے جھانکا، پہلے تو اسے اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا پھر اس نے دیکھا کہ مناب نے کمبل میں سے سر نکالا، اس کا زرد خوفزدہ چہرہ اور اس میں سے ابلتی ہوئی آنکھیں — یہ منظر اتنا وحشت‌ناک تھا کہ تورسنائی نے اپنی پوری طاقت سے ایک چیخ ماری۔

اب عدالت بھی ڈر گئی اور وہ تورسنائی کو کھڑکی سے الگ کھینچ لے گئی۔ برآمدے کے پاس پہنچ کر دونوں کی جان میں کچھ جان آئی۔

"ہم لوگ سب سے دلچسپ حصہ نہیں دیکھ سکیں گے، یہ سب تمھارا قصور ہے" عدالت نے سرگوشی کی۔

"ہم کیا نہیں دیکھ سکیں گے؟"

"ارے وہی کہ پہنچی ہوئی عورت بھوت پر کیسے جادو کرتی ہے۔"

"مگر تم تو کہہ رہی تھیں کہ یہاں مرنے‌والے کی برسی کے موقعے پر فاتحہ‌خوانی ہو رہی ہے؟.."

"ارے تو کیسی گدھی ہے! مردے کی نذر تو ہو بھی چکی مگر جب یہ عورت آئی نا تو یہ لوگ مناب کو اس کے پاس لے آئے۔"

"میں نہیں دیکھنا چاھتی، میں... مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ھے" تورسنائی بڑبڑائی۔ "میں نے سب کچھ دیکھ لیا۔ مناب بھی بہت ڈرا ھوا لگ رہا ھے، یہ لوگ اس بےچارے کو کیوں اتنا پریشان کر رھے ھیں؟"

"تم بڑی بےوقوف ھو، اس کو تو بدروحیں پریشان کر رھی ھیں۔ دیکھو، دیکھو، سنو، سن رھی ھو؟"

جھونپڑی سے خوف‌ناک آوازیں اور جادو ٹونے کے الفاظ سنائی دینے لگے اور اس عورت کی بھرائی ھوئی منمناتی آواز، جھٹکوں کے ساتھ آنے لگی جیسے کوئی کتا بھونک رہا ھو۔

"اے، گے، سڑ جا! مر جا! ززز، بھرزز ھش ھش، کمبخت دور ھو، شیطان، بدروح ناپاک، بدمعاش... خی، خی!.. دون، پلیون، گرن، درن، ماروں‌گی عصا سے، ٹھوکر ماروں، ھشیار ھو جا۔ سڑ... زنجیریں چھنک رھی ھیں... زنجیں، زنجیر... ھے، گے، دور ھو، سڑ جا، مر جا، الٹا لٹک جا، میں تم سب کا خاتمہ کر دوں‌گی، سورج کا شیطان بھی گر پڑے گا! بندر خوبانی پر جھولا جھولے نکل دور، مر، خوں۔ں۔ں!"

جس عورت کے بال سفید ھوتے جا رھے تھے وہ کندھے جھکائے جلدی سے جھونپڑی سے دور چلی گئی اور برآمدے میں جمع سب ھی عورتوں نے دعا کے لئے ھاتھ اٹھائے۔ تورسنائی عدالت سے لپٹی تھرتھر کانپ رھی تھی۔

"کیا ھوا؟ اب کیا ھو رہا ھے؟"

"اس عورت نے بھوت کو مار ڈالا، اس کے پر نوچ کر توڑ دئے۔"

تورسنائی سانس روکے دروازے کی طرف دیکھ رھی تھی۔ وہ اپنی نگاھیں وھاں سے ھٹا ھی نہیں پا رھی تھی۔ وہ سوچ رھی تھی کہ بس اب کسی پل بھی دروازہ بھڑ سے کھلے گا اور بھوت اور بدروحیں، لڑھکتی پڑھکتی اپنے ٹوٹے پروں کو گھسیٹتی نکلیں گی۔

اس کا جی تو چاہ رہا تھا کہ بھاگ جائے مگر برآمدے سے قدم تک اٹھانے کی ھمت نہ تھی کہ عدالت کو چھوڑ دے

ورنہ کہیں جھٹپٹے میں کسی بدروح نے اسے جا لیا تو پھر... ہائے اب وہ گھر کیسے پہنچے گی؟

جھونپڑی کے اندر کی چیخ پکار رک گئی تھی۔ وہ عورت جس کے بال سفید ہوتے جا رہے تھے، خاموشی سے آگے بڑھی اور اس نے بڑی احتیاط سے دروازے پر ٹکی ہوئی بلی ہٹائی۔

دروازہ چوں چوں کرکے کھل گیا، برآمدے میں بیٹھی عورتیں آہیں بھرنے لگیں، پہنچی ہوئی عورت جھکی ہوئی، عصا ٹیکتی جھونپڑی کے باہر نکلی، وہ بہت کمزور لگ رہی تھی اور تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح ہانپ رہی تھی، اس کے موٹے ہونٹوں پر سفید جھاگ خشک ہوکر سفید سفید بھوسی کی طرح لگ رہا تھا۔ آگے قدم بڑھاتے ہوئے اس نے اس عورت کے ہاتھ میں کوئی چیز رکھی جس کے بال سفید ہوتے جا رہے تھے اور گہری سانس لےکر بولی:

"یہ جادو کی کیلیں اپنے بیٹے کے کمرے کی دہلیز میں گاڑ دینا کیونکہ فرشتے تمہارے گھر سے خفا ہو گئے ہیں!"

پھر وہ سیڑھیاں چڑھتی برآمدے میں پہنچی اور عورتوں کے درمیان اپنی جگہ پر بیٹھ گئی، اپنے بازو اٹھائے اور آہستہ سے کہا:

"آمین! تعریف ہو خدا کی، تعریف ہو پروردگار کی، بنام پیغمبر کہ اپنی آرام‌گاہ میں سکون سے ہیں، بنام کل انبیاو اولیا، اپنے ناچیز بندے پر کرم کر۔ آمیں!"

تورسنائی اس پر پڑے ترس کے ساتھ گھور رہی تھی۔ بےچاری عورت، کتنی تھک گئی تھی... اگر وہ اس بدروح کے پر نہ نوچ پاتی تو کیا ہوتا؟ کتنی خوش‌قسمتی کہ یہ معاملہ یوں ختم ہو گیا...

"مگر وہ شیطان کہاں ہیں؟" تورسنائی نے پوچھا۔

"چپ رہ" عدالت نے ڈانٹا۔

گھروالی نے اس کو چائے پیش کی۔ ایک جوان بیاہی عورت اس پہنچی ہوئی عورت کے پاس گئی اور اسے رومال سے پنکھا جھلنے لگی، سب طرف سے سوالات ہونے لگے:

"اسے کیا آزار تھا، عالم محترمہ؟"

"کیا نظر لگی تھی؟"
"اسے کیا بیماری ہے؟"
دعائیں پڑھتے ہوئے پہنچی ہوئی عورت نے بڑے اطمینان سے چائے کا پیالہ قبول کیا اور پھر مزے میں چسکیاں بھرتے ہوئے اپنے موٹے ہونٹ چاٹتے ہوئے معنی‌خیز انداز میں جواب دیا۔

"آپ لوگوں نے خود ہی دیکھ لیا کہ اسے کیا بیماری ہے۔ اور اس کی وجہ کیا ہوتی، وہی پاک روحوں کا غصہ اور قہر۔ اور کیا میری اچھی بیبیو۔"

تورسنائی حیرت کے ساتھ عدالت کی طرف مڑی اور احساس فتحمندی سے اس کے کہنی ماری۔

"لو! تم تو کہتی تھیں کہ بدروحیں ہیں۔"

پہنچی ہوئی عورت نے سرخ مخمل کی جلدوالی ایک موٹی سی کتاب نکالی اور اسے اپنے گھٹنے پر رکھا۔

"اب میں آپ لوگوں کو صحیح ماجرا بتاتی ہوں، اس مقدس کتاب میں محی‌الدین اعرابی نے خوابوں کی تعبیریں بیان کی ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ تمام پاک اور مقدس مقامات جہاں اولیا ہمیشہ کے لئے آرام کرتے رہتے ہیں، ان پر خداوند تعالی کی نگاہ رہتی ہے جو ہر جگہ حاضر اور تمام اشیا کا ناظر ہے۔ آپ کا نعمانچہ بھی ایک ایسا ہی مقام ہے! یہاں میرے محافظ ولی شیخ ہزار شیخ کے مبارک قدم پڑے تھے، نعمانچہ ہی میں آپ کو اعلیٰ‌وصال حاصل ہوا، نعمانچہ ہی میں آپ کی آخری آرام‌گاہ ہے اور یہیں آپ اپنے خالق باری وقادر مطلق سے جا ملے۔ ان بزرگ ولی کا پاک مقبرہ یہیں ہے۔"

"ہاں، ہاں، ہزار شیخ کا مقبرہ تو یہیں نعمانچہ میں ہے" عورتوں نے کہا۔

پہنچی ہوئی عورت نے کتاب کھولی اور منمناتی ہوئی ڈراؤنی آواز میں پڑھنا شروع کیا:

"گنہگار لوگ، مکار شیطان کے بہکائے میں آکر، پاک مقامات کی بےحرمتی کرتے ہیں تو خدا کا قہر نازل ہوتا ہے

کیونکہ مرحوم اولیا کی پاک روحیں ہمیشہ اپنی آرام‌گاہوں میں موجود رہتی ہیں... آہ، گنہگارو، اس بات کو گرہ میں باندھ لو!"

"اے خدائے برتر..."

"جو گنہگار شیطان کے بہکانے میں آ جاتے ہیں انہیں تدفین کے بغیر ہی کافروں کی طرح سیدھے جہنم میں جھونک دیا جاتا ہے۔ انہیں ایک دوزخ سے دوسری میں، پہلی سے ساتویں تک پھینکا جائے گا اور ہر دوزخ میں یہ لوگ دھکتے ہوئے انگاروں میں جلیں گے... اے گنہگارو، اس بات کو ہمیشہ یاد رکھو!"

"اے رحمن الرحیم، تیری پناہ۔"

"گنہگارو، کمزورو" پہنچی ہوئی عورت نے پھر کہنا شروع کیا اور خبردار کرنے کو کلمے کی انگلی اٹھائی۔ "تم لوگوں میں آپس میں وہ دشمنی پھیل گئی جسے شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے، مسلمان، مسلمان کا دشمن ہو رہا ہے، کیا یہ اس لئے کہ تم نے اولیا کی معجزنما قوت پر ایمان لانا بند کر دیا ہے؟ آہ۔ اے رحمن الرحیم، تو اپنے مومنین کو ایماندار رہنے کی ہدایت کر..."

"مرشدہ عالم و فاضل" وہ عورت جس کے بال کھچڑی تھے، بڑے احترام کے ساتھ بولی۔ "اس لڑکے پر یہ بدبختی کیوں نازل ہوئی؟ یہ تو ابھی بچہ ہے اور خدا کے نزدیک معصوم۔"

پہنچی ہوئی عورت نے سرزنش کے انداز میں سر ہلایا:

"میں بتاتی ہوں، جب میرے محافظ ولی ہزار شیخ دنیا میں پیدا ہوئے تو آپ نے آسمان سے ایک صدا سنی۔ "میرے انسانوں کو ایمان کا راستہ دکھا، اس فانی دنیا میں جو ایمان‌والے ہیں ان کے لئے میں آخرت میں جنت کے دروازے کھول دوں‌گا"۔ اور جیسے ہی حضرت کی زبان گفتگو کے لائق ہوئی آپ فرمانے لگے: "کیا دنیا میں زندگی چند روز سے زیادہ ہے؟ یہاں ہر انسان کے لئے فنا ہے۔" آپ نے اس دنیائے دنی کی ہر شے، ہر لالچ اور حرص کو ٹھوکر مار دی، اپنی نظریں زمین پر جمائے رکھیں۔ لباس فاخرہ ترک کیا اور جلی ہوئی

سوکھی روٹی کے ایک ٹکڑے اور پانی جیسے شوربے پر قناعت فرماتے تھے، جوانی ہی میں آپ جنگلوں اور ویرانیوں میں بسر کرتے تھے اور آپ نے دو بار حج کیا اور مکۂ شریف کی زیارت کی، آپ مجبوروں اور بیکسوں کی امداد کرتے اور اپنی مانگی ہوئی بھیک تک اپنے دست مبارک سے ضرورتمندوں میں بانٹ دیتے تھے۔ بیماروں اور معذوروں کے سامنے جھک کر فرمایا کرتے تھے۔ جو مصیبتیں اور بیماریاں تم پر آنےوالی ہیں وہ اپنے اوپر لے لوں گا، بڑے بڑے معزز علما، قاضی، مولانا اور مفتی لوگ ان کے نقش قدم پر چلتے، ان کی مریدی اختیار کرتے اور انہیں اپنا محافظ ولی کہتے تھے۔ سات دانگ عالم میں آپ کے مرید موجود تھے مگر آپ کو تخلیہ پسند تھا" پھر اس نے دھڑ سے کتاب بند کر دی۔ "اور آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ انہوں نے یہاں، آپ کی قربت کو اپنی آماجگاہ بنایا اور یہیں خدا کو پیارے ہو گئے۔ ان کے بہت سے مرید بھی یہیں دفن ہیں، اس لئے یہ مقام پاک ہے، مقدس ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس لمحے بھی ولی ہزار شیخ یا ان کے فرشتے کی روح یہاں ہمارے سروں پر بلندی سے اپنا سایہ کئے ہوئے ہو، وہ ہمیں نظر نہیں آئے گی مگر وہ بڑی طاقتور ہے۔ اے پروردگار، اے رب العالمین میرا سجدہ قبول فرما..."

پھر وہ یوں رونے لگی جیسے واقعی اس نے کشف حاصل کر لیا اور نور اس کے سینے میں سما گیا ہو۔ یہ گویا ایک حکم تھا کہ سب عورتوں نے اپنی آنکھوں پر رومال اور آستینیں رکھ لیں۔

"لیکن اس لڑکے کو کیا ہوا ہے؟" کھچڑی بالوں والی عورت نے پھر پوچھا۔

پہنچی ہوئی عورت نے ایک گہری آہ بھری۔

"اس لڑکے نے قبرستان سے گزرتے ہوئے ہزار شیخ کے ایک مرید کی قبر کو ٹھوکر ماری۔ یہ ہوا..."

"ارے اللہ!"

"اس کی تو بدبختی ہی ہوگی" پہنچی ہوئی عورت نے آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔ "جو ان مقدس قبروں کو پاؤں

لگائیے گا محافظ ولی کا غصہ اس کو مار گرائے گا، راتوں کو یہ بزرگ ولی اپنے مقبرے سے اٹھتے ھیں، آگ روشن کرکے اپنی آرام گاہ کا جائزہ لیتے ھیں، خود ملک الموت رات میں حاضر ہوکر اس روشنی کے آگے تعظیم سے سر جھکاتا ھے!"

"امی!" ایک بچی کی دردناک چیخ سے اس جادوگرنی کا سلسلۂ کلام منقطع ہو گیا۔ سب عورتیں ہڑبڑاکر اٹھ کھڑی ہوئیں اور مڑکر دیکھا۔ وہ چیخ تورسنائی کی تھی۔

عدالت خوف کے مارے سکتے کی حالت میں تورسنائی کے پاس کھڑی تھی۔

عدالت کی ماں تیز دوڑتی ہوئی بچیوں کے پاس پہنچی اور پہنچی ہوئی عورت کے اشارے پر ان کے ھاتھ پکڑکر وھاں سے ہٹا لے گئی۔

دادی عنظیرت برآمدے کے سرے پر بیٹھی، وحشت‌زدہ، اس عورت کی باتیں سن رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنے دونوں ھاتھ دعا کے لئے اٹھاتی، سر ہلاتی، آہ بھرتی اور اس عورت کے کہے ہوئے فقروں کے آخری الفاظ دوھراتی جیسے وہ دعا کے الفاظ ہوں۔

"لوگ کہتے ھیں" دادی عنظیرت نے اچانک دبی زبان سے کہا۔ اس کی آواز میں تجسس، غصہ اور خاکساری سب کچھ تھا۔ "لوگ کہتے ھیں کہ جہاں اس وقت ھمارا قبرستان ھے وھاں ایک مل بنے گی، تو اے مرشدہ، اگر ایک معصوم بچے نے کسی مرید کی قبر چھو لی تب تو اس کا دماغ چل گیا، پھر ان سب کا کیا حشر ہوگا جو خود محافظ ولی کے مقبرے کو تاراج کرکے اس پر مل بنائیں گے۔ کیا زمین ان کو نگل نہ جائے گی، محترمہ؟"

پہنچی ہوئی عورت چونک‌کر دادی عنظیرت کے پاس سے ذرا پیچھے ہٹی، جیسے دادی عنظیرت نے اس پر کوئی وار کر دیا ہو جس سے وہ بچنے کی اور اسے دونوں ھاتھوں سے روکنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"حق تعالی... بہتر جانتا ھے... میں نہیں جانتی، میں لاعلم ہوں" اس نے جواب دیا اور پھر دونوں ھاتھ منہ پر

پھیرے جیسے دعا پڑھ رہی ہو۔ "اے مالک، تو ہی مقدس محافظ ولی کے غصے کو ٹھنڈا کرنےوالا ہے... میں لاعلم ہوں! میں اللہ پر ایمان رکھنےوالی، مجھے گناہ آلود منصوبوں سے کیا تعلق؟ میں تو اسی چیز کا ذکر کرتی ہوں جو رسول پاک کی شریعت میں ہے اور شریعت کے علاوہ مجھے کوئی علم نہیں۔ گھر جاکر میں اپنے سر پر خاک ڈالوں گی، تلخ آنسو بہاؤں گی، گناہوں سے بچتی رہوں گی۔ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے وہ ذلت وخواری اور سزا بھگتتے ہیں... اے اللہ، ایمانداروں کو نیک ہدایت دے!.."

اور اس نے پھر جلدی سے وہ مخمل جلد والی کتاب کھولی۔

"میں جو کچھ کہہ رہی ہوں اسے کہنے کی قادر مطلق نے مجھے توفیق دی ہے، میں اس کے ہی احکام آپ لوگوں کے دلوں میں ڈالنا چاہتی ہوں، سنو..." اس نے پڑھنا شروع کیا: "اللہ کے ہر نیک بندے کا دینی فرض، مقدس فرض ہے کہ کافر کو سنگسار کرے، قیامت برحق ہے اور کلمہ نہ پڑھنےوالے اور بےایمان لوگ قعر جہنم میں جھونکے جائیں گے، تارے آسمان سے یوں ٹوٹ کر گریں گے جیسے پیڑ سے شہتوت، زمین کا تختہ الٹ جائے گا، لوگ اپنا سر چھپانا اور عبادت کرنا بند کر دیں گے..."

پہنچی ہوئی عورت کے چہرے پر شہیدوں کی سی کیفیت طاری ہو گئی، وہ پھوٹ کر رونے اور رونے ہی کے درمیان، ترنم کے ساتھ، درویشوں کے مانند، صدا لگا لگاکر پڑھنے لگی:

"جو اللہ سے خوف نہ کھائے گا
قعرجہنم میں پھینکا جائے گا..."

ساری عورتیں آنسو بہانے اور جس کو جو دعائیں یاد تھیں وہ پڑھنے لگیں۔

شام کا اندھیرا تیزی سے بڑھنے لگا بادل اتنے نیچے آ گئے کہ لگتا تھا ہاتھ سے چھوئے جا سکتے ہیں۔

خالبووی کو یاد آیا کہ رات کو قبرستان میں مقبرے کی روشنی کے آگے تعظیم سے سر جھکانے کے لئے ملک الموت آتا ھے اور وہ اتنی خوفزدہ ہوئی کہ اس نے چراغ بھی نہیں جلایا۔ بس ڈر ڈرکے وہ دور آسمان پر بار بار تڑپتی ہوئی بجلی کے کوندوں کو دیکھتی رہی۔

دادی عنظیرت بڑبڑائے جا رہی تھی:

"شکر خدا کا!.. شکرالله!.."
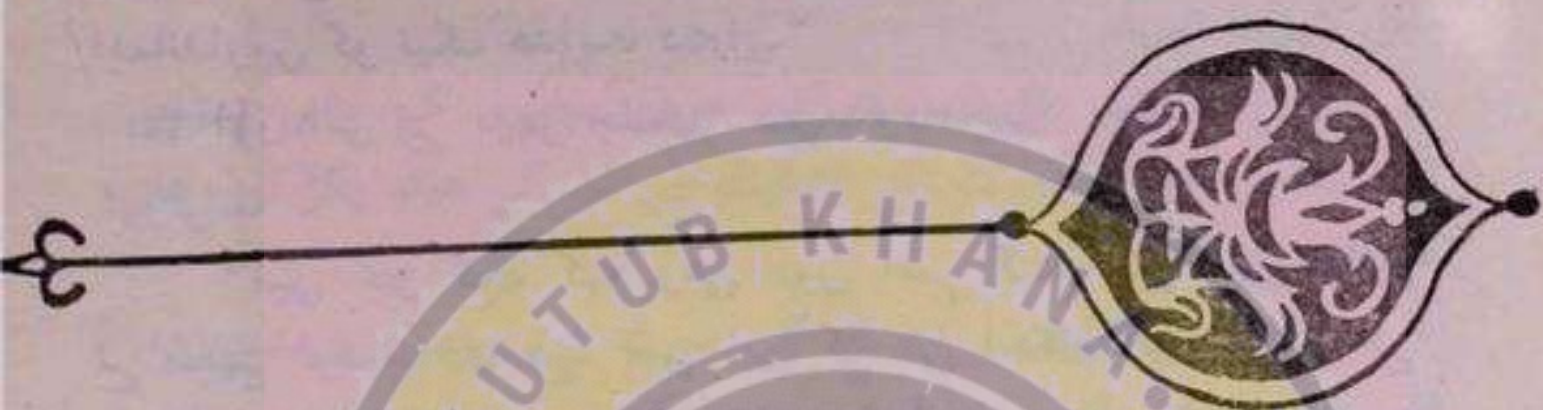
سولھواں باب

اناخان بسترعلالت سے اٹھی ھی تھی کہ اس کے کندھوں پر نئی فکروں کا بوجھ آ پڑا۔ ان فکروں کے ساتھ نئی پریشانیاں بھی آئیں لیکن اب اگر ان کا مقابلہ کرنے میں وہ اپنی صلاحیت پر شک کرتی تو یہ بڑی شرمناک بات ہوتی۔ اسے تو اپنی صلاحیت سے کچھ زیادہ ھی کرکے دکھانا تھا کیونکہ اسی بات پر نعمانچہ کی بہت سی عورتوں کی قسمت کا انحصار تھا۔

زندگی میں پہلی بار وہ سڑک پر بےنقاب نکلی، اس کے قدم تو مضبوطی سے پڑ رہے تھے مگر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ پیر تلے زمین ڈگمگا رہی ھے۔ جیسے صرف لوگ ھی نہیں، درودیوار بھی اس کو گھور رہے ہوں۔ پرنجے کے بغیر سر اٹھانا کتنا مشکل تھا، سامنے دیکھنا کتنا دشوار، معمولی چال چلنا کتنا محال۔ تیز چلے بغیر اس سے رہا نہیں جا رہا تھا، کوآپریٹو جاتے ہوئے وہ کبھی سرد محسوس کرتی، کبھی گرم!

بے شک منہ چھپانے کی عادت بڑی سخت‌جان تھی اور بہت دھیرے دھیرے مر رہی تھی... اناخان نے ارادہ تو پکا کر لیا تھا کہ اب وہ نقاب نہیں ڈالےگی لیکن دل ہی دل میں ایک عجیب سا چور تھا کہ لوگ اسے دیکھیں‌گے تو یوں منہ پھیر لیں‌گے جیسے وہ انسان نہیں، کوئی بندر تھی۔ بڑی خیر ہوئی کہ جن مردوں نے اسے دیکھا انہوں نے پہچانا نہیں۔ اسے مرد لوگ صورت سے پہچانتے ہی نہیں تھے۔

گھر کو واپسی کے وقت اس کو ذرا زیادہ سکون تھا اور اس دن برسوں بعد اسے شام کی ٹھنڈی ہوا اچھی لگی، اس نے نعمانچہ کا مختصر غروب آفتاب کا منظر دیکھا، نیا چاند دیکھا جو اچھا شگون تھا۔ اپنے لکڑی کے جنگلےوالے پھاٹک کے پاس اس نے ادھر ادھر دیکھا تو اسے آزادی کا ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اسے پورا حق تھا کہ اپنے آپ پر فخر کرتی کیونکہ اس کا ارادہ کمزور نہیں پڑا تھا۔

کوآپریٹو میں عورتوں نے اناخان سے کہا تھا کہ وہ ابھی جوان تھی کہ خزاں ابھی اس سے کوسوں دور تھی۔

اناخان ان کی باتیں سن‌کر کمسن لڑکیوں کی طرح جھینپ گئی تھی۔

وہ ماسکو جانےوالی تھی، وہ بڑا مشہور و معروف شہر جہاں عورتیں جانتی بھی نہ تھیں کہ پرنجے کیا ہوتا ہے، وہاں ایک بڑی سی شاندار مل تھی جس کا نام تریوخ‌گورنایا تھا۔ اس میں بہت سی روسی بہنیں کام کرتی تھیں جن کو ٹریننگ ملی تھی۔ اس مل میں عجیب‌وغریب کرگھے تھے، ویسے ہی کرگھے نعمانچہ بھی بھیجے جانےوالے تھے اور نعمانچہ کے بنکروں کو انہیں چلانا، ان پر کام کرنا سیکھنا تھا۔

اناخان کبھی اس بستی سے بھی باہر نہیں گئی تھی جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔ یہاں کی کوآپریٹو میں ایسی عورتیں بھی تھیں جنھیں یہ تک معلوم نہ تھا کہ پڑوس کے ضلعوں اور شہروں میں لوگ کیسی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ابھی بہت دن تو نہیں ہوئے تھے جب انہوں نے اپنے چولھوں، اپنی

دھلیزوں سے باہر دیکھنا شروع کیا تھا۔ دوردراز ماسکو میں ان پر کیا گزرے گی؟ وہاں ان کا رویہ کیا ہوگا؟

"کیا ہم اپنے ان ہی کالے، بھدے جھولا کپڑوں میں دارالحکومت جائیں گے؟" اناخان نے اداسی اور مایوسی سے سوچا۔ "لوگ وہاں کیا کہیں گے؟ ہم سے کیونکر ملیں گے؟"

خالہ رضوان، اناخان کے ساتھ ساتھ قدم ملاتی چل رہی تھی۔ اس نے سوالوں کی بوچھار کر دی:

"کیسی ہیں وہ مشینیں؟ انہیں کونی کیسے چلاتا ہوگا بھلا؟ اب میرے ہاتھ تو بڈھے، ہڑیلے ٹھہرے، ان ہاتھوں سے میں ان کو چلا پاؤں گی؟ ایں؟ کیا کہتی ہو بہن صدر؟"

اناخان کو خود ہی یقین نہ [illegible] تھا کہ کیا ہوگا مگر وہ اس کو یقین دلاتی رہتی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اناخان کے لئے ایک [illegible]ی بڑی فکر دونوں بچیوں کی تھی۔ ان کو کافی دنوں کے لیے تنہا چھوڑنا پڑے گا۔

ویسے بشارت پر تو بھروسہ کیا جا سکتا تھا کیونکہ اس میں بڑوں سے بھی ز[illegible]ہ عقل اور خوداعتمادی تھی۔ کسی کی مدد کے بغیر ہی اس نے معلوم کر لیا تھا کہ فورمینوں کے لئے ایک اسکول کھلے گا اور پہلے صوفیہ [illegible] جوراخان سے مفصل معلوم کر لیا تھا کہ [illegible]ن اسکول میں کیا سکھایا جائے گا۔ اور پھر جلدی ہی ماں نے دیکھا کہ وہ ایک درخواست لکھ رہی تھی۔ تورسنائی اس کے کندھے پر سے جھانک کر تعجب سے دیکھ رہی تھی کہ [illegible] کیا ہو رہا ہے۔ بشارت بڑی احتیاط سے ایک ایک لفظ [illegible] رہی تھی جیسے کشیدہ کاری کا ایک ایک ٹانکا بھ[illegible] ہو۔

"کومسومول کے حکم کے مطابق..."

"کیا تم فورمینوں کے اسکول میں داخلہ لینے [illegible] سوچ رہی ہو؟" اناخان نے پوچھا۔ "ویسے تمہارے خیال میں کیا تمہیں پہلے میری اجازت نہیں لینی چاہئے تھی؟"

"امی پیاری، میں نے خود ہی سوچا تھا کہ بھیجنے سے پہلے درخواست آپ کو دکھاؤں گی۔"

بشارت کا خیال تھا کہ اس نے تعمیراتی فورمین بننے کا

جو فیصلہ کیا تھا اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔

اناخان کو تورسنائی کی فکر زیادہ تھی۔ وہ بچی پھر کچھ سہمی، ڈری رہنے لگی تھی، اندھیرا ہونے کے بعد گھر سے باہر نہ جاتی، سر شام ہی سے بستر میں گھس جاتی مگر بےچین نیند سوتی اور بار بار ماں کو یا بڑی بہن کو جگاتی رہتی:

"امی، سو رہی ہیں آپ؟"

"بشارت، سن رہی ہو، ہمارے گھر کے باہر کوئی چل رہا ہے نا؟"

کبھی کبھار وہ گم سم بیٹھی سنتی رہتی اور پھر اچانک کوئی نہایت غیرمتوقع سوال کر بیٹھتی:

"کیا یہ بات سچ ہے کہ قدرت‌الله هزار شیخ کا مرید ہے؟"

"یہ تم دادی شکراللہ سے [illegible] سڑپٹر باتیں سنتی ہو" بشارت اسے ڈانٹنے لگی۔ "بالکل بڑھیوں کی طرح ہو گئی ہو! اور جاؤ ان فاتحہ‌خوانیوں میں پھر دیکھنا نتیجہ یہ ہوگا کہ کومسومول میں تم کو ہرگز نہیں لیا جائے گا۔"

"نہیں بشارت، اب تو میں کبھی نہیں جاؤں گی، کبھی ہرگز نہیں" تورسنائی ڈر کے کہتی۔

ادھر کچھ دنوں سے اس کا چہرہ بالکل اتر گیا تھا اور وہ دبلی بھی ہو گئی تھی۔

"بیٹی، تجھے کیا روگ لگ گیا ہے؟" اس کی ماں پوچھتی۔ "کہیں درد ہوتا ہے تیرے؟"

"نہیں امی۔"

"آخر تو کس سے ڈرتی رہتی ہے؟ ذرا ذرا سی آہٹ پر چونک کیوں پڑتی ہے؟"

"میں نہیں جانتی..."

"پھر بھی، مجھ سے کچھ تو کہہ۔"

تورسنائی خاموشی سے ماں سے لپٹ جاتی یا گھبراہٹ میں زور سے کہتی:

"نہیں امی، کہاں ڈرتی ہوں، ذرا بھی تو نہیں ڈرتی۔" لیکن اس کی آنکھوں سے اداسی جھلکتی۔

ایسے موقعوں پر اناخان کو طرح طرح کے خیال آتے — مل جو بننےوالی تھی، اس کے متعلق طرح طرح کی بھیانک افواھیں شہر میں پھیلائی جا رھی تھیں۔ مگر ان افواھوں کی تہہ میں کون تھا؟ کون پھیلا رھا تھا ان کو؟

ویسے لوگوں میں اس منصوبے کی عزت اور اس کے لئے شوق اور جوش بڑھتا جا رھا تھا۔

اناخان گھر ھی پر تھی جب لکڑی کے جنگلے کا پھاٹک چرمرایا اور خالنسا چچوان کے بغیر مگر سرخ پرنجے ڈالے اندر آئی۔ اس کے ساتھ کچھ عورتیں تھیں جنھیں اناخان نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پانچ عورتیں جن کے پرانے پرنجوں کے رنگ دھوپ سے اڑ گئے تھے، جن کے پاؤں کی مخسیاں* دھول سے بھری تھیں، ھاتھوں میں گٹھریاں تھیں۔

برآمدے میں اپنا پرنجے اتارتے ہوئے خالنسانے تیزی سے کہا: "اناخان پیاری، یہ میری سہیلیاں ھیں، ھم لوگ ایک ھی گاؤں کے رھنےوالے ھیں، یہ عورت بھی کھیت مزدور تھی اور اس نے بھی میری طرح دکھ اٹھائے ھیں، ھم لوگ جوراخان کو سلام کرنے آئے ھیں۔"

"جوراخان کو سلام؟"

"ھاں، ھم انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاھتے ھیں، عورتوں میں سے سب سے معمر نے اپنے سنولائے ہوئے، پسینے سے تر چھرے پر سے چچوان ھٹاتے ہوئے جواب دیا۔ "انھوں نے تو اپنے سب خوابوں کی تعبیر پائی ھے، سنا ھے انھوں نے خود لینن کو دیکھا ھے، اللہ لینن کی حیات دراز کرے۔ تو ھم لوگ جوراخان سے ذرا مل سکتے ھیں؟"

"جوراخان تم لوگوں سے مل کر بہت خوش ھوں گی، وہ تو خود ھی گاؤں گاؤں گھومتی ھیں۔ کیا تمھارے گاؤں میں کبھی نہیں گئیں؟"

"نہیں بیٹی، شاید خالنسا نے تمھیں بتایا ھوگا کہ ھمارا گاؤں تو بڑی ھی دوردراز جگہ واقع ھے اور پھاڑوں اور چٹانوں

---

* لانگ بوٹ کا جیسا پاتابہ جس کے اوپر ربڑ کا جوتا اور بعض اوقات، خاص کر موسم گرما میں "کاووش" پہنا جاتا ھے۔ اڈیٹر۔

میں اسے ڈھونڈنا بڑا ہی مشکل ہے سو ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ خود ہی چلے چلیں، اور ہم یہاں آکر بہت خوش ہیں۔ خالنسا نے بتایا کہ اس جج عورت نے کس طرح اس کی مدد کی، اگر ہم یہ سب اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتے، اپنے کانوں سے نہ سنتے تو ہمیں کبھی یقین نہ آتا۔ ہمارے گاؤں کی ایک معمولی سی عورت اور اس کی اتنی عزت کی گئی!"

"ہم نے سنا ہے کہ جج جوراخان نے تمہاری بھی بہت مدد کی؟"

"ہاں۔"

"سنا ہے کہ تم بھی ماسکو جا رہی ہو؟"

"ہاں، میں سفر کی تیاری کر رہی ہوں۔"

"کیا یہ بات صحیح ہے کہ کسی نے تمہیں قتل کرنے کی کوشش کی تھی؟ پھر تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

"نہیں، ڈر تو اسے ہے جس نے پیچھے سے مجھے چھرا بھونکا۔ اسے لگتا ہے مجھ سے ڈر! خیر چھپا رہے۔"

عورتیں حیران ہوکر سر ہلانے لگیں۔

اتنے میں حاجیہ تیز چلتی ہوئی صحن میں آئی اور راستے ہی میں پرنجے اتار دیا۔ بشارت اور تورسنائی دوڑکر اس کے گلے میں جھول گئیں۔ حاجیہ نے ان کو چوما اور گھبراکر پریشانی سے ادھر ادھر دیکھا۔

"بہن جوراخان یہاں ہیں؟"

...جوراخان اطمینان سے سڑک کے سایہ‌دار کنارے پر چل رہی تھی، نکڑ پر، جہاں چائےخانہ تھا وہاں بھی وہ سڑک پار کرکے دوسری طرف کو نہیں گئی حالانکہ پہلے وہ ایسا ہی کیا کرتی تھی۔ چھوٹے سے رومال سے اپنے کو جھلتی ہوئی وہ بڑے سکون سے چائےخانے کے سامنے سے نکلی، جہاں چائےخانےوالے نے زمین پر چھڑکاؤ کر رکھا تھا۔ اب وہ اس بات سے نہیں ڈرتی تھی کہ کوئی اسے برا بھلا کہےگا یا اس کی ہنسی اڑائےگا، اب تو چائےخانے سے بھی بس احترام سے بھری ہوئی سرگوشیاں ہی اس کے کانوں تک پہنچتی تھیں۔ "ہاں، ہاں، وہی ہیں! میں جو تم سے کہہ رہا ہوں کہ وہی ہیں..."

البتہ ایک ایسا بھی زمانہ تھا جب وہ نعمانچہ میں نکلتے ڈرتی تھی، کم از کم رات گئے تو کبھی بھی باہر رہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

کبھی نعمانچہ اندھیرے کا مارا، مفلسی کا ستایا اور محرومیوں کا شکار تھا۔ قدرت‌اللہ کے بنے ہوئے جال میں پھنسا ہوا تھا مگر آج اسی نعمانچہ کا، لوگوں کی نگاہوں کے سامنے نقشہ بدل رہا تھا۔ دکاندار کے مکان پر تختے جڑ دئے گئے تھے اور قدرت‌اللہ کے کارخانے میں خاک اڑ رہی تھی... پرانے شہر کو اب اس مرمت کی ہوئی تقریباً نئی عمارت سے پہچانا جاتا تھا جو عورتوں کا کوآپریٹو تھی، پھر کوآپریٹو کی دکان تھی جس پر چمکدار نیلی قلعی کی ہوئی تھی، دروازوں پر روغن اور عورتیں شہر بھر سے اس میں ہر وقت ریلا لگائے رہتی تھیں۔ نیا اسکول تھا جسے علاقے میں رہنےوالوں نے خود بنایا تھا۔ سوتی مل کا منصوبہ بن گیا تھا اور ایک بار مل کھڑی ہوئی کہ نعمانچہ شہر کے اہم علاقوں میں سے ایک ہو جائے گا۔

اناخان کے مکان کے پاس سڑک پر خاموشی اور سناٹا تھا، کسی بچے تک کی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی، جوراخان ایک لمحے کے لئے گیٹ کے پاس ٹھٹھک گئی اور غیرارادی طور پر اس جگہ کو دیکھا جہاں اناخان پر حملہ ہوا تھا، اس آدمی کا اب تک کوئی پتہ نہ لگ سکا تھا جس نے اناخان پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ یہ بات ٹھیک نہیں تھی اور اس کے معنی یہ تھے کہ نعمانچہ میں ابھی تک ایسی جگہیں موجود تھیں جہاں کوئی قاتل پناہ لے سکتا تھا۔

پھاٹک کے جنگلے کے نیچے جوراخان کی نگاہ کسی سفید سی چیز پر پڑی، ایسا لگتا تھا کسی سے کوئی رومال گر گیا ہے، وہ اسے اٹھانے کے لئے جھکی تو اس کا ھاتھ بیچ ہی میں رک گیا۔ وہ رومال نہیں بلکہ ایک کاغذ تھا، چار تہہ کیا ہوا۔ اس پر ایک پتھر رکھا تھا تاکہ اڑ نہ جائے۔ اس پر کوئی مٹی وغیرہ نہیں لگی تھی جس کے معنی یہ تھے کہ وہ ابھی کے ابھی یہاں رکھا گیا ہے۔

جوراخان نے اسے اٹھایا، کھولا، عربی رسم الخط میں دو سطریں پنسل سے لکھی تھیں، جوراخان نے خط پڑھا اور پھر چونک کر ادھر ادھر دیکھا، اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی کھڑا ہے۔ لیکن سڑک پر پہلے کی طرح سناٹا چھایا ہوا تھا اور کوئی نظر نہ آتا تھا۔ کسی مرد کے قدموں کے نشان جو نرم غبار کی موٹی تہہ پر کافی نمایاں تھے، پھاٹک کے پاس سے دور تک آڑے بنے ہوئے تھے۔

جوراخان پھاٹک کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی: اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی ساری قوت جواب دے رہی ہے اور دل بیٹھا جا رہا ہے۔ اس نے ایک بار پھر خط کو پڑھا اور ہمت کرکے سیدھی کھڑی ہو گئی۔ شاید دشمن کہیں سے اس کو دیکھ رہا ہو تو ٹھیک ہے، دیکھے، وہ جوراخان کو بزدل یا کمزور نہ پائے گا!

پھاٹک کھلا، اناخان اور حاجیہ مہمان کے استقبال کو باہر نکلیں اور دونوں پکار اٹھیں:

"کیوں بہن، کیا ہوا ہے آپ کو؟"

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟"

"حاجیہ، تم کیا دیر سے یہاں ہو؟" جوراخان نے پوچھا۔

"میں... میں تو ابھی آئی ہوں۔"

جوراخان نے اسے پرچہ دکھایا۔

"تم نے اسے پھاٹک کے پاس پڑا دیکھا تھا؟"

"ن... ن... نہیں تو۔"

"اور تم نے مکان کے آس پاس بھی کسی کو نہیں دیکھا؟"

"نہیں، کسی کو نہیں دیکھا۔"

"ذرا یاد کرو، سوچو۔"

"نہیں، مجھے بالکل یقین ہے، اچھی طرح یاد ہے، ایسا ہی سناٹا تھا..."

"اناخان، تم نے بھی کسی کو نہیں دیکھا؟"

"نہیں، میرا تو ایسا خیال نہیں ہے، پر یہ ہے کیا؟"

"ہمارے "دوستوں" کو معلوم رہتا ہے کہ ہم ٹھیک کس

وقت کہاں جائیں گے" جوراخان نے جواب دیا اور پرچہ اناخان کے ہاتھ میں دے دیا۔

وہ سب آنگن میں آ گئیں، اناخان نے پرچے کو دیکھ کر ایک دم سانس روک لی، حاجیہ کو دیا، اس نے بہ آواز بلند پڑھ کر سنایا:

"اب کے تو تمہاری جان بخشی جاتی ہے لیکن پھر اگر تم یہاں آئیں تو تمہاری لاش ہی نعمانچہ سے باہر جائے گی۔"

"یہ کس نے لکھا ہوگا؟" خالنسا دنگ ہو کر بولی۔

اناخان نے غصے میں اپنا منہ پھاٹک کی طرف کر لیا۔

"یہ وہی آدمی رہا ہوگا جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔"

گاؤں سے آئی ہوئی عورتوں میں گڑبڑ مچ گئی، رونے پیٹنے لگیں، ان میں سے ایک نے جلدی سے اپنا پرنجے پہنا، دوسری نے اپنا گریبان کھول کر سینے پر تھوکا۔

"اے پروردگار، ہم لوگوں پر رحم کر... لا الہ الا اللہ۔"

لیکن ان میں سب سے معمر عورت نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور اپنے ساتھ آنے والیوں پر خفا ہونے لگی:

"بند کرو یہ مرغیوں کی سی کڑکڑاہٹ۔ یہ رونا پیٹنا کیسا؟ کیا کوئی مر گیا ہے خدا نخواستہ؟ کسی کو بولنے بھی دو گی تم سب کی سب..."

پھر وہ جوراخان کی طرف مڑی:

"ان لوگوں کا کچھ خیال نہ کرو بیٹی، اس طرح کا خط لکھنے والا ہاتھ خدا کرے سوکھ جائے! بھلا تمہارے اتنے قیمتی سر اور ایسی بیش بہا جان پر ہاتھ ڈالنے کی مجال کس کی ہے؟ اگر ضرورت ہو تو تم کوئی پرانا پرنجے پہن کر نکلو۔ میرا پرنجے لے لو... بس منہ ڈھک کر نکل جانا، پھر پہچانے گا ہی کون؟"

جوراخان نرمی کے ساتھ مسکرائی اور ان عورتوں کو غور سے دیکھا جو اب چپ ہو گئی تھیں۔

"آپ سب کہاں سے آئی ہیں، خالہ؟"

"یہ لوگ کسی دوردراز گاؤں سے آئی ہیں" بشارت جلدی سے بولی۔ "یہ لوگ آپ کو ایک نظر دیکھنا چاہتی تھیں۔"

تورسنائی اپنی ماں سے لپٹی پرچے کو گھورے جا رہی تھی۔
جوراخان نے حاجیہ کو گھور کے دیکھا، وہ اس کا مطلب سمجھ گئی، جلدی سے پرچے کو تہہ کرکے جیب میں رکھ لیا، پھر جوراخان نے گاؤں سے آئی ہوئی ہر عورت سے ھاتھ ملایا اور پیار سے تورسنائی کا گال تھپتھپایا۔ وہ بچی ڈر کے مارے جیسے مفلوج ہوکر رہ گئی تھی۔ وہ حاجیہ کی جیب کی طرف کن‌انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بڑے دردناک انداز سے مسکرائی۔
جوراخان نے نرمی سے اسے اپنے پاس کھینچ لیا اور اپنے قریب بٹھاکر بازو میں بھینچ لیا، پھر اپنے پاس بیٹھی ہوئی عورتوں سے بولی:
"نہیں میری اچھی خالہ! نہیں میری پیاری بہنو! میں نے پرنجے اس لئے تھوڑی اتارا ھے کہ پھر اس کی آڑ میں چھپ جاؤں، یہ جو بدمعاش، بےایمان لوگ ھیں، ھماری زندگی کے دشمن، یہ یہی تو چاھتے ھیں! لیکن چچوان ھو یا یہ دھمکیاں، اب میرے اور سورج کی روشنی کے بیچ میں کوئی چیز نہیں آ سکتی۔ میں نے تو اپنا پرنجے پھونک دیا اور یہ پہلا موقع نہیں ھے کہ یہ لوگ مجھے ڈرانے دھمکانے کی کوشش کر رہے ھیں... میں کمیونسٹ ھوں اور کمیونسٹوں اور کومسومولوں کو" جوراخان نے تورسنائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "اندھیرے سے یا اس طرح کے پرچوں سے ڈرنا نہیں ھے یا پھنچی ہوئی عورت سے خوف نہیں کھانا ھے جو محض ایک احمق دھوکےباز ھے۔ ... کیوں بی‌بی، ٹھیک ھے نا؟"
"جی ھاں" تورسنائی نے اعتماد اور احسان‌مندی کی نگاھوں سے جوراخان کو دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔
اس کے زرد چہرے پر ھلکا سا گلابی رنگ آیا۔
جوراخان نے سر اٹھایا، اس کی آنکھیں خوابیدہ سی تھیں۔
"ھم میں سے کس کو یاد ھے کہ جب ھماری پیدائش ہوئی، ھماری آنکھیں کھلیں اور پہلی بار روشنی کو دیکھا۔ اس وقت ھمارے دلوں میں کیا تھا؟ کسی کو یاد نہیں ھوگا نا؟ لیکن نہ جانے کیوں مجھے یاد ھے وہ وقت اور وہ گھڑی اور میں اسے

زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی۔ میں نے لوگوں کو اکثر اس کے متعلق بتایا ہے اور بتاتے بتاتے کبھی نہیں تھکوں گی...“

دیہاتی عورتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، سب کی صورتوں پر دلچسپی کی جھلک آئی۔

”مگر آپ ایسی بات کو کیسے یاد رکھ سکتی ہیں؟“ سب سے معمر عورت پکار اٹھی۔

”میں آپ کو بتاتی ہوں کہ کیسے۔ یہ بات ۱۹۲۱ء میں ہوئی، آج سے ۴ سال پہلے... ہاں، ہاں! یہی تھا وہ سال، اس سے ایک گھنٹہ بھی پہلے نہیں جب کہ میں واقعی پیدا ہوئی اور میری آنکھیں کھلیں اور مجھے روشنی نظر آئی۔ ہم ستر عورتیں ماسکو گئی تھیں جن میں ازبیک، تاجک، ترکمان سبھی تھیں، ہم ایک کانفرنس میں گئے تھے اور وہاں ہمیں صلاح مشورہ لینا تھا، ایک نئے طریقے سے زندگی بسر کرنا سیکھنا تھا۔ ایک نیا طرز زندگی جس سے ہم سب خوش رہ سکیں۔ سفر بہت لمبا تھا اور جب ہم وہاں پہنچ گئے تو جو کچھ دیکھا اس سے ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ دیکھنے کو اتنا زیادہ تھا کہ سب کچھ تو خیر دیکھ ہی نہیں سکتے تھے، شروع میں تو سڑکوں پر نکلتے ڈر لگتا تھا کیونکہ عمارتیں، بلندترین میناروں سے بھی اونچی تھیں، ہر قدم پر ہچکچاہٹ ہوتی تھی کہ کہیں وہ ہمارے اوپر نہ اوندھ پڑیں...“

خالنسا نے حیرت کے مارے زبان سے ایک چٹخارہ بھرا۔ جوراخان نے بات جاری رکھی:

”ہم لوگوں کو ایک بڑے سے سفید ہال میں لے جایا گیا اور ہم سے کہا گیا کہ یہاں لینن خود آکر ہمارا استقبال کریں گے... میں پرنجے پہنے تھی لیکن ہال میں جانے سے پہلے میں نے یہ دیکھا تھا کہ سڑکوں پر عورتیں رک رک کر مجھے یوں دیکھتی تھیں جیسے میں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہوں۔ اور ان کی آنکھوں میں رحم اور ترس ہوتا تھا اور وہ اس طرح مجھ سے بات کرتی تھیں جیسے لوگ بچوں سے بات کرتے ہیں گویا پرنجے کی وجہ سے میں کوئی سنجیدہ بات، بڑوں کی بات سمجھ ہی نہیں سکوں گی۔ پہلے تو مجھے اس

رویے سے دکھ ہوا، پھر شرمندگی ہوئی۔ میں اس نتیجے پر پہنچی کہ میں نے خود اپنے آپ کو تکلیف پہنچائی ہے، ذلیل کیا ہے۔ میری حالت ایسی تھی جیسے منھ میں چسنی لگائے گھوم رہی ہوں... سفید ہال میں کھڑے کھڑے میں نے سوچا: "لینن میرے پاس آئیں گے، اپنا ہاتھ بڑھائیں گے... اور میں؟ میں کیا، نقاب کے اندر سے ان سے بات کروں گی؟ وہ بھی مجھے ترس بھری نظر سے دیکھیں گے... میرے پورے وجود نے بغاوت کی! میرا خون کھولنے لگا۔ لینن کے آنے تک میں نے برداشت کیا جب وہ اندر آئے اور ہم لوگوں سے ہاتھ ملانے لگے تو میں ضبط نہ کر سکی۔ میں نے اپنے سر پر سے نقاب نوچ دی اور وہ منحوس شے لینن کے قدموں میں جا گری۔ میں ایسا نہ کرتی تو میرے اندر کی آگ وہیں مجھے جھلس دیتی اور میں زندگی بھر ضمیر کی ملامت کے ڈنک سہتی رہتی اور لینن... جانتی ہو، انہوں نے کیا کیا؟ لینن جھکے اور انہوں نے میری مدد کرنے کے لئے پرنجے اٹھانا چاہا کیونکہ وہ سمجھے کہ پرنجے اتفاق سے گر گیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ میں نے ایسا کیوں کیا یا یہ کہ میری ہمت کیسے پڑی بہرحال میں نے پرنجے کو پاؤں سے کچل دیا... جیسے سانپ کا سر کچلا جاتا ہے! لینن نے میرے اس اقدام کو جس طرح سمجھا اس طرح میرے کہے ہوئے اچھے سے اچھے الفاظ بھی نہ سمجھا پاتے اور انہوں نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا:

"آپ کیسی ہیں؟" انہوں نے کہا۔ "مجھے اپنا نام بتائیے۔"

اب یاد نہیں میں نے کیا جواب دیا۔ انہوں نے کہا:

"میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں، کامریڈ جوراخان!"

میرا خیال ہے میں نے کہا: "شکریہ۔"

"شکریہ تو آپ کا کامریڈ" انہوں نے کہا۔ "بالشویک پارٹی کی طرف سے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں"۔ ہاں، یہ بات انہوں نے مجھ سے کہی!

اور پھر انہوں نے مزید کہا:

"ازبیکستان کی عورتوں سے میرا سلام کہئے، ہر اس انسان سے سلام کہئے جو انسانی اور سماجی وقار کے لئے جدوجہد کر رہا ہے، سوویت حکومت اس جدوجہد میں آپ کا پورا ساتھ دے گی۔"

"ان کے الفاظ کے معنی بعد میں کہیں جاکر میری سمجھ میں آئے، میں ان کو ٹھیک سے جواب بھی نہ دے پائی، بس اتنا ہی کہہ سکی: "شکریہ، آپ کا بہت شکریہ..." اور سب عورتوں کا بھی میرا ہی جیسا حال تھا.. ہم نے سنا تھا، پڑھا تھا کہ لینن ایک زبردست مجاھد ھیں، زبردست پہلوان مگر وہ پہلوان تو بالکل نہیں لگتے تھے، وہ تو ایک معمولی سے سیدھے سادے انسان لگتے تھے لیکن میں کبھی نہ بھول سکوں گی کہ انہوں نے میرے ھاتھ سے اپنا ھاتھ کس طرح ملایا تھا.. یہی میرا ھاتھ۔ یہی..."

جوراخان نے اپنا دھنا ھاتھ اٹھایا اور پھر اسے اپنے سینے پر رکھا۔ سب عورتیں سانس روک کر ھاتھ کو تکنے لگیں جیسے اس میں انہیں کوئی غیرمعمولی بات نظر آنے کی توقع ہو۔

"خالہ، آپ ہی بتائیے" جوراخان نے معمر عورت کی طرف مڑتے ہوئے کہا، "اب اس کے بعد میں کس طرح پرنجے میں چھپوں گی؟"

"بیٹی، میں تو ایک ان‌پڑھ دیہاتی عورت ہوں، اگر میری بات تمھارے دل کو بری لگی تو مجھے معاف کر دو، میں تو سٹھیا گئی ہوں، حمدو ثنا خدا کی کہ جس نے تم جیسی عورتیں پیدا کیں۔"

"لیکن خدا نے ایسے آدمی بھی تو پیدا کئے ھیں جس نے کہ یہ پرچہ لکھا ھے" جوراخان نے کہا۔

"گاؤں کی سب عورتیں بیک وقت بات کرنے لگیں۔

"اس آدمی کا ھاتھ سوکھ جائے.. جہنم کا کندہ بنے وہ موا..."

اندھیرا بڑھنے لگا تو سب عورتیں جوراخان کے ساتھ نکلیں اور اسے پہنچانے گئیں۔ پھاٹک پر ذرا دیر لگی۔

"اب ہمیں کاہے کا انتظار ہے چلو نا، ویسے ہی دیر ہو چکی ہے" حاجیہ نے کہا۔

"ہم لوگوں کے ساتھ آ رہی ہو؟" جوارخان نے پوچھا۔

"ہاں، ہاں، شہری کمیٹی تک تو ساتھ چلوں گی..."

"تو پھر جلدی آؤ۔"

"میں تو بالکل تیار ہوں!" حاجیہ نے جواب دیا۔

وہ بغیر پرنجے کے تھی، جوراخان نے مڑکر دیکھا تو اس کا پرنجے گیند کی طرح گڑمڑ کیا ہوا، باھری دھلیز کی سیڑھیوں کے نیچے پڑا تھا۔

حاجیہ آھستہ سے ھنسی، اس کے چھرے سے بےحد خوشی ٹپک رھی تھی۔

جوراخان نے اسے گلے لگا لیا۔ اناخان اور بشارت بھی دوڑکر اس کے پاس پہنچیں اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کے رخسار پر پیار کیا۔ تورسنائی بھی اس کے گلے میں جھول گئی۔

"میں اب یہ واھیات چیز کبھی نہ پھنوں گی" تورسنائی نے کہا۔ وہ پھدکتی ہوئی برآمدے پر چڑھی اور حاجیہ کے پرنجے کا ایک حصہ جو سیڑھیوں تلے سے نکلا ہوا تھا، اس کے پاؤں کے نیچے کچل گیا۔

حاجیہ گھر واپس آئی تو تقریباً آدھی رات گزر چکی تھی۔ ایرگاش اس کے گھر کے پاس ھی شہتوت کے ایک پیڑ کے نیچے اس کا انتظار کر رھا تھا۔

"ہم دونوں نے کتنے زیادہ دنوں سے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا" اس نے کہنا شروع کیا مگر پھر چپ ہو گیا اور تعجب سے حاجیہ کو سر سے پیر تک تکنے لگا۔

"تم کچھ کہتے کیوں نہیں؟" حاجیہ نے جسے اس کی خاموشی سے چوٹ سی لگی تھی اور جو اپنے دفاع پر اتر آئی تھی، چیلنج کے انداز میں پوچھا۔

"کیا دن میں... دن میں بھی تم اس طرح باہر نکلتی ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"آپ کو یقین نہیں آتا؟ یا شاید آپ کو میرا ایسا کرنا پسند نہیں آتا۔ ایں؟" اس نے تیزی سے جواب دیا۔

"اچھا، تو تم یہ ہو" ایرگاش اس کا معترف ہوکر دھیرے سے بولا۔ "تو تم ایسی ہو حاجیہ!"

حاجیہ نے جیسے ہار مان لی، نظریں زمین پر گاڑ دیں۔

ایرگاش نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"میں تمہارے متعلق زیادہ نہیں جانتا تھا، اوروں کے متعلق بھی نہیں، مجھے تو گمان بھی نہ تھا کہ ہمارے نعمانچہ کی عورتیں اتنی دلیر ہیں۔ ویسے اگر تمہارے دماغ میں ہوا نہ بھرے تو میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ تم لوگوں کی دکان نے تو کمال کر دیا ہے... یقین مانو، میں تو تمہارا بڑا معترف ہو گیا ہوں۔ سارا شہر تمہارا نام جان گیا ہے۔"

"یہ سب جوراخان آپا کی بدولت ہوا" حاجیہ نے بہت دھیمے سے کہا۔

ایرگاش نے سر جھکاکر اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

"لیکن یہ نہ سمجھنا کہ میں اتنا اندھا بہرا ہوں، میں اس طرح تمہاری سرگرمیوں کا پتہ رکھتا ہوں جیسے شکاری کتا ہرن کا۔ تم جس طرح کام کر رہی ہو وہ مجھے پسند ہے۔ میں تمہارا معترف ہوں، یقین مانو۔"

"یہ سب جوراخان کی بدولت ہوا" حاجیہ نے پھر کہا۔

"تم ماسکو جاؤگی، وہاں سے پڑھ لکھکر ہنر سیکھکر واپس آؤگی، پھر تو تم میری طرف دیکھوگی بھی نہیں، میری قربت سے ایسی بھاگوگی جیسے پرندہ۔ ایں؟"

حاجیہ چپ رہی، ایرگاش کی آنکھوں میں چمک آئی۔

"لیکن میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں بھی تم سے پیچھے نہیں رہوں‌گا، میں بہت جلد تم کو جا لوں‌گا چاہے اس کے لئے مجھے آسمان تک پرواز کرنا پڑے۔"

حاجیہ نے ایک‌دم سر اٹھایا اور ایرگاش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بےباکی اور مسرت کے ساتھ بولی:

"تو آپ مجھے جا لیں گے؟ ایں؟ کیا واقعی آپ کا یہی مطلب ہے؟ تو پھر آئیے، دیکھیں گے کون کس سے آگے نکلتا ہے! ہیں؟ ہو جائے پھر مقابلہ؟"

"اچھا تو تم ایسی ہو!" اس نے حاجیہ کے گرم ہاتھ کو اپنی ہتھیلیوں میں بڑے پیار سے دباتے ہوئے دوہرایا۔

سترھواں باب

نعمانچہ میں قبرستان سے ملا ہوا ایک بہت بڑا سا بےکار قطعہ‌زمین پڑا ہوا تھا۔ اگر طائرانہ نظر سے اس کو دیکھا جاتا تو اس کی صورت کچھ ایسی لگتی کہ ایک مٹی سے اٹا، سوکھا، پھٹا ہوا لانگ بوٹ پڑا ہے۔

اس پر قسم قسم کی جنگلی گھاس اور جھاڑیاں اور خس وخاشاک کا ڈیرہ تھا، اسی لئے موسم بہار شروع ہوتے ہی وہ سبزے سے ڈھک جاتا اور گرمیوں کا نصف موسم گزرتے گزرتے اس پر زردی چھا جاتی، پاؤں میں کانٹے چبھوئے بغیر اس پر ایک قدم نہ رکھا جاتا تھا۔ اس کے طول و عرض میں کہیں کہیں، سفید سفید، نمکین مٹی کے دھبے، روڑوں کے ڈھیر، نیچے نیچے، چھوٹے موٹے ٹیلے، اور گڑھے تھے جن سب کی وجہ سے وہ بےکار پڑی ہوئی زمین کسی کوڑھی کا جسم لگتی تھی۔ اس کا جو سرا نعمانچہ کی طرف تھا اس پر گوبر، نیلی مائل بنولے کے چھلکے کی راکھ اور کوڑے کرکٹ کا ڈھیر تھا۔

کسی کو یاد نہ تھا کہ شہر والے کب سے یہاں اپنا کوڑا پھینک رہے ہیں۔

کوڑے کے ان ٹیلوں پر آوارہ کتے گشت کیا کرتے تھے اور مکھیوں کے دل کے دل ہوا میں بھنبھناتے رہتے تھے جیسے آسمان سے لٹکا دئے گئے ہوں۔

یہاں سے پرانا نعمانچہ ایسا لگتا تھا جیسے شہد کے چھتے اکٹھا ہو گئے ہوں۔ قریب قریب بنے ہوئے خاک دھول سے اٹے آنگنوں کے جال سے بچھے تھے، جھکی ہوئی شکستہ کچی دیواریں، نیچے نیچے مٹی کے جھونپڑے اور لکڑی کے بالاخانے! سب سے زیادہ اونچی جگہ پر مسجد تھی جس کا گنبد نیلے رنگ کا تھا اور پھر قدرت اللہ کی حویلی تھی جس کے چاروں طرف سرسبز باغ — اور یہی دونوں چیزیں پورے ماحول اور شہر پر چھائی ہوئی لگتی تھیں۔

"لانگ بوٹ" کی ایڑی ایک ڈھلوان ٹیلا تھا جو "شیر کی پہاڑی" کہلاتا تھا مگر اب مدتوں سے اس نے بیٹھے ہوئے شیر کی طرح نظر آنا چھوڑ دیا تھا، ہوا اور بارش نے اسے سل کی طرح چکنا بنا دیا تھا، لوگوں نے بھی یہاں وہاں اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا، ایک نیچی سی کچی دیوار اس کی چوٹی کے برابر برابر کچھ دور تک چلی گئی تھی۔ کسی زمانے میں لوگوں نے یہاں اینٹیں پکانے کا بھٹا بنانا شروع کیا تھا۔

"لانگ بوٹ کی نوک" کے پاس اس بےکار زمین پر قبرستان کی حد شروع ہوتی تھی۔ اسی قبرستان میں ایسی قبروں کے درمیان جن کی کوئی دیکھ بھال نہیں ہوتی تھی، ہزار شیخ کا بلند مقبرہ اپنے طاقوں اور گنبد سمیت کھڑا تھا۔ پتھر کے بنے ہوئے اس مقبرے کے کونوں پر لمبی لمبی بلیاں گڑی ہوئی تھیں۔ ان پر چیتھڑے لٹک رہے تھے جن کا رنگ دھوپ میں اڑ گیا تھا اور جنہیں بارش نے گلا سڑا دیا تھا۔ ان بلیوں پر گھوڑے کے بالوں کے گچھے بھی بندھے تھے جو چھوٹی چھوٹی جھاڑوں جیسے لگتے تھے۔

ایرگاش، یفیم دانیلووچ اور دوبروخوتوف صبح تڑکے

ہی شیر کی پہاڑی پر پہنچ گیا تھا۔ لوگ اسٹول لئے، تپائیاں اٹھائے ادھر ادھر کھڑے تھے۔

ایرگاش سگریٹ پہ سگریٹ پئے جا رہا تھا، دوبروخوتوف اپنی پرانی مڑی چڑی ہیٹ کے نیچے سے آنکھیں بچکا بچکاکے دیکھ رہا تھا اور یفیم دانیلووچ مونچھوں ہی مونچھوں میں مسکرا رہا تھا کیونکہ اسے نظر آ رہا تھا کہ ایرگاش اور انجینیر بار بار ایک دوسرے کو کن‌انکھیوں سے دیکھتے تھے۔

"کہئے، سرگئی لووچ؟ کیا رائے ہے آپ کی؟ جگہ پسند آئی؟" یفیم دانیلووچ نے اپنی ٹوپی کی چمکدار نوک اپنی ابروؤں پر جھکاتے ہوئے پوچھا۔

"اسے دیکھکر دل کچھ بیٹھنے سا لگا" دوبروخوتوف نے جواب دیا۔

"ہاں، یہ ہے کہ اللہ میاں نے دنیا کے خاتمے کے بعد یہیں جہنم بنانے کا منصوبہ بنایا تھا" ایرگاش نے کہا۔

"بھئی، مل تو اس سے بہتر کسی جگہ پر بننے کا حق رکھتی ہے۔ میں تو یہی سوچتا ہوں" دوبروخوتوف نے اپنی جھنجھلاہٹ چھپاتے ہوئے کہا۔

یفیم دانیلووچ نے سر ہلایا۔

"ہمارا تو کام ہی یہی ہے کہ خراب زمین کو استعمال کر لیں، اچھی زمین پر تو ہم کپاس اگائیں گے۔"

"کپاس..." دوبروخوتوف نے دل میں سوچا۔ "اچھا تو یہاں مصر سے مقابلہ کرنے کی تیاری ہو رہی ہے!"

"اب خفگی بند کرو" یفیم دانیلووچ نے کہا۔ "سروں کو اٹھاؤ، سینے تانو۔ ہم یہ زمین صاف کریں گے، تم نے اس جگہ کو گندگی کے معاملے میں اگیاز* کے اصطبلوں سے تشبیہہ دی ہے۔ ہم اسے صاف کریں گے اور عام لوگ ہماری مدد کریں گے۔ سارا شہر اس کام کے لئے نکل پڑے گا۔"

---

* اگیاز کے اصطبل اتنے گندے تھے کہ ہرقل نے دریائے الفیوس کو ان پر بہاکر انہیں صاف کیا تھا۔ اڈیٹر۔

"اتنے سال سے تو یہ جگہ گھور تھی اور اب آپ چند دنوں میں اس کو صاف کرنا چاہتے ہیں۔"

"اور تم لوگوں نے جو وہ اصطبلوں والا قصہ سنایا تھا؟... تو وہ تو قدیم لوگ تھے۔ ہم پھر کیا ان سے بھی گئے گزرے ہو گئے؟ ارے تم دیکھنا، ہم عوام کی قوتوں کے باڑھ پر آئے دریا کے گیٹ کھول دیں گے!"

دوبروخوتوف ہنسا ــ بے اعتباری، بے یقینی کی ہنسی۔

دس انچ لمبی ایک چھپکلی جھاڑیوں میں سے زن سے نکلی، ایک پتھر کے سائے میں بےحس و حرکت ٹھہر گئی۔ ان لوگوں کو ساکت، پتھرائی ہوئی سی آنکھوں سے گھورنے لگی۔

اوس سے بھیگی ہوئی جھاڑیوں سے ایسی بھاپ اٹھ رہی تھی کہ دم گھٹا جاتا تھا۔

دوبروخوتوف جھک کر اپنے پتلون میں چپکے گوکھرو نکالنے لگا، ایرگاش آنکھ کے اشارے سے یفیم دانیلووچ کو ایک طرف لے گیا اور دھیمے سے کہا:

"دیکھا آپ نے۔ یہ انجینیر اپنی اوقات دکھا رہا ہے..."

"ارے وہ بےچارہ صرف نروس ہو رہا ہے لیکن اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ وہ سنجیدگی سے کام کرنے کی سوچ رہا ہے۔"

"یہ تو تھا کبھی ماہر، اب تو نہیں ہے۔ مہنگا پڑے گا ہم لوگوں کو..."

"مہنگا؟" یفیم دانیلووچ نے جیب میں سے ایک نوٹ‌بک نکالی، اسے ایک جگہ کھولا اور ایرگاش کی طرف بڑھایا:

"پڑھو یہاں کیا لکھا ہے۔"

ایرگاش نے پڑھا:

"کمیونسٹوں کے بورژوا ماہرین سے علم حاصل کرنے سے نہ ڈرو... علم حاصل کرنے کے مصارف ادا کرنے میں کفایت کو دخل نہ دو۔ اگر علم کو صحیح مقصد کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے تو حصول علم کے سلسلے میں مہنگے دام دینے سے ہرگز نہ کترانا چاہئے۔"

"ارے یہ سب عقل کی باتیں تو دوبروخوتوف پہلے ہی

رعب جمانے کے لئے مجھ سے کہہ چکا ہے" ایرگاش کندھے اچکا کے غرایا۔
"تم جنہیں یہ عقل کی باتیں کہہ رہے ہو وہ لینن کے لکھے ہوئے الفاظ ہیں۔"
ایرگاش نے دانت تلے زبان دبا لی ایک بار پھر نوٹ‌بک میں جھانکا اور کچھ سوچنے لگا۔
"اگر دشمن عقلمند ہو تو تمہیں جاننا چاہئے کہ اس سے بھی کیسے کچھ سیکھو" یفیم دانیلووچ نے کہا۔
دوبروخوتوف نے دیکھا کہ پروجیکٹ افسر اور کمیسار آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہے ہیں تو وہ سمجھداری کے ساتھ ایک طرف ٹہل گیا۔ وہ شیر کی پہاڑی کے قریب پہنچ چکا تھا تو دونوں اس سے آن ملے۔
یہاں سے پوری بے‌کار زمین، اس کے اندر گھسا قبروں سے بھرا ہوا قبرستان، پن‌چکی کو جانےوالی سڑک اور چھوٹا سا خوبانی کا باغ جو اس کے پیچھے تھا، سب کچھ بہت صاف نظر آتا تھا۔
"تمہارا کیا خیال ہے انجینیر، ہم لوگوں کو اس شیر کی پہاڑی سے کام شروع کرنا چاہئے نا؟" یفیم دانیلووچ نے دھیرے سے کہا۔ "ہم اسے بارود سے اڑا دیں گے اور پھر روڑے کنکر صاف کرنے کے لئے کومسومولوں کے دو دستے دونوں طرف سے لگ جائیں گے؟"
"کیا، کیا کہا آپ نے؟" ایرگاش نے حیرت سے پوچھا۔
"یہاں کیا مسطح زمین کافی نہیں ہے، یفیم دانیلووچ؟ یہ سب آپ کیا کیا منصوبے بنا رہے ہیں؟ پہاڑی کو اڑا دیں گے واقعی، کیا سوجھی!"
"لیکن ہے کہاں وہ تمہاری مسطح زمین؟"
"کیا مطلب؟ یہ رہی۔ یہیں ہے، بس ذرا آنکھیں کھولئے۔"
"لیکن وہ تو قبرستان ہے، وہ تو مردوں کی بستی، ان کی آرام‌گاہ ہے۔"
"اس سے کیا ہوتا ہے، کیا ہم مردوں سے ڈریں؟ مجھے تو جب سے یاد ہے یہ تھا ہی قبرستان..."

"یہی تو اور خرابی ہے۔ تم نے اس بات کو گہرائی سے سوچا ہی نہیں۔"

ایرگاش نے اپنے سخت، تراشیدہ لبوں کو ایک طنزیہ مسکراہٹ میں سکوڑا۔

"یفیم دانیلووچ، اگر ہم اسلام کی بات کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ میں آپ کی بہ‌نسبت زیادہ مسلمان ہوں۔ مگر میرے سامنے ایک میدان موجود ہے تو میں اس کمبخت دیوار سے کسی پاگل کی طرح کیوں سر ٹکراؤں؟" اس نے شیر کی پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم ایک اچھے مسلمان ہو مگر کیا تمہیں یقین ہے کہ تم ایک کمیونسٹ بھی ہو؟" یفیم دانیلووچ نے ایک مہربان مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "یہ دیوار تو اس صدیوں پرانی دیوار کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے جسے تم نہیں دیکھ سکتے۔"

"جو کچھ میں دیکھ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ سب لوگ بےحد ڈرے ہوئے ہیں" ایرگاش بپھر پڑا۔ "آپ نعمانچہ کے ان چار پانچ پگڑی بند بوڑھوں سے ڈرتے ہیں جن کے بکرے کی سی داڑھیاں ہیں۔ آخر آپ کا انجام کیا ہوگا، وہ پہنچی ہوئی عورت، وہی تیشیک‌قاپ‌قاق‌والی آپ کو زنجیر میں باندھ‌کے گھسیٹے گی، یا آخر کیا ہوگا۔ دیکھئے نا اس کنارے تو ایک بھی تازی قبر نہیں ہے، بس یہ کھنڈر، پتھر پڑے ہیں جنہیں کوئی پوچھتا نہیں اور جہاں تک بدروحوں کے اس ڈیرے کا سوال ہے" اس نے ہزارشیخ کے مقبرے کی طرف مکے سے اشارہ کیا۔ "یہ چھپکلیوں کا آشیانہ تو ہزار سال سے بھی زیادہ پرانا ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ اس کو منہدم کر دیا جائے۔ لوگ اب تک اس کھوکھلے پتھر پر سجدہ کر کرکے کافی اپنا سر پھوڑ چکے، کافی اپنے آپ کو بےوقوف بنا چکے۔ کیا ہم بھی اس کے آگے جھکیں؟ ان درجن بھر احمقوں نے جو توہم‌پرستی میں گردن تک ڈوبے ہوئے ہیں اور متصب مفسدوں نے ایک لفظ بھی کہنے کی جرأت کی، تو قسم ہے میں خود ان کی گردنیں اڑا دوں گا!"

یفیم نے ایک ٹھنڈی، گہری سانس بھری، چاروں طرف دیکھا۔

"ایرگاش، لوگ تم جیسے گرم‌مزاج شخص کی رہبری قبول نہیں کریں گے... نہیں قبول کریں گے۔ وہ کام کرنا چاہتے ہیں لیکن تمہارا ابھی لڑنے سے دل نہیں بھرا ہے۔ اگر تم سے کہا جائے کہ لوگوں کی ٹوپیاں اتار لو، تو تم ان کی گردنیں اتارنا بھی شروع کر دوگے اور پھر آخر میں اکیلے پھرا کروگے، یوسف بےکارواں ہوکر... نہیں، لوگ تمہیں ہرگز اپنا رہنما نہیں بنائیں گے۔"

دوبروخوتوف بڑی دلچسپی سے یہ مباحثہ سن رہا تھا۔ شروع میں تو اس کا بھی یہی خیال ہوا تھا کہ سلطانوف ٹھیک کہہ رہا ہے، اگرچہ وہ ذرا جلدباز آدمی لگتا تھا لیکن پھر اس کا ذہن بھی یفیم دانیلووچ کے ساتھ ہو گیا۔ یہی غنیمت ہوا کہ جب تک اس نے بات کو ٹھیک سے سمجھکر اپنی رائے نہیں قائم کی تب تک اس نے بحث میں حصہ نہیں لیا۔

یہ پروجیکٹ کوئی معمولی کام نہ تھا، انجینیر کے لئے ضروری تھا کہ اس سلسلے میں ایک مخصوص رویہ اختیار کرے۔ اور دوبروخوتوف اچھی طرح سوچ سمجھکر ہی کوئی رویہ طے کرنا چاہتا تھا تاکہ قدم بڑھاتے ہی دلدل میں نہ پھنس جائے۔

ایرگاش نے دیکھا کہ انجینیر اسے غور سے اور بھانپ لینےوالی نظروں سے دیکھ رہا ہے اس نے تیوریوں پر بل ڈال کر تمباکو نکالنے کو جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"کیا میں پھر چیخ رہا تھا؟" اس نے یوں پوچھا جیسے اسے خود اپنے آپ پر حیرت ہو۔

"ہاں، تم چیخ رہے تھے" یفیم دانیلووچ نے اطمینان سے کہا۔

"مجھے بہت غصہ آ رہا ہے، جوراخان کے واسطے جو پرچہ پھینکا گیا ہے، اس پر میں دشمن کو کبھی معاف نہیں کر سکتا، میرا دل مجھے ہرگز اس مصلحت پر آمادہ نہ ہونے دےگا، کبھی نہیں۔"

"ہاں، یہ ہوئی کوئی مردوں کی طرح کہی ہوئی بات! میرا بھی خیال ہے کہ ہمیں جلد از جلد اس کا جواب دینا چاہئے" یفیم دانیلووچ نے ایرگاش سے تمباکو لےکر سگریٹ بناتے ہوئے کہا۔ "کیوں، انجینیر، آپ کا کیا خیال ہے؟"

دوبروخوتوف اس اچانک سوال کے لئے تیار نہ تھا لیکن اس نے بغیر ہچکچائے یوں کہا جیسے اس کی بات زبان سے نہیں، دل سے نکلی ہو:

"ہمیں اس پروجیکٹ کو جتنی جلد ممکن ہو سکے، شروع کر دینا چاہئے۔ ہو سکے تو منصوبے میں مقررکردہ وقت سے ایک ہی ہفتہ پہلے، ورنہ کم از کم ایک دن پہلے تو ضرور۔ اس حرکت کا سب سے زیادہ منھ توڑ جواب ہم لوگ یہی دے سکتے ہیں۔ ہیں نا؟"

یفیم دانیلووچ نے معنیٰ‌خیز نگاہوں سے ایرگاش کی طرف دیکھا اور ایرگاش جھنجھلاکے ایک جھٹکے کے ساتھ انجینیر کی طرف مڑا۔

"کتنی جلدی؟ ذرا ٹھیک ٹھیک بتائیے۔"

دوبروخوتوف نے آنکھیں بھینچ لیں۔

"اچھا... اگر آپ زمین کی صفائی ذرا جلد کروا دیں تو پھر میں گھٹنے توڑکے بیٹھتا ہوں اور پورے پندرہ دن کے اندر اندر آپ کو اخراجات کا کل حساب بناکر دوں گا۔"

ایرگاش نے خوشی سے ایک کلکاری ماری لیکن ساتھ ہی دھمکی کے انداز میں بولا:

"آپ سمجھے رہئے، ہم آپ کی بات لکھ لیں گے، انجینیر صاحب..."

تینوں آدمی ساتھ قدم بڑھاتے شیر کی پہاڑی سے اترنے لگے۔

بیٹھک کی کھلی ہوئی کھڑکی پر سر ٹیکے، قدرت‌الله بائے غم اور غصے کے مارے کھولتا جاتا تھا اور سنتا جاتا تھا۔ ایک اور دھماکے کی آواز فضا میں گونجی اور کھڑکیوں کے شیشے کھڑبڑا گئے... زنان‌خانے سے خاجار بی‌بی کے رو رو کر دعائیں مانگنے کی آواز آ رہی تھی۔

"یہ لوگ رک نہیں رہے ہیں" قدرت اللہ بڑبڑایا۔ "مجھے تو گمان بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی یہ سب کچھ ہو جائے گا! ان کے پاس اتنا سب پیسہ کہاں سے آ گیا؟"

"یہ لوگ آپ کے پیر تلے کی زمین اڑائے دے رہے ہیں، بائے!" کسی آواز نے تمسخر کے انداز میں کمرے کے دوسرے سرے سے کہا۔ "ڈوبنے سے پہلے دعا تو مانگ لیجئے۔"

قدرت اللہ کھڑکی کے پاس سے الگ ہٹا اور جاکر ریشمی گدوں، تکیوں پر ڈھے پڑا۔ چائے کا تاجر، اپنے کوئلے جیسے سیاہ چہرے سمیت آنکھیں سکوڑے، اس کو اپنی نگاہوں سے چھلنی کئے دے رہا تھا۔

"آپ بےوقوف نہ بنئے، اس بار بچپنا نہ کرنا، وہی کرنا جو ہم لوگوں نے منصوبہ بنایا ہے، جب تک آپ کے کندھوں پر سر سلامت ہے، وہی کیجئے۔ وقت بالکل نہ ضائع کیجئے!"

"ہاں، کہنا آسان ہے" قدرت اللہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "آپ یہاں ایک اجنبی ہیں۔ آپ کا سارا روپیہ بس چائے کے ایک بنڈل میں بندھا ہے، دنیا بھر میں آپ زندگی بھر گھومتے رہے، آپ کو ان سب باتوں سے کیا لینا۔"

"پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ!" چائے کا تاجر دانت دبا کر بولا۔

هڑیلا مقسوم سینے پر ہاتھ باندھے، دروازے کے پاس بیٹھا تھا، اٹھکر پاس آ بیٹھا اور باتوں میں شریک ہو گیا۔ اس کی آواز اور نگاہ دونوں میں نہایت ہی غلامانہ قسم کی چاپلوسی اور غلامانہ بےتکلفی جھلک رہی تھی۔

"کیوں مالک، آپ کیا مولوی نعیم خواجہ کی طرح نہیں کر سکتے؟ وہ اللہ کا بندہ ہی کیا جو اپنی جان کی حفاظت نہ کرے۔ لوگوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مولوی نے اپنی بڑی سی پگڑی اتاری۔ ویسے انہیں اس بات کا صدمہ بہت ہوا۔ مگر بہرحال وہ چائے کی ایک پیٹی میں گھس گئے..."

"کیا کہا تم نے؟ چائے کی پیٹی کیسی؟"

"جو جھوٹ بولے وہ سات فرقوں میں کہیں مسلمان نہ

کہلائے۔ ...اب وہ ایک مقدس متام پر ہیں اور پھر سے مولوی نعیم خواجہ کہلاتے ہیں اور وہاں تو پاکبازوں، پرہیزگاروں کی ایڑی میں کانٹا تک نہیں چبھ سکتا۔"

قدرت‌اللہ نے اس سے پہلے بھی سنا تھا کہ عزت‌مآب مولوی ایک بکس میں بیٹھکر یا جیسا کہ کچھ لوگ کہتے تھے، بچھڑے کی کھال میں چھپ‌کر سرحد پار کر چکے ہیں۔

"نہیں!" وہ ایسے چیخا جیسے کسی میں مایوسی کی شدت سے ارادے کی قوت پیدا ہو جائے۔ "قدرت‌اللہ خواجہ مولوی کی طرح یا اس کے پیچھے بھاگے‌گا نہیں۔ میں نے ابھی یہاں اپنا بدلہ نہیں لیا ہے اور مجھے پرواہ نہیں چاہے ایسا کرنے میں میری ساری دولت صرف ہو جائے۔ میں سونے کا ڈلہ بن‌کر ان سوویتوں کے گلے میں ایسے پھنسوں‌گا جیسے بھیڑئے کے حلق میں مینڈھے کی ہڈی۔ میں سارے بچے کھچے "قورباشیوں"* کو خرید لوں‌گا اور ان کے خونی ہاتھوں سے لوگوں کے دلوں کو نوچ‌کے نکال پھینکوں‌گا، وہ لوگ تو مقدس "شاہ‌مردان"** میں میرے منتظر ہیں ہی۔"

"جی ہاں، جی ہاں، محترم بائی، یہ تو مجھے معلوم ہے" چائے کا تاجر تڑ سے بولا۔

قدرت‌اللہ نے اسے کن‌انکھیوں سے دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ اسے اس امر پر اب تعجب نہیں ہوتا تھا کہ چائے کے تاجر کو تمام تازہ‌ترین واقعات کا علم تھا۔

"مجھے بس ایک ہی پریشانی ہے، ایک ہی بات ہے جو میرے راستے میں اڑچن لگا سکتی ہے اور وہ یہ کہ میرے نکمے بیٹے کے سلسلے میں پھر کوئی فضیحتا کھڑا ہو سکتا ہے" قدرت‌اللہ نے کہا۔ اس کا لہجہ اچانک غمگین ہو گیا تھا۔ "جب میں نے یہ اشارہ کیا کہ میں چاربازاروالا باغ بیچ دوں‌گا، تو اس کا منہ مٹی کی طرح کالا پڑ گیا۔ میں نے تو

---

*بسماچی گروہوں کے سردار۔ اڈیٹر۔

**شاہ‌مردان — وادی‌فرغانہ میں مذہبی جنونیوں کا انقلاب دشمن اڈا۔ مترجم۔

بالکل امید چھوڑ دی ہے کہ اس ناخلف کی سمجھ میں کوئی بھی عقل کی بات آ سکتی ہے!"

"ظاہر ہے" چائے کے تاجر نے مضحکہ آمیز معقولیت پسندی سے کہا۔ "جب مویشیوں کے باڑے میں آگ لگتی ہے تو گدھا اس کے اندر ہی رہ جاتا ہے کیونکہ وہ جلتے ہوئے پھاٹکوں سے باہر نکلتے ڈرتا ہے۔"

قدرت اللہ نے مایوسی اور پریشانی سے اپنے ہاتھ ہوا میں لہرائے۔

"یہاں کوئی عورت ہے جس نے بری طرح اس کو اپنے چنگل میں گرفتار کر رکھا ہے کہ وہ بالکل پاگل ہو رہا ہے۔"

"آہ!.. ایک دلھن! ہاں، میں نے بھی اس کے متعلق سنا ہے..." چائے کے تاجر نے کہا۔

اب کی بار بائے کا چہرہ اودا اور غصے سے خون چھلک آنے پر کچھ سوج سا گیا: دیوالیہ ہونے کی بات وہ سن سکتا تھا مگر یہ دلھن کا ذکر تو اس سے بھی تیز نشتر تھا۔

چائے کے تاجر نے بڑے اطمینان سے تکئے کو ٹھیک کیا جس پر وہ بیٹھا تھا۔

"اتنے پریشان نہ ہوئیے، میرے معزز دوست۔ بے شک آپ کے لڑکے کی حرکتوں سے آپ کو تکلیف پہنچ رہی ہے مگر میرا خیال ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اس سے برائی کے بجائے بھلائی بھی نکل سکتی ہے۔ کبھی کبھی بچوں کی حماقتوں سے بھی بڑوں کا فائدہ ہو جاتا ہے اور بچوں کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ میری بات سنئے۔ چلتے چلاتے میری صلاح مانئے: اپنے بیٹے کو آپ یہیں چھوڑ جائیے۔"

"کیا؟!"

"آپ کی تو اس سے بنتی نہیں نا؟ بہت خوب۔ تو اس وجہ سے وہ صاحبانِ اقتدار کا اعتماد جلد ہی حاصل کر لے گا یعنی صورت یہ ہوگی کہ لڑکے کو عشق ہے، باپ نے اسے چھوڑ دیا تو اس نے بھی اپنے بدمعاش باپ کو چھوڑ دیا... یہ بات اس کو ذرا سنجیدگی سے سمجھا دیجئے۔ اس کے لئے یہ سبق برا نہیں رہے گا۔ یہاں آپ کا لڑکا بہت مفید ثابت

ہوگا، وہ یہاں آپ کی وفادار آنکھ بنا رہےگا اور میں اس کا دماغ بنا رہوں‌گا۔ آپ مجھ پر تو بھروسہ کر سکتے ہیں کہ اس کی مدد کروں‌گا، بائے کے لڑکے کو بائے کی غیرموجودگی میں فاقے نہ کرنے پڑیں گے۔ بس یہی ہے کہ ذرا ان باتوں کو راز رکھئےگا اور خدا کے لئے اپنی بیوی سے فی‌الحال کچھ نہ کہہ دیجئےگا۔ اس کو بیٹے سے رخصت ہوتے وقت سچ مچ کے آنسو بہانے دیجئے۔"

"آپ... آپ مجھے یہ صلاح دیتے ہیں؟" قدرت‌اللہ نے کوشش کرکے کہا۔

"آپ ہی بتائیے، کیا یہ معقول صلاح نہیں ہے؟.."

بائے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ٹھیک اسی وقت ٹیچر نعیمی، نصرت‌اللہ سے رازدارانہ گفتگو کر رہا تھا۔ دونوں اس چھوٹے نئے مکان میں بیٹھے تھے جو حوض کے پاس نصرت‌اللہ کے لئے بنوایا گیا تھا۔

بائے کا بیٹا ریشمی لبادے میں لیٹا نیم‌دراز تھا، نعیمی صورت پر اداسی طاری کئے اپنی چھڑی سے کھیل رہا تھا۔ وہ چھڑی کے ہڈی سے بنے موٹھ کو سہلاتے ہوئے اپنے ساتھی کے چیچک کے داغوں‌والے چہرے کو کن‌انکھیوں سے دیکھ رہا تھا جو ٹیچر کے الفاظ کے اثر سے کبھی زرد ہو جاتا، کبھی سیاہ۔

"آہ، ہم بھی کیسے زمانے میں جی رہے ہیں..." نعیمی نے کہا۔ "جہاں تک میرا تمہارا سوال ہے تو میرے دوست، میں تو خود بھی ہمت باندھ‌کر خوش ہوتا اور تمہاری بھی ہمت بندھاتا لیکن سب تو ہمارا ساتھ چھوڑ گئے، سب ہی! آج مسلمان اسلام کا پیرو نہیں رہا، باپ بیٹے کا سرپرست نہیں..."

"آخر آپ کاہے کا رونا رو رہے ہیں؟" بائے کا بیٹا چیخا۔ "خدا نے سب کچھ تو دے رکھا ہے۔ آپ کو کیا چاہئے؟ غمگین اور پریشان تو میں ہوں۔ اگر میرا باپ بائے نہ ہوتا تو وہ بیاہ کر میرے گھر آ بھی جاتی۔ اور اب تو سب کچھ چھن گیا! میں کس طرح اس کا سامنا کروں؟"

"میرے پیارے دوست، میں نے بھی اپنے باپ کی بڑی زیادتیاں سہی ہیں، میں تمہاری پریشانی سمجھ سکتا ہوں... یہ نہ بھولو کہ تمہارا باپ وہ جائیداد فروخت کر دینا چاہتا ہے جو کبھی نہ کبھی تمہاری ہوتی۔ پھر تمہارے پاس گھر تک نہ ہوگا، دلہن بیاہ کے لاؤگے تو بٹھاؤگے کہاں؟ اسی لئے میں اتنا پریشان ہوں۔ اب تم پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ بانکے کے لئے تو غلطی کرنے سے بہتر ہے کہ وہ ڈوب مرے۔ اگر تمہارا باپ تمہیں عاق کرنے کی دھمکی دے، تو تم بھی اس سے تعلقات منقطع کرنے کی دھمکی دو، یہ ادب لحاظ کا زمانہ نہیں ہے میری جان! یہ کہتے ہوئے میرا دل دکھتا ہے مگر دیکھ لینا: تمہیں نہ جائیداد ملے گی نہ بیوی، افسوس ہے تمہاری حالت پر..."

"افسوس؟" نصرت‌اللہ لبادہ دور پھینکتے ہوئے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "تمہارے خیال میں خدا نے مجھے یہ چیز کیوں دی ہے؟" اس نے چیخ کر کہا۔ اپنے لانگ بوٹ میں سے ایک خنجر نکالا اور اسے اپنی آستین میں چھپا لیا۔

نعیمی ہچک کر پیچھے ہٹا اور چھری کی آڑ کر لی۔

"ارے بھائی، ذرا رک کے، ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ مخبوط الحواس سہی، کوڑھی سہی، پر ہے تو تمہارا باپ نا، منہ پر دو زوردار تھپڑ اس کا دماغ درست کرنے کو کافی ہیں، خنجر کی کیا ضرورت۔"

نصرت‌اللہ نے یکایک خنجر پھینک دیا، گدے پر ڈھے پڑا اور پھوٹ کر رونے لگا۔

"ہائے، میرا کوئی نہیں! نہ باپ، نہ بیوی، نہ دوست، نہ اور کچھ — نہ روپیہ پیسہ، نہ کوئی کام، نہ ہنر، نہ پیشہ... میں کسی قابل نہیں۔ ہائے میں کہیں کا نہیں رہا!"

"ارے یہ کیا" نعیمی نے چمکارا۔ "آنسو تو تمہیں اتنے ہی زیب دیتے ہیں جتنا کسی شیر کو رومال۔ اپنے کو سنبھالو، مجھ پر بھروسہ کرو، میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا، میں تمہارے لئے ایسا کام تلاش کروں گا جو تمہاری ہمت اور

جوش و خروش کے شایان شان ہو، تم ہمیشہ سے بانکے ہو اور رہو گے۔"

نصرت اللہ نے سر اٹھاکر سنا تو سہی مگر دانت پیستا رہا۔

"میں اس کی ناک کٹوا دوں گا، میں غائب ہو جاؤں گا، ڈھونڈے مجھ کو، خوشامد کرے میری کہ "واپس آ جا بیٹے" میں تو اسے مجبور کر دوں گا کہ میرے پاؤں چومے، میرے تلوے چاٹے!"

گرجتا ہوا وہ ایکدم کمرے کے باہر نکل گیا، نعیمی اپنے دونوں بازو پریشانی میں چھت کی طرف بلند کئے دوڑتا ہوا اس کے پیچھے اپنی چھڑی ہلاتا بھاگا۔

"نصرت اللہ بھائی، ملا نصرت اللہ!" اس نے پکارا۔ "ماں باپ کی عزت کرنا خدا کی عزت کرنے کے برابر ہے!"

لیکن اس اثنا میں بیٹھک سے لڑنے کی اور چینی کے برتن ٹوٹنے کی آوازیں آنی شروع ہو گئی تھیں۔

"ہٹا اپنے ہاتھ، گیدڑ کہیں کا، گھونگا، بدمعاش۔"

"سمجھتا بھی ہے کہ تو کس کو فقیر بنا دینا چاہتا ہے۔ مجھے بتا؟"

"یہ جائیداد میری ہے، تجھے میرا تھوک ملے گا، جائیداد نہیں۔"

"اچھا پھر دیکھنا، آج کا دن تجھے ہمیشہ یاد کرواؤں گا۔"

"ارے کمبخت، کیا تیرا دماغ چل گیا ہے!"

"اور تو نے جو مجھے تباہ کر دیا!"

کان کے پردے پھاڑنے والے دو دھماکوں میں یہ ساری چیخ پکار دب گئی۔ دور شیر کی پہاڑی پر زرد ریت کا ایک بادل اٹھا اور دھیرے دھیرے قبرستان کی طرف پھیلنے لگا۔

قدرت اللہ کی بیٹھک میں سناٹا چھا گیا۔ قالین پر چاروں طرف ٹوٹے ہوئے پیالے بکھرے ہوئے تھے۔

دھماکے کی سمت دیکھتے ہوئے بائے اور اس کے بیٹے کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا جب انہیں دہلیز پر ایرگاش سلطانوف کھڑا دکھائی دیا۔

نعیمی تو یوں غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ، چائے کے تاجر نے تکئیے میں منھ چھپا لیا اور بھونڈےپن سے کہنی یوں جھکاکے سامنے کر لی جیسے وہ شراب کے نشے میں ہو، ہڑیلا مقسوم جھکا اور پھر جھکے ہی جھکے منجمد سا ہوکر رہ گیا۔

"یہ روز روشن مبارک میرے مالکو، معلوم ہوتا ہے خاندان میں کچھ جھگڑا ہوا ہے!" ایرگاش نے کمرے میں نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ "اور آپ..." اس نے مقسوم کے سر کی پشت سے مخاطب ہوکر کہا۔ "آپ اس طرح دوہرے کیوں ہوکے جا رہے ہیں؟ کیا پیٹ میں درد ہے؟"

مقسوم کھسیاکے کھی کھی کرنے لگا مگر سیدھا نہیں کھڑا ہوا۔

قدرت‌الله نے اپنے ہوش جلدی سے ٹھکانے کئے۔

"خوش آمدید، میرے پیارے ایرگاش بائے، اندر آئیے، نا۔ بہت دنوں سے ہم ایک دوسرے سے نہیں ملے ہیں، کتنے سال گزر گئے، کتنی تبدیلیاں ہو گئیں! جس کا بچپن دیکھا ہو اسے ایسا لائق آدمی بنتے دیکھکر کیسی خوشی ہوتی ہے۔ ہم نے آپ کے شاندار کارناموں کے متعلق بہت کچھ سنا ہے۔ ویسے تو مجھ بوڑھے کی حیثیت ہی کیا لیکن میں آپ کا بہت معترف ہوں اور اکثر اس بات کا غم کرتا ہوں کہ میرا بیٹا آپ سے ذہانت اور صلاحیت کے معاملے میں کہیں پیچھے رہ گیا۔ خدا نے مجھے یہ ناخلف بیٹا دےکر مجھے سزا دی ہے..."

"افسوس، افسوس" ایرگاش نے اپنے مودب میزبان کی باتوں سے متاثر ہوئے بغیر جواب دیا۔ "ویسے آپ سن لیجئے کہ میں تمام تبدیلیوں کے باوجود بائے نہیں بنا ہوں۔ اور اس بات کو یاد رکھئیے۔ اور مجھے معاف کیجئیے کہ میں آپ کو کوئی خوشی نہیں دے سکوں‌گا، وہ خوشی تک نہیں جو آپ کو میرے باپ دیا کرتے تھے تاوقتیکہ آپ نے انہیں کچل کے رکھ دیا۔"

"اف خدایا! آپ کو نہ چاہئے کہ... بھلا یہ کیسی باتیں کرتے ہیں؟" بائے جلدی سے شکایت کے لہجے میں بول اٹھا۔

"کیوں نہ کہوں؟ کیا یہ حقیقت نہیں؟ یہاں موجود یہ شہری اس بات کا گواہ ہے" ایرگاش نے ہڑیلے مقسوم کی طرف سر سے اشارہ کیا۔ "کیوں، یاد ہے نا؟ سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہی ہوا تھا۔"

مقسوم خامی بھرتے ہوئے یوں سر ہلانے اور تعظیماً جھکنے لگا جیسے اس میں چابی بھر دی گئی ہو۔

"بے شک، بے شک!.." اس نے حال آنے کی سی کیفیت میں سرگوشی کی۔ "میری آنکھوں کے سامنے... مجھے یاد ہے!.. میں تصور میں آج بھی دیکھ سکتا ہوں!.. خدا اسے بہشت نصیب کرے، کاش وہ جنت الفردوس سے ہم سب پر نگاہ ڈالے..."

ایرگاش نے نفرت کے مارے زور سے تھوکا۔

چائے کا تاجر ایک ہی رخ پڑے پڑے تھک گیا، اس نے کروٹ لی اور منہ کھولے بغیر، چیخ چیخ کر گانے لگا:

"دیکھو، کوے اڑ رہے ہیں،
مارغیلان کے راستے پر"

"شہریو، مجھے آپ سے یہ کہنا ہے" ایرگاش نے کہا۔ "آپ لوگ کافی دنوں سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ باپ بیٹے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ آپ لوگوں نے نوٹس دیکھا؟ اس کا تعلق آپ سے بھی ہے کیونکہ آپ بھی یہاں کے شہری ہیں۔ آپ لوگوں کو دس جولائی کو حاضر ہوکر، مل بنانے کے لئے بے کار زمین کی صفائی میں ہاتھ بٹانا ہے۔ آپ سب کو! اگر آپ اپنی مرضی سے نہیں آئیں گے تو ہم آپ کو گھسیٹ کر لے جائیں گے اور پھر آپ اپنی ذلت کے خود ذمے دار ہوں گے۔ اپنی زندگی میں پہلی بار عوام کے لئے بھی کچھ کرنے کی زحمت برداشت کیجئے، تھوڑا پسینہ بہائیے تو پھر آپ کا جو یہ رجحان ہے کہ ہم لوگوں کو بدمعاشی بھرے پرچے بھیجتے رہتے ہیں، یہ شاید ختم ہو جائے۔"

قدرت اللہ لمحے بھر کے لئے جوش میں آ گیا۔

"یہ آپ کن پرچوں کی بات کر رہے ہیں، میں نہیں سمجھ پا رہا ہوں..."

تاجر نے زور کی ہچکی لی اور کمبل کے اندر منہ چھپاتے ہوئے کسمسایا۔

"یہ کون ہے؟" ایرگاش نے پوچھا۔

"یہ بیمار ہے اور اس کی حالت کافی خراب ہے..."

"یہ کون ہے؟" ایرگاش نے مقسوم سے پوچھا۔

ہڑیلا مقسوم منجمد سا کھڑا، کتے کی طرح خوشامد بھری نظروں سے ایرگاش کو تکے جا رہا تھا اور اگر ایرگاش نے تیوری پر بل لاکر، غصے سے منہ نہ پھیر لیا ہوتا تو وہ اسے چائے کے تاجر کا نام بھی بتا دیتا۔

"تو دس جولائی کو اسے بھی ساتھ لانا۔ اور میں خود وہاں کھڑا ہوکر دیکھوں گا کہ آپ لوگ کیسے کام کرتے ہیں۔"

"میں آج ہی آ سکتا ہوں؟ میں آنا پسند کروں گا" یکایک نصرت‌الله نے ایرگاش کی طرف ایک قدم بڑھاتے ہوئے ہچکچاتی آواز میں کہا۔

"تم؟ آج؟" ایرگاش نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے تیوری چڑھاکر پوچھا۔

"جی ہاں، میں کام کروں گا، میں کام کرنا چاہتا ہوں!"

"تم کام کرنا چاہتے ہو؟ کب سے ایسا ہوا؟ اور کب تک کروگے؟ تمہیں یقین ہے کہ تم سنجیدگی سے بات کر رہے ہو؟"

"جی ہاں، جیسی قسم کہئے کھانے کو تیار ہوں!"

"میں ایسی باتوں سے متاثر نہیں ہوتا" ایرگاش نے اسے روکتے ہوئے مشکوک نظروں سے قدرت‌الله کی طرف دیکھا۔

لیکن بائے کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

ایرگاش نے کندھے اچکائے۔

"اچھی بات ہے، آج ہی سے آ جاؤ۔"

نصرت‌الله وہ لانگ بوٹ ٹھیک سے پہنے جن میں خنجر اڑسا ہوا تھا اور ایرگاش کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

اٹھارھواں باب

سورج ڈوب چکا تھا مگر اودے بادل اپنی نیلی دھاریوں سمیت ابھی تک چمک رہے تھے اور اس چمک کی آخری شعاعیں زمین پر پڑ رہی تھیں۔

بشارت اور تورسنائی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ریلوے کی بستی کی طرف سے آ رہی تھیں۔ دونوں بڑی خوش تھیں اور اپنے ملے ہوئے ہاتھوں کو جھولے کی طرح جھلاتی چل رہی تھیں۔

نالے کے دونوں طرف لگی پودینے کی جھاڑیوں میں پتیاں شام کی ٹھنڈک سے بھاری ہوکر جھکی جا رہی تھیں۔ تورسنائی نے جھک کر ایک ننھی سی شاخ سے انگلی گزارتے ککروندے کا ایک پھول توڑ لیا، اس پر پھونک ماری، خوشی سی ہنسی اور پھر ایک گیت شروع کر دیا۔ اس کی آواز جو نرم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ تیز بھی تھی، ناقابل بیان حد تک خوشگوار تھی۔

پہلے تو بشارت اپنی بہن کے گانے کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دیتی تھی اور نہ ہی اس کی تعریف کرتی تھی بلکہ اسے اس بات پر تعجب بھی ہوتا تھا کہ تورسنائی کی آواز بڑوں کو کیوں اتنا زیادہ متاثر کرتی ہے۔ لیکن چونکہ ایسا ہوتا تھا اس لئے وہ تورسنائی کی زیادہ تعریف نہیں کرتی تھی کہ لڑکی کے دماغ میں ہوا نہ بھر جائے...

لیکن آج نہ جانے کیوں بشارت تورسنائی کے گانے سے مسحور ہو رہی تھی۔ اس گانے کو سنتے رہنے کے لئے اس کے دل میں ایک عجیب سی خواہش کروٹیں لے رہی تھی۔ جی

چاھتا تھا آسمان پر نظریں جمائے رھے کہ کب پہلا ستارہ جھلملانا شروع کرتا ھے، جی چاھتا تھا تورسنائی کو اپنے سینے سے بھینچ لے...

"تورسنائی، تم نے جیسا کلب میں گایا تھا اس سے اچھا گا رھی ھو اس وقت" بشارت نے کہا۔

تورسنائی مسکرائی۔ اپنی ننھی منی لال سلیپروں پر نظریں جمائے، ذرا سا جھومتی ھوئی وہ اپنی بہن کے ساتھ، خاکساری مگر وقار کے ساتھ چل رھی تھی جیسے بڑی عمر کی لڑکیاں چلتی ھیں۔

"تم سے ایک بات کہوں؟" بشارت نے سرگوشی کی۔

اس پراسرار سوال کے ساتھ اس کی بہن عموماً ایک مخصوص نوجوان کا ذکر چھیڑ دیا کرتی تھی۔

"عبدالصمد کے بارے میں ھے نا؟" تورسنائی نے پوچھا۔

بشارت ایک‌دم مڑی۔

"تمھیں کیسے معلوم؟"

"بتاؤ نا، مجھے بتاؤ نا..."

"نھیں، پہلے تم بتاؤ تم، تمھیں کیسے معلوم ھوا؟"

"پتہ نھیں۔ میں کچھ نھیں جانتی، بشر... مجھے بتاؤ!"

"امی کی غیرموجودگی میں صوفیہ خالہ ھم لوگوں کی دیکھ‌بھال کریں گی" بشارت نے سنجیدگی سے کہا۔ "جب تم ریہرسل پر گئی ھوئی تھیں تو وہ آئی تھیں، عبدالصمد بھی آیا تھا..."

تورسنائی نے احتیاطاً کچھ نھیں کہا۔

"اور اس نے کہا: "کومسومول کی جانب سے ھم تمھارے سپرد ایک کام کر رھے ھیں۔"

"وہ امی کو کوئی کام کیسے سپرد کر سکتا ھے؟"

"اس نے یہی کہا تھا: "کومسومول کی جانب سے!"

بشارت سوال کو ٹالتی ھوئی اپنی بات پر مصر رھی، ساتھ ھی مزے میں آکر کندھے اچکائے "اور اس نے امی کو سپاھی کی طرح سلیوٹ کیا... اے یوں! امی ھنسنے لگیں..."

تورسنائی قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ بشارت نے بھنویں سکوڑ کے عبدالصمد کی نقل کی۔

"آپ تاشقند جائیں" اس نے کہا، "تو مہربانی کر کے موسیقی کے اسکول میں جائیں کیونکہ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا وہ ایک اور طالب علم کو داخل کر سکتے ہیں اور اگر تاشقند میں جگہ نہ ہو تو آپ دریافت کریں کہ کیا ماسکو میں کچھ انتظام ہو سکتا ہے۔ ہمارے یہاں بڑی صلاحیت والی ایک لڑکی ہے جسے ہم اسکول بھیجنا چاہتے ہیں..."

"صلاحیت کیا ہوتی ہے؟"

"صلاحیت؟ ارے تو کیسی بےوقوف ہے! عبدالصمد کا مطلب تو تجھ ہی سے تھا۔ سمجھی؟ پھر عبدالصمد نے ان بوڑھے پروفیسر صاحب کا ایک خط امی کو دیا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ تجھ کو داخلہ دیا جائے۔"

"مگر میں تو اپنے نئے اسکول میں پڑھنا چاہتی ہوں، ہائے کتنا خوبصورت اسکول ہے۔"

"خوبصورت... ہاں، وہ تو ہے خوبصورت! مگر عبدالصمد نے تو امی کو کومسومول کی طرف سے ایک ذمےداری سونپی ہے۔ اتنی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی؟ اور عبدالصمد نے یہ بھی کہا کہ بوڑھے پروفیسر کہتے ہیں امی کو تیرے لئے ماسکو میں ایک اونی جرسی خریدنی چاہئے۔ وہ اس کے لئے رقم بھی لیتا آیا تھا اور بتانے لگا کہ یہ کام بھی کومسومول نے ہی کرنے کو کہا ہے..."

تورسنائی نے خوشی کے مارے کلکاری بھری:

"ہائے تو کتنی اچھی ہے! سچ کہہ رہی ہے نا؟" اس نے بشارت کو گلے لگا لیا۔ "اونی جرسی؟"

"اچھا جب امی چلی جائیں گی تو ٹھنٹھناؤ گی تو نہیں نا؟"

"ارے نہیں۔ بالکل نہیں۔"

"اور اندھیرے سے ڈرو گی نہیں؟"

"نہیں، نہیں" تورسنائی نے اپنی بہن کو چھوڑتے ہوئے کہا۔

بشارت نے اس کا ھاتھ پکڑ کر کھینچا۔
"جلدی آ۔ تیز چل۔ امی کل ھی تو جا رھی ھیں۔"
اندھیرا ھو گیا تھا ور ستاروں کی مدھم روشنی میں لڑکیوں کو مشکل سے سڑک دکھائی دیتی تھی۔ چاند ابھی نہیں نکلا تھا۔ تورسنائی اچانک ٹھہر گئی اور اس نے جلدی سے کانپتے ہوئے اپنی بہن کا ھاتھ پکڑ لیا۔ کسی عجیب چیز کا سیاہ سایہ سامنے منڈلایا۔
"ارے... ھم لوگ کہاں آ گئے؟"
"آ چل نا۔ ادھر سے گھر کا فاصلہ کم ھے۔"
"مگر یہ تو قبرستان ھے، اس میں سے ھوکر تو میں نہیں جاؤں گی!"
"انھہ، احمق نہ بن، گھوم کر جائیں گے تو بڑی دیر لگے گی اور تم بھول گئی ھو کیا کہ امی انتظار کر رھی ھوں گی؟"
"نہیں، ھم لوگ گھوم کر ھی چلیں گے۔ گھوم کر ھی چل، بشارت۔"
"اب ضد نہ کر، تو نے کیا پہلے کبھی ھمارا یہ قبرستان نہیں دیکھا؟ دیکھ یہ راستہ دکھائی دے رھا ھے نا؟"
"ھاں۔"
"تو پھر آ۔ چل، پر ذرا دھیان رکھنا۔"
"کیوں؟"
"کسی پتھر سے ٹھوکر نہ کھا جانا..."
"پتھر! قبرستان کا پتھر!"
"کیسی بےوقوف ھے... کیا قبر کے پتھروں کے علاوہ یہاں پتھر نہیں ھیں؟ آ۔ میرا ھاتھ پکڑ۔"
یہ راستہ قبروں کے بیچ میں سے ھوتا ھوا، آڑا ترچھا گزرتا تھا۔ رات کے سناٹے میں دونوں لڑکیوں کے پیر تلے بجری کی کھچر کھچر دور تک گونج رھی تھی، نعمانچہ کی طرف ایک بھی روشنی نظر نہ آتی تھی اور مکمل خاموشی تھی۔ بشارت راستہ ٹٹولتی بڑھتی جا رھی تھی اور اندازے سے سمت مقرر کئے ھوئے تھی۔
تورسنائی کو نہ کچھ دکھائی دے رھا تھا، نہ سنائی دے

رہا تھا۔ وہ بالکل سن ہو گئی تھی، صرف اپنے دل کی تیز ہو جانےوالی دھڑکن اور بشارت کے ہاتھ کی گرمی اسے محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرکے چلنے کی کوشش کی لیکن پھر اس سے رہا نہ گیا، آنکھیں کھول دیں اور اسے ایسا لگا گویا اس نے کچھ دیکھا۔

وہ کوشش تو بہت کر رہی تھی کہ جن چیزوں سے ڈر لگ رہا تھا ان کا خیال ذہن میں نہ آنے دے لیکن وہ جتنی زیادہ کوشش کرتی اتنا ہی زیادہ اسے نظر آتا کہ وہ مرگی کا مارا لڑکا، مناب چت پڑا ہے، اس کا منہ ٹیڑھا ہو گیا ہے اور پھر اسے ایسے لگا کہ کچھ بڑبڑانے، بدبدانے کی بھکی بھکی سی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔

بشارت نے بہن کا دل بڑھانے کے لئے گلا صاف کرکے لڑکوں کی طرح سیٹی بجانی شروع کر دی۔

"ش ش، چپ رہو..." تورسنائی نے اس سے کہنا چاہا مگر اتنی خوف‌زدہ تھی کہ منہ نہ کھول سکی۔

پھر یکایک ایک کبڑی پیٹھ والا سایہ اس کے سامنے ابھرا جو کسی قبر کی ابھری ہوئی زمین کے بجائے ایسا لگتا تھا کہ کوئی آدمی بیچ راستے میں بیٹھا ہے۔ لاش کی طرح ساکت، بےحس و حرکت، خاموش!

تورسنائی خوف کے مارے لرزنے لگی، بشارت تو اسے سیدھی اس آدمی کی طرف لے جا رہی تھی۔ وہ دونوں جتنی ہی قریب پہنچتی جا رہی تھیں، وہ سایہ اتنا ہی اونچا، منارہ جتنا اونچا ہوتا جاتا تھا۔

تورسنائی نے کوشش کی کہ زور سے چیخے "امی!" لیکن حلق سے آواز ہی نہیں نکلی۔

"لو، اب ہم مقبرے تک پہنچ گئے" بشارت بولی۔ "جلد ہی گھر پہنچ جائیں گے۔"

تورسنائی خاموشی کے ساتھ پھر سانس لینے لگی۔ وہ جو سایہ سا نظر آ رہا تھا، وہ تو مقبرہ ہی تھا اور وہ کبڑی پیٹھ والا شخص — وہ تو ایک جھاڑی تھی۔

لیکن وہ دونوں مقبرے کے پاس سے کیسے گزریں گی؟

تورسنائی کو یاد آیا کہ یہ راستہ مقبرے کا طواف کرتا ہوا ان لمبی لمبی بلیوں کے پاس سے گزرتا ہے جن پر چیتھڑے اور گھوڑے کے بالوں کے گچھے لٹکے ہوئے ہیں۔ اس نے ایک ہاتھ سے بشارت کا ہاتھ کس کر پکڑا اور دوسرے سے اپنا دامن اور رک کر بہن کے شانے کے اوپر آنکھیں پھاڑکر یوں دیکھنے لگی جیسے کسی نے اس پر جادو کر دیا ہو، اسے لگ رہا تھا اس نے کوئی ایسی شے دیکھی جس کا نہ نام بتا سکتی تھی نہ کسی چیز سے تشبیہہ دے سکتی تھی۔

دونوں لڑکیاں قدم اٹھاتی بلیوں کے پاس سے گزر رہی تھیں کہ انہیں ایک وحشت‌ناک چیخ سنائی دی، اتنی تیز کہ ایک پل کے لئے تو بشارت کے بھی کان گنگ ہو گئے، دوسرے ہی لمحے تورسنائی برف کی طرح ٹھنڈی ہوکر، اس کے بازوؤں میں ڈھے پڑی۔ وہ بےہوش ہو چکی تھی۔ بشارت نے بہن کے بوجھ تلے پیچھے پھسلتے ہوئے ایک خوفزدہ جانور کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔ اسے ایک ننھا سا شعلہ، مدھم لپکتا نظر آیا مگر وہ یہ نہ طے کر سکی کہ وہ پاس تھا یا دور۔

اس میں نہ جانے کہاں کی طاقت آ گئی کہ بہن کو بالکل ایک چھوٹے سے بچے کی طرح اٹھاکر وہ قبرستان کے اس راستے پر تیز بھاگنے لگی۔ تورسنائی کے پاؤں، لٹکتے گھسٹتے، زمین پر تڑاتڑ لگتے جاتے تھے۔

بشارت کو کچھ اندازہ نہ تھا کہ وہ کدھر جا رہی ہے، وہ اپنی بہن کو ایک ایسی قوت کے ساتھ گھسیٹ رہی تھی جو مایوسی کی حالت میں یکایک پیدا ہو جاتی ہے، قبروں پر پاؤں رکھتی، جھنکاڑوں جھاڑیوں سے گزرتی، وہ پاگلوں کی طرح اپنا قیمتی بار اٹھائے دوڑی جا رہی تھی۔ وہ صرف اس وقت رکی جب ایک گڈھے میں پاؤں جا پڑا۔ اس نے پیر نکالا تو ایک جوتا گڈھے میں ہی چھوٹ گیا، اگلا قدم بڑھاتے ہی اس کے ننگے پیر میں کانٹا چبھا مگر اسے درد محسوس تک نہ ہوا۔ وہ تورسنائی کو کھینچتی رہی یہاں تک کہ اس کی طاقت جواب دے گئی اور وہ بہن کو لئے ہوئے گر پڑی۔ بشارت ہانپ رہی تھی مگر بار بار وہ بہن کے چہرے، ہاتھوں

اور سینے کو اپنے لرزتے، تھرتھراتے ھاتھوں سے ٹٹول رہی تھی۔

تورسنائی کے ماتھے اور رخسار پر پسینے کی نمی تھی۔ بڑے بڑے شفاف موتی... مگر اس کا دل دھڑک رہا تھا - وہ زندہ تھی۔

اور اب قبرستان پیچھے چھوٹ چکا تھا۔

"تورسنائی، میری جان، بچی، تجھے میری آواز سنائی دے رہی ھے؟ مجھ سے کچھ بول، کچھ کہہ تورسنائی" بشارت زور زور سے سانسیں لے رہی تھی۔

اس کی بہن نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بشارت کو گمان گزرا کہ کچھ روشنی سی ہوئی، اس نے تورسنائی کے چہرے پر نظر ڈالی، تورسنائی کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ یکایک وہ زور زور سے کانپنے لگی، اس نے اپنے آپ کو بشارت کی بانہوں سے گھسیٹ لیا، آنکھیں گول گول گھمانے لگی اور بشارت نے اس کی آواز نہیں پہچانی - جیسے وہ بالکل کسی اور کی، کوئی اجنبی آواز ھو۔

"وہ رہا، وہ ھے موت کا فرشتہ، ملک الموت!"

بشارت کا فطری ردعمل یہ تھا کہ اس نے بہن کو اپنے جسم سے ڈھک لیا اور وحشت زدہ نگاھوں سے چاروں طرف دیکھا۔

سفیدے کے پیڑوں کی آڑ سے چاند جھانکا اور اپنی ایک زرد آنکھ جو خزاں کے پتے کی طرح پیلی لگ رہی تھی، بشارت پر جما دی۔

بشارت نے اپنی بچی کھچی قوت کو مجتمع کیا، پھر تورسنائی کو اٹھایا اور چل پڑی۔ اس کے ننگے پیر میں سخت تکلیف ہو رہی تھی مگر وہ چلتی رہی، آگے کو جھکی ہوئی، لنگڑاتی ہوئی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا، کان بج رہے تھے!

تورسنائی ابھی تک بےھوش تھی۔ بشارت کو بھی کچھ ھوش نہ تھا کہ وہ کتنی دیر اس کو اٹھاکر چلتی رہی ھے، ایک گھنٹہ یا پوری ایک رات، چاروں طرف کوئی تنفس نہ تھا۔

ایک آوارہ کتا ان لڑکیوں کو ملا، ڈر کے چھلانگ لگائی اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

بشارت کو پودینے کی خوشبو آئی، پانی کی ایک نالی بھی دکھائی دی۔ وہ پسینے سے تر تھی لیکن تھکن کے مارے اسے یہ سوچنے کا ہوش نہ تھا کہ ایک گھونٹ پانی پی لے یا بہن کے منھ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ جب تھوڑی دور نکل گئی تب اسے یہ خیال آیا مگر واپس لوٹنے کی سکت باقی نہ تھی۔

اپنے لکڑی کے جنگلے والے پھاٹک کے سامنے دونوں بڑی دیر تک زمین پر پڑی رہیں۔ بشارت نے کئی بار ماں کو پکارنے کی کوشش کی مگر منھ سے آواز نہ نکلی۔

اناخان کی مامتا نے اسے محسوس کرایا کہ کوئی گڑبڑ ہے، کہ بچیوں کو اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے۔ دل کے اس کہنے پر وہ بےقرار ہوکر باہر نکلی تو پھاٹک کے سامنے اپنی بیٹیوں کو زمین پر پڑا دیکھا۔

...بشارت کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ گھر عورتوں سے بھرا ہے۔

اس کی ماں پریشان آواز اور شکایت کے لہجے میں جوراخان سے کہہ رہی تھی:

"ارے، آپ کیوں آئیں بہن، اتنا سب کچھ ہو چکا ہے، پھر ایسے وقت میں رات کو، اکیلے، آپ کو آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم لوگ آپ کو اتنا سمجھاتے ہیں پر آپ کسی کی نہیں سنتیں۔ آپ کو اپنی زندگی سے اتنی لاپرواہی برتنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"بس، بس، چپ بھی رہو، میری بہن" جوراخان نے کہا۔

حاجیہ، بشارت کے پاؤں میں پٹی باندھ رہی تھی اور بشارت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے کیونکہ اب درد تو بالکل نہیں تھا۔

دادی عنظیرت پاس ہی بیٹھی، ہاتھ میں دیاسلائی کی تیلی کے برابر موٹا ایک کانٹا لئے اسے یوں دیکھ رہی تھی گویا وہ کوئی ایسی چیز ہے جسے اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔

"میں جانتی ہوں کیا ہوا ہے" وہ دھیرے سے بولی۔ "ہزار شیخ کے مقبرے پر ابدی سکون و رحمت ہو..."

تورسنائی کے کپڑے بدل دئے گئے تھے اور اسے بشارت کے پاس ہی لٹاکر کمبل اڑھا دیا گیا تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں، چہرہ چونے کی طرح سفید تھا۔

"اب کیسی ہو بی‌بی؟" جوراخان نے بشارت سے پوچھا۔

بشارت اپنی بہن کی صورت کو تکے جا رہی تھی۔

"کیا سو رہی ہے؟"

"تم لوگ کہاں تھیں، میری جان؟" اناخان نے پوچھا۔

"امی‌جان، یہ سب میرا قصور ہے، ہم لوگ قبرستان میں سے ہوکر آئے..."

"ہائے!" دادی عنظیرت جلدی سے بولی۔ پھر بڑبڑانے لگی: "شکر اللہ! شکر اللہ!"

اسی وقت جیسے انسانی قوت سے بھی بالاتر کوشش کرکے تورسنائی نے اپنی آنکھیں کھول دیں، اس کی آنکھیں نندا سی اور پتھرائی ہوئی تھیں۔ اناخان اس پر جھکی مگر وہ اس سے دور خلا میں کہیں گھورتی رہی۔ اناخان اس کے چہرے کے اور پاس ہو گئی مگر بچی کی آنکھوں کی کیفیت نہیں بدلی۔ ماں نے اسے بازوؤں میں لےکر کلیجے میں بھینچ لیا مگر ایسا لگتا تھا کہ وہ کچھ محسوس نہیں کر رہی ہے۔

اناخان نے اس کا منھ اپنی طرف گھمایا اور اسے چومنے لگی۔

"میری جان، تجھے کیا ہوا ہے۔ دیکھو میں ہوں، تیری امی۔ تو مجھے دیکھ رہی ہے نا؟ سن رہی ہے میں کیا کہہ رہی ہوں؟ میں ہوں تیری امی، تیری امی..."

تورسنائی نے کوئی جواب نہیں دیا، چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑکر دیکھتی رہی جیسے نیند میں کھوئی ہوئی ہو۔

بشارت اپنی بہن کو ایک ٹک گھورے جا رہی تھی، اس نے اپنے آپ کو گیند کی طرح گڑمڑ کر لیا تھا، بہن کو دیکھتے ہوئے اسے سانس لینے کی مشکل سے ہمت پڑ رہی تھی۔ ہائے کیا ننھی، شرمیلی، پیاری تورسنائی اب کبھی نہیں کہے‌گی:

"پیاری امی"۔ کیا وہ اور اس کی امی اب کبھی تورسنائی کی صاف، پیاری، دل میں اتر جانےوالی آواز نہ سن سکیں گی؟

"امی، ھائے اس کی آواز بند ہو گئی ھے! وہ بول نہیں سکتی، امی" بشارت سسکیاں بھرنے لگی۔

اناخان بھی تورسنائی کو سینے سے لگائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ھائے، یہ مجھے کس قصور کی سزا مل رہی ھے؟ کس قصور کی... میری پیاری، منی بیٹی، میری مسرت، میری خوشی، میری گاتی چھکتی بلبل... آہ، میں نے کیا کیا ھے جو یہ دیکھنا پڑ رہا ھے؟"

عنظیرت پھرتی سے اٹھی، ایسی پھرتی جو اس کے لئے غیرمعمولی تھی، وہ اپنے جھریوں‌دار ھاتھ آگے بڑھاتی ہوئی اناخان کے پاس پہنچی اور اس نے اسے اور اس کی بچی کو ایک ساتھ اپنے سینے سے لگا لیا، اس کی آواز میں شدید غصہ تھا جس سے عام طور پر وہ لوگوں کو منع کیا کرتی تھی۔

"اناخان پیاری، یہ تو ٹھیک ھے" اس نے دوزانو ہوکر کہا ــ "میں ایک بےکار، کھوسٹ بڑھیا ہوں، میرے دن اب گنتی کے ھی رہ گئے ھیں پر تو سچ بات ھی کہوں‌گی! ھزار شیخ کی قبر ہمیشہ پاک رہے، اس پر رحمت ہو، مگر اس کے محافظین کو کوئی حق نہیں کہ وہ بچوں کو ھاتھ لگائیں! بچے فرشتوں کی طرح معصوم ہوتے ھیں۔ مائیں بچوں کی حفاظت کرتی ہوئی جان دے دیتی ھیں۔ مائیں اپنے بچوں کے لئے کتنی تکلیفیں اٹھاتی ھیں، ان سے پیار کرتی ھیں، ماں کے گناھوں کا اثر بچوں پر کیوں پڑے، گناہ بھی تو مائیں بچوں کی خاطر ھی کرتی ھیں۔ کہو، ٹھیک کہتی ہوں نا؟"

جوراخان اٹھی، بڑھیا کے پاس گئی جو دوزانو تھی اور اسے ٹھیک سے بٹھایا۔ دادی عنظیرت نے بیٹھنے کے بعد بیان کیا کہ تیشیک قاپ‌قاق کی پہنچی ہوئی عورت نے فاتحہ‌خوانی کے موقعے پر کیا کیا اور کہا تھا۔

جوراخان نے بس اتنا ھی پوچھا:

"مگر دادی اماں، کس قسم کی فاتحہ‌خوانی تھی؟"

دادی عنظیرت اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکی۔

"اب یہ تو میں کیا کہہ سکتی ہوں بیٹی، مجھے خود ہی خبر نہیں" پھر حسب‌عادت بڑبڑانے لگی: "شکر اللہ... شکر اللہ!"

جوراخان، اناخان کے پاس بیٹھ گئی، اس کے کہنے سے اناخان نے پھر تورسنائی کو اچھی طرح کمبل سے ڈھک دیا۔ وہ اداس مگر مضبوط لہجے میں بولی:

"اب تم کل نہیں جا سکتیں، مجبوری ہے... جب تک تورسنائی بالکل ٹھیک نہ ہو جائے یہاں تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ تم پریشان نہ ہونا، گروپ کا چارج حاجیہ کے ہاتھ میں رہے گا، ویسے اس کے لئے یہ کام مشکل تو ہے مگر..."

حاجیہ نے گھبراہٹ میں ہاتھ ہلائے مگر جوراخان نے اس کی ایک نہ سنی۔

"اچھا اب میں تم سے رخصت ہوتی ہوں، مجھے جانا ہے۔ حاجیہ کو اپنے ساتھ لیتی جا رہی ہوں۔"

اب کہیں جاکے اناخان سمجھی کہ جوراخان کا دراصل مطلب کیا تھا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ابھی مت جائیے! صبح ہونے دیجئے، روشنی نکل آئے تب جانا۔ نہیں، میں آپ کو نہیں جانے دوں‌گی، کسی قیمت پر نہیں، وہ لوگ تو ایسے موقعے کے انتظار ہی میں ہیں۔"

جوراخان نے اسے گلے لگاکر اس طرح پیار کیا جیسے وہ کوئی بچہ تھی۔

"اوسان برقرار رکھو، اناخان، لوگوں کے سامنے مجھے شرمندہ نہ کرو۔ ایں؟ ٹھیک ہے نا؟ اچھا، چلو، آنسو پونچھو۔"

اناخان نے حاجیہ اور جوراخان کو پھاٹک تک پہنچاہا پریشان کھڑی ان دونوں کو دیکھتی رہی، دیکھتی رہی، یہاں تک کہ وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں اور چاند کی ٹھنڈی سیاہی‌مائل سفید روشنی میں کھو گئیں۔ پھر وہ بڑی دیر تک پھاٹک ہی پر کھڑی آہٹ لیتی رہی!

صبح کو عبدالصمد اور حلقے کے دوچار اور ممبران تورسنائی کو دیکھنے آئے۔

وہ ابھی تک بستر پر تھی، اپنے دوستوں کو دیکھ‌کر اس نے نہ کسی دلچسپی کا اظہار کیا، نہ ان کے سلام کا جواب دیا، انھوں نے اس کا نام لےکر پکارا تب بھی جواب نہیں دیا۔

اس کی آنکھیں اب کچھ صاف لگتی تھیں مگر نگاہیں اسی طرح ہر شے سے بےنیاز تھیں، کبھی کبھار کوئی تکلیف‌دہ پرچھائیں یوں اس کی آنکھوں میں تیرنے لگتی جیسے اسے کچھ یاد آ رہا ہو، اسے اپنے سامنے کچھ دکھائی دے رہا ہو اور جو کچھ نظر آ رہا تھا اسے وہ بڑے غور سے دیکھ رہی ہو۔

لمحے بھر کے لئے اس کی نظریں عبدالصمد پر ٹھہریں۔ اس کے ہونٹوں نے جنبش کرنے کی کوشش کی۔ اس نے گہری گہری سانسیں لیں مگر اس کی نظریں جیسے کہہ رہی ہوں "نہیں۔ میں نہیں بول پا رہی ہوں..."

عبدالصمد اور اس کے دوست، تورسنائی کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے اشارے پر کومسومول والوں نے دھیرے دھیرے ایک گیت چھیڑ دیا۔ انھوں نے تورسنائی کے پسندیدہ گیت کا انتخاب کیا تھا جو حمزہ کے بہترین اشعار پر مشتمل تھا۔

ایسا لگا کہ تورسنائی میں جان سی پڑ گئی ہے اور اس کی آنکھیں کچھ تلاش کر رہی ہیں، اس نے اپنے آپ کو ذرا سا اٹھایا بھی جیسے کہ وہ توجہ سے سن رہی ہو، پھر یکایک اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر دھر لئے، بستر پر دوہری ہوکر اوندھی گر پڑی اور تکئے میں منہ چھپا لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور ان میں اتنا دکھ اور اذیت نظر آئی کہ جیسے اب وہ تکلیف کی شدت سے چیخ پڑےگی۔ لیکن لب خاموش رہے۔

گیت رک گیا۔ کومسومول کے ممبران ششدر ہوکر اپنی گانے والی ٹولی کے لیڈر کو بےحد دکھ اور ہمدردی سے تک رہے تھے۔

انیسواں باب

ٹیچر نعیمی، چائے کے تاجر کے سامنے پرانے شہر میں اسی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ کمرہ ایک ایسی پھٹیچر سی جھونپڑی کا ایک حصہ تھا جہاں کوئی بھک‌منگا بھی دستک دیتے ہوئے ہچکچاتا۔ تنگ، تاریک اور گندہ جیسے لومڑی کا بھٹ۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے نعیمی کو یہاں بھی ذہنی یکسوئی حاصل نہ ہوتی تھی۔ گرم چائے پیتے ہوئے وہ غمگین ہو ہوکر سوچ رہا تھا۔ اس کا میزبان سور کے چمڑے سے مڑھے ہوئے ایک خوبصورت تھرماس میں سے، بار بار چائے انڈیل‌کر اس کو دیتا۔ تھرماس پر کوئی غیرملکی ٹریدمارک چھپا تھا۔ میزبان خود سنہری زرد رنگ کی برانڈی شراب کی چسکیاں بھرتا اور بار بار ہونٹ چاٹتا۔ وہ بہت ذرا ذرا سی برانڈی پی رہا تھا کیونکہ اس کے پاس اس شراب کا بہت کم ذخیرہ رہ گیا تھا اور اسے یہ گلہ شکوہ تھا کہ اب یہ شراب نایاب ہوتی جا رہی ہے۔

وہ ایک معمولی سا، گھٹیا سا دکاندار تھا مگر پھر بھی نعیمی جو کبھی سیاست‌داں، فلسفی اور انسانوں کے دماغ کا معلم مانا جاتا تھا، اس وقت بالکل اس کے چنگل میں گرفتار تھا۔ کبھی کبھی تو نعیمی اس بیرونی شہری کو یوں تکتا جیسے خرگوش بھیڑئیے کو... وحشی جانور کہیں کا... روسیاہ بدمعاش... اس نے ٹیچر کو اتنا خوفزدہ کر دیا تھا کہ وہ بے‌حد اذیت میں مبتلا تھا اور بالکل کچل گیا تھا۔ اور صرف اسی پر اس نے قناعت نہیں کی، جب وہ کمرے کے کسی کونے میں

چوھے کی سرسراھٹ پر بھی نعیمی کو لرز اٹھتے اور شانے جھکاتے دیکھتا تو اس کا مذاق اڑاتا۔

لیکن ایسے بھی لمحات آتے تھے جب لگتا تھا کہ چائے کے تاجر کو نعیمی سے خلوص ھے اور وہ نعیمی سے اس طرح پیش آتا جیسے وہ اس کا وفادار صلاح‌کار ھو۔ ان لمحات میں نعیمی کو محسوس ھوتا کہ یہ پراسرار اور خطرناک آدمی بھی اپنی جگہ پر بالکل تنہا ھے پھر حیرت کیا ھے کہ اس نے بھی نعیمی کے ساتھ اپنے اس پسندیدہ گوشے، اس بل میں پناہ لی ھے، آخر اسے بھی تو خوف نے اذیت میں مبتلا کر رکھا ھے۔ خفیہ، للچائی ھوئی نظروں سے اسے دیکتے ھوئے نعیمی کی توجہ چائے کے تاجر کے ھاتھوں پر مبذول ھو گئی جن سے وہ چائے اور برانڈی انڈیل رھا تھا۔ اور نعیمی کو یہ دیکھکر خوشی ھوئی کہ اس کے ھاتھ کچھ کانپ سے رھے تھے۔

"آج کون سا دن ھے؟" چائے کے تاجر نے چاندی کے چھوٹے سے جام کو اپنے ڈورے جیسے پتلے ھونٹوں تک لاتے ھوئے پوچھا۔

نعیمی اس غیرمتوقع سوال پر کچھ حیران ھوا مگر فوراً اس کا مطلب سمجھ گیا، تاجر کے ھونٹ آھستہ آھستہ سکڑنے لگے۔ وہ بےآواز ھنسی ھنس رھا تھا۔ واقعہ تو یہ تھا کہ اس کے لئے ھنسنے کی کوئی بات نہ تھی بس بن رھا تھا، اداکاری دکھا رھا تھا — اب کوئی نہیں تھا جس کا وہ مذاق اڑا سکتا۔

نعیمی نے کچھ کھوئے کھوئے انداز میں اخلاق کے ساتھ اس کی بات کا جواب دیا، تاجر کے ساتھ وہ کوئی اور رویہ رکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

"نصرت‌اللہ سے تو ھم ٹھکانے سے نپٹ چکے" چائے کے تاجر نے روکھےپن سے کہا۔ "اس کا طرز عمل میری توقع سے کچھ بہتر ھی رھا۔ کیا خردماغ ھے! لیکن خیر، وہ بہت سے ذھین لوگوں سے جنھیں میں جانتا ھوں، زیادہ مفید ثابت ھوا۔ آخرکار میں نے شکاری کتوں کو بو کے سراغ سے ھٹا ھی دیا، بھٹکا ھی دیا، وہ نصرت‌اللہ‌والی چال کو آسانی سے نہیں سمجھ

سکیں گے۔ البتہ ایک بدتر بات اور ہو گئی ہے: انہوں نے ایک سراغ اور پا لیا ہے اور ہمارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ میں تو ان کو بالکل اپنی پیٹھ کے پاس محسوس کر سکتا ہوں۔"

نعیمی کا رنگ اڑ گیا، اس نے پیالہ رکھ دیا۔

"آپ کو مجھ سے تو کوئی شکایت نہیں ہے..."

"نہیں، ابھی تک تو نہیں ہے۔ میں تو اس تیشیک قاپ‌قاق‌والی عورت کے متعلق سوچ رہا تھا۔"

"مگر وہ... اس نے کیا کیا ہے؟ سچ پوچھئے تو میں تو اس کے فن کا قائل ہو گیا، اس کے ذریعے وہ ایسی چیزوں کے متعلق باتیں کر سکتی ہے جن کا ذکر کوئی ٹیچر نہیں کر سکتا۔ اور بظاہر یہ محض جادو ٹونا، جھاڑ پھونک لگتا ہے۔"

چائے کے تاجر نے اپنی بوتل روشنی میں کی۔

"ارے وہ کمبخت گائے، وہ تو حد سے آگے نکل گئی۔ انتہا سے زیادہ چالاکی اور مہارت دکھائی۔ اس نے تو بچوں کو بھی اس میں پھنسا لیا..."

"ہاں، یہ تو ٹھیک ہے۔ شاید اب اسے روپوش ہو جانا چاہئے۔"

"ہاں، ایسا ہو تو بہت ہی اچھا رہے مگر مجھے اس میں شبہہ ہے کہ وہ اب بچ کے نکل سکتی ہے۔ تمہیں پتہ ہے روسی لوگ کس طریقے سے بھیڑیوں کا شکار کرتے ہیں؟ بھئی، یہ پہنچی ہوئی عورت اب چاروں طرف سے گھر چکی ہے۔ یہ علاج کرنے‌والی عورت کافی الجھن میں پھنسی ہوئی ہے اور وہ ہم سب کو بھی لے ڈوبے گی۔"

"تو پھر آپ کے خیال میں اب کیا کرنا چاہئے؟"

چائے کا تاجر خاموش رہا، نعیمی لرزنے لگا۔

"آپ کہیں تو میں جاکر اس کو ہوشیار کر دوں؟"

"نہیں، نہیں" تاجر سختی سے بولا۔ "میں اپنے آدمیوں سے خود ہی نبٹتا ہوں۔ میرا یہی اصول ہے۔ ہمیں چاہئے کہ..." اور اس نے جام کو بوتل سے ٹکرایا۔ "ہمیں چاہئے کہ خاتمہ ہی کر دیں۔"

"کس کا خاتمہ؟"

"سراغ کا — نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"

نعیمی اس قدر خوفزدہ تھا کہ اس نے اور کچھ نہیں پوچھا۔ انتظار کرتا رہا کہ تاجر خود ہی کچھ وضاحت کرے، کہ وہ کیا چاھتا ھے لیکن تاجر نے کچھ ایسا تاثر دیا جیسے وہ اپنی بات کی کافی وضاحت کر چکا ھے۔

"دسویں جولائی کا ذرا خیال رکھنا تم" اس نے نعیمی کو یاد دلایا اور پھر لب کھولے بغیر، منھ ہی منھ میں بولا: "کبھی بھی کوئی نشانے سے اتنا نزدیک نہیں پہنچتا ھے جتنے کہ تم۔ مجھے یقین ھے کہ تم مہارت اور صفائی سے کام کرنا جانتے ھو اور اس معاملے میں اپنی لاج رکھوگے۔ اپنی یہ چھڑی ذرا گھر ہی پر چھوڑ دینا، ھو سکتا ھے کہ اتفاقاً کہیں تم سے گر جائے۔ عین وقت پر ہیجانی لمحے میں... بہت ھوشیار رھنا کہ تم کوئی نشان یا سراغ نہ چھوڑو جس سے تمہارا پتہ چل جائے۔"

نعیمی نے ایک بار پھر کھسیائی ھوئی نظروں سے اس کی بات کا جواب دیا۔

اور پھر اس نے ایک رات آنکھوں میں کاٹ دی، منھ تک کمبل اوڑھے، وہ مٹھیاں بھینچ بھینچ کر اپنے سینے پر مارتا اور دل میں قسمیں کھاتا کہ ایک نہ ایک دن وہ اس کمینے پردیسی تاجر سے ایسا بدلہ لے گا، ایسا بدلہ لے گا... ساری رات اس کو یہ سوچتے گزر گئے کہ ان الفاظ کے کیا معنی تھے: "میں اپنے آدمیوں سے خود ہی نبٹتا ھوں" اور "سراغ کا ہی خاتمہ کر دیا جائے"؟

اگلا دن اپنے ساتھ اس کا جواب لایا۔

اتفاقاً نعیمی عورتوں والی دکان کے پاس سے گزر رہا تھا، حسب معمول شہر کے تمام حصوں سے عورتیں وھاں اکٹھا تھیں لیکن آج وہ روز سے زیادہ شور و غل مچا رہی تھیں، بہتوں نے اپنے چچوان اتار دئے تھے یا پیچھے کو ڈال لئے تھے تاکہ جو کچھ کہا جا رہا تھا اس کا ایک ایک لفظ سن سکیں۔ ایک لمحے کا بھی وقفہ دئے بغیر ساری عورتیں

میناؤں کی طرح مسلسل چوں چوں کئے جا رہی تھیں، ہوا میں بس ان کی ہی آوازوں کی گونج تھی۔

ایک لمبی سی عورت نے جو گود میں بچہ لئے، باہری دائرے میں کھڑی منھ میں رال چپڑ چپڑ کر رہی تھی، اپنے ہاتھ کے اشارے سے ناراضگی ظاہر کی اور بظاہر بڑی بےنیازی سے بولی:

"مجھ سے کیا مطلب ہے! جسے جانا ہے اس بےکار زمین کو سو میری جوتی سے، کل کا جاتا آج ہی چلا جائے، میں تو نہیں جاؤں گی، دیکھنا ہے کیا ہوتا ہے۔"

بوڑھی عنظیرت نے بچے کو اس کی گود سے لے لیا۔

"اگر مجھے ٹھیک یاد ہے تو جب کوآپریٹو کھل رہا تھا تب بھی تم نے کہا تھا کہ ابھی تو تم دیکھوگی کہ کیا ہوتا ہے مگر اسے کھلے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ تم بچے کو لٹکائے کوآپریٹو میں آ پہنچیں۔"

"ہاں، ہاں، تو پھر کیا ہوا؟ آ گئی تو کیا ہوا؟ کوآپریٹو تو اور بات تھی اور ہمارے بزرگوں کی مقدس قبروں کو کھودنا، باپ دادوں کے قبرستان میں ہل چلوا دینا تو بالکل اور بات ہے۔"

عنظیرت نے آستین سے پہلے بچے کی ناک پونچھی، پھر اپنی۔

"بیبیو، میں تم لوگوں کو ایک کہانی سناتی ہوں۔ اگر وہ تم میں سے کسی پر چپک جائے تو برا مت ماننا۔"

فوراً ہی عورتیں عنظیرت کے گرد جمع ہو گئیں۔

"ہاں ہاں، سنائیے، ضرور ہم لوگ کہانی سنیں گے۔"

عنظیرت نے اپنے جھریاں پڑے ہونٹ، اپنے ہاتھ کی پشت سے پونچھے۔

"بہت بہت پرانے زمانے کی بات ہے، پرندوں اور دوسرے جانوروں میں ایک بحث اٹھ کھڑی ہوئی، ایک چمگادڑ، کمر پہ ہاتھ رکھے الگ کھڑی رہی کہ دیکھیں، کون جیتتا ہے۔ جانور جیت گئے تو وہ ان کے پاس گئی اور اپنے دانت اور کان اور چھاتیاں دکھاکے بولی: "دیکھو، میں تمہاری طرح

ہوں، میں پرندہ نہیں ہوں!" جانوروں نے سوچا ٹھیک ہے، پھر کچھ دن بعد پرندے جیت گئے۔ چمگادڑ نے بہت سوچا اور تو وہ پرندوں کے پاس پہنچی اور اپنے پر دکھاکے کہنے لگی: "دیکھو، میں تو پرندہ ہوں!" اور پھر عنظیرت نے ایک آہ بھری۔ "وہ بےچاری بار بار کبھی ادھر جاتی، کبھی ادھر، یہاں تک کہ دونوں سمجھ گئے کہ وہ مکار ہے اور اس کو دھکے دےکر نکال باہر کیا، اس وقت سے وہ اندھیرے کونوں، کھدروں اور کھنڈروں میں الٹی لٹکی رہتی ہے اور چونکہ کسی کو منھ نہیں دکھا سکتی اس لئے صرف رات کو نکلتی ہے۔۔۔"

سب عورتیں ہنسنے لگیں اور پھر زور زور سے باتیں کرنے اور اپنی آوازوں کو ایک دوسرے سے اونچا لے جانے کی کوشش کرنے لگیں۔

"واہ دادی شکر اللہ، وہی ایسی بات کر سکتی ہیں!"

"دادی اماں نے اسے اچھا کھونٹی پر سے اتارا!"

"خالہ خال‌بو، کیا تم ہی وہ چمگادڑ ہو؟!"

"ہاں، اب یہ دیکھیں گی کہ کیا ہوتا ہے! یہ تو ایسا کریں گی ہی۔"

خال‌بو نے بچے کو دادی عنظیرت کی گود سے لے لیا: وہ کلکاری مار کے ہنسنے لگا، سیاہ آنکھیں چمکنے لگیں، پوپلے مسوڑے دکھائی دینے لگے، ماں نے غصے میں آکے کولھے پر ایک تھپڑ دیا۔

اب یہ بحث کرتی شور مچاتی بھیڑ دکان کے برآمدے میں آ گئی۔

ایک نوجوان عورت، بھونرا سے سیاہ بال، پسینے سے تر کنپٹیاں، برآمدے میں پریشان بےقرار کبھی سیڑھی چڑھتی، کبھی اترتی چیخ چیخ کر کہتی جا رہی تھی:

"میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی ساس کو وہاں لے جاکر دفنایا! اب میں وہاں جاؤں‌گی اس کی قبر کھودنے؟ میں تو خود دفن ہو جاؤں‌گی پر ایسا کبھی نہیں کروں‌گی۔ اللہ کرے جو لوگ میری ساس کی قبر کھودیں ان کے ناک کان کٹ جائیں!"

"ارے اللہ، یہ کیسی کیسی بری بری باتیں بک رہی ہے..."

"پر ٹھیک تو کہتی ہے، وہ تابعدار بہو تھی، اس کو برا نہیں لگے گا؟"

دادی عنظیرت بھیڑ کو ڈھکیلتی آگے بڑھی اور اس نوجوان عورت کی آستین پکڑی۔

"ذرا مجھے بتا، تجھ سے کس نے کہا ہے کہ کوئی قبر کھود، بتا مجھے؟"

لیکن جوان عورت نے اس کا کمزور ہاتھ جھٹک کر پرے ڈھکیل دیا اور اچھل کر برآمدے کے اندر چلی گئی۔

"خدا کا شکر ہے کہ میری آنکھیں اور کان سلامت ہیں، دیکھ سکتی ہوں، سن سکتی ہوں! ذرا سوچئے تو، یہ لوگ قبرستان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں... یہ گناہ کی دیواریں کھڑی کر رہے ہیں — عورتوں کی مل! اس مقدس پاک مقام کو مٹاکر! اور شروع کس نے کیا؟ اناخان نے، اس کوآپریٹو میں جاکر وہ اپنا دین ایمان بھول گئی اور میں تو کہتی ہوں کہ اس پر خدا کا قہر یوں ہی نہیں نازل ہوا ہے۔ روز اس پر ایک نئی آفت آن کھڑی ہوتی ہے۔ یہ کون نہیں جانتا؟ سب ہی جانتے ہیں! مرنے سے بچ گئی تو بس ایک معجزہ ہی تھا کہ خدا نے رحم کیا، جان بخش دی! لیکن وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی، اب اس کی بیٹی پر قہر ٹوٹا ہے۔ اس کی زبان ہی گونگی ہو گئی ہے کیونکہ بیٹی بھی ماں کے راستے پر چل رہی تھی، ہزار شیخ کے مقبرے کے پاس اس نے ایک گندہ گیت گایا اور زبان ہی رہ گئی، خدا نے اس کی گناہگار زبان پر بجلی گرائی۔"

"میری عزیز بہنو، اس پہنچی ہوئی، اس عقلمند عورت کی پیشین‌گوئی صحیح ثابت ہو رہی ہے!" ایک لنگڑی بوڑھی عورت پاگلوں کی طرح چلائی۔ "اے حق‌تعالی، اے قادر مطلق، اپنے بندوں کو ایمان سے محروم نہ کر۔ گناھگارو، شریعت کو، پاک شریعت کو یاد رکھو!.."

دادی عنظیرت کانکھتی کونکھتی اپنے کو گھسیٹتی،

سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں پہنچی، جوان عورت کو الگ ڈھکیلا اور اپنی کمزور آواز سے جتنا چیخ سکی اتنی زور سے کہنے لگی:

"تم لوگوں کو کیا حق ہے کہ اناخان کو نام دھرو، تم میں سے کسی کو بھی یہ حق نہیں۔ یہ سب جھوٹ ہے اور جھوٹ کے علاوہ کچھ نہیں! سنو، بیبیو، میری بات سنو، اناخان کو دشمن نے چھری ماری تھی اور اس کی بچی کو اسی عورت نے دھلایا ہے، اسی پہنچی ہوئی عورت نے۔ اور اس کے علاوہ سن لو کہ وہ کچھ پاک واک کچھ بھی نہیں ہے، اس کی قبر کو آگ لگے!"

عنظیرت کی کمزور آواز بہت سی غصہ بھری آوازوں کے شور میں ڈوب گئی۔

"بڑی کمبخت عورت ہے یہ!"

"ارے تجھے خبر بھی ہے کیا کہہ رہی ہے، خدا تجھے اپنی پناہ میں رکھے!"

"پہنچی ہوئی عورت کی شان میں ایسے الفاظ!"

"یہ اس کی زبان کیسی چل رہی ہے، ہو کیا گیا ہے اسے؟"

"سٹھیا گئی ہے بڑھیا!"

"اناخان نے سکھا پڑھا بھیجا ہوگا۔"

"خود تو ڈر کے مارے منھ چھپاکے بیٹھ گئی۔"

"ارے دوہری چوٹ پڑی ہے نا۔ پہلے خود، پھر بیٹی..."

"ٹھیک ہوا، اس کی یہی سزا ہے!"

مگر بوڑھی عنظیرت نے میدان نہیں چھوڑا۔ اسی طرح ڈٹی رہی۔ اس خیال نے اس کو عجیب سی طاقت دے دی کہ وہ سچائی پر ہے، ذرا دم لےکر اس نے غصے میں پھر چیخنا شروع کیا:

"مجھے ذرا یہ بتاؤ کہ تمہاری اس پاکباز عورت کو کیا ہوا؟ وہ کہاں غائب ہو گئی ہے؟ اس کا حشر کیا ہوا، یہ ذرا بتاؤ! سچ سچ بتاؤ، یہاں سب کے سامنے!"

ایک دم خاموشی چھا گئی اور نعیمی کو بھی عنظیرت کی

بات سنائی دینے لگی حالانکہ وہ سڑک کی دوسری جانب کھڑا تھا۔

"اس نے تو قبریں نہیں کھدوائی تھیں، ملیں نہیں بنوائی تھیں، اس نے تو ہمیں کوآپریٹو میں نہیں بلوایا، ہمیں کام نہیں دلوایا کہ ہم اپنے بچوں کا پیٹ بھر سکیں۔ وہ تو ہم سے اولیا کی بات کرتی تھی، اپنے محافظ ولی سے دعا مانگتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے منہ سے جھاگ نکل آتا تھا۔ میں نے خود اسے دیکھا ہے اور ولیوں نے کیا خوب اس کی حفاظت کی۔ ہاں، میں تمہیں بتا سکتی ہوں، ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔"

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اگر اناخان پر اولیا کا ہی قہر نازل ہوا ہے تو پھر تمہاری اس پاک عورت کو جو کچھ ہوا اس کے لئے کیا جواز پیش کروگی؟ کوئی بتائے گا مجھے؟"

"کیا؟ کیا ہوا؟ اس کو کیا ہوا ہے؟"

"وہ کتے کی موت مر چکی ہے، یہ ہوا ہے تمہاری بڑی پاکباز پہنچی ہوئی کو! دیکھا!"

نعیمی ایسا گم سم ہو گیا اور اتنا سہما ہوا سن رہا تھا کہ لاشعوری طور پر آگے بڑھتا ہوا وہ عورتوں کے نزدیک پہنچ گیا۔

"ہاں، ہاں، کتے کی موت" عنظیرت نے دوہرایا۔ "بستر ہی میں کسی نے چھرا بھونک کر ٹھکانے لگا دیا، شکر اللہ! اور آپ لوگوں کو پتہ ہے اس کے گھر میں کیا ملا؟ ڈیڑھ پونڈ افیون۔ یہ ملا تلاشی لینے والوں کو! میں پوچھتی ہوں کسی پاکباز عورت کو افیون سے کیا مطلب ہے؟ کیا پاکباز اور پہنچے ہوئے لوگ افیون کا کاروبار کرتے ہیں؟"

مجمع میں ایک بھنبھناہٹ یوں پھیل گئی جیسے خشک گھاس میں ہوا سرسرائے!

"افیون؟"

"ذرا سوچو تو ڈیڑھ پونڈ افیون!"

"تو کیا اس بدعنوانی کے لئے آپ لوگ اسے معاف کر دیں گی؟" عنظیرت نے پوچھا۔

"ارے تو اب یہ کسے معلوم تھا؟"

"کیسی گھٹیا حرکت..."

"میں تو کہتی ہوں ڈوب مرنے کی بات ہے۔"

"وہ ہم سب کو بےوقوف بناتی رہی، ہم پر ہنستی، ہمارا مذاق اڑاتی رہی... ہمارے ایمانوں کا تمسخر کرتی رہی، ایماندار لوگوں کو رسوا کرتی رہی، کمزوروں کو دھمکاتی اور معصوم بچوں کو خوفزدہ کرکے، ان کو پاگل بناتی رہی۔ جو کچھ ہوا اسے یاد رکھو۔ وہ کیا کوئی پیغمبر تھی؟ اور پھر یہ بھی سوچو کہ کس نے اسے قتل کیا اور وہ بھی بستر میں..."

اب تو نعیمی لڑھکتا پڑھکتا، ایک بار بھی پیچھے دیکھے بغیر سڑک سے بھاگا۔

نکڑ کے ایک مکان سے ایک چھوٹی سی لڑکی ننگے پاؤں باھر نکلی اور تقریباً اس کے کان میں چیخی:

"السلام علیکم ٹیچر!"

نعیمی ایسا اچھل کر اس سے دور ہٹ گیا جیسے کسی پھاٹک پر پہرہ دیتے ہوئے کتے سے کوئی فقیر اچھلے۔ وہ دانت پیس کر بولا:

"تیرے باپ کی قبر پر تھو ہے!"

سارے دن وہ چلتا رہا، یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ اس کی پیٹھ پسینے سے بھیگ گئی، منہ سوکھ گیا، لب خشک ہو گئے مگر وہ اس پہنچی ہوئی عورت کے گھر کے آس پاس کی گلیوں کے چکر کاٹتا رہا۔

ھاں، وہ تھی تو بےشک بڑی چالاک۔ اگر اس کے گھر میں سے سونا، کافی سونا، برآمد ہوتا تو بھی نعیمی کو کوئی تعجب نہ ہوتا۔ چائے کا تاجر اس سونے کو بھی ھاتھ نہ لگاتا جیسے کہ اس نے افیون کو بھی نہیں لگایا تھا۔ وہ بہت جلدی میں رہا ہوگا۔ بدمعاش۔ لیکن یقیناً اس نے کوئی نشان ایسا نہ چھوڑا ہوگا جس سے اس کا پتہ لگایا جا سکے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہو سکتا تھا۔ کیسا پکا گنڈہ تھا وہ۔ پھر اس کے متعلق فکر کی کیا ضرورت تھی۔

سب سے اہم بات یہ تھی کہ جو اصلی مرد ہو اسے اوسان قائم رکھنے چاہئیں۔ ویسے دیکھا جائے تو وہ تھی ہی کیا - ایک معمولی سی عورت اور بس۔ نعیمی کی وہ کیا لگتی تھی؟ نعیمی نے تو کبھی اس کے ہاتھ کی ایک پیالی چائے بھی نہیں پی تھی اور پھر یہ بھی ہے کہ آدمی کو جو کچھ کرنا ہو مضبوطی کے ساتھ ٹھیک ٹھیک کرنا چاہئے۔ وہ ان سب کا ہی بھانڈا پھوڑ دیتی تو کیا ہوتا۔ چلو اچھا ہی ہوا کہ بڑے وقت سے اسے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا گیا...

ویسے تو نعیمی بھی اتنی دور نکل آیا تھا کہ اسے اپنے اوپر کوئی اختیار باقی نہ رہ گیا تھا۔ اس کی زندگی اور اس کے ارادے سبھی کچھ قسمت پر منحصر تھے لیکن بہرحال جب تک وہ زندہ رہے گا عقل کا راستہ اپنائے گا: "تم نے کچھ دیکھا؟" "نہیں..."

بیسواں باب

دسویں جولائی کو نقاروں کے پٹنے اور سرنائی اور کرنائی کی پکار اور ہوحق کے خروش سے شہر کی نیند ٹوٹی۔ اور صبح کی پہلی کرن نے لوگوں کے ہجوم سڑکوں پر اکٹھے ہوتے دیکھے، گانا بجانا، شور قہقہے! بچے بانسریوں میں سے تیز آوازیں نکالتے ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے، جھنڈوں، جھنڈیوں، لہریوں اور تختوں کو اٹھائے ہوئے بےشمار لوگ ہر طرف سے نکل نکل کر نعمانچہ کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ بیل گاڑیاں تھیں جن میں پھاوڑے، کدالیں اور پرات اور مٹی ڈھونے کے چھوٹے چھوٹے ٹھیلے تھے۔ جب یہ لوگ

بازار سے گزرے تو مخمل کی ٹوپیاں لگائے دکاندار اپنی چھوٹی چھوٹی دکانوں سے جھانکنے لگے۔ عوام کے سمندر نے ان کو بھی اپنے ساتھ لے لیا جیسے کہ وہ اپنے راستے میں آنےوالے ہر شخص کو اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہا تھا۔ چاہے وہ سڑکوں پر ہوں، چاہے چائےخانوں اور احاطوں میں۔

ایک گھنٹے سے بھی کم میں وہ بےکار زمین اور شیر کی پہاڑی جسے دھماکوں سے پہلے ہی مسطح کر دیا گیا تھا، ایک سرے سے دوسرے تک لوگوں سے بھر گئی۔ جدھر نظر جاتی تھی عورتوں کے سروں کے رنگین انیلے، لال رومال اور مردوں کے دمکتے ہوئے تانبے سے بدن دکھائی دیتے تھے۔ مردوں نے قمیضیں اتار دی تھیں اور کمر تک ننگے تھے۔ پھاوڑوں اور کدالوں پر سورج کی کرنیں چمک رہی تھیں۔ سرخ فوج کے دستے قبرستان کے قریب تعینات تھے کیونکہ وہ بھی مدد دینے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ لوگ آتے ہی چلے جا رہے تھے، شوروغل بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"ارے واہ بھئی، یہ ہو کیا رہا ہے؟" دوبروخوتوف بار بار کہتا۔ وہ خوش بھی تھا اور پریشان بھی۔ "ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ میں نے تو اپنی زندگی میں ایسا کبھی نہیں دیکھا۔"

"یہ خاشار* ہے، قومی خاشار!" ایرگاش بولا۔ "ویسے یہ روایت قدیم ہے البتہ آج اس کا مقصد بالکل نیا اور جدید ہے۔"

وہ دونوں، فورمینوں اور ورک مینیجروں کے ایک تنگ حلقے میں کھڑے تھے۔ وہیں کام کے منتظمین بھی تھے، اور جو لوگ، دوسرے لوگوں کو جمع کرکے لائے تھے، وہ اپنی اپنی ٹولیوں کے لئے کام سپرد کئے جانے کی جلدی کر رہے تھے۔ بعض تو اتنے بےصبر تھے کہ انہوں نے انجینیر کی آستین پکڑکر کھینچی۔

---

* کسی کام کو اجتماعی طور پر کرنے کے لئے باہمی تعاون۔ اڈیٹر۔

"باری باری سے، ایک ایک کرکے بھائی، ایک ایک کرکے" انجینیر نے اپنے نقشوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر کیوں، ہم تو سب سے پہلے آئے ہیں، ہم پہنچے تھے تو یہاں کوئی تھا ہی نہیں۔"

"بات یہ ہے کہ آپ کے ساتھ جو لوگ آئے ہیں ان میں زیادہ‌تر جوان ہیں۔ ہیں نا؟ آپ لوگ یہاں سب سے زیادہ مضبوط لوگ ہیں..."

"تو پھر آپ ہمیں کام بتا دیجئے نا، آپ تو ہمیں لٹکائے ہوئے ہیں۔"

"ذرا ٹھہر جائیے۔ آپ کو زیادہ مشکل‌والے حصے پر لگایا جائے گا۔"

"اور ایسا کام دیا جائے گا جس کو کرکے آپ زیادہ احترام حاصل کریں گے" یفیم دانیلووچ نے کہا۔

"معاف کیجئے گا، زیادہ احترام کا کیا مطلب ہوا؟" ایک ٹولی کے لیڈر نے کہا۔ "کیا لانگ بوٹ بنانےوالے کسی سے کچھ کم ہیں؟"

"بگڑئیے نہیں، بگڑیے نہیں۔ آپ سب کو کام کرنا ہے۔ ہم کسی کو نظرانداز نہیں کریں گے۔ کام کافی ہے اور آپ لوگوں کے کرنے بھر کا سب کو دیا جائے گا مگر بعد میں کچھ نہ کہئے گا!"

"لانگ بوٹ بنانے والوں کو تو بس ایک ہی شکایت ہے اور وہ یہ کہ ان کے پاس کبھی بوٹ نہیں ہوتے..."

دھیرے دھیرے آوازوں کا غل رک گیا، گانا بجانا تھم گیا، پھر سب کے لئے کافی جگہ ہو گئی اور کام شروع ہو گیا۔

"کامریڈ سلطانوف" جوراخان، ایرگاش سے مخاطب ہوئی۔ "مجھے ایک ذاتی سوال کرنا تھا: تم نے وہ خط لکھ دیا؟"

"وہ سیمنٹ کے لئے؟ تاشقند لکھنا تھا نا؟ جی ہاں، بےشک!"

"نہیں، ماسکو۔"

21 — 2710

ایک منٹ کے لئے ایرگاش کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔

"دیکھئے، سچی بات تو یہ ہے" اس نے کہا، "میں گزشتہ رات گھر ہی نہیں گیا، وھیں باناتوں والے دفتر میں ایک میز پر سو گیا تھا۔ کھانا کھانے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ آج ضرور لکھ دوں گا، وعدہ رہا۔"

"لکھ کیا دوگے، اگر میں تمھیں یاد نہ دلاتی تو تمھیں کبھی یاد بھی نہ آتا" جوراخان اس کو ڈانٹنے لگی۔ "تم اپنی ماں سے منٹ بھر کو ملے اور پھر اس سے الگ ہو گئے۔ اپنی ماں کو بھول جانا بڑی غلط بات ہے ایرگاش، ویسے تم چیف ہو جاؤ، چاھے جو بھی ہو جاؤ۔"

"یہاں تو بہت سی مائیں ہیں، جوراخان آپا" ایرگاش نے آنکھوں میں شرارت اور خوشی کی ملی جلی چمک پیدا کرکے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری تو سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ مجھے تو کبھی بھی ایسی امید نہ تھی۔"

جوراخان تعریف سے خوش ہوکر مسکرائی۔

"ھاں، دیکھ لو، بھلا آدھی تعداد تو ضرور عورتوں کی ہے۔ ایں؟"

"یہ پرنجے عورتوں کے لئے بڑی اڑچن ڈال رہی ھیں۔ پرنجے..." یفیم دانیلووچ نے کہا۔ "ورنہ ہم آسانی سے کہہ سکتے تھے کہ عورتوں کی رفتار تیزتر ہے!"

"بائے تو نوک دم بھاگ لیا" ایرگاش نے جھوٹ موٹ کا رنج ظاھر کرتے ہوئے بن کر کہا۔ "مجھے اسے ھاتھ میں پھاوڑا لئے دیکھنے کی حسرت ھی رہ گئی۔ لیکن اس کا بیٹا گھوڑے کی طرح کام اور محنت کر رہا ھے... دیکھا آپ نے؟"

شیر کی پہاڑی اور خالی زمین پر دھول کا بادل چھایا ہوا تھا۔ پہئے پتھروں سے ٹکرا رہے تھے۔ ٹھیلوں میں جب مٹی پھینکی جاتی تو دیر تک آواز ابھرتی رہتی۔ روڑے پتھر اور کنکر، لکڑی کے تختوں سے ٹکرا ٹکراکر کھڑکھڑاتے، ٹھیلوں کے بغیر تیل دئے پہئے چوں چر، چوں چر بولتے جاتے۔

کھیں قبرستان کے پاس سے کسی گدھے کی ہچکیوں جیسی کریہہ ڈھینچوں ڈھینچوں سنائی دی۔ اس پر خالی زمین کے ایک سرے سے دوسرے تک ھنسی کی لہر دوڑ گئی۔
"کھینچ بھئی، اور زور سے... ھاں ھاں" چلا چل لمبے کان، بڑے کان، درازگوش..."

عبدالصمد کے حصےوالی زمین کے ٹکڑے پر جھاڑیوں میں آگ لگا دی گئی، شعلے، چرچراتے سائیں سائیں کرتے ہوا میں اٹھے اور سیاہ، بدبودار دھواں بل کھا کھاکر رینگنے لگا۔ آگ نے کانٹےدار جھاڑیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور صرف راکھ اڑتی ہوئی چھوڑی۔ اور پھر وہ تمام سوراخ، دراریں اور گڈھے نظر آنے لگے جو اب تک نظروں سے پوشیدہ تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دھوئیں اور غبار میں پتھر بلکہ خود زمین بھی جل رہی ھے۔

دوپہیوںوالی چھے گاڑیاں کھڑبڑاتی ہوئی آ پہنچیں جو اپنے پچھلے حصے سے بندھے ہوئے لکڑی کے لمبے لمبے پٹڑے کھینچ رہی تھیں۔ یہ پٹڑے چھوٹے ٹھیلوں کے لئے راستے بنانے کے سلسلے میں لائے گئے تھے تاکہ ان پر سے گزرکر ٹھیلے آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکیں، پٹڑوں کو جلدی سے ان کی جگھوں پر پہنچا دیا گیا۔

بیل‌گاڑیوں‌والے، ڈھیر کے پاس جاکر حیران کھڑے رہ گئے، ان کی سمجھ ھی میں نہیں آ رہا تھا کہ گوڑے یہ ڈھیر نہ تو کانٹوں سے ہٹ سکتے تھے نہ بیلچوں سے، پھر کیا کیا جائے گا۔

"ارے بھئی، بڑے پھاوڑے لاؤ..."

"ارے یہ تو چٹانوں کی طرح سخت ھیں..."

"کیا کہا؟ تمہارے خیال میں یہ قیمتی سنگ‌مرمر؟"

"اگر اس میں آگ لگا دی جائے تو اچھا رھےگا مگر مشکل یہ ھے کہ یہ جلےگا ھی نہیں۔"

بعض نے گھورے کے ڈھیروں کے زیادہ قریب جانا چاھا مگر اتنی بدبو آ رھی تھی کہ وہ اسے برداشت نہ کر سکے اور پیچھے ہٹ گئے۔

پھر ایک گٹھیلا، تنومند بوڑھا جس کے بال سفید تھے آگے بڑھا، اس کے ھاتھ میں ایک بڑا سا پھاوڑا تھا۔

"خدا کا شکر ھے کہ آخرکار اب ھمارے محلے میں بھی صاف ھوا نصیب ھوگی۔"

وہ نعمانچہ کا رھنےوالا تھا، اس نے پھاوڑے کو گھماکر بڑے طیش میں ایک ڈھیر پر مارا۔

"دور ھو منحوس! اس کمبخت ڈھیر نے، اس گھورے نے مجھے پیدائش سے لےکر آج تک ٹھیک سے سانس نہیں لینے دی۔"

پھر سب نعرے لگاتے ھوئے اس ڈھیر پر پل پڑے۔

عورتیں کہیں جھاڑیاں اکھیڑ رھی تھیں اور کہیں کلھاڑیوں، گنڈاسوں وغیرہ سے جڑیں کاٹ رھی تھیں۔ وہ جھاڑیوں اور جڑوں کو زمین سے کھودکر اٹھاتیں اور آگ میں جھونک دیتیں۔

چار عورتیں ایک دوسرے کی کمر پکڑے شفتالو کی ایک جھاڑی اکھاڑنے میں لگی تھیں۔ وہ بڑی مضبوط تھی اور ان کی ھر کوشش کو بےکار کئے دے رھی تھی، پھر ایک موٹی سی جوان عورت بھی اس رسہ‌کشی میں جٹ گئی تب جڑیں ایک دم نکل آئیں اور پانچوں عورتیں ایک دوسرے پر ھنستی، چیخیں مارتی گریں۔ جوان موٹی عورت ایک دم کھڑی ھوکر باقیوں کو گدگدانے لگی: وہ انھیں اٹھنے نہیں دے رھی تھی۔

جوراخان دور کھڑی یہ سب کھلواڑ دیکھ رھی تھی اور اپنے دوستوں کی خوشی پر نہال ھوئی جا رھی تھی۔ وہ سب ایک ساتھ رہ‌کر کتنی خوش تھیں۔ وہ جب ایک ساتھ ھوتی تھیں، شانے سے شانے ملاتی تھیں، تو اس حالت سے جب وہ تنہا ھوتی تھیں کتنی مختلف نظر آتی تھیں۔

جوراخان نے ایک معمر عورت کو روکا جو اپنے کندھے پر، پرنجے میں لپٹی جھاڑیاں، پھینکنے کو اٹھائے لئے جا رھی تھی۔

"آپ کبھی نہ تھکیں!"

عورت نے گٹھری کی جھاڑیاں ایک ڈھیر پر پھینک دیں اور مڑی — وہ قمری تھی، اس کے بازوؤں پر جھاڑیاں اٹھاتے اٹھاتے سبز دھبر پڑ گئے تھے، چہرہ خاک اور پسینے سے تر تھا مگر آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

وہ سمجھ گئی کہ جوراخان کیا سوچ رہی تھی، چنانچہ اس نے زمین پر لوٹتی، ہنستی کھیلتی ٹولی کی طرف اشارہ کیا:

"ان بیچاریوں کو دیکھو بہن جوراخان، ہنسنا انہیں بھی آتا ہے۔ اور دھما چوکڑی مچاتی یہ کتنی اچھی لگتی ہیں۔"

"ہاں، انسانوں کی سی زندگی بسر کرنے کا انہیں بھی حق ہے، خالہ قمری" جوراخان نے کہا۔ "تمہاری ٹولی کا لیڈر کون ہے؟"

"بشارت، اناخان کی بیٹی، کیا ہی ہوشیار لڑکی ہے! اللہ کرے کہ حسین عورت نکلے وہ! اسے تو سب ہی کچھ معلوم ہے۔ ہم سب کو بتایا کہ کیا کیا کرنا ہے، سب کو کام بانٹے۔ "آپ کو پانچ ٹکڑے پورے کرنے ہیں، آپ کو چھے کرنے ہیں..."

"آپ سے اس نے کتنے ٹکڑے کرنے کو کہے ہیں؟"

"چھے۔ کہنے لگی آپ نعمانچہ کی ہی ہیں اس لئے یہ خصوصیت اور عزت آپ کو دی جائے گی۔ میں نے کہا نا کہ وہ اتنی ہوشیار ہے، جانتی ہے کس سے کیا بات کرنا چاہئے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اناخان یہاں نہیں ہے جو اسے دیکھتی، ہمارے اس جشن کو دیکھتی۔ اس وقت تو اس کے لئے کچھ بھی خوشی نہیں ہے۔ لو، وہ ہماری فورمین آ پہنچی!

بشارت بھاری لانگ بوٹ پہنے تھی جو ظاہر تھا کہ اس کے باپ کے رہے ہوں گے، ہاتھ میں ایک ناپنے کا فیتہ لئے تھی جو ساژین* کہلاتا تھا، فورمینوں کی طرح کان میں پنسل اٹکی ہوئی۔ اور اس کا چہرہ تمتا رہا تھا۔

---

* ایک پرانی روسی ناپ جو سات فیٹ کے برابر ہوتی ہے۔ اڈیٹر۔

جوراخان نے اس کی طرف یوں ہاتھ بڑھایا جیسے برابر والوں سے ملاتے ہیں۔

"کہو، تورسنائی کی طبیعت کچھ بہتر ہے؟"

"جی نہیں... اور میری کچھ سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ کیا کروں۔ کل رات امی تو سمجھیں کہ میں سو رہی ہوں تو پھر وہ تورسنائی کے پاس بیٹھکر بہت روئیں... ہائے، کس بری طرح روئی ہیں!"

بشارت کی آواز کانپ رہی تھی۔ قمری خالہ نے بھی چپ چاپ آنسو پونچھے۔

"آج شام کو بھائی عبدالصمد اور کومسومول کے لڑکے لڑکیاں خاشار میں آنے والے تمام لوگوں کے لئے گانے گائیں گے... کتنا اچھا ہوتا، ہائے کاش کہ تورسنائی بھی یہاں ہوتی۔" اور بشارت نے اپنا سر جھکا لیا۔

پھر کسی مردانی آواز نے اس کا نام لے کر پکارا، اس کا چہرہ ایک دم روشن ہو گیا اور اس نے بڑی شان کے ساتھ ہاتھ ہلاکر پرجوش طور پر آواز کا جواب دیا۔

"میں تو عورتوں اور مردوں کی ٹولیوں کے بیچ میں بالکل ٹیلیفون ہو رہی ہوں" اس نے مسرت کے ساتھ کہا اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

جوراخان نے قمری کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"آج جب کام ختم ہو جائے تو اناخان کے یہاں ضرور جانا، میں تو نہیں جا سکوں گی اور..."

"ہاں، ہاں بہن، ضرور ضرور۔"

جوراخان دادی عنظیرت کے نزدیک گئی، اس کے ہاتھ سے پھاوڑا لیا اور آستینیں چڑھاکر کھدائی کرنے لگی۔

دادی عنظیرت، یہ تھکا دینے والا کام ہے کیا؟"

"شکر اللہ بیٹی، ٹھہر جاؤ... بھلا جب یہاں اتنے لوگ موجود ہیں تو تم کیوں کھودو؟"

"کیوں، کیا کوئی گناہ ہو گیا؟"

"ارے نہیں، بالکل نہیں! تم تو بڑا نیک کام کر رہی ہو! بھلا بتاؤ، یہاں نعمانچہ میں کتنے ہی لوگ ہیں اور نہ

جانے کب سے یہاں رہتے آئے ہیں لیکن آج تک یہ کسی کو سوجھی ہی نہیں تھی کہ اس مکھیوں کے بازار کو بھی ذرا صاف کروا دے۔ شکر اللہ کا کہ میں یہ مبارک دن دیکھنے کے واسطے زندہ رہی اور خدا چاہے گا تو میں مل بھی دیکھ لوں گی۔"

"آپ کو یاد ہے کہ آپ مرجانا چاہتی تھیں۔"

"ہاں، میری بیٹی، خدا مجھے معاف کرے! اب تو یہ سوچ کر بھی ڈر لگتا ہے کہ میں کس طرح سب سے الگ تھلگ رہتی تھی: کس طرح ہر ایک پر سے اعتماد اٹھ گیا تھا۔ سچ پوچھو تو مجھ گنہگار کو پہلے تو صرف مردوں پر ہی رشک آتا تھا کہ وہ حج کرنے مکۂ شریف چلے جاتے ہیں مگر اب تو اپنے یہاں کی ان عورتوں پر بھی آتا ہے جو دوردراز کا سفر مزے میں کر رہی ہیں۔ معمولی معمولی عورتیں اور ماسکو چلی گئیں! کمال ہو گیا۔ بیٹی، تم کو ان لوگوں کی کوئی خیر ملی؟ میں تو انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔"

"بس اب کسی بھی دن کوئی خبر آنے ہی والی ہے۔"

"لو وہ پھوھڑ رضوان بھی چلی گئی... مجھے اس بڑھاپے میں اس کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ تو وہاں اتراتی پھرتی ہوگی، ماسکو میں اور پھر مل مزدور بن کر واپس آئے گی، وہ بھی کوئی دل لگی نہیں ہے... ہائے، اس سے ملاقات کے لئے میں کیا کچھ نہ دے دوں گی اور تم اسے خط لکھنا تو پوچھنا کہ مجھ سے خفا تو نہیں ہے۔ آخر ہم دونوں سہیلیاں تھیں اور ہیں اور خدا کے اور لوگوں کے بھی نزدیک۔ یہ ظاہر ہے مگر اب تم سے کیا چھپاؤں، سچ تو ہے کہ میں نے اسے ناراض کر دیا تھا..."

"لیکن آپ نے اپنے دوست کو کیسے ناراض کر دیا؟"

"ارے بیٹی، وہ بس میری ہی جہالت تھی، کیا کہوں تم تو خود ہی جانتی ہو... میں اس سے چپکے چپکے اس عورت کی باتیں کہتی رہتی تھی، وہی جو افیون فروخت کیا کرتی تھی، جو قتل کر دی گئی۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کہیں باہر سے آ گئی ہے، کام کاج کچھ کرتی نہیں، عزیز

رشتے دار یہاں اس کے کوئی ہیں نہیں۔ مجھے شک تھا کہ وہ بری عورت ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے قدرت اللہ خواجہ کو علی الصباح اس کے گھر سے نکلتے دیکھا۔ موئے کو ہر ہر قدم پر ٹھوکر لگے، خدا کی مار... میں تو سمجھتی تھی کہ اس کے خلاف کوئی گناہ کی بات کر رہی ہوں خدا پناہ میں رکھے اور ایسوں سے بچائے... لا بیٹی، یہ پھاوڑا مجھے دے، اپنے لئے کوئی اور دیکھ لے..."

"اب آپ آرام کیجئے دادی اماں، جائیے ذرا لوگوں سے باتیں کیجئے، آپ کے الفاظ دس مزدوروں سے زیادہ قیمتی اور ضروری ہیں۔"

"ہاں، ہاں، سو تو میں کبھی خاموش نہیں رہتی" عنظیرت نے جواب دیا۔ "کبھی چپ نہیں رہی، شکر اللہ۔"

یکایک جوراخان کو محسوس ہوا کہ کوئی اسے غور سے دیکھ رہا ہے، اس کا جی تو چاہا کہ مڑکر دیکھے مگر پھر اس نے اپنے پر قابو کیا، پھاوڑے پر جھک کر، کہنی کے نیچے سے دیکھا اور چونک پڑی۔

ٹیچر نعیمی ایک کدال پر جھکا ہوا، اپنے پاس کام کرتے آدمی کے کندھوں کے اوپر سے اس پر نظر جمائے تھا۔ جوراخان نے اس مودب، بااخلاق اور دبو ٹیچر کی آنکھوں میں وہ بات پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شدید خوف اور شدید نفرت، دونوں کی ملی جلی کیفیت پائی جاتی تھی جیسے جال میں پھنسا ہوا کوئی جنگلی بلا!

لیکن جوراخان جیسے ہی سیدھی کھڑی ہوئی، نعیمی نے اپنی کدال گھمائی اور پھر اپنے کام میں جٹ گیا۔ اور اب اس کے چہرے پر کام کے جوش کے علاوہ اور کوئی جذبہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اپنی کدال سے اتنی شدید محنت کر رہا تھا کہ آس پاس کے لوگ حیران تھے، کدال تلے سے روڑے پتھر اور مٹی کے ٹکڑے ہر طرف کو اڑ رہے تھے۔ اس کی ریشمی قمیض پسینے سے بھیگ کر اس کے جسم کو چپک گئی تھی اور سیاہ دکھائی دے رہی تھی، کسی عام قلی یا کھدائی کرنے والے مزدور کی طرح وہ کمر میں رسی باندھے تھا۔

وہ اسی جوش کے ساتھ کام کرتا رہا اور اس کے گرد دھول کے بادل اڑتے رہے۔ جوراخان نے سوچا کہ میری نگاہوں نے دھوکا کھایا، بھلا ٹیچر مجھے ان نظروں سے کیوں دیکھے گا۔

وہ اس کے پاس گئی۔

"آپ بھی آج ہمارے ساتھ ہیں؟"

"میرے بہت سے شاگرد یہاں ہیں" نعیمی نے کنپٹیوں سے پسینہ پونچھتے ہوئے کچھ ایسے لہجے میں جواب دیا جس میں شکایت کا رنگ تھا۔ "آپ یہ کیوں بھول گئیں؟ اچھا اب ذرا معاف کیجئے، معاف اس لئے کہ ابھی مجھے اپنا کام ختم کرنا ہے، ویسے بعد کو، اگر آپ اجازت دیں تو میں حاضر ہوکر آپ سے درخواست کروں گا کہ مجھ پر ایک مہربانی کیجئے۔"

"آپ چاہیں تو ابھی کہئے۔"

"نہیں، نہیں، کام کے بعد عرض کروں گا اور اگر ممکن ہو سکے تو چاہوں گا کہ آپ اس بات کو اپنے ہی تک رکھیں۔"

"ہوں، یہ بڑی دلچسپ بات ہے۔"

نعیمی نے تعظیم سے سر جھکایا۔

پاس ہی ہڑیلا مقسوم بیٹھا اپنی مخسی پر سے مٹی جھاڑ رہا تھا، پھاوڑوں اور بیلچوں کی دھمادھم بھڑابھڑ میں اس کی، دل میں گھر کرنےوالی آواز سنائی دے رہی تھی:

"ویسے تو میں نے خود تنہائی کی زندگی گزاری ہے مگر پھر بھی عشق کے متعلق ایک آدھ بات تو جانتا ہی ہوں۔ مرد کو وفادار ہونا چاہئے اور عورت کو تابعدار، ہاں... اگر ایسا نہ ہو تو گھریلو زندگی کا نہ کوئی مزہ ہے نہ کوئی مقصد۔"

مقسوم کے آس پاس پھاوڑا یا مٹی ڈھونے کا ٹھیلا کچھ نہیں تھا، ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کام کرنے سے زیادہ کام کرتے ہوئے لوگوں کے لئے ذرا ہنسنے ہنسانے اور دل‌لگی کا سامان مہیا کر رہا تھا۔

"ایک بار ایسا ہوا کہ ایک آختہ کیا ہوا مرغا کہیں کسی مرغے کی جگہ چلا گیا" کسی نے مذاق کیا۔

"تو مرغیوں نے چونچیں مار مارکے اس کی کلفی نوچ ڈالی!" دوسرے نے جملہ پورا کیا۔

لیکن ھڑیلے مقسوم پر ان طعنوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔
"میں تو اپنی کہتا ھوں، میں نے اپنی بیوی سے شادی کی کیونکہ اس نے دل میرا جیت لیا تھا اور میں محبت اور جذبات کی شدت سے انگاروں پر لوٹتا تھا لیکن شادی کے پہلے ھی دن وہ میرے پاس سے بھاگ گئی بلکہ یوں سمجھئے چیملدیق* کے پیچھے سے بھاگ گئی لیکن صاحب، مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ھے۔ میں تو اس کا شوھر تھا اس لئے مجھے تو اس کا وفادار رھنا ھی تھا چنانچہ قسمیہ کہتا ھوں میری وفاداری ایسی تھی کہ میں نے پھر شادی نہیں کی اور میری بیوی کو تو وہ مل گیا جو لوگ کہتے ھیں نا کہ اس کی قسمت میں تھا۔ اب بھی کبھی کبھار اس سے ملنے جاتا ھوں اور اس کے بچوں کو دیکھکر خوش ھوتا ھوں۔ تعریف ھو خدا کی کہ میں نے اپنی وفاداری میں کبھی فرق نہیں آنے دیا، ھاں..."
"اور وہ، جو اس کی قسمت میں لکھا ھے وہ آپ سے کس طرح پیش آتا ھے؟"
"عمدہ عمدہ باتیں کرتا ھے یا عمدہ ڈنڈا دکھاتا ھے؟"
"کیوں؟ میں اس سے بالکل یوں ھی گفتگو کرتا ھوں جیسے آپ لوگوں سے کر رھا ھوں" مقسوم نے مسکرائے بغیر جواب دیا۔
جوراخان دوسری طرف کو مڑ گئی۔
اس نے دور سے کسی کو بائیسکل پر آتے دیکھا جو نوکدار پرانی گھسی ٹوپی پہنے تھا۔ وہ بائیسکل دھیرے دھیرے چلا رھا تھا اور اپنے اردگرد کے لوگوں سے ھنسی مذاق بھی کرتا جاتا تھا۔ لوگ اس کو راستہ دیتے ھوئے ایرگاش اور یفیم دانیلووچ کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ وہ ڈاکیہ تھا جس کا سب کو بےحد انتظار تھا۔

---

* وہ پردہ جس کے پیچھے دولھا دلھن پہلی رات بسر کرتے ھیں۔ اڈیٹر۔

جوراخان نے دیکھا کہ اس نے ایرگاش کو ایک خط دیا۔ ایرگاش نے ڈاکئے کی طرف پیٹھ کرکے خط کھولا، یفیم دانیلووچ نے خوش اخلاقی سے قہقہہ لگایا اور ایرگاش کے کندھے پر دھپ سے ہاتھ مارا۔ جوراخان جلدی جلدی ادھر بڑھی، خط ماسکو سے آیا تھا!

ایرگاش نے خط کھولا اور کچھ تعجب سے بھنویں سکوڑیں:

"مل پروجیکٹ کے چیف کامریڈ ایرگاش سلطانوف" اس کا کیا مطلب ہوا؟ پھر اس کی نظریں دستخط پر گئیں۔ خط حاجیہ کا تھا۔ لیکن اس نے یہ سرکاری انداز کیوں اختیار کیا؟ پہلے تو ہمیشہ اس کے خط: "میرے بہت عزیز بھائی ایرگاش" سے شروع ہوتے تھے۔

وہ جلدی جلدی بڑے شوق سے خط پڑھنے لگا لیکن اسے اپنا نام اور کہیں کسی جملے، کسی سطر میں نہیں ملا، پیار محبت کا بھی ایک لفظ نہیں۔ "ہم اس عظیم شہر میں بخیریت پہنچ گئے" اور آخر تک یہی ایک رنگ: "ہم... ہماری عورتیں... مقامی عورتیں..." وغیرہ وغیرہ۔

دستخطوں سے بالکل اوپر کی سطر بڑی احتیاط سے کاٹ دی گئی تھی، صرف الگ الگ حروف پڑھے جاتے تھے۔ ایرگاش نے ان کو یہ اندازہ لگانے کے لئے بڑے غور سے پڑھا کہ دیکھیں پہلے حاجیہ نے کیا لکھا تھا جو بعد کو کاٹ دیا لیکن یفیم دانیلووچ نے خط ایرگاش سے لے لیا۔

خط کو غور سے پڑھتے ہوئے وہ ایرگاش کی طرف مڑا۔

"یہ تو بڑا اچھا خط ہے! اور یہ اچھی لڑکی ہے... تم کس بات پر منہ پھلائے ہو، چیف؟"

"کون؟ میں؟ میرا بھی یہی خیال ہے کہ بہت اچھا خط ہے۔ صرف ایک سطر کاٹ دی گئی ہے۔"

"کہاں؟ کہاں کاٹ دی گئی ہے؟"

ایرگاش نے انگلی رکھ کے بتایا۔

"یہ؟" یفیم دانیلووچ نے سنجیدگی سے سطر کو دیکھا۔ "مگر یہ تو بالکل صاف لکھا ہے۔ تم نہیں پڑھ سکے؟"

"ن... ن... نہیں تو... آپ پڑھ سکتے ہیں کیا؟"
یفیم نے منھ سکوڑکر اپنی مسکراہٹ چھپائی۔
"میں تو بڑا حیران ہوں تم پر۔ تم ان پڑھ تو نہیں ہو نا؟ اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ لڑکی کوئی غمگین جملہ لکھ گئی ہے۔"
"غمگین؟ کیا مطلب؟"
"اور کیا۔ تم خود ہی دیکھ لو۔"
ایرگاش بڑے شوق اور دلچسپی سے خط میں جھانکنے لگا اور یفیم نے اپنی انگلی کٹی ہوئی سطر کے شروع سے چلانی شروع کی اور اسے بغیر دیکھے "پڑھنے" لگا۔
"میرے سب سے پیارے، تم مجھے بہت یاد آتے ہو اور ضرور تم بھی مجھے بہت یاد کرتے ہوگے؟ اگر تم یکایک یہاں میرے پہلو میں آ جاؤ تو مجھے کتنی زیادہ خوشی ہو..."
ایرگاش سر اٹھاکر زور سے ہنسنے لگا۔
"چچا یفیم" اس وقت اس نے کمیسار کو بالکل اسی طرح "چچا" کہا جیسے فوج میں جانے سے پہلے کہا کرتا تھا۔ "اب آئندہ سے میں اس کے سب خط آپ ہی سے پڑھوایا کروں گا۔ آپ کو خط پڑھنا خوب آتا ہے اور آپ کی آواز بھی بڑی خوشگوار ہے۔"
"میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ شرمیلےپن کی بنا پر یوں کاٹی ہوئی سطریں صرف خط ہی میں نہیں ہوتیں، انسان کے دل میں بھی ہوتی ہیں" یفیم دانیلووچ نے کہا۔ "اور صرف کسی لڑکی ہی کے دل میں نہیں ہوتیں..."
ایرگاش کی ہنسی رک گئی۔
"کیا آپ کا مطلب پھر دوبروخوتوف سے ہے؟ آپ نے سنا اس نے کیا کہا۔ "کتنے بہت سے ہاتھ، بالکل بےکار..." اس کا مطلب ہمارے لوگوں سے تھا! اتنے بہت سے لوگ اور کچھ نہیں!"
"میں سب کچھ سنتا ہوں ایرگاش، لیکن ان الفاظ کے بعد ہی کٹی ہوئی سطر آتی تھی اور اصلی بات اس سطر میں تھی۔"

"کون سی اصلی بات؟"
"اب وہ تم خود پڑھو۔"
دوبروخوتوف سر سے پاؤں تک دھول میں اٹا، اس کی قمیض کہنی کے پاس سے پھٹی، تھکے تھکے قدم اٹھاتا بلکه گھسیٹتا شیر کی پہاڑی سے اتر رہا تھا۔ پھر اس نے چاندی کی ایک چھوٹی سی زنجیر میں بندھی ہوئی گھڑی اپنی جیب سے نکالی اور اس کی طرف اشارہ کیا۔
"کیا وقت پورا ہو گیا؟" یفیم دانیلووچ نے خود اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"میں تو ان لوگوں پر بڑا حیران ہوں۔ آخر انہیں یه توانائی کہاں سے ملتی ہے" انجینیر نے کہا۔ "یه مزدور ہیں که شیر! اور عورتیں بھی تو شیرنیاں ہو رہی ہیں، بہرحال اب تو سورج نصف النہار پر ہے، سانس لینے کی تو ان کو مہلت ملنی ہی چاہئے اور میرا خیال ہے بھوک بھی سب کو لگی ہی ہوگی۔ عورتیں جن بچوں کو گھر چھوڑ آئی ہیں ان کو شاید ایک نظر دیکھنا چاہیں گی اور بچے تو یہاں بھی ہیں۔"
یفیم دانیلووچ مسکراتا اس کا منتظر رہا که دیکھیں ایرگاش کیا کہتا ہے۔ ایرگاش نے یونہی کندھے اچکا دئے، جوراخان تیز تیز چلتی ہوئی ان لوگوں کے پاس آئی اور خط کے لئے ہاتھ بڑھایا۔
"خط تو تمہیں دے دوں مگر کیا کھلاؤگے؟" یفیم نے مطالبه کیا۔
اور پھر اسی وقت جیسے ہی ایرگاش نے اشارہ کیا لوہے سے فولادی پٹری کے پیٹے جانے کی ایک زوردار جھنجھناہٹ خالی زمین اور شیر کی پہاڑی پر گونجی۔
"کام روک دو، آرام کرو!" قبرستان کی طرف سے روسی زبان میں ایک آواز نے صدا دی۔ یه آواز ادھر سے آئی تھی جدھر سرخ سپاہی کام کر رہے تھے۔
پھر عبدالصمد کے ٹکڑے سے ایک گانا شروع ہو گیا، بعض لوگ جہاں جہاں سایه ملا ادھر کھسکے، دوسرے لوگ

وهیں بیٹھ گئے جہاں کام کر رہے تھے۔ تمباکو، روٹی، پیاز، نمک وغیرہ نکالا گیا، کچھ ہی لوگ گھر گئے۔

جوراخان وہ خط لے کر عورتوں کی طرف گئی۔

آگ پر ایک بڑی سی سیاہ قمغان* رکھی تھی جو قمری لائی تھی، پانی کھول کر ڈھکنا کھڑبڑا رہا تھا۔

ایک بوڑھے گاڑی‌بان نے دور سے قمری کو پکار کے کہا کہ وہ اس کے پاس چائے پینے آئے گا۔ قمری نے تڑ سے جواب دیا کہ "آؤ ضرور مگر زبان جل جائے گی تو میں نہیں جانتی!"

"ساتھیو" جوراخان نے اپنی مدھم مگر گونجتی آواز میں سب کو مخاطب کیا۔ "کامریڈو، اگر آپ سننا چاھتے ھیں کہ ماسکو سے ھماری بہنوں نے جو وھاں گئی ھیں، کیا لکھا ھے تو سب لوگ ذرا قریب آ جائیے۔"

پوری خالی زمین میں آوازیں گونجنے لگیں:

"خط۔ ماسکو سے۔ ھماری عورتوں کا بھیجا ھوا۔"

سب عورتیں جوراخان کو گھیرکر بیٹھ گئیں، مرد بھی قریب آ گئے مگر عورتوں سے ذرا دوری ھی پر رھے کہ ان کو پوری آزادی رھے۔

"آہ، رضوان، ھائے وہ عورت، آخر اس نے میرا خیال کیا نا، خط بھیجا نا" دادی عنظیرت نے جو اپنا منہ کھولے ھوئے تھی، پہلی صف میں بیٹھتے ھوئے زور سے اعلان کیا۔

دوسری عورتیں بھی معمول سے کچھ زیادہ ھی آزادانہ رویہ اختیار کئے ھوئے تھیں۔ کسی ایک نے پرنجے اتار دیا تھا البتہ رومال سر پر ذرا آگے کو کر لیا تھا۔

جب تک جوراخان خط پڑھتی رھی کوئی عورت نہیں بولی۔ بس بیچ بیچ میں "آہ"، "واہ" کر دیتی تھیں اور وہ بھی آھستہ سے۔

"ھم یہاں بالکل گھر کی طرح آرام سے ھیں، ھماری ایک روسی بہن ھے، وہ بھی بنکر ھے، وہ ھمیں کام سکھاتی ھے اور

---

*صراحی جیسا برتن جو چائے کا پانی ابالنے کے لئے استعمال کیا جاتا ھے۔ اڈیٹر۔

ہم لوگ پہلے ہی دن سے ایک دوسرے کو چاہنے لگے ہیں۔ ان لوگوں نے ہمیں اپنے ہوسٹل میں کمرے دئے ہیں اور برابر ہمارے ساتھ رہتی ہیں: کام پر بھی، کھانے کے وقت کینٹین میں بھی اور کام کے بعد بھی۔"

"یہ لوگ اکثر ہم سے ہماری زندگی کے متعلق پوچھتی رہتی ہیں اور آپ سب کو اپنا پرولتاری سلام بھیجتی ہیں کیونکہ وہ کہتی ہیں ہم سب محنت‌کش ایک برادری ہیں۔"

"یہاں ان کی جو مل ہے اسے دیکھ‌کر تو ہمیں اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا تھا، مل کیا ہے، پورا ایک شہر ہے۔ عمارتوں کے بڑے بڑے بلاک اور پھر ان کے سامنے پھولوں کے تختے۔ اگر آپ لوگ یہ کرگھے دیکھیں تو حیران رہ جائیں۔ پہلے تو ہم بہت پریشان اور رنجیدہ ہوئے کہ ان پر کیسے کام کریں گے لیکن جیسے جیسے کام کرنے کے طریقے سمجھ میں آتے گئے تو ہمیں پتہ چلا کہ یہ کرگھے پیچیدہ تو ضرور ہیں مگر اشارے پر چلتے بھی ہیں اور میں کہہ سکتی ہوں کہ بہت جلد ہم بھی ایسے ہی کرگھے حاصل کر لیں گے۔ اس وقت جو کچھ ہم صرف دیکھ رہے ہیں وہ کل ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔ ایک لیکچر میں ہم سے یہی کہا گیا ہے۔"

دوبروخوتوف بھی مزدوروں کے ساتھ وہیں زمین پر بیٹھا ہوا تھا اور یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جوراخان کی بات سنتے ہوئے اس کے اپنے دل میں جذبات کیوں اس قدر ابل رہے تھے؟ کیا خط کی سادگی موثر تھی یا فخر کا وہ جذبہ اس کے دل کو بےقرار کر رہا تھا جس کے ساتھ لوگ اس خط کو سن رہے تھے؟ حاجیہ کے خط میں لکھے کئی لفظ عورتوں کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے، مثلاً: "ہوسٹل"، "بلڈنگوں کے بلاک"۔ جوراخان کو سمجھانا پڑا تھا۔ لیکن یہی لوگ تھے جو ایک مل کی تعمیر میں جی جان سے جٹے تھے۔ ہاں، کیوں نہ ہو؟ ابھی بہت دن تو نہیں گزرے تھے کہ روسی مزدور جو آج مارکس اور لینن کو پڑھتا اور سمجھتا ہے وہ غلامی اور جہالت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

حاجیہ نے لکھا تھا کہ وہ سب نعمانچہ میں مل تعمیر

کرنےوالوں کی کامیابی کی دعائیں مانگ رہی ہیں اور ان الفاظ سے سننےوالوں میں ایک‌دم کیسی پرخلوص مسرت کی لہر دوڑ گئی! لوگوں نے، عورتوں، مردوں سب نے مل‌کر نعرے لگائے، تالیاں بجائیں، اچھل اچھل پڑے، ہوا میں ٹوپیاں اچھلنے لگیں! دوبروخوتوف بھی کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اٹھ‌کر کھڑا ہو گیا اور زور سے نعرہ لگایا "ارا!"۔

کسی نے ایک دھپ اس کی پیٹھ پر دیا تو وہ ایک‌دم ہوش میں آ گیا۔ ایرگاش نے تیزی سے اس کے کندھوں کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور بڑے جوش کے ساتھ اس کے کان میں آہستہ سے کہا:

"انجینیر صاحب، میں کبھی بھی آپ کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاھتا تھا، میری طرف سے دل میں کوئی شکایت نہ رکھئے گا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک۔ میں بھی اپنی طرف سے یہی کہتا ہوں" دوبروخوتوف نے بےحد متاثر ہوکر جواب دیا۔

دوپہر گزرنے کے بعد جب پھر کام شروع ہوا تو لوگ اور بھی زیادہ جوش کے ساتھ اس میں لگ گئے، عبدالصمد کی ٹیم تو گھنٹہ بجنے سے بہت پہلے ہی اپنے اپنے پھاوڑے، کدال لےکر جٹ گئی تھی۔

سورج غروب ہونے تک خالی زمین پر دھول کے بادل اٹھتے رہے اور مردوں کے جسموں پر قمیضیں جو پسینے سے تر تھیں، خشک نہ ہوئیں۔

جب اندھیرا ہونے لگا تو ریلوے مرمت کے کارخانے کے کومسومولوں نے زمین کا ایک حصہ ہموار کیا جو شیر کی پہاڑی کی بچی بچائی اونچائی پر تھا، اس پر لکڑی کے تختے جمائے اور پلک جھپکتے میں خبر پھیل گئی کہ یہاں اب کنسرٹ ہوگا، ایکٹر لوگ آ گئے ہیں۔

قمری جو اپنے حصہ کے چھے "ٹکڑے" صاف کر چکی تھی، سب سے پہلے اپنے بچوں کو لے آئی اور تختوں کے پاس لاکر بٹھا دیا۔

پھر "اسٹیج" کے آس پاس مشعلیں جلائی گئیں جن سے

چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور جلتے چیتھڑوں اور رینڈی کے تیل کی مہک پھیل گئی تھی۔ بڑے چھوٹے سب ایک نیم دائرے کی شکل میں شانے سے شانے ملاکر زمین پر بیٹھ گئے، بچے چیونٹیوں کی طرح "اسٹیج" کے آس پاس رینگ رہے تھے۔ ایکٹر لوگ ان پر سے اچک اچک‌کر "اسٹیج" پر جا رہے تھے۔

دوبروخوتوف کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خود کیا کرے۔ ڈیوٹی کے حساب سے تو اس کو گھوم پھرکر یہ دیکھنا چاہئے تھا کہ اس دن کتنا کام ہوا مگر اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کام کا سلسلہ بندکر دے اور دوسروں کے ساتھ مل‌کر کنسرٹ دیکھے جو مزدور ایکٹر دے رہے تھے۔ لوگوں نے اسے آوازیں دیں اور ایک ٹھیلے پر اس کے لئے ایک آرام‌دہ جگہ بنا دی... آخر وہ مان گیا اور بڑی خوشی سے ٹھیلے پر بیٹھ‌کر اپنی تھکی اور دکھتی ہوئی ٹانگیں، آگے جھکے ہوئے بیٹھے لوگوں کے درمیاں پھیلا دیں۔

پھر نیلی قمیضیں پہنے ہوئے کومسومول اسٹیج پر نظر آئے۔ وہ وہی کپڑے پہنے تھے جو انہوں نے دن میں کام کرتے وقت پہنے تھے، بس مٹی ذرا جھاڑ دی گئی تھی اور سب ہی لڑکے لڑکیوں کے سینے پر سرخ ربن ٹانگ دئے گئے تھے جن سے سب کو فوراً ہی پتہ چل گیا کہ یہی ایکٹر ہیں۔

تماشائیوں کے بڑے مجمع پر خاموشی چھا گئی۔ صرف دو بچوں کے بحث کرنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"یہ لوگ گانا گائیں گے..."

"نہیں، گانا نہیں۔ اداکاری دکھائیں گے..."

کسی نے سی سی کر کے انہیں ٹوکا اور وہ دونوں بھی چپ ہو گئے۔

لیکن ایکٹروں نے گانا شروع کرنے میں کافی دیر لگائی۔ نوجوان لڑکے کبھی اس پیر پر زور ڈالتے، کبھی اس پر، کبھی ایک دوسرے کو دیکھتے۔ لڑکیاں گھبرا گھبراکر منھ پھیر لیتیں اور اپنی آستینوں سے چہرے اس طرح چھپاتیں جیسے مشعلوں کی روشنی سے چکاچوند ہو رہی ہوں۔

تماشائیوں میں سے کچھ لوگ ہنسنے لگے۔

اتنے میں عبدالصمد دوڑتا ہوا اسٹیج کے سامنے آیا، ایکٹروں میں مستعدی آ گئی، قریب قریب کھڑے ہو گئے، سیدھی قطار باندھ لی لیکن عبدالصمد کی کچھ عجیب سی حالت تھی، وہ بھی جیسے بھول گیا ہو کہ لوگ یہاں کیوں جمع ہوئے ہیں۔ وہ کومسومولوں کی قطار کے پاس سے تیزی سے گزرتا ہوا سرگوشی میں ان سے کچھ پوچھتا جا رہا تھا۔ جواب میں ان لوگوں نے انکار میں سر ہلا دئے، کندھے اچکا دئے!

"پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے؟" دوبروخوتوف نے سوچا۔ اسے کچھ ایسی الجھن سی محسوس ہو رہی تھی جیسے وہ خود بھی "اسٹیج" پر ہو۔

یکایک کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ مڑا تو ایرگاش نے اسے اشارے سے بلایا۔

دوبروخوتوف کو محسوس ہوا کہ کوئی سخت گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ایرگاش کی پیشانی پر بل تھے اور وہ بےحد پریشان نظر آ رہا تھا۔

"آپ نے جوراخان آپا کو کہیں دیکھا ہے؟" اس نے انجینیر کو ایک طرف لے جاکر پوچھا۔

"نہیں تو۔"

"وہ مجھے کچھ دیر سے نظر نہیں آئی ہیں، میں نے ہر جگہ ڈھونڈ لیا۔ بڑے تعجب کی بات ہے! آخر وہ کہاں جا سکتی ہیں؟"

تشویش‌ناک سرگوشیوں کی ایک لہر ہوا کے جھونکے کی طرح اس بھیڑ میں یہاں سے وہاں تک تیر گئی جس پر مشعلوں کی لہراتی، لپکتی روشنی یہاں وہاں پڑ رہی تھی۔ عبدالصمد نے آگے کو جھک کر مشعلوں سے پرے اندھیرے میں نظریں جما دیں۔

وہ یہ سننے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ اب کسی طرف سے ہنسنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔

"جوراخان کہاں ہے؟ لوگو، خدارا بتاؤ، جوراخان کہاں ہے!" کسی عورت کی تیز آواز گونجی۔

اور پھر یکایک یفیم دانیلووچ نظر آیا۔

اس کا چہرہ، آنکھیں، گالوں کی ہڈیاں، مونچھیں سب ایسا لگتا تھا کہ پتھر کی طرح سخت ہو گئے ہیں۔ اس کے ہاتھ جن کی مٹھیاں کس کر بندھی تھیں، بالکل بےحس وحرکت تھے۔

وہ اندھادھند چلا آ رہا تھا جیسے اسے کچھ نہ سوجھ رہا ہو کہ کدھر جا رہا ہے۔ لوگوں نے جلدی جلدی دونوں طرف ہٹ کر اس کے لئے ایک پتلا سا راستہ بنا دیا اور وہ پلیٹ فارم پر جو پل بھر میں خالی ہو گیا تھا، پہنچ کر رک گیا۔ بڑی دیر تک اس کے منھ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ لوگ ساکت بیٹھے چپ‌چاپ انتظار کرتے رہے، بڑی توجہ سے وہ اسے ہانپتے دیکھتے رہے، یہ کوشش کرتے دیکھتے رہے کہ وہ اپنے آپ پر کسی طرح قابو حاصل کر لے۔

پھر مشعلوں کی لہراتی روشنی میں لوگوں نے دیکھا کہ اس کے رخساروں پر آنسو رواں ہیں۔

"بھائیو... بہنو..." آخرکار اس کی زبان سے نکلا۔ "دشمن نے ہماری جوراخان کو مار ڈالا!"

اکیسواں باب

اگلے دن علی‌الصباح ہی پھر شہر کے تمام حصوں سے لوگ جائے تعمیر پر اکٹھے ہونے لگے۔ گلیاں پھر لوگوں سے اٹم اٹ بھر گئیں لیکن اب کی بار مکمل خاموشی کے ساتھ۔ لوگوں کا جم غفیر یوں امنڈا آ رہا تھا جیسے طوفان

برق و باراں سے پہلے بادل اٹھتے ہیں اور جھنڈوں پر لگے ہوئے سیاہ فیتوں کو ہوائیں اڑا رہی تھیں۔

شیر کی پہاڑی پر پھولوں سے ڈھکا ہوا ایک لمبا سا جنازہ، ایک اونچے تخت پر رکھا تھا۔ جوراخان کا سفید چہرہ جو زندہ لگتا تھا، بند آنکھوں سے لوگوں کو تک رہا تھا، ہونٹ ذرا سے کھلے تھے، باریک کمان سی بھنویں تھوڑی سی کھچی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا وہ کوئی بات کہہ رہی تھی جو ادھوری رہ گئی۔ اس کی صورت کو دیکھ‌کر لوگوں کو محسوس ہوتا کہ موت نے اس پر اس وقت وار کیا جب وہ کوئی مہربانی کی بات کہہ رہی تھی، کوئی بات جو اس نے دل سے محسوس کی تھی۔

ایک بوڑھی عورت اپنے سفید بالوں والے سر پر سیاہ رومال باندھے اس کے پاس ہی بیٹھی تھی — جوراخان کی ماں۔ اسی کے پاس اناخان تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنی بانہوں میں سمیٹے تخت کے سرہانے بیٹھی تھیں، اناخان بار بار غمزدہ ماں کے سر کو اپنے سینے میں بھینچ لیتی اور اس کے ساتھ آہستہ آہستہ جھومنے لگتی جیسے کسی بچے کو بہلا رہی ہو۔ وہ خشک جلتی ہوئی آنکھوں سے جوراخان کے چہرے کو تک رہی تھی، البتہ اس کے ہونٹ کبھی یوں کانپنے لگتے جیسے اسے درد کے دورے پڑ رہے ہوں۔ جنازے کے پائینتی بشارت کھڑی تھی، بغاوت کے انداز میں سر کھولے ہوئے۔ اس کے چہرے پر ایسی سختی تھی گویا وہ ایک ہی رات میں لڑکی سے عورت بن گئی تھی۔

لوگ جوراخان کو الوداع کہتے ہوئے جنازے کے پاس سے دھیرے دھیرے گزرتے جاتے، اس پر پھول بکھیرتے جاتے جو جنازے پر بھی گرتے اور زمین پر بھی۔ اس درمیان ایک عظیم الشان مجمع جیسا کہ اس علاقے میں کبھی اکٹھا نہیں ہوا تھا، شیر کی پہاڑی کی طرف منھ کرکے نیم دائرے کی شکل میں کھڑا ہوتا جاتا تھا، سامنے عورتوں کی ایک کثیر تعداد تھی جو کبھی کبھی دبی آوازوں میں پھوٹ کر

روتیں۔ اور پھر بڑی سنگین خاموشی چھا جاتی، بچے بھی بہت اداس اور چپ‌چاپ تھے۔ وہ اپنے اپنے والدین کے پاس سکڑے سمٹے بیٹھے تھے، نہ ہمت پڑتی تھی کہ کچھ پوچھیں نہ وہاں سے ہٹنے کا یارا تھا۔

پھر عورتوں کی ایک ٹولی آئی جو ایک دوسرے سے بالکل قریب قریب تھیں، ان کی تعداد پانچ تھی اور وہ پرنجے پہنے تھیں۔ اناخان نے ان کو پہچانا۔ یہ وہی تھیں جو اس دن دور دراز گاؤں سے آئی تھیں۔ ان میں سب سے آگے جو عورت تھی اس نے اپنا چچوان اٹھایا اور بازو پھیلاتے ہوئے جنازے پر گرگر زور زور سے رونے اور نالہ و فریاد کرنے لگی، بڑی دیر تک وہ اپنے کو سنبھال نہیں پائی اور کسی نے اس کو روکا بھی نہیں۔

سورج آسمان پر کافی بلند ہو چکا تھا جب یفیم دانیلووچ اور ایرگاش آگے بڑھے اور اناخان کے پاس جاکر کھڑے ہو گئے۔

اناخان کھڑی ہو گئی، اس نے اپنے سر پر بندھا ہوا رومال اتارا۔ یہاں سے وہاں تک مجمعے میں ایک خاموش سنسنی پھیل گئی۔

"ساتھیو، محنت‌کش، ایماندار لوگو" اناخان نے اپنی آواز بلند کئے بغیر کہا لیکن اس کے الفاظ سب کو سنائی دے رہے تھے۔ "میری پیاری بہنو، دیکھو کتنے لوگ ہماری دلیر جوراخان آپا کو ان کے آخری سفر پر رخصت کرنے آئے ہیں۔ دیکھو ان کے کتنے دوست ہیں، کتنے لوگ ان سے پیار کرتے تھے۔ میں ان عورتوں کے نام گنانا چاہتی تھی جن کی جوراخان نے مدد کی ہے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ میں ان کے نام نہ گناؤں‌گی کیونکہ مرحومہ نے یہاں موجود ہر شخص کی مدد کی ہے۔ چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ اس نے ہر اس انسان کی مدد کی جس کے ہاتھ محنت‌کش کے ہیں، جس کا ضمیر محنت‌کش کا ہے۔ اپنے شہر کو دیکھئے، یہاں پہلے کوآپریٹو کھلا، پھر دکانیں، پھر ایک نیا اسکول اور پھر یہ مل جو ہم سب مل‌کر تعمیر کر رہے ہیں۔ کتنی بہت سی اچھی، مفید

باتیں ہوئیں! بتاؤ، آج قدرت‌الله کہاں ہے جو اپنے کو نعمانچہ کا مالک سمجھتا تھا؟ وہ کہاں ہے تاجر متقوول؟ اور اس سے چھوٹے چھوٹے مکڑے سب کہاں گئے؟ کوئی بچہ بھی آپ کو بتا دے‌گا کہ ہماری بستی میں آج اچھی چیزوں کی تعداد بڑھ گئی ہے اور برے لوگوں کی تعداد گھٹ گئی ہے۔ اور ہم میں سے ہر ایک یہ بھی جانتا ہے کہ یہ سب کچھ جوراخان نے شروع کیا تھا، انھوں نے ہی اپنا جی جان دے‌کر ہمارے لئے یہ سب کچھ حاصل کیا۔ ہماری خاطر، عام لوگوں کی خاطر نہ انھوں نے اپنی قوت کی کوئی قیمت جانی نہ اپنی جان کی کوئی پرواہ کی۔" اس کے بعد اناخان نے ایک قدم آگے بڑھایا اور آواز کو بلندتر کرکے کہا: "اور ایسے انسان کو، ایسے انمول انسان کو آج دشمن نے مار ڈالا!"

مجمعے بھر سے ٹھنڈی آہ نکلی جیسے وہ ایک ہی سینے سے نکلی ہو۔

اناخان نے اپنا سر جنازے کی طرف جھکایا اور اپنی بات جاری رکھی:

"میری پیاری بہن، ہم لوگ تمہیں بہت چاہتے تھے، ہم تمہیں کبھی نہیں بھولیں گے! اور میں تمہارے جنازے پر قسم کھاتی ہوں... ساتھیو، آؤ ہم سب مل‌کر یہ قسم کھائیں! تم نے جس کام کو شروع کیا ہے ہم اسے منزل پر پہنچاکر رہیں گے۔ ہم مل کو مکمل کرکے رہیں گے، ہم ایک نئی زندگی کی تخلیق کریں گے۔ آج ہم سوگ مناتے ہیں، تمہارا سوگ کیونکہ ہم نے تمہیں کھو دیا ہے۔ جوراخان، ہمیں معاف کر دو لیکن ہمارے دلوں میں خوف کا گزر نہ ہے، نہ ہوگا۔ تم مطمئن رہنا کہ ہمارے قدم نہیں ڈگمگائیں گے۔ اور کل جب اس بے‌کار زمین پر ہماری مل تعمیر ہوکر کھڑی ہوگی تو تمہارا وہ پہلا‌نام ہوگا جو یاد کیا جائے‌گا اور تم یوں ہمارے ساتھ ہوگی جیسے تم زندہ ہو! الوداع پیاری بہن، الوداع ہماری ماں!"

پھر یکایک اناخان مڑی اور اس نے مجمعے کی طرف منھ کرکے اپنا مکا ہوا میں لہرایا:

"لوگو، میری بات سنو۔ قاتلوں پر لعنت ہو! جوراخان کی یاد زندہ‌باد!"

سینکڑوں آوازوں نے اس کی صدا پر صدا دی۔

قمری آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اور غصے سے جلتی ہوئی آنکھیں لئے جنازے کی طرف دوڑی۔ اس نے اپنے محنت سے کٹے پھٹے، سیاہ ہاتھ پہلے آسمان کی طرف بلند کئے اور پھر ان کو اناخان کی طرف پھیلایا۔

"اناخان! بہن! تم نے یہ تو بتایا کہ دشمنوں نے کیسے انسان کی جان لے لی، خدا کرے ان کی آنکھیں پھوٹیں، انہیں دن کی روشنی دیکھنی نصیب نہ ہو! لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ مرتے وقت جوراخان کا چہرہ کھلا ہوا تھا! دشمن اپنا منہ چھپائے، مگر ہماری جوراخان نے اپنا منہ نہیں چھپایا تھا۔ اور میں... میں یہی کہنا چاہتی ہوں: اگر دشمن چاہتا ہے تو اس بات پر مجھے بھی مار ڈالے۔ لیکن وہ بھی میرا چہرہ اب سے بےنقاب ہی دیکھے اور اپنا جی جلائے اور اس کی آنکھوں میں خون اترے! لو۔" اور قمری نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پرنجے سر پر سے نوچا، اس کا گولا سا بنایا اور زمین پر پھینک دیا۔ اس کے چھدرے بال جن میں چاندی کے کافی تار تھے، بکھر گئے۔ اس لمحے اس کا طیش‌آلود چہرہ دیکھنے میں کس قدر وحشت‌ناک لگ رہا تھا۔

"اب آئے وہ بزدل دشمن، آئے ذرا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھے، آئے تو وہ کمینہ بزدل گیدڑ۔ وہ ہے کہاں؟"

"بہن!" اس تناؤ بھری خاموشی کو توڑتی ہوئی ایک آواز اور گونجی۔ "بہن، میں بھی تمہارے ساتھ ہوں!" خالنسا جذبات کی شدت سے ہانپتی ہوئی قمری کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ "بہنو، آپ سب جانتی ہیں کہ جوراخان نے میرے ساتھ کیا کیا نیکیاں کی ہیں۔ میں جاہل عورت، میں نے اس کی نصیحتوں پر پورا دھیان نہیں دیا، میرے لئے یہ کڑوا گھونٹ ہے کہ آج وہ میری بات سننے کے لئے یہاں موجود نہیں مگر لوگو! تم میری بات سنو! جب اس نے مجھے متقوول

کے پنجے سے چھڑایا تھا تو اس نے مجھے ایک مادرانہ مشورہ دیا تھا: "خالنسا، اب تم آزاد ہو، اپنے چہرے پر روشنی پڑنے دو۔" میں ایسا کرتے ڈری، ہچکچائی مگر اب دیکھو! میں جب تک اس کے مشورے پر عمل نہیں کر لوں گی اس کو الوداع نہیں کہوں گی!"

پھر اس نے اپنا سرخ پرنجے نوچ کر اتار لیا، چچوان بھی اتارا اور جہاں قمری کا پرنجے پڑا تھا اسی پر ڈال دیا۔ پھر وہ ایک قدم پیچھے ہٹی اور اس نے ان پر زور سے تھوکا۔

ایسا کر چکنے کے فوراً ہی بعد اس کا ایک دم جی چاہا کہ عورتوں کی بھیڑ میں کہیں گھس جائے کیونکہ خود بخود اس پر چھپ جانے کا جذبہ شدت سے طاری تھا۔ لیکن اسی کے گاؤں کی ایک عورت نے جو سب عورتوں کو لے کر آئی تھی، اسے روکا اور سب کے سامنے اسے گلے لگاکر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا، پھر وہ بوڑھی عورت خالنسا کو پکڑے آگے بڑھی، پہلے جنازے کے پاس جاکر دونوں جھکیں پھر مڑکر مجمعے کی طرف جھکیں۔

"میرے بیٹو اور بیٹیو، مجھے بھی کچھ کہنے کی اجازت دو۔ حال ہی میں میں نے جوراخان کو تقریر کرتے سنا تھا۔ وہ کتنی جاندار اور باہمت تھی اور جو الفاظ اس نے کہے تھے وہ عقل و فراست سے بھرے تھے۔ اس نے لینن کے بارے میں بتایا، اس کی آنکھوں نے لینن کو دیکھا تھا، لینن نے اس سے ہاتھ ملایا تھا، اب ان آنکھوں کی روشنی گم ہے۔ وہ ہاتھ سرد ہیں۔ اب ہم اس کی آواز کبھی نہیں سنیں گے لیکن میں بڑھیا بھی یہ چاہتی ہوں کہ آج جب میں آخری بار اس کی صورت دیکھوں تو میرا چہرہ کھلا ہو اور میں آزادی کے ساتھ اس کا آخری دیدار کر سکوں۔"

سرمئی رنگ کا، دھول سے اٹا پرنجے اس کے سر اور کندھوں پر سے پھسل کر نیچے گر پڑا۔ وہ ابھی تک جوان لگتی تھی اور اس کو دیکھنے سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کمسنی میں بہت ہی حسین رہی ہوگی، اس نے اپنے پرنجے

پر پاؤں رکھکر قدم آگے کو بڑھائے، جوراخان کے قدموں کو لپٹایا اور عقیدت کے الفاظ نچھاور کئے، آزادی کے آنسوؤں کے ساتھ:

"تمہاری زندگی مختصر تھی مگر تمہاری عزت اور مسرت کا ستارہ آسمان کی بلندیوں پر بہت اعلا مقام رکھتا ہے! وہ ستارہ ہمیں بھی روشنی بخشتا رہے۔"

اب تک جو خاموشی چھائی ہوئی تھی وہ یکایک ٹوٹ گئی، بھیڑ میں سے ڈھیروں چچوان اور پرنجے گٹھریاں بن بن‌کر، عورتوں کے سروں پر سے ہوتے ہوئے جوراخان کے جنازے کے پاس گرنے لگے۔ ذرا سی دیر میں بڑا سا ڈھیر لگ گیا، عورتوں اور مردوں نے نعرے لگائے:

"جلا دو ان کو!"

"جلا دو اس کوڑے کو، پھونک دو ان کالی کفنوں کو!"

"جلا دو ان کو ابھی ہمارے سامنے!"

"ایسے جلا دو کہ نشان باقی نہ رہے! ان کی راکھ کو ہوا پر اڑا دو!"

نزاکت جو اب پرنجے نہیں پہنے ہوئے تھی، جنازے کی طرف دوڑی۔ اس کے بالوں میں بندھے سکے دھوپ میں چمک رہے تھے۔

"پیاری بہنو" اس کی آواز شور و غل سے اوپر بلند ہوئی۔ "میں اپنی اس سفید بالوں‌والی ماں سے کچھ بات کروں‌گی۔" وہ جوراخان کی ماں کی طرف جھکی جو سر جھکائے جنازے کے پائینتی بیٹھی تھی۔ "ماں! غم نہ کر، اپنی کمر سیدھی کر لے، تیری بیٹی ہماری حقیقی بہن جیسی تھی اور ہم سب تیری بیٹیاں ہیں، ہم جتنی محبت اس سے کرتے تھے اتنی ہی تجھ سے کریں‌گے اور ہم اس جیسی ہی بننے کی کوشش کریں‌گے!"

اس درمیان عبدالصمد نے ایک جلتی ہوئی مشعل پرنجوں کے ڈھیر پر پھینکی، دوسری مشعل بشارت نے پھینکی، جب اس کے اوپر رینڈی کا تیل ڈال دیا گیا تو چیتھڑوں اور گھوڑے کے بالوں کا وہ ڈھیر شعلے دینے لگا۔ چٹختا اور سائیں

کرتا بدبودار، سیاہ دھواں آسمان کی طرف لپکنے لگا اور آگ میں مزید سیاہ بنڈل دنادن گرنے لگے۔

منہ کھولے ہوئے عورتیں سامنے آنے لگیں جنھوں نے اپنے پرنجے نہیں اتارے تھے۔ وہ پیچھے تو تھیں مگر پنجوں کے بل کھڑی ہو ہوکر، اوروں کے سروں اور کندھوں پر سے اپنی گردنیں اونچی کر کرکے اس الاؤ کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

بعض جو ہمدردی میں تو کم اور نظارہ کرنے کے لئے زیادہ آئی تھیں، خاموشی کے ساتھ بھیڑ سے الگ ہو گئیں اور اس طرح نکل گئیں کہ کوئی ان کو نہ دیکھے۔ چند ایک دقیانوسی بوڑھے الگ ایک ٹولی بنائے کھڑے تھے۔ آج ان کی ہمت نہیں پڑی کہ کچھ کہتے۔

بالکل غیرمتوقع طور پر نعیمی نہ جانے کہاں سے بجھتی ہوئی آگ کے پاس آ کھڑا ہوا اور ہوا میں اڑتی راکھ کو ہاتھوں سے ہٹانے لگا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں چھڑی نہیں تھی، وہ بھی کچھ بولنا چاہتا تھا۔

"شہریو" اس نے بڑی پرتکلف زبان میں چیختے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "ہم نے پرنجوں کو آگ میں جھونک دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے پرانے طریقۂ زندگی کو آگ لگا دی!"

اناخان کو خود بخود اس کے پاس سے ہٹ جانے کی خواہش ہوئی، وہ نعیمی سے الگ جاکر کھڑی ہو گئی اور ایرگاش غصے سے بڑبڑایا:

"سانپ کہیں کا!"

نعیمی نے ادھر ادھر دیکھا، پیچھے ہٹا، کھنکارا اور جلدی سے اپنی بات یوں ختم کر دی: "میں تو بس صرف یہ کہوں‌گا کہ... کہ دشمن پر پھٹکار ہو اور آزادی اور روشن‌خیالی پائندہ‌باد!"

اس کے بعد وہ جلدی سے وہاں سے کھسک لیا اور بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

آگ بجھ گئی اور سرمئی راکھ کو ہوائیں اڑا لے گئیں۔

عوام نے اس تخت کو کاندھے پر اٹھایا جس پر ان کی

بیٹی کا تابوت رکھا تھا۔ پھر مجمعے پر ایک غمناک خاموشی طاری ہو گئی۔ اگرچہ لوگوں کے سر اور کندھے شدید غم سے جھکے تھے لیکن ان سب نے پہلے کبھی خود کو ایک دوسرے سے اتنا قریب نہیں محسوس کیا تھا۔ اتنے بہت سے دوست نعمانچہ میں ایک جگہ کبھی بھی نہیں جمع ہوئے تھے۔

جنازے کے جلوس میں دیر نہیں لگی۔ جوراخان کو انجینیر کے بتائے ایک ایسے مقام پر دفن کیا گیا جو مستقبل میں تیار ہونےوالی مل کے بالکل سامنےوالے برآمدے کے آگے تھا۔ جب لوگ تازی بنی ہوئی قبر کے پاس سے منتشر ہونا شروع ہوئے تو سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا۔

بائیسواں باب

تورسنائی کی حالت بہتر نہیں ہو رہی تھی۔ ویسے اب یہ تو نہیں لگتا تھا کہ اسے درد یا کوئی تکلیف ہے مگر اناخان بڑی مایوسی کے ساتھ اس کی آواز سننے کی منتظر تھی۔

کبھی کبھی وہ بچی اس ٹوپی کو اٹھا لیتی جس پر وہ پھول کاڑھ رہی تھی اور ہاتھ میں سوئی دھاگا لےکر ماں کے پاس بیٹھ جاتی۔ اس کے کاڑھے ہوئے پھول ویسے ہی دلکش اور نازک ہوتے تھے جیسے وہ گیت جنھیں وہ گایا کرتی تھی۔ وہ اپنی کڑھائی بڑے شوق سے کرتی تھی مگر کبھی کبھی یکایک وہ اپنے کام، اپنی دستکاری کو حیران نظروں سے تکتی رہ جاتی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ وہ اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کرتی اور اناخان ایسا ظاہر کرتی جیسے

اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ وہ تیزی سے باہر صحن میں جاکر کسی کونے میں چھپ کر خوب روتی۔ اس کے ضبط سے باہر تھا کہ بچی کی بے آواز گریہ و زاری دیکھ سکتی جو شاید اس بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتی تھی جسے اس کے بزرگ نہیں سمجھ پاتے تھے، شاید سمجھنا چاھتی تھی کہ اس کو کیا ہوا تھا۔

تورسنائی شاذ و نادر ھی باہر جاتی۔ وہ لوگوں سے کتراتی تھی۔ اس کے دوست اس سے ملنے آتے مگر کبھی دیر تک نہ ٹھہرتے، انہیں اس کی موجودگی میں کچھ گھبراہٹ سی ہوتی، اس کی بےزبانی سے کچھ ڈر سا لگتا۔ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں وہ ھنسیں تو وہ رو نہ پڑے۔ تورسنائی ان کو یاد تو کرتی تھی مگر تنہائی میں زیادہ اطمینان سے رھتی۔ خود بشارت بھی گھر سے باہر رہنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈتی رھتی، وہ اپنی ننھی بہن کی آنکھوں میں ایک شکوہ سا دیکھتی کہ "تم مزے کر رھی ہو، خوش ہو، طاقتور ہو اور میں..." بشارت اس کو پیار بھی کرتے ڈرتی، یہ ظاہر کرتے بھی ڈرتی کہ اس کا دل اپنی بہن کے لئے کتنا غمزدہ تھا۔ اور بشارت کے یہ جذبات تورسنائی کی ذہانت سے پوشیدہ نہ تھے۔

اناخان کھوئی کھوئی رہنے لگی، کہیں جاتی، کچھ بھی کرتی دل تورسنائی میں ھی لگا رھتا۔ وہ موقعے ڈھونڈتی رھتی کہ کب کوآپریٹو سے بھاگ کر گھر پہنچ جائے، اس امید میں کہ شاید آخرکار اسے "امی!" کی وہ صدا سنائی دے جائے جس کا اسے اتنے دن سے اس قدر انتظار تھا۔

بشارت مقام تعمیر سے تھکی ہوئی آتی، دھول میں اٹی، ہاتھوں پر کھرونچے مگر خبروں سے لبالب بھری! اس کے پاس تو ہمیشہ اتنی نئی باتیں کہنے کو ہوتی تھیں کہ رات بھر باتیں ھی کرتی لیکن وہ اور اس کی ماں، دونوں ھی تورسنائی کے سامنے ادھر ادھر کی باتیں کرنے سے گریز کرتی تھیں کیونکہ وہ ان کی گفتگو کو دلچسپی کے ساتھ سنتی تو تھی مگر رفتہ رفتہ اس کی آنکھوں میں درد اور تکلیف کی

جھلکیاں دکھائی دینے لگتیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ گھر میں گھنٹوں کوئی بات نہ ہوتی اور سناٹا چھایا رہتا۔

سارے دن بشارت اور اس کی ماں دماغ لڑاتی تھیں کہ حاجیہ کے بھیجے ہوئے خط میں جو خوشخبری تھی اسے تورسنائی کو بتانے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ بوڑھے پروفیسر کی درخواست کا تاشقند میں بہت اچھا ردعمل ہوا تھا اور پورا امکان تھا کہ تورسنائی کو موسیقی کے اسکول میں داخل کر لیا جائے مگر سوال یہ تھا کہ تورسنائی خود اس خبر پر کیسا تاثر محسوس کرے گی؟ دونوں نے بہت سوچنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اسے کچھ نہ بتایا جائے۔

تورسنائی کو کہیں سے ایک پرانی گڑیا مل گئی جو اس نے مدتیں ہوئیں پھینک دی تھی اور اسے بھول چکی تھی۔ اس نے گڑیا کے لئے قمیض سینی شروع کی۔ وہ کپڑے کی گڑیا تھی، آگے کو ابلتی ہوئی شیشے کی آنکھیں اور پکے سیب ایسے سرخ گال۔ تورسنائی کے گال زرد تھے اور اس کے دبلے پتلے بازوؤں پر باریک باریک نیلی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ گڑیا میں جی جان سے جٹ گئی، اس پر قمیض فٹ کی، شرارت کرنے پر اسے تھپڑ مارا اور ڈانٹا۔ اس کے ہونٹ ہلنے سے ایسا ہی ظاہر ہو رہا تھا: گڑیا نے اپنی آنکھیں اس کو دکھائیں اور اپنی مسکراہٹ بھی، جو مستقل طور سے اس کے لبوں پر چپکی ہوئی تھی۔ گڑیا اور اس کی ننھی "ماں" دونوں ہی بےزبان تھے۔

ایک دن اناخان بےقرار ہوکر اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی، اس نے بچی کو اپنے بازوؤں میں لےکر سینے سے لگایا اور اس کی خوشامد کرنے لگی۔ اس کی آواز میں بےحد مایوسی تھی۔

"جلدی سے مجھ سے کچھ بول۔ جلدی سے۔ کہہ "امی"۔ سن رہی ہے؟ "امی!" چل کوشش تو کر، میری فاختہ، میری ننھی بلبل..."

تورسنائی چپ رہی اور خوفزدہ نگاہوں سے ماں کو گھورتی رہی، اس کے ہونٹ رہ رہ کر کانپ رہے تھے۔ اس نے

اپنے تمام اعصاب پر زور ڈال کر کوشش کی مگر ماں کے چہرے پر اس کی صرف سانسیں ہی پہنچ سکیں، لبوں سے کوئی آواز نہ نکلی، پھر آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اناخان نے اپنے آپ کو سنبھالا، تورسنائی کو اپنے گھٹنوں پر بٹھایا، اس کے آنسو پونچھے۔

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔ اب میں جانتی ہوں: تو جلدی ہی بات کرنے لگےگی، گانے لگےگی۔ تو نئے اسکول جائےگی، تیرے دوست تجھے دیکھ کر بہت خوش ہوں‌گے..." اناخان یہ سب کچھ کہتی جا رہی تھی مگر اسے اپنے کسی ایک لفظ کا بھی یقین نہ تھا۔

البتہ تورسنائی ایک ایسے اعتماد کے ساتھ سنتی رہی جو صرف ماں ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

وہ ہمیشہ اپنی بہن سے زیادہ حساس تھی۔ وہ اپنی ماں کا موڈ فوراً محسوس کر لیتی تھی اور کبھی کبھی تو اناخان کو اس کی اس بات پر جھنجھلاہٹ بھی ہوتی تھی کیونکہ اسے محتاط رہنا پڑتا تھا۔ بچی بڑوں کی باتوں اور ان کی فکروں کو ضرورت سے زیادہ ہی محسوس کرتی تھی۔ تو پھر اس وقت اس کے احساسات پر کیا گزر رہی تھی؟ اس کا ننھا سا گیتوں بھرا دل جو سہم گیا تھا، اس میں کیا ہو رہا تھا؟

جس دن جوراخان قتل ہوئی اور اس کے اگلے دن جب وہ دفن ہوئی، تورسنائی ماں کو کچھ ایسی پریشان نظروں سے تکتی رہی تھی کہ اناخان میں منہ پھیر لینے کی بھی ہمت نہ رہی۔ تورسنائی گھر میں ماں کے پیچھے پیچھے گھومتی اور اس کی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ ماں نے جب اپنا منہ چھپانے کے لئے اسے سینے سے لگایا تو آہستہ سے ماں کے بازوؤں سے نکل گئی۔ اناخان چپ رہی اور تورسنائی کی نگاہوں میں سوال اور مطالبہ زیادہ شدت اختیار کر گیا جیسے کہہ رہی ہو: "تم کیوں چپ ہو، امی؟ آخر کیا چھپا رہی ہو؟ میں محسوس کر رہی ہوں کہ کوئی بہت ہی بھیانک بات ہو گئی ہے..."

اناخان نے محسوس کیا کہ وہ اس سے جھوٹ نہیں بول سکتی مگر سچ بھی اسے کیسے بتایا جائے؟

اناخان کے لئے وہ راتیں قیامت کی تھیں، پل بھر کو آنکھ لگتی اور پھر گھبراکر نیند اچٹ جاتی جیسے کسی نے اسے زور سے جھنجھوڑ دیا ہو۔ نیم‌وا آنکھوں سے تورسنائی کو دیکھتی جو سوتی ہوتی، اس کی سانس کی آواز سننے کی کوشش کرتی لیکن دوسری رات کو ماں کو یقین ہو گیا کہ بچی بھی نہیں سو رہی ہے بلکہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہی ہیں۔

صبح کو اناخان نے تورسنائی کو بتایا کہ کوآپریٹو کارگاہ میں اسے سردی لگ گئی تھی اور زکام ہو گیا ہے۔ بعد کو اسے اپنی اس بات پر افسوس ہوا کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ اس سے تو معاملہ اور بگڑ گیا۔ تورسنائی نے ایسا ظاہر کیا کہ اسے ماں کی بات کا یقین آ گیا ہے...

خوف سے اناخان کا دل بیٹھنے لگا۔ اسے صاف نظر آیا کہ تورسنائی سمجھ گئی ہے کہ اسے دھوکا دیا جا رہا ہے۔ پھر کیا کیا جائے، کیسے تورسنائی کی مدد کی جائے؟

پھر ایسا ہونے لگا کہ تورسنائی گھر میں آنےوالے ہر شخص کو تجسس اور شبہے کی نظروں سے دیکھنے لگی۔ یفیم دانیلووچ آیا اور تورسنائی کو سامنے بٹھاکر بڑی پرمسرت آواز میں بتانے لگا کہ کس طرح قبرستان کے سامنےوالی بیکار زمین کی کایا پلٹ ہو گئی ہے اور "فورمین" بشارت، اس مہم پر کیسا اعزاز حاصل کر رہی ہے۔ لیکن تورسنائی کھوئی کھوئی نگاہوں سے اس کے ناک کے بانسے پر نگاہیں جمائے رہی اور منتظر رہی کہ اسے سچی بات بتا دی جائے۔ اس کے یوں دیکھنے سے یفیم دانیلووچ کو سخت گھبراہٹ ہوئی۔

اناخان نے بیٹی کے پیچھے کھڑے ہوکر لبوں پر ایک انگلی رکھی اور بےبسی کے عالم میں اپنے دونوں بازو پھیلائے۔ تورسنائی نے یکایک پیچھے مڑکر، ڈر اور خوف بھری نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔

ایک روز کافی رات گئے جب اناخان بچی کو سلا رہی

تھی، دوبروخوتوف اچانک آ پہنچا، اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جس کے گھنی سیاہ داڑھی تھی۔

"امی، یہ ہمارے انجینیر ہیں - سرگئی لووچ" بشارت نے دوبروخوتوف کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"اور یہ میرے ایک پرانے دوست ہیں، ویکینتی فیودرووچ" دوبروخوتوف نے جھکتے ہوئے کہا۔ "یہ اعصاب کے ڈاکٹر اور اعصابی بیماریوں کے ماہر ہیں، ان ہی کی آپ کی بیٹی کو ضرورت ہے۔"

اناخان خوشی کے مارے پھولی نہ سمائی، مہمانوں کا استقبال کرکے ان سے بیٹھنے کی درخواست کی لیکن ڈاکٹر نے اسے اشارے سے روک دیا۔

"نہیں، آپ ہمیں معاف کریں، ہم بیٹھیں گے نہیں۔" اس کا لہجہ نہایت پرسکون اور کاروباری تھا اور وہ اس طرح بات کر رہا تھا جیسے تورسنائی کو سناکر کہہ رہا ہو جسے اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دیکھ لیا تھا۔

"عام طور پر زیادہ بیٹھنا مجھے پسند نہیں ہے، میرا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کا علاج جلد اور آسانی سے اور بغیر کسی تکلیف کے کر دیتا ہوں تاکہ مریض کو پتہ تک نہ چلے کہ اس کو کس طرح اچھا کر دیا گیا ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ میں آپ کو اپنا ایک راز بتاتا ہوں۔ ایسا ہے کہ جب میں بیٹھ جاتا ہوں تو میری داڑھی زیادہ تیزی سے بڑھنے لگتی ہے..." وہ چند منٹوں کے لئے بیٹھ گیا۔ "اب آپ ہی دیکھ لیجئے کیسی بڑھتی چلی جا رہی ہے؟ دیکھا آپ نے؟"

اناخان مسکرائی، بشارت منھ پر ہاتھ رکھکر کھی کھی کرنے لگی۔

تورسنائی ڈاکٹر پر نظریں جمائے تھی اور اس کی نگاہوں میں زیادہ چمک اور دلچسپی تھی۔

"واقعہ تو یہ ہے" ڈاکٹر اٹھتے ہوئے بولا، "میں ایسے لوگوں کا علاج کرنا پسند کرتا ہوں جو کافی عرصے سے بیمار ہوں اور جنہیں کوئی اور اچھا نہ کر سکا ہو۔ دیکھئے، یہ چھوٹی سی کتاب ہے نا" اس نے جیب سے چمڑے کی

جلدوالی ایک موٹی سی نوٹ بک نکالی جس کے سنہرے کنارے تھے۔ "اس میں ان تمام لوگوں کے نام لکھے ہیں جنہیں میں نے اچھا کیا ہے۔ ہر صفحے پر دس نام ہیں اور اس میں سو صفحے ہیں! تو ذرا شمار کیجئے کہ میں نے اب تک کتنے لوگوں کو اچھا کیا ہے۔"

تورسنائی شرماتی ہوئی اٹھکر پلنگ پر بیٹھ گئی اور اس غیرمعمولی ڈاکٹر کی اس نوٹ بک میں جھانکنے لگی۔ اس کی صورت سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ گنتی جوڑ رہی ہے۔ جب اس نے گننا ختم کیا تو ڈاکٹر کو احترام بھری ایک نظر بخش دی۔

"اچھی بات ہے" ڈاکٹر بولا۔ "تو میں پہلے آپ کے مریض کا نام لکھوں گا اور پھر اس کا علاج کروں گا۔ اس کا کیا نام ہے؟"

"تورسنائی!" بشارت نے جواب دیا۔

"اور خاندانی نام؟"

"صابرووا!"

"صا... بر... و... وا..." ڈاکٹر نے نام لکھتے ہوئے دوہرایا۔ "ذرا ایک منٹ ٹھہرئیے! کیا اسی مریضہ کا باپ تو نہیں تھا صابروف؟ وہ جو انقلاب کا ہیرو ہے، جس نے سارے دشمنوں کا مقابلہ کیا؟ میں نے تو اس کے متعلق بہت کچھ سنا ہے۔ اچھا تو اس کی بیٹی بیمار ہے؟ تو پھر ایسی صورت میں اب ہم کس بات کے منتظر ہیں، جلدی سے مجھے مریضہ کو دکھا دیجئے!"

"مریضہ تو یہی ہے ڈاکٹر صاحب۔ یہ جو پلنگ پر بیٹھی ہے۔"

ڈاکٹر نے ایک اچٹتی سی نظر تورسنائی پر ڈالی اور شکایت کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بشارت کی طرف مڑا۔

"یہ ہے تورسنائی صابرووا؟ مجھے تو محسوس ہو رہا ہے کہ مجھے اس کا نام اپنی نوٹ بک میں نہیں لکھنا چاہئے تھا۔"

"کیوں نہیں؟"

"کیونکہ اس کو تو کچھ نہیں ہوا ہے!" ڈاکٹر نے تقریباً غصے میں جواب دیا۔ "میں بیماروں کا علاج کرتا ہوں اور یہ تو بالکل بیمار نہیں ہے۔ آپ لوگوں نے مجھے دھوکا کیوں دیا؟"

بشارت اور اس کی ماں نے گھبراکر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"ڈاکٹر صاحب، ذرا اسے اچھی طرح دیکھ تو لیجئے۔"

"ارے تو دیکھوں کیا؟ میں نے تو ایک نظر میں دیکھ لیا! یہ سچ ہے کہ یہ بہت بری طرح ڈر گئی ہے مگر ڈر جانا بھی بھلا کوئی بیماری ہوئی؟ ہر کوئی کبھی نہ کبھی ڈر جاتا ہے۔"

ڈاکٹر نے اپنی نوٹ بک جیب میں رکھی، تورسنائی اس کی تمام حرکات و سکنات کو بڑی شرمندگی کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ عادتاً تو وہ اس وقت ڈر گئی تھی جب یہ داڑھی والا اجنبی، گھر کے اندر آیا تھا۔ اس نے اسے کن انکھیوں سے دیکھا تھا۔ اچھا کوئی بات نہیں۔ اگر وہ بیمار نہیں تھی، تو بیمار نہ ہونے پر شرمندہ تھی۔ اب تو وہ بس یہی چاہتی تھی کہ وہ آدمی کہیں نہ جائے، اس کے ہی پاس رہے۔

"ویکینتی فیودرووچ" دوبروخوتوف التجا کرنے لگا، "اب یہاں تک آئے ہیں تو کم از کم دیکھ تو لیجئے کہ اس بچی کو کیا ہوا ہے۔ مہربانی کرکے۔"

"ارے تو کیا دیکھ لوں، بھئی؟ میں تو آپ لوگوں سے کہہ چکا ہوں کہ اس کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ ہے نا؟ بس اس کو ذرا بولنے میں دقت ہو رہی ہے۔ یہ بھول گئی ہے کہ اسے اپنی زبان کو استعمال کرنا چاہئے۔"

تورسنائی کے لب ذرا سے کھلے، اس نے زبان ہلائی۔

"واہ وا، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے! اچھا تو اب چونکہ میں آ ہی گیا ہوں اور آپ لوگ اتنا اصرار کر رہے ہیں تو چلئے میں دیکھے لیتا ہوں، بس ذرا یہ ہے کہ آپ لوگ ادھر ادھر کھڑے ہیں تو اس کو اچھا نہیں لگےگا اور آپ لوگ بیچ بیچ میں آئیں گے تو مجھے بھی خلل دیں گے اس لئے ذرا ہٹ

جائیے۔ دراصل میں لوگوں کا علاج آسانی سے اس طرح کرتا ہوں کہ انہیں خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ آپ لوگ مہربانی کرکے الگ چلے جائیں اور جب تک ہم آپ کو نہ پکاریں اس تک انتظار کریں۔"

اناخان، بشارت اور دوبروخوتوف باہر برآمدے میں چلے گئے۔

دوبروخوتوف نے اپنی نئی قمیض کا کالر ٹھیک کیا اور ذرا قدیم طرز اخلاق سے اناخان سے مخاطب ہوا:

"مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ میں آپ کا بےحد معترف اور مداح ہوں۔ میں نے آپ کے متعلق سنا ہے اور جنازے کے موقعے پر تو آپ کی تقریر نے مجھے مسحور کر دیا۔"

"مہربانی کرکے اس بات کا ذکر نہ کیجئے" اناخان نے جس کے کان ڈاکٹر کی بےربطی کے ساتھ سنائی دینےوالی آواز پر لگے تھے، پریشان ہوکر کہا۔

"لیکن ویسی ہستی کو کیا ہم کبھی بھول سکتے ہیں؟" دوبروخوتوف نے جذبات سے لبریز آواز میں احتجاج کیا۔ "کیا آپ اس کو بھلا دینا چاہیں گی جبکہ آپ خود ہی بہت کچھ اس کی طرح ہیں؟"

اناخان نے کھڑکی کی طرف ایک قدم بڑھایا۔ دوبروخوتوف نے ہلکے سے اس کی کہنی کو چھوکر اسے روکا۔

"آپ بالکل فکر نہ کیجئے، وہ بہت اچھا انسان اور بہت اچھا ڈاکٹر ہے۔ اگر وہ نہ ہوتا تو میں تنہائی کے مارے پاگل ہو جاتا۔ اس جیسا دوسرا انسان تو میں نے صرف جوراخان کو پایا تھا۔ ہاں، شاید آپ کو جوراخان کے ذکر سے غم ہوتا ہے۔"

"شکریہ کامریڈ انجینیر" اناخان بولی۔ "شاید آپ کا دوست میری بچی کو بچا لے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ ویسے میں نے بھی آپ کے متعلق سنا ہے۔"

"اچھا، آپ نے سنا ہے؟ غالباً کوئی بہت خوشگوار بات نہ سنی ہوگی" سرگئی لووچ نے تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ

کہا۔ "ویسے میں ہوں تو پرانی دنیا کا آدمی مگر یقین مانئے مجھے بہت خوشی ہے اور قسمت کا بہت شکرگزار ہوں کہ اس نے مجھے جوراخان، آپ اور یفیم دانیلووچ جیسے لوگوں کے قریب کیا۔"

انجینیر کے خلوص، صاف گوئی اور دوستانہ لہجے نے اناخان کو حیران بھی کیا، متاثر بھی۔

"پھر بھی ایرگاش آپ سے برا برتاؤ کرتا ہے۔ ہے نا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، نہیں، آپ کو ایسا نہ سوچنا چاہئے!" انجینیر نے جوش کے ساتھ کہا۔ "دیکھئے، میرا بھی یہی خیال تھا کہ آپ ایسا سوچتی ہیں۔ اس بات سے مجھے بہت صدمہ ہوتا ہے۔ ایرگاش سلطانوف نوجوان ہے لیکن عزم اور ارادے کے معاملے میں بہت ہی مستحکم۔ ذاتی طور پر میں بہت ہی کچھ ڈھیلا ڈھالا آدمی ہوں اس لئے مجھے ایرگاش کے سے جوشیلے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں۔ پھر وہ سمجھدار ہے اور ہنرمند بھی۔ جب وہ غصے میں نہیں ہوتا تو باتوں کو بڑی تیزی سے سمجھ لیتا ہے اور مجھے یہ خوبی ہر بات سے زیادہ پسند ہے۔ دراصل آپ کی بڑی بیٹی بھی ایسی ہی ہے۔ ابھی سے اس نے لوگوں کو کافی متاثر کر لیا ہے اور پھر اس میں توانائی اور جوش تو ہے ہی۔ میرا خیال ہے یہ آپ کی عمدہ تربیت کا نتیجہ ہے۔"

"آپ بہت ہی نیک دل انسان ہیں" اناخان نے مسکراکر بشارت کو دیکھتے ہوئے کہا جو کانوں تک لال ہو گئی تھی۔ "اور ہمیں یہاں آپ کی بہت ضرورت ہے۔"

اب کے دوبروخوتوف جھینپ گیا۔

"یہ سوچ کر آپ نے میری بڑی عزت‌افزائی کی" اس نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ "آپ کی بیٹی بھی میرا بہت خیال کرتی ہے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ آپ کو اس سے کوئی شکایت نہیں" اناخان نے جواب دیا۔

دروازے پر قدموں کی آہٹ ہوئی۔ ڈاکٹر دکھائی دیا۔ اناخان اس کی طرف جھپٹی۔

"رک کے، ذرا سنبھل کے" ڈاکٹر نے اطمینان سے اپنی داڑھی کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "آپ ضرور اپنی بیٹی کے پاس جائیے مگر اس سے پہلے ذرا اپنے آپ کو سنبھال لیجئے۔ آپ نے سنا ہوگا میں اس سے کس انداز سے بات کر رہا تھا؟ آپ کو بھی اس کے سامنے اسی طرح باتیں کرنی چاھئیں۔ اچھا، اچھا، کوشش تو کیجئے۔ آپ بڑی ھیں، اتنی سمجھدار ھیں آپ!"

"لیکن ڈاکٹر صاحب، آپ مجھے بھی تو کچھ بتائیے؟ کیسی ھے وہ؟ مجھ سے کچھ نہ چھپائیے گا..."

ڈاکٹر آھستہ سے ھنسا۔

"آئیے، ھم دونوں ساتھ ساتھ اندر چلیں گے۔"

اناخان کمرے میں داخل ہوئی۔

تورسنائی نے جس کی آنکھوں سے مسرت اور تشویش، دونوں بیک وقت جھلکتی تھیں، ماں کی طرف دونوں ھاتھ پھیلا دئے۔

"مم..." یہ آواز یکایک اس کی زبان سے یوں نکلی جیسے وہ لفظ نہیں بلکہ ایک کراہ، ایک آہ ہو!

اناخان ڈاکٹر کے مشورے کو بالکل بھول گئی: آنکھوں میں آنسو لئے وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے ایک دم بچی کی طرف دوڑی، اس کی آنکھیں، ھاتھ، کندھے اور گھٹنے چومنے لگی۔ بشارت ان دونوں کو لپٹ کر چومتی ہوئی رونے لگی۔

دوبروخوتوف اور ڈاکٹر دروازے کے پاس خاموش کھڑے رھے، دونوں نے ایک دوسرے کو بھی نہیں دیکھا۔

پھر یہ دونوں دو بار اور آئے اور دونوں دن تورسنائی نے ماں کو یونہی، اسی ناممکن سی آواز سے پکارا اور اس سے لپٹی رھی۔

"لو بھئی، اب تمھیں ھماری ضرورت نہیں ھے" تیسری مرتبہ آنے کے بعد ڈاکٹر نے رخصت کی اجازت چاھتے ہوئے سختی سے کہا۔ "ھم سمجھتے ھیں، اب تم دھیرے دھیرے بات کرنے لگوگی، ویسے تمھارا خود کیا خیال ھے؟"

تورسنائی ایک پل تو چپ کچھ سوچتی رہی پھر یکایک اس نے خامی بھرتے ہوئے سر ہلایا اور ایک دم سے کہا:

"ہاں۔"

"تو پھر ہماری تمہاری بات پکی ہو گئی۔ ایں؟ وعدہ کرتی ہو؟"

"ہاں" تورسنائی نے پھر کہا۔

"شاباش، بہت اچھی لڑکی ہے، اچھا خدا حافظ۔"

"ممی" ڈاکٹر اور انجینیر کے جانے کے بعد تورسنائی نے صاف طور پر کہا۔ اب اس کی آواز صاف ہو چکی تھی۔ "بشر... جو... را... خان... خالہ جوراخان کہاں ہیں؟"

سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا، ٹیڑھی میڑھی، ٹوٹی پھوٹی کچی دیواروں پر منارے کے لمبے ہوتے ہوئے سائے پڑ رہے تھے۔ خالی بازار میں گھٹن اور گندگی تھی۔ تربوز کے چھلکے کے ڈھیروں پر مکھیاں اور گوشت کی دکانوں کے قریب بھڑیں بھنبھنا رہی تھیں۔

دو دکانوں کے درمیان، ایک بدبودار جگہ پر نعیمی اکڑوں بیٹھا تھا۔

ابھی ایک گھنٹہ پہلے اس نے کوڑے اور گندگی کے اس ڈھیر میں ایک پستول دفن کیا تھا جو ایک رومال میں لپٹا ہوا تھا۔ رومال میں لپیٹنے سے پہلے نعیمی نے پستول کو اسپرٹ سے دھو دیا تھا اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ اسے وہ ننگے ہاتھوں سے نہ چھوئے۔ رومال ریشمی تھا اور اس پر نعیمی نے خود بڑی محنت سے، عربی رسم الخط میں، قدرت اللہ خواجہ کے نام کے حروف کاڑھے تھے۔ اگر یہ پستول کسی کو مل بھی گیا تو ایسا کرنے سے وہ خود بڑی حد تک محفوظ رہے گا۔

اندھیرا ہونے تک وہ اسی جگہ چھپا رہا، بدبو اور سڑاند سے اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا اور اس کی ناک میں مستقل کھجلی ہوتی رہی۔ بار بار وہ ناک کو ملتا تاکہ چھینک نہ آئے۔ حالت یہ تھی کہ پتا کھڑکا بندہ بھڑکا!

جوراخان کے جنازے کا منظر اس کے ذہن سے کسی طرح محو نہیں ہوتا تھا۔ چائے کے تاجر کو تو گمان بھی نہ رہا ہوگا کہ حالات یہ کروٹ بدلیں گے، کسی کو بھی اس کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ ایرگاش نے جو یکایک کہا تھا "سانپ" تو وہ آواز ابھی تک نعیمی کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ تو کہئے ایک اتفاق ہی تھا ورنہ وہ بھک‌منگا بنکر کا بچہ تو نعیمی کا گلا دبوچتے بھی نہ ٹھٹھکتا۔ نعیمی راتوں کو گھر سے باہر رہتا، دوست، دشمن سب سے کتراتا، کون کہہ سکتا تھا کہ وہ چائے کا تاجر پھر اپنے ذہنی سکون کے لئے وہی طریقہ اختیار نہ کرتا جو اس نے پہنچی ہوئی عورت کے سلسلے میں اپنایا تھا اور جو بہت موثر ثابت ہوا تھا۔

کافی اندھیرا ہونے تک نعیمی وہیں چھپا رہا، پھر نکلا اور چپکے سے چھپتا چھپاتا ریلوے اسٹیشن کی طرف چلنے لگا۔ یہ چاندنی رات نہیں تھی مگر ٹیچر کے کان ہر آہٹ پر لگے تھے اور اس کی سماعت مکمل طور پر کام کر رہی تھی: کوئی اس کا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔

فرغانہ جانےوالی گاڑی روانہ ہو چکی تھی جب نعیمی اچک کر اس کے ایک ڈبے کے پائدان پر چڑھ گیا۔ پلیٹ‌فارم دور اور دور چھوٹتا گیا۔ گاڑی سگنلوں سے آگے نکلتی گئی تب نعیمی نے اپنی کمر سیدھی کی۔

وہ شہر شاہ‌مردان جا رہا تھا۔ اسے بہرحال جوراخان کی قبر سے جتنی دور ہو سکے بھاگ جانا تھا۔

تیئیسواں باب

ایرگاش سلطانوف کو شہر میں بہت زیادہ لوگ جاننے پہچاننے لگے۔ ٹیلی‌فون پر اس کی آواز صرف شہری پارٹی

کمیٹی اور شہری سوویت کے دفتروں ہی میں نہیں، کوآپریٹو کے دفتروں، ریلوے اسٹیشن اور سرکاری وکیل کے دفتر میں بھی پہچان لی جاتی تھی۔

جب سے سونارخوز میں ٹیلی‌فون لگا تھا "باناتی" آدمی کے کانوں کو چین نصیب نہیں ہوا تھا۔ ایرگاش کے ھاتھ میں مقامی آمدنی کا آدھا حصہ تو آ ہی گیا تھا مگر اسے پھر بھی اطمینان نہ تھا۔ روز فون کرتا:

"کہئے، روپیوں کی تازہ‌ترین اطلاع کیا ھے؟ صنعتی بیورو سے کوئی خبر آئی؟"

"بانات" کے آدمی کو اس کے ٹیلی‌فون سے نفرت ہو گئی تھی، اس کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ ایرگاش ھے کیسا آدمی! جس بات پر اسے اصرار ھوتا وہ کامیابی سے پوری ھو جاتی تو وہ "باناتی" سے ایسے مذاق کرتا، ایسا برتاؤ کرتا جیسے وہ اس کا پرانا یار ھو:

"ارے یار، تو لمبی عمر پائے جی خوش ھو گیا، تو یہ بات تو نے پہلے ھی کیوں نہیں بتا دی..."

لیکن جہاں کوئی معاملہ ذرا سا اٹکتا اور ایرگاش کے کانوں میں لفظ "کل" پڑتا بس وہ ھنگامہ کرنے اور گرجنے لگتا:

"تم کو کائی لگ گئی ھے! نوکرشاھیو! دیکھنا ذرا کیسا ھم تمہیں جھنجھوڑکر تمہاری گدےدار کرسیوں سے اٹھاکر پھینکتے ھیں!"

اور ھر بار یہ دھمکیاں اتنی پرخلوص اور پرجوش لگتی تھیں کہ باناتی بیچارے کو مستقل یہ ڈر لگا رھتا کہ ایرگاش کسی بھی وقت اسے کرسی پر سے اٹھاکے پھینک دے‌گا۔

لیکن واقعہ یہ تھا کہ سونارخوز سے زیادہ تعداد میں گدےدار فرنیچر مل پروجیکٹ دفتر میں تھا کیونکہ یہ دفتر قدرت‌الله کی حویلی میں واقع تھا۔

جب قدرت‌الله بائے شہر چھوڑکر بھاگا تو اس نے یہ حویلی اپنے بیٹے کو دے دی تھی لیکن نصرت‌الله نے بالکل غیرمتوقع طور پر اسے مل پروجیکٹ کے سپرد کر دیا یا بقول

نعمانچه کی بوڑھی عورتوں کے، ایرگاش کو "تحفے میں" دے دیا۔ ایرگاش نے بائے کے شاندار آرام‌ده سجے سجائے ڈرائنگ روم میں اپنا دفتر جمایا اور اپنا وہ ڈیسک سونارخوز سے اٹھا لایا جس پر سبز کپڑا تھا۔ حوض کے پاس نصرت‌الله کے لئے جو ایک چھوٹا سا مکان بنوایا گیا تھا، اس کو اس نے حساب کتاب کے شعبے کے حوالے کر دیا۔ وهاں سے صبح سے شام تک گنتاروں* کے چلنے کی آوازیں سنائی دیتی تھی۔ باغ کی طرف کھلنےوالی کھڑکی پر پروجیکٹ کا سب سے هردلعزیز بورڈ لگا هوا تها: "خزانچی"۔

لکڑی کے خوبصورت خراد کئے هوئے پھاٹک کے پاس کاغذ پر چھپی هوئی نوٹسیں چسپاں تھیں اور تقریباً هر نوٹس اس ایک لفظ سے شروع هوتی تھی: "ضرورت هے"۔ نوٹس بورڈ کے سامنے همیشه لوگوں کی ایک بھیڑ لگی رهتی جن میں سے زیادہ‌تر ان‌پڑھ هوتے اور اس انتظار میں رهتے که کوئی پڑھا لکھا ادھر سے گزرے تو اس سے پڑھوائیں۔ جب کوئی نه ملتا جو ان کی مدد کر سکتا، تو وہ گیٹ سے اندر جاکر "خزانچی" والی کھڑکی بھڑ بھڑاتے۔

انهیں پروجیکٹ کے دفتر سے ایک آواز سنائی دیتی جس سے اچھے جذبات اور غصه، دونوں جھلکتے تھے۔

"هیلو! هیلو! لعنت هو تم پر!"

ایک موٹا سا هاتھ کا بنا هوا سگریٹ پیتے هوئے ایرگاش پریشان کمرے میں ادھر ادھر گھوم رها تها۔ تھوڑی دیر بعد وہ ٹیلی‌فون کے بکس کے پاس رکتا اور تیزی سے هینڈل گھماتا۔

"هیلو! هیلو، تمارا! تم هو تمارا؟ زنده هو کیا؟ اچھی هو نا؟ اس قیمتی ٹیلی‌فون کو گھماتے گھماتے، انتظار کرتے کرتے تو میری مونچھیں هاتھ هاتھ بھر کی هو گئیں۔ کیا؟ لعنت هو! هیلو، هیلو، تمارا! ارے

---

* ایک قسم کا چوکھٹا جس میں تار لگے هوتے هیں اور تاروں میں گولیاں۔ ان گولیوں سے شمار کا کام لیا جاتا هے۔ اڈیٹر۔

بھئی، کہاں غائب ہوتی رہتی ہو؟ بات یہ ہے کہ تمہارے لئے ہم لوگوں کا عشق روز بہ روز بڑھتا رہےگا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ایوانوو وازنیسنسک سے جو سامان روانہ ہونےوالا تھا نا، وہ چل پڑا ہے سو ہم لوگ کافی رئیس دولہا ہیں۔ ہاں کہے دیتا ہوں، ہم جو بری کا سامان لا رہے ہیں وہ ایک نہیں کئی کاروانوں پر لدکے آ رہا ہے۔ پانچ ریل کے ڈبے، تین فلیٹ کاریں۔ اور چونکہ معاملہ ایسا ہے اس لئے... ہیلو! ہیلو! سمارا، ذرا مجھے تمارا کا نمبر ملانا پھر سے... یعنی... کہ، معاف کرنا تمارا... ذرا مجھے سمارا کا نمبر دینا پھر سے!..

ریسیور میں ہنسی کی آواز سنائی دی، ایرگاش بھی ہنسا، اس کی ہنسی میں اطمینان کی جھلک تھی۔ سامان واقعی روانہ ہو چکا تھا! مل کی مشینیں راستے میں تھیں! سارے دن تمارا کوشش کرتی رہی تھی کہ کسی طرح سمارا کے دوردراز ریلوے اسٹیشن سے یہاں کا فون ملاکر ایرگاش کی ان لوگوں سے بات کروا دے اور ایرگاش اس کی ہمت بندھاتا رہا۔

"تمارا، جتنی تیزی سے ہمارا یہ پروجیکٹ ترقی کرےگا نا، اتنا ہی تم سے ہمارا عشق زور پکڑےگا۔ ابھی ہمیں سیمنٹ ملنا باقی ہے اور تم جانتی ہو کیا؟ ایک نہایت ہی عمدہ، پیچ کاٹنےوالا خراد! یعنی جس کو دیکھنا جنت دیدار ہے! خدا چاہےگا تو ہم مل چالو کر دیں گے اور جو پہلا تین گز بہترین پھولدار سارپنکا بنےگا نا، وہ تمہیں پیش کیا جائےگا۔ تم اس سے ایک نہایت فیشن‌ایبل، چست و درست لباس بنوانا۔ کیا؟ او... ہو... ہو، مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ تم اتنی سروقد واقع ہو۔ یہ تو معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔ چلو کوئی بات نہیں، تم کو ساڑھے تین گز دے دیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟ اچھا اور اگر تم عشق کے معاملے میں اتنی ہی ماہر ہو تو پھر میرے دل کو کیوں جلاکر تکہ کباب کئے دے رہی ہو، میری جان تمارا؟ مجھ سے سمارا سے ذرا بات کروا دو نا!"

آخرکار بڑی آفتوں کے بعد سمارا کی کال ملی۔ معلوم

ہوا کہ سب کچھ درست ہے: سامان ریلوے اسٹیشن سے گزر چکا تھا۔ لیکن اس اچھی خبر نے ایرگاش کو ایک اور تازہ مسئلے سے دوچار کر دیا۔ اس کے پاس سامان اتارنے کی تیاری نہیں تھی۔ دو ویگن بھرکر تختے، سیمنٹ، شیشہ اور لوہا تو ابھی تک پہلے ہی سے ریلوے کے گوداموں میں رکھے تھے اور انہیں چھڑایا نہیں گیا تھا۔ نقل و حمل کی سخت دقت تھی اور سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ وہ سامان حاصل کرنےوالا ایجنٹ اول نمبر کا نکما تھا۔ خوشامدی ذہنیت‌والے اس شخص میں ذرا بھی تیزی نہ تھی۔ وہ اشیائے مرسلہ کی فہرستیں اتنی لجاجت کے ساتھ پیش کرتا تھا جیسے وہ خود اس کی اپنی عرضیاں ہوں۔ وہ ریلوے کے لال ٹوپی‌والے افسر سے دبتا بھی بہت تھا۔ دراصل اس بیچارے نے اب تک کبھی اتنے بڑے پیمانے کا کوئی کام کیا ہی نہیں تھا۔ پھر وہ ذرا بوڑھا بھی تھا اور اس چلت پھرت کے کام کو کرنا اس کے بوتے کی بات نہ تھی۔ بس اس میں کل جمع یہی صفت تھی کہ لکھ پڑھ سکتا تھا اور دستخط بڑی خوبصورتی سے کر لیتا تھا۔ کاش کہ اس کے ساتھ کام کرنے کے لئے کوئی جوان اور زیادہ طاقتور آدمی مل جاتا...

ایرگاش نے سارے بڑھئیوں، رنگریزوں، پتھر کاٹنےوالوں، یہاں تک کہ مزدوروں کے نام بھی دل ہی دل میں گن ڈالے لیکن کوئی دور دور بھی ایسا سمجھ میں نہ آتا تھا جو اس کام کے لائق ہو، ایک آدھ کو چھوڑکر سب ان‌پڑھ تھے۔

ایرگاش جائے تعمیر پر پہنچا۔

اب تو پہلی‌والی بےکار زمین اور وہ شیر کی پہاڑی پہچانی نہیں جاتی تھی۔ کہیں نہ کوئی ٹیلا تھا نہ جھاڑی، نہ گڈھا، نہ کوڑا کرکٹ، نہ گندگی – زمین یوں ہموار پڑی تھی جیسے رکابی۔ پہاڑی کی جگہ مل کی بنیاد کی خندق کھودی جا چکی اور خندق کے گیلے کناروں پر چیونٹیوں کی طرح کھدائی مزدوروں کی بھیڑ اکٹھا تھی۔ ایک طرف کو لکڑی کے رندہ کئے ہوئے تختے ایک پر ایک برابر سے جمے ہوئے تھے۔ سرخ اینٹوں کے ڈھیر دھوپ میں جلتے ہوئے معلوم ہو رہے

تھے، چونے بالو، سیمنٹ اور روڑی کے ڈھیر نیلے نیلے فاختئی اور سرمئی نوکیلے ٹیلے جیسے لگے ہوئے تھے۔ انجینیر نے ہر چیز کی ایک خاص جگہ مقرر کر دی تھی تاکہ جلدی اور آسانی سے اسے چار پہیوں کی گاڑیوں، ٹھیلوں یا پھاوڑوں کے ذریعے ہر جگہ پہنچایا جا سکے۔

تارکول پھرے ہوئے نمدوں کی چھتوں‌والے سائبانوں کے نیچے کارگاہیں قائم تھیں۔ بھٹیوں میں دھکا دھک آگ روشن تھی اور لوہار، جن کے جسموں پر پسینے کی چمک تھی، دھونکنیاں پھونک رہے تھے یا ہتھوڑے مار رہے تھے۔ مستری لوگ شکنجوں پر جھکے تھے اور بڑھئی گھٹنے گھٹنے تک لکڑی کی چھیلنوں میں ڈوبے، بنچوں کے پاس کھڑے لکڑیوں پر رندہ کئے جا رہے تھے، بڑے بڑے آروں پر لکڑیاں کاٹ کاٹ کر تختوں کی شکل میں ڈھالی جا رہی تھیں اور کسی طرف بڑھئیوں کے لکڑی پر کلہاڑیاں مارنے کی آواز گونج رہی تھی۔ ایک جگہ عورتیں ایک بڑے سے دیگچے میں پانی ابال رہی تھیں جس کے نیچے وہ بار بار آگ تیز کرنے کے لئے لکڑی کی چھیلنیں ڈالتی جا رہی تھیں۔ ہر طرف باقاعدگی سے کام ہو رہا تھا۔ انجینیر نے یہاں بھی ہر کام اپنے مخصوص حساب سے کیا تھا۔ اس نے سارا کام اپنے ہاتھ میں لےکر، ہر بات باقاعدہ منصوبہ بناکر کی تھی۔

سارا کام بغیر کسی گڑبڑ کے ہو رہا تھا۔ ایرگاش نے صرف ایک جگہ کام میں تساہلی اور لاپرواہی دیکھی جہاں پتھر توڑے جا رہے تھے۔ دو مستری زور زور سے ہاتھ چلا چلاکر، پوری طاقت سے چیخ چیخ‌کر نہ جانے کیا بحث کر رہے تھے اور کام بالکل نہیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو ہڑیلا مقسوم تھا اور دوسرا ایک ذرا سن‌دار، گٹھیلا سا آدمی جس کی داڑھی دھول سے سفید ہو رہی تھی۔ نعمانچہ میں لوگ اسے ماماجان قلی کے نام سے جانتے تھے۔ جب بحث کو کافی دیر ہو گئی تو ایرگاش ان دونوں کی طرف بڑھا۔

"کل تو تم نے کام پر شکل ھی نہیں دکھائی" ماماجان

چیخ رہا تھا۔ "پورا دن ضائع ہو گیا۔ آج آئے ہو تو دو گھنٹے سے مولویوں کی طرح وعظ کہہ رہے ہو۔ "وفا" اور "عشق"... کون پوچھتا ہے تمہاری اس وفا اور عشق کو؟"

"ارے، یہ سب باتیں تمہاری سمجھ میں آنےوالی نہیں ہیں" مقسوم نے جواب دیا۔ "یہ تمہاری عقل سے اوپر ہیں۔"

"مجھے ذرا بھی فکر نہیں کہ یہ باتیں اوپر ہیں کہ نیچے، میں کہتا ہوں کام کرو، مجھے بھی لے ڈوبے، تم جیسے کے ساتھ کام کرکے تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا! ہڑیلا زنخا کہیں کا!"

مقسوم نے اپنی لال لال، بغیر پلکوں والی آنکھیں بچکائیں، اپنی پتلی، جھریاں پڑی گردن یوں آگے کو کھینچی کہ گردن کی نوکدار ڈھنیڑی آگے کو نکل آئی اور اس کی گردن پر نچی مرغی کی گردن لگنے لگی۔

"مگر تمہیں میری نگرانی پر کس نے مقرر کیا ہے؟ اب اوورسیر نہیں رہے! وہ زمانہ لد گیا!"

"میں اوورسیر نہیں ہوں!... تم البتہ ایسے اوورسیر ہو جو شکاری کتا تھا، جب قدرت اللہ کا جھوٹن کھاتے تھے تو تم نے کر لیا جو کچھ کرنا تھا۔"

"ماماجان، زبان کو لگام دو! میں نے بائے کے چوکھٹ کی غلامی کی اور میری زندگی کے تیس سال بائے کے قدموں میں برباد ہوئے، اب میں آزاد ہوں جیسے ہر کوئی آزاد ہے! اور جو پہلے غلام تھے اب کے خوشیاں منانے کا وقت آیا ہے، میری زبان آزاد ہے، میرے ہاتھ پیر بھی آزاد ہیں۔ تم مجھ سے کام کے لئے اصرار کرنےوالے کون ہوتے ہو!"

"جہنم میں جا کمبخت، ابھی بھی وقت ہے، اپنی چمڑی سلامت لےکر میری نظروں سے دور ہو جا! میں اکیلا ہی کر لوں گا! یا بائے کے بیٹے کو اپنے ساتھ لگا لوں گا۔ تجھ سے تو وہی غنیمت ہے، ویسے تو کل کا چھوکرا ہے وہ مگر پتھروں کے پہاڑ اس نے یوں ہٹاکر رکھ دئے جیسے آٹا ہوں۔"

نصرت اللہ پاس ہی کام کر رہا تھا۔ اس کی قبا سینے پر

سے کھلی تھی اور دھنا ھاتھ آزاد تھا۔ پھاوڑا بھر بھر کر بجری اٹھا رہا تھا اور ہر بار اس کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ پھاوڑا زیادہ سے زیادہ بھر جائے۔

ھڑیلے مقسوم نے اس پر حقارت کی ایک نظر ڈالی اور تھو تھو کرتے ہوئے ماماجان قلی پر چیخا۔

"تو تم میرا اس چھوکرے سے موازنہ کرتے ہو! میرا مقابلہ؟ میں جس نے بائے کے مظالم سہے ہیں؟ دیکھو، اگر سنبھل کے نہیں رھوگے تو میں تمہارے خلاف سیاسی کارروائی شروع کروا دوں گا!"

ماماجان کچھ پسپا سا ہو گیا۔

"دیکھتے جاؤ، کہیں سیاسی کارروائی تمہارے ہی خلاف نہ ہو جائے۔ نہ خود کام کرتے ہو، نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہو۔"

"ہم آزاد ہو چکے ہیں! جب جی چاھےگا تب کام کروں گا! اب میرا کوئی آقا یا مالک تھوڑی ہی ہے۔ وہ زمانے لد گئے! یا تم اس آزادی کے خلاف ہو؟ ایں؟ صاف کہو نا!"

ماماجان چپ ہو گیا اور مقسوم بڑے طنطنے کے ساتھ گھٹنوں پر ھاتھ رکھ کے اس کے سامنے بالو کے ڈھیر پر بیٹھ گیا۔

پھر ایک مضبوط ھاتھ نے پیچھے سے مقسوم کی گردن پکڑی اور اسے جھٹکے کے ساتھ بالو کے ڈھیر پر سے اٹھا لیا۔ ایرگاش اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"کیا کہا تھا؟ ذرا پھر کہنا۔ کوئی مالک نہیں ہے۔ ایں؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ بیٹھے بک بک کرتے رھوگے اور کام کوئی جادو کا ڈنڈا آکے کر دےگا؟ ہوں! تو ہم لوگوں نے اور ھمارے باپوں نے تم جیسوں کے لئے یہ آزادی حاصل کی ہے؟ تم سیاسی کارروائی سے دھمکا کس کو دے رہے ہو؟ ھماری قسم کے لوگوں کو؟ ایک محنت کش کو؟"

"میں... میں تو... خدا کرے آپ صحت مند رہیں... آپ خیریت سے تو ہیں نا مالک؟ میرا مطلب ہے کامریڈ مالک..." ھڑیلے مقسوم نے منہ ہی منہ میں کہا اور اپنی گردن کندھوں میں چھپا لی۔

"جی ہاں، میں بالکل بخیریت اور صحت مند ہوں" ایرگاش

نے کہا۔ "اور ہماری سیاست نہایت ہی سیدھی سادی ہے: اگر آپ کام نہیں کریں گے تو پھر آپ کو کیشیر کی کھڑکی کے پاس پھٹکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹھیک ہے نا ماماجان بھائی؟"

"ہاں، بھائی ایرگاش" ماماجان نے فوراً جواب دیا اور اس کے پوپلے منہ پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

مقسوم دوہرا ہوکر اپنے پھاوڑے کی طرف لپکا۔

ایرگاش نصرت‌الله کے پاس گیا۔

"قدرت‌الله ئیف!"

نصرت‌الله مڑا، سیدھا کھڑا ہو گیا اور آستین سے چہرے کا پسینہ پونچھنے لگا۔ پچھلے چند ہفتوں سے اس نے داڑھی بڑھانی شروع کی تھی جس نے پھیل کر اس کے چہرے کے چیچک کے داغوں کو ڈھانپ لیا تھا اور اب اس میں اور کسی مزدور میں بظاہر کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر کھرونچے پڑے ہوئے تھے۔ اب وہ کسی محنت‌کش کے ہاتھ معلوم ہوتے تھے لیکن اس کی آنکھوں میں وہ پہلی سی دبی ہوئی اداسی اب بھی باقی تھی۔

"کہئے، آپ کیسے چل رہے ہیں؟" ایرگاش نے پوچھا۔

"خود ہی دیکھ لیجئے" نصرت‌الله نے پھیکے‌پن سے جواب دیا۔

"آپ کی کمر میں درد تو نہیں ہوتا؟"

"درد تو اندر کہیں ہوتا ہے، چیف۔"

"اندر کہیں؟.. اپنا کام ایمانداری سے کرتے جائیے، ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بالکل یہی کر رہا ہوں۔"

"کیا اپنے باپ کی کمی محسوس کرتے ہیں؟ یا باپ کی حویلی دے دینے کا غم ہے؟"

"نہیں، نہ وہ یاد آتے ہیں، نہ حویلی کا غم ہے۔ اس کی تو مجھے رتی برابر پرواہ نہیں ہے کیونکہ میں تو ویسے بھی لٹ چکا ہوں۔"

"کیوں؟"

"ظاہر ہے، ہے نا؟"

"کیا مجھے نہیں بتا سکتے؟"

"وہ تو آپ میرے بتائے بغیر بھی جانتے ہیں۔"

"شاید میں نہیں جانتا۔ آپ کچھ اور وضاحت نہیں کر سکتے؟"

نصرت‌الله نے یکایک اپنے سینے پر ایک گھونسہ مارا اور ایرگاش کے بالکل نزدیک آ گیا۔

"میں نے اپنی حویلی دے دی، پسینے کی کمائی کرتا ہوں، آئی۔ اے۔ او۔ آر۔ ایف* کو برابر چندہ دیتا ہوں لیکن پھر بھی ہر کوئی مجھے ایک بانکا نواب سمجھتا ہے۔ آپ بھی تو یہی سمجھتے ہیں اور جب تک میں جیوں گا تب تک یہی سمجھتے رہیں گے۔"

"تمہارا خیال غلط ہے" ایرگاش بے تکلفی سے بولا۔ "یہ تو سب کچھ اس پر منحصر ہے کہ تم اپنے آپ کو کیا اور کیسا ثابت کرتے ہو۔"

"میں تو خوشی سے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں مگر اب اپنی کھال کیسے چھوڑ دوں" نصرت‌الله نے سر جھکاکے کہا۔

"سنو" ایرگاش سوچتے ہوئے بولا۔ "تم کافی تعلیم‌یافتہ ہوگے نا؟ لکھ پڑھ سکتے ہو؟"

"ہاں۔"

"روسی زبان بھی؟"

نصرت‌الله نے مسکراہٹ میں منھ سکوڑا:

"میرے باپ یہ خواب دیکھتے تھے کہ میں کبھی ماسکو اور سمبرسک سے تجارت کروں گا۔"

ایرگاش نے مکا لہرایا۔

"اچھا۔ تو میرے ساتھ دوہراؤ: دنیا کے محنت‌کشو، ایک ہو جاؤ!"

نصرت‌الله نے ویسا ہی کیا... ایرگاش نے منھ بنایا۔

"ہوں... ہاں... ایکدم صاف نظر آ جاتا ہے کہ تم دوسری ہی برادری کے ہو۔ خیر، میں تمہارے رشتے کا بندوبست کرتا ہوں!"

---

* انقلابی مجاہدین کے لئے بین‌الاقوامی امدادی تنظیم۔ اڈیٹر۔

"رشتہ؟" نصرت‌اللہ نے حیرت سے کہا۔ اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔

ایرگاش نے اس کے کندھے پکڑکر جھنجھوڑے۔

"ذرا تصور کرو کہ تم اپنی ہونےوالی دلہن کے سامنے کھڑے ہو... پھر سچ سچ جواب دو! سوویت سرکار کی خدمت کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں!"

"تو پھر پھاوڑا پھینک دو اور جاکر سامان وصول کرنےوالے ایجنٹ کو بلا لاؤ۔ جانتے ہو اسے؟"

"ہاں۔"

"بس ٹھیک ہے، اسے لے کر میرے پاس دفتر میں آؤ۔ جاؤ نا۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں: رشتہ طے کرا دوں گا۔"

نصرت‌اللہ نے پھاوڑا پھینک دیا اور جلدی جلدی ایک کنڈال کی طرف بڑھا جس میں کلورین ملا ہوا پانی تھا۔ اس نے ربڑ کے ایک پائپ سے کنڈال میں سے نکلتا، پھواریں مارتا پانی اپنے گردآلود چہرے پر ڈالا اور چہرے کو پونچھے بغیر گوداموں کی طرف دوڑا۔

ہڑیلا مقسوم اسے حیرت سے منہ کھولے تکتا کا تکتا ہی رہ گیا۔

جائے تعمیر پر ایک زوردار جھناکے کی آواز گونجی – لوہے پر ہتھوڑے کی ضرب لگنے کی آواز۔ اور پھر نیو کھودتے مزدور چھلانگ لگاکر اوپر چڑھ آئے اور ایک دوسرے کے آگے پیچھے سائبانوں کی چھاؤں کی طرف بڑھنے لگے۔

یفیم دانیلووچ اور اناخان ایرگاش کی طرف بڑھے۔

اناخان دن میں ایک بار وہاں کام کرنےوالی عورتوں کے پاس ضرور آتی تھی۔ "خاشار" کے بعد نعمانچہ کی اور بھی بہت سی عورتیں وہاں مدد کو آ جاتی تھیں اور ان کے لئے وہ لوگ کام نکال دیتے تھے۔ لنچ کے وقفے میں وہ لوگ سب کے لئے چائے بھی بنا دیتی تھیں۔

"چیف!" یفیم دانیلووچ نے ایرگاش کو آواز دی۔ "ذرا چاروں طرف تو دیکھو، تمہیں کیا نظر آتا ہے؟"

ہر جگہ مزدور چائے کی قمغان آگ پر چڑھا رہے تھے۔ کھانا کبھی چائے کے بغیر ممکن نہیں ہوتا تھا! اور اس کے علاوہ اب کے گرمیاں کافی سخت تھیں، سب ہی کو پیاس کی شدت تھی۔ عبدالصمد اپنی تانبے کی قمغان کا ڈھکن جھن جھن کرتا، اپنی لمبی ٹانگوں پر دوڑتا جا رہا تھا۔ جائے تعمیر کے پرلے سرے سے جہاں پانی کی ٹنکی رکھی تھی، اس کی اونچی، پریشان آواز سنائی دے رہی تھی:

"کون ہے لائن کے آخر میں؟ ارے ارے، پانی پھر نہیں ابلا! میں نے کہہ دیا ہے میری ٹیم کو کافی پانی چاہئے۔ یہی تو بڑا مسئلہ ہے!"

ایرگاش مسکراکے یفیم کی طرف مڑا۔

"ہاں تو۔ تو مجھے کیا دیکھنا چاہئے؟"

"ارے اپنے آپ دیکھو نا۔"

"جو مجھے نظر نہیں آتا وہ ہمیشہ آپ کو کیوں نظر آتا ہے۔ اب آپ بتا بھی دیجئے، مجھے کیوں پریشان کرتے ہیں۔"

"سب کچھ تو تمہاری نظروں کے سامنے ہے... یہ کیا ہے؟ چھٹی ہے؟.. کام رک گیا ہے؟ آگ، آگ... کمر کی پیٹیوں سے چائے کے مگ لٹک رہے ہیں، لانگ بوٹوں میں چمچے اڑسے ہوئے ہیں۔ مزدوروں کی کسی معمولی سی کینٹین کا جہاں گرم شوربہ مل سکتا ذکر ہی کیا، تمہارے یہاں تو کوئی ایسی بنچ تک نہیں جس پر کوئی بھلا آدمی بیٹھکر تمباکو یا ایک پیالہ چائے پی لے۔"

"عورتیں کہہ رہی ہیں" اناخان بولی، "اگر آپ ان کے لئے آٹا منگوانے کا انتظام کر دیں تو وہ کام کرنےوالوں کے لئے یہیں گرم روٹیاں پکا سکتی ہیں بلکہ جوان عورتوں میں سے کچھ کو انہوں نے روٹی پکانے کے لئے نامزد بھی کر دیا ہے۔ اس قسم کی آگ کو اب وہ برداشت نہیں کر سکتیں۔ ان الاؤوں سے تو ان کے چہروں ہی کو نہیں، دلوں تک پسینے آ رہے ہیں کامریڈ چیف!"

ایرگاش نے مذاق میں ہاتھ کے اشارے سے اپنی گردن اڑا دی جس کا مطلب یہ تھا کہ چلو، میں نے ہار مانی۔

"اچھی بات ہے، جلدی ہی آٹا منگوانے کا انتظام کر دوں گا۔ ایک دن کی تو مہلت دیجئے۔ آپ کو یقین ہے نا کہ اتنی دیر میں تو عورتیں بغاوت نہ کر بیٹھیں گی؟"

"نہیں، بھائی ایرگاش، میں تو نہیں سمجھتا۔"

یفیم دانیلووچ نے اپنی ٹوپی کا کنارہ آنکھوں پر کھینچا، دوپہر تو بالکل آنکھیں چندھیائے دیتی تھی۔

"ویسے عورتیں ہیں ذرا لڑنے کے ہی موڈ میں" اس نے اطمینان کے ساتھ کہا۔

"صاف بات یہ ہے کہ آج سب عورتوں نے میرے لئے ایک مسئلہ کھڑا کر دیا" اناخان نے کہا۔ "وہ پوچھ رہی ہیں کہ کیا یہ سچ ہے کہ جوراخان پارٹی کی ممبر تھیں اور میں نہیں ہوں۔"

"بالکل ٹھیک کہتی ہیں" یفیم دانیلووچ پکار اٹھا۔ "میں آپ سے یہی سوال ایک اور طریقے سے پوچھتا ہوں: کیا آپ نے درخواست لکھ دی ہے؟"

اناخان پریشان ہوکر ہاتھوں کو بھینچنے لگی۔

"مگر یفیم دانیلووچ، وہ لوگ مجھے ممبر بنا بھی لیں گے؟ میں جوراخان تو نہیں ہوں... ایک معمولی بنکر عورت ہوں... مجھ سے سچ سچ بتائیے، آپ کو اپنے بھائی کی طرح سمجھتی ہوں۔"

"افوہ، آنیا، آنیا..." یفیم دانیلووچ نے ہلکی سی ڈانٹ کے ساتھ کہا۔ "آپ کے نام کو ممبری کے لئے تجویز کرنےوالے آپ کے سامنے کھڑے ہیں: ایرگاش اور میں۔ کیا آپ پارٹی کو اپنا نہیں محسوس کرتی ہیں؟ کیا پارٹی ہی ہمارا سب سے مضبوط باہمی رشتہ نہیں ہے؟.. بےشک اب جوراخان ہمارے درمیان نہیں مگر پارٹی کو توقع ہے کہ آپ اس کی جگہ لیں گی۔ پارٹی مطالبہ کرتی ہے کہ آپ یہ جگہ لے لیں! اور آپ کیا خود اسے نہیں محسوس کرتیں؟"

"ہاں، محسوس کرتی ہوں۔"
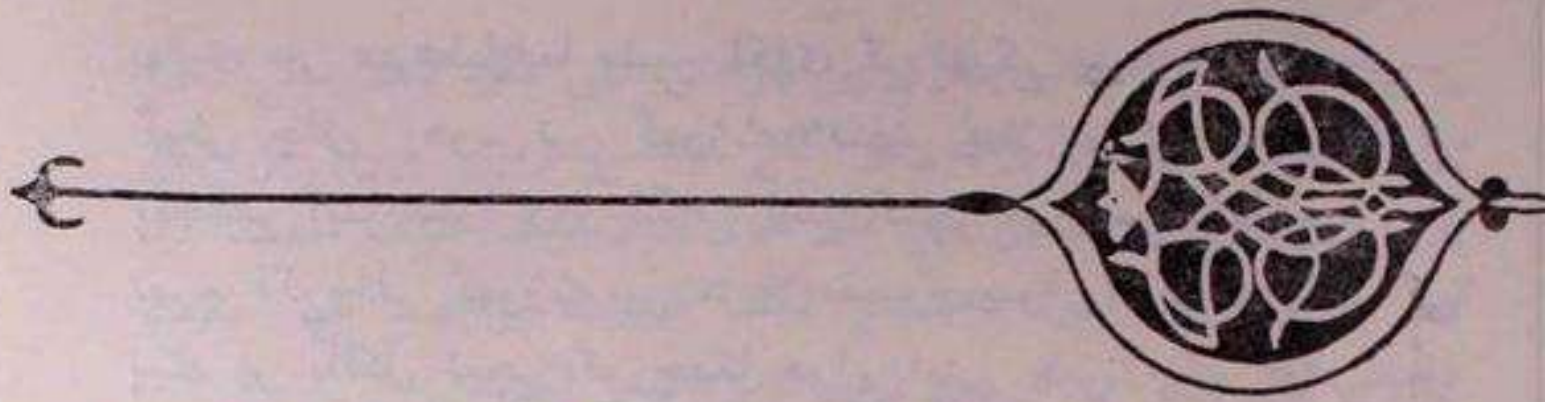
چوبیسواں باب

اس رات خزاں کی پہلی موسلادھار بارش نے پورے شہر کو بھگوکر رکھ دیا۔

صبح ہوتے ہوتے آسمان تھوڑی دیر کے لئے کھلا لیکن پھر اس پر گھرے بادل چھا گئے۔

جائے تعمیر پر ڈھیلی مٹی خوب گیلی ہو گئی اور جگہ جگہ پانی کے چھوٹے گڈھے نظر آنے لگے۔ بنیاد کی خندق میں گدلا پانی بھر گیا جس پر زرد زرد سوکھے پتے تیر رہے تھے۔ انہیں ہوائیں دوردراز سے اڑاکر لائی تھیں۔

چند لوگ جو وہاں موجود تھے، انہوں نے ان گوداموں کے پاس سے نالیاں کھودنی شروع کیں جہاں سیمنٹ اور چونا وغیرہ رکھا تھا تاکہ گڈھوں کا پانی گوداموں سے دور بہہ جائے۔ دو عورتیں بنیاد کی خندق سے بالٹیوں کے ذریعے پانی اولیچ اولیچ کر پھینک رہی تھیں۔

نئے سامان، کتائی کی فریموں اور کرگھوں سے بھری ہوئی ٹرین آ پہنچی تھی۔ پتھر کاٹنےوالے اور کھدائی کرنےوالے مزدور صبح سے سامان اتارنے میں جٹے تھے۔

جائے تعمیر تک سامان پہنچانے کی رفتار آہستہ تھی۔ شہر میں ایک ہی ٹرک اور ایک ہی ٹریکٹر تھا اور دونوں ایرگاش کی تحویل میں دے دئے گئے تھے جن میں سے "فورڈسن" مارکہ ٹریکٹر تو بس ٹوٹنے کے قریب تھا۔ اس نے پہلے پل تک تو ساتھ دیا اور پھر بیچ سڑک میں جواب دے گیا جس سے سڑک بھی رک گئی، آخر ٹھیلے کو گھسیٹنے کے لئے گھوڑے لائے گئے۔

تختوں سے ڈھکی لوہے کے تاروں سے بندھی کسی ایک

بھاری سی مستطیل نما مشین لکڑی کے ٹھیکے پر لدی تھی جیسے کوئی چٹان ہو۔ تین گھوڑے، نتھنے پھلا پھلاکے خرخر کرتے پھسلتے اپنا سارا زور لگاتے اسے کیچڑ میں سے کھینچ رہے تھے۔ آگےوالے گھوڑے پر ہڑیلا مقسوم سوار تھا۔ وہ اس کی پیٹھ پر بالکل نیچے کو جھکا ہوا، اپنی چیں چیں آواز میں فضاؤں کو گالیوں، کوسنوں سے بھر رہا تھا۔ وہ ایک چھڑی لہراتا اور تھوڑی دیر بعد اسے گھوڑوں کی پسینے سے تر پیٹھوں پر جما دیتا۔ ماماجان قلی اور بانکا نورمت داڑھیوں تک کیچڑ میں لت پت گاڑی کے برابر، کیچڑ میں مشکل سے قدم بڑھاتے چل رہے تھے۔ باری باری سے وہ گاڑی کے پہیوں کے نیچے بلیاں لگاتے اور جب بلیاں پہیئے کے نیچے پچی ہو جاتیں تو اور ان کی کھپچیاں بکھرنے لگتیں تو پھر دونوں میں سے ایک آگے دوڑکر اسی طرح کی بلیاں گھوڑوں کے پیروں تلے بچھاتا۔ ایک گھنٹے میں آدھے میل سے زیادہ کا فاصلہ طے نہیں ہو پا رہا تھا اور مال گودام والے اسٹیشن سے جائے تعمیر تک تین میل کا فاصلہ تھا۔

سڑک بدتر ہوتی گئی، گاڑی اس طرح پیچھے دو گہری نالیاں کھودتی گئی جیسے دو ہل چلائے گئے ہوں۔ گھوڑوں کے جسموں پر پسینہ بھاپ کی طرح اٹھ رہا تھا اور وہ بار بار ٹھہر جاتے تھے، ہڑیلا مقسوم طیش میں آکر ان پر چھڑی برساتا اور وہ پھر زور لگاتے پیچھے کی ٹانگیں جھک جاتیں، کیچڑ کے بڑے بڑے لوندے ادھر ادھر اڑتے لیکن ٹھیلا نہ کھسکتا۔ یکایک مشین پر لپٹا تار ٹوٹ گیا، ماماجان اور نورمت جو مشین کے سامنے بالشتیے لگ رہے تھے، اچھل کر ڈر کے مارے راستے سے دور ہٹ گئے۔ کھسیاکر تھکن سے چور وہ بھی اپنا غصہ گھوڑوں ہی پر اتارنے لگے۔

ایک گاؤں کے باہر مکا کے زرد زرد، بارش سے بھیگے پودوں کے درمیان بچے نکل کر آس پاس کھڑے ہو گئے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں نیم‌خوردہ، سورج‌مکھی کا پھول تھا اور بیجوں کے چھلکے ہونٹوں کے آس پاس چپکے ہوئے تھے، پھر جلد ہی کچھ عورتیں اور بوڑھے بھی ان میں شامل ہو گئے۔

یہاں سے سڑک پہاڑی پر چڑھتی تھی مگر ڈھلان کے دامن میں گھوڑے یوں کھڑے ہو گئے جیسے زمین میں جڑ پکڑ گئے ہوں، بھاری مشین سے لدا ہوا ٹھیلا ایک طرف جھک گیا اور کیچڑ میں گہرا دھنسنے لگا، گھوڑے بوجھ کے مارے کانپنے لگے اور ان کے پیر زمین سے اٹھنے لگے۔

جس بکس میں مشین رکھی تھی وہ ٹھیلے کو پورا گھیرے ہوئے تھا اور پھر وہ بکس زمین سے لگ گیا کیونکہ ٹھیلا پورا زمین میں کیچڑ کے اندر دھنس گیا تھا۔

بچے آس پاس جمع ہوکر میناؤں کی طرح چھکار مچا رہے تھے۔ ان میں جو زیادہ بہادر تھے انہوں نے آگے بڑھکر بکس کو ہاتھ سے چھوا مگر یوں ایکدم ہاتھ ہٹا لیا جیسے ہاتھ جل گیا ہو۔

"میں تو کہوں گا یہ حاجی‌مت کے بیل کے برابر تو ہوگا۔"

"اجی، اس میں تو دو بیل سما جائیں۔"

"پر یہ ہے کیا؟"

"مل ہے اور کیا ہے! کل بھی تو ادھر سے ایسا ہی ایک بکس گیا تھا، ٹھوس لوہا ہے، ٹھوس۔"

"ہاں تو، تو سب کچھ جانتا ہے نا! بھلا یہ ٹھوس لوہے کا ہوتا تو زمین دو بیلوں جتنی بڑی کسی چیز کا بوجھ برداشت کر لیتی؟"

"تم تو گدھے ہو! لوہے کی تو اس سے بھی بڑی بڑی چیزیں بنتی ہیں۔"

"ہاں، شاید زمین میں..."

پھر دو بوڑھے آدمی آ پہنچے اور گپیں لڑاتے لڑکوں کو وہاں سے بھگایا، پھر ان دونوں نے ماماجان اور نورمت کے ساتھ مل‌کر پہیوں کے نیچے سے بلی نکالی تو ٹھیلے کو ایک طرف سے سہارا ملنے پر وہ خود بخود ذرا سیدھا ہو گیا۔

لیکن بوڑھے بھی اسے دیکھکر بچوں کی طرح حیران ہو رہے تھے۔

"اف اللہ تعالی، یہ کیا معجزہ ہے کہ یہ زمین میں نہیں دھنس جاتا!.."

"ذرا مہربانی کرکے بتائیے گا تو کہ یہ عجوبہ چیز ہے کیا؟"

"یہ ماسکو سے آئی ہے" ماماجان قلی نے تھکی ہوئی مگر فخر بھری آواز میں کہا۔ "کیا مشین ہے! اس نے تو ہماری طاقت آزما لی، یہ میں بتا سکتا ہوں۔"

"لیکن یہ کس کام آتی ہے؟"

"یہ سوت سے بنائی کرتی ہے۔"

"جاؤ، کیا کہتے ہو! اچھا کیا یہ بات صحیح ہے کہ یہ ٹھوس لوہے کی بنی ہوئی ہے؟"

"تب اور کیا! ہاتھ لگاکے دیکھ لو، برف کی طرح نم ہے اور کام ایسے کرتی ہے جیسے اس میں جان ہو۔"

"غالباً اس میں ایسے پیچ اور کل پرزے ہوں گے جو خود ہی سوت کی کتائی، بنائی کر لیتے ہیں؟"

"پیچ اور پرزے؟ پتہ بھی ہے اس میں کتنے پیچ ہیں؟ سات ہزار اور سات! یہ لوگ اسے یہاں مل میں فٹ کریں گے۔ اور یہ ایک دن میں اتنا کام کرے گی جتنا پچیس پرانے کرگھے کرتے ہیں۔"

"ارے اللہ! مگر کیا انسان کو جان سے مار سکتی ہے؟"

"کسی احمق کی ناک تو مکھی بھی کاٹ سکتی ہے۔"

"کیا کہا آپ نے کہ یہ مل میں لگائی جائے گی؟ وہی مل تو نہیں جو نعمانچہ میں بن رہی ہے؟"

"تو پھر آپ کون سی مل سمجھے؟"

بوڑھے آدمیوں نے اپنی آستینیں چڑھائیں، لاٹھیاں زمین پر ڈال دیں اور سب کو آواز دی۔

"چلو بھئی، ایماندارو، لگاؤ ہاتھ! جٹ جاؤ سب کے سب!"

بچوں نے گھوڑوں کو اکسانے کے لئے شور مچایا، سیٹیاں بجائیں اور ہاتھ ہلائے۔ ہڑیلا مقسوم آگے کے گھوڑے پر بیٹھا

سب سے زیادہ چیختا جا رہا تھا۔ بوڑھوں نے ٹھیلے میں اپنی پوری قوت لگائی۔

"ھاں، لگاؤ زور، سب ساتھ لگاؤ، دو دھکا!"

گھوڑے کیچڑ کو ٹاپوں سے پھینٹتے جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھکر رک گئے پھر زور لگایا اور دو ایک بار جھٹکے لےکر گاڑی پل سے کتراتی ھوئی اور آھستہ پہاڑی پر چڑھنے لگی۔

"اے! کہاں جا رھے ھو؟" ایک بوڑھے نے جو چٹائی کی ھیٹ لگائے ھوئے تھا، زور سے مقسوم کو آواز دی۔ "گھوڑوں کو موڑ لو!"

مقسوم نے اس کی بات پر کچھ دھیان نہیں دیا بلکہ آگے بڑھے ھوئے گھوڑوں کو اور وحشی‌پن سے مارنے لگا۔

"رک جاؤ! مڑو! میں کہتا ھوں مڑ جاؤ! نہیں تو وھاں پھنس جاؤگے!"

"دور ھٹ جاؤ راستے سے۔ اے مکا کھانےوالے بوڑھے!" مقسوم غصے میں چیخا۔ "مجھے کیا یہاں رات گزارنی ھے پل پر۔"

"ارے پل کی تو مرمت کر دی ھے ان لوگوں نے۔ سن رھے ھو؟ اس کی مرمت کر دی گئی ھے! رک جاؤ، رک جاؤ، ارے رک جاؤ!.."

لیکن ھڑیلا مقسوم تو جیسے بہرا ھو گیا تھا۔ آگےوالے گھوڑے پر سوار، کودتا اچھلتا، چھڑی لہراتا، وہ گھوڑوں کو ھانکتا، پل سے کتراکر ایک نالی کے کنارے کے اوپر آ گیا تھا۔ ماماجان، نورمت، وہ بوڑھے لوگ اور بچے سب کیچڑ میں پھنس‌کر پیچھے رہ گئے تھے۔ ڈھلان کے اونچے کنارے پر ٹھیلا کیچڑ میں ادھر ادھر لڑھکتا، چلا جا رھا تھا۔ ایک بار تو پل بھر کے لئے ایسا لگا کہ وہ نالی پر بالکل لٹک گیا ھے۔ لڑکوں نے چلانا شروع کیا: "ارے الٹ جائےگا! الٹ جائےگا!" لیکن بھرحال ٹھیلا اس خطرناک مقام پر سے نکل گیا، سیدھا ھوا اور پھر پہلے سے زیادہ تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔

"بھئی واہ، کمال کر دیا!" بوڑھوں میں سے ایک آدمی

بولا۔ "دیکھنے میں ایسا منحنی سا آدمی اور اس میں خوداعتمادی اتنی۔"

"ارے بس اندھادھند ھانکے جا رھا ھے گھوڑوں کو!" دوسرے بوڑھے نے جواب دیا۔ "اس سڑک کو تو خالی گاڑی لےکر بھی پار نہیں کیا جا سکتا ھے!"

"ارے، ارے" لڑکے پھر چلانے لگے۔ "پھر الٹ رھا ھے، پھر الٹ رھا ھے! دوڑو، دوڑو! دیکھو تو سہی!"

ٹھیلا پھر ایک طرف کو جھک کر ڈھلان پر پھسل رھا تھا۔ اس وقت اسے صرف رفتار ھی بچا سکتی تھی۔ ذرا سا جھٹکا بھی لگتا تو اڑ اڑاکر نیچے نالے میں گرتا لیکن گھوڑے تھے کہ جھٹکے دے دےکر اپنی اپنی طرف کو کھینچے لئے جا رھے تھے۔ ایک تو وہ تھکے ھوئے، دوسرے، مریلے مقسوم کے احمقانہ شور پکار اور سامنےوالے گھوڑے پر سے اس کی اچھل‌کود نے ان کو ڈرا دیا تھا۔ ٹھیلے نے ایک ھچکولہ لیا اور نالے کی گہرائی کی طرف پھسلنے لگا۔

"گھوڑوں کو چابک مار! گھوڑوں کو چابک مار احمق!" بوڑھے چلائے۔

مگر اب وقت اتنا گزر چکا تھا کہ کچھ بنائے نہ بن سکتا تھا۔ یکایک مریلا مقسوم اگلے گھوڑے پر سے اچھلا اور اس نے ھوا میں یوں قلابازی کھائی جیسے کسی غیرمرئی طاقت نے اسے اچھال دیا ھو۔

اور پھر مشین کو جو تار ٹھیلے میں باندھے ھوئے تھا وہ بربط کے تار کی سی جھنجھناھٹ کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ مشین‌والا بکس بغیر کسی آواز کے ٹھیلے پر سے کھسکا اور اپنے ایک کونے سے سرخ مٹی کھودتا ھوا دھڑام سے نالے میں جا رھا۔ اگر وہ تار نہ ٹوٹتا تو مشین ٹھیلے کو اور اس کے ساتھ گھوڑوں کو بھی گھسیٹ لے جاتی۔

مقسوم گرمڑ بنا، آھستہ آھستہ کراھتا ھوا، ٹھیلے کے پاس کیچڑ میں پڑا تھا۔ ٹوٹتے ھوئے تار کے سرے نے اسے ایسا جھٹکا دیا تھا کہ وہ اڑکے دور جا پڑا تھا۔

ماماجان اور نورمت نے مل‌کر اسے اٹھایا اور ھانپتے

ہوئے گھوڑوں سے الگ لے گئے۔ اس کا کینوس پھٹ گیا تھا، دونوں کولھوں پر کھرونچے لگے ہوئے تھے۔

بچے سہم کر خاموش ہو گئے تھے مگر چٹائی ہیٹ والا بوڑھا برابر گالیاں دئے جا رہا تھا۔

"آخر اتنا اہم کام ان لوگوں نے اس خر دماغ کے حوالے کیسے کر دیا! اس کے تو کان ہی دیکھ کے کوئی سمجھ سکتا ہے کہ یہ گدھا ہے۔ اب تو اس مشین سے ہاتھ دھونا پڑے گا، بھلا لوہے کے اس دیو کو کون پانی میں سے کھینچ نکالے گا۔ واہ بھئی کیا آدمی ہے تو بھی! اپنا الگ ستیاناس کر لیا، گھوڑوں کو الگ تھکا مارا۔"

پھر دو گھوڑے جتی ایک اور گاڑی آکر پل کے پاس کھڑی ہوئی، گاڑی بان اور ان کے پیچھے ایرگاش اور نصرت اللہ دوڑتے ہوئے آ پہنچے۔

"تم لوگ نکلے واقعی ہیرو، تباہ کر دی نا مشین" ایرگاش نے نیچے نالے میں جھانک کر دیکھتے ہوئے کہا۔

ماماجان قلی اور بانکا نورمت، ایرگاش کے سامنے بازو پھیلا کے خاموش کھڑے ہو گئے۔

"ان کا قصور نہیں ہے۔ ان کو الزام مت دیجئے" بوڑھوں نے ایک ساتھ کہا۔

ایرگاش نصرت اللہ کی طرف مڑا۔

"تم اس کے ذمے دار ہو! اب گھور کیا رہے ہو؟ تمہیں یہاں کسی کو کھڑا کرنا چاہئے تھا تاکہ جو لوگ مشین لا رہے تھے ان کو پل والا راستہ دکھا دیتا۔ ہاں، اور کیا، مشین تمہاری تھوڑی ہے۔ یہی سبب ہے کہ تم نے اپنا دماغ نہیں استعمال کیا۔"

ہڑیلا مقسوم زور سے کراہا، اس کے چاروں طرف جو لوگ جمع تھے وہ ہٹ گئے اور ایرگاش نے مقسوم کو زمین پر پڑا دیکھا۔

"یہ کیا ہے؟"

بوڑھے اور بچے پھر ایک ساتھ بولنے لگے۔ ایرگاش مقسوم پر جھکا اور اچانک زور سے چیخا:

"چپ ہو جاؤ! نصرت‌اللہ، ان تازہ دم گھوڑوں پر سوار ہوکے جاؤ اور ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔"

کئی آدمی گھوڑوں کو گاڑی میں سے کھولنے کے لئے دوڑے اور چٹائی ہیٹ‌والے بوڑھے نے اپنے پاس‌والے شخص کو متوجہ کرکے ایرگاش کی طرف اشارہ کیا:

"اچھا آدمی ملا ھے تم لوگوں کو۔ نعمانچہ کا یہ بانکا۔"

رات کے اندھیرے میں نصرت‌اللہ اپنے گھر کے سامنے بھیگی ہوئی دیوار سے پیٹھ ٹکائے کھڑا تھا۔ جو کمرہ کبھی اس کے باپ کی بیٹھک تھا اس کی کھڑکیوں میں روشنی جل رہی تھی۔ ایرگاش کی تیز آواز اب تک اس کے کانوں میں آ رہی تھی اور وہ یہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ زنان‌خانے کی طرف جائے نہ جائے جہاں وہ رہتا تھا۔

"تم اس کے ذمے‌دار ہو، مشین تمہاری تھوڑی ھے"۔ کاش‌کہ چیف جانتا کہ وہ کتنی صحیح بات کہہ رہا تھا! تو کیا اسے کچھ شبہہ ہو گیا تھا؟

پرسوں اسی وقت نصرت‌اللہ ریلوے اسٹیشن سے گھر واپس آ رہا تھا کہ چائےخانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے چائے کے تاجر نے اس کو روک لیا تھا۔ وہ اسے کسی جھونپڑی میں لے گیا اور اسے خوب تیز شراب پلائی۔ نصرت‌اللہ پر جلدی ہی نشہ طاری ہو گیا اور وہ چلانے اور اپنے میزبان کے راکھ کے رنگ کے چہرے کے سامنے مکے ہلانے لگا۔ ٹھنگنے تاجر نے اس کی بات سنی، اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا، پھر یکایک اٹھکر کھڑا ہوا اور آہنی انگلیوں سے نصرت‌اللہ کا گلا پکڑ لیا۔

نصرت‌اللہ کی آنکھیں باہر کو ابل آئیں، اس نے ان ہڈیلی انگلیوں کو اپنے گلے پر سے ہٹانے کی بےسود کوشش کی اور منٹ بھر میں اس کے ہوش حواس درست ہو گئے۔ چائے کا تاجر بےآواز ہنسی ہنسنے لگا۔

"ابے پلے! جب میں بات کیا کروں تو دھیان سے میری بات سنا کر۔"

نصرت‌الله کو چھوڑتے ہوئے وہ پھر اپنی جگہ پر جا بیٹھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ چاندی کے پیالوں میں تھوڑی سی برانڈی انڈیلی اور بڑے تکلف کے ساتھ بولا:

"تمہارے محترم والد صاحب نے تم کو میرے حوالے کیا تھا۔"

"میں نے اپنے والد سے ناتہ توڑ لیا ہے" بوکھلائے ہوئے نصرت‌الله نے بھاری آواز میں جواب دیا۔

"تو پھر اب سے میں تمہارے والد کی جگہ ہوں، جوان" چائے کا تاجر بولا۔ "اور میں تمہیں مرد بناکے رہوں گا۔"

نصرت‌الله کھانستا رہا اور اس کے ہاتھ کو دیکھتا رہا جس کی مٹھی باندھ کے وہ گھٹنے پر رکھے ہوئے تھا۔

چائے کے تاجر نے اسے سنبھلنے کا موقع دیا۔ دونوں نے پھر ایک ایک جام پیا لیکن اب کے نصرت‌الله کو نشہ نہیں ہوا۔ بیٹھا چپکے چپکے کن‌انکھیوں سے اپنے آس پاس دیکھتا اور اندر ہی اندر کانپتے ہوئے تھوک گھونٹتا رہا۔ اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔

"تم مل پروجیکٹ کے معزز چیف کے دفتر کے پاس رہتے ہو" چائے کے تاجر نے اطمینان سے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "یہ بڑی خوش‌قسمتی کی بات ہے، اس کی آواز خاصی اونچی ہے مگر تمہیں وہ سب بھی سننا ہے جو وہ بہت دھیمے سے کہتا ہے۔ ایک ایک قدم جو وہ اٹھاتا ہے اس پر نظر رکھنی ہے، اس کی ہر حرکت کو محسوس کرنا ہے۔"

"مگر میں کیوں ایسا کروں؟" نصرت‌الله بڑبڑایا۔

"کیونکہ تم میرے چشم و گوش ہو، میرا دماغ ہو۔ میری کمزوری یہ ہے کہ میں معاملات کی کھوج میں رہتا ہوں۔ دراصل ہر تاجر کو تجسس پسند ہونا چاہئے۔"

نصرت‌الله اٹھنا چاہتا تھا لیکن چائے کا تاجر یوں غیر محسوس طور پر اس کی طرف بڑھا کہ وہ ایک‌دم دبک گیا اور اپنا گلا ہاتھوں سے ڈھک لیا۔

اس نے اس مختصر سے آدمی کو اکثر اپنے ابا کے گھر آتے جاتے دیکھا تھا لیکن اس کی طرف کبھی کوئی خاص

توجہ نہیں دی تھی، یہاں تک کہ نعیمی بھی اس کی بات کرتا تو ایسے جیسے اس پر احسان کر رہا ہو۔ وہ تو بس یوں ہی ایک اٹھائی گیرا سمجھا جاتا تھا، ایک معمولی سوداگر جو بائے کے دسترخوان کے لئے چائے سپلائی کرتا تھا۔ کالی رنگت کا یہ آدمی نیم‌وا سوئی سوئی آنکھوں سے نصرت‌الله کے سینے کی طرف دیکھ رہا تھا اور نصرت‌الله دم سادھے بیٹھا تھا۔ سانس لیتے ہوئے ڈرتا تھا۔

اسی انداز سے کالے قولمت نے بھی جوئےخانے میں اس کو گھورا تھا۔

"لیکن آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟ آخر آپ چاہتے کیا ہیں محمد سعید؟" آخر وہ بڑی کوشش کرکے بولا۔

"ہم دونوں تمہارے معاملات کے متعلق کچھ بات‌چیت کریں گے۔ تم نے مزدور صابر کی بیٹی سے شادی کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے نا؟"

نصرت‌الله نے یکایک اپنے سینے پر گھونسہ مارا، مایوسی نے اسے قوت عطا کر دی۔

"ہاں اور میں کرکے رہوں گا۔"

"قابل تعریف، نہایت درجہ قابل تعریف۔ تم یہی امید کرتے ہو نا کہ سوویت اقتدار کے لئے ایمانداری کے ساتھ محنت کرکے تم اس کو حاصل کر سکوگے؟"

"اب یہ تو میرا معاملہ ہے کہ میں کیسے اس کو حاصل کرتا ہوں! اس سے آپ کو مطلب؟ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟ آپ خود چین سے رہئے اور مجھے بھی رہنے دیجئے۔ میں نہ آپ کو جانتا ہوں اور نہ جاننا چاہتا ہوں!"

"میرے پیارے نوجوان دوست" چائے کے تاجر نے بڑے سکون سے کہا۔ "جب تم نے اس کی ماں کو چھرا بھونکا تھا تب تم اپنی منزل سے زیادہ قریب تھے۔"

نصرت‌الله کا دم گھٹنے لگا جیسے کہ پھر اس کا گلا دبایا جا رہا ہو۔ اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ اس کی ریڑھ میں نہایت ہی تکلیف‌دہ کپکپی دوڑ گئی۔

اسے اسی بات سے تو سب سے زیادہ خوف محسوس ہوتا تھا اور وہ جانتا تھا کہ کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی اسے یہ بات ضرور یاد دلائے گا۔

"لیکن آپ کو کیسے معلوم؟" اس نے ہکلا ہکلا کے کہا۔ اس کی زبان نہیں کھل رہی تھی۔

چائے کا تاجر ادب سے سر جھکاتے ہوئے حقارت سے مسکرایا۔

"تو تمہیں اس بات سے دلچسپی ہوئی؟ تم خود بھی تحقیق‌پسند معلوم ہوتے ہو۔ ہے نا؟ اچھے تاجر بن سکتے ہو، افسوس کہ تم نے اپنا پیشہ اختیار نہ کیا۔ وہ لڑکی بےماں باپ کی ہو جاتی تو اس سے شادی کرنا زیادہ آسان ہوتا، ہے نا؟ ٹھیک کہتا ہوں نا؟"

نصرت‌الله نے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی مگر آواز نہیں نکلی۔ اس کے گھٹنے کانپنے لگے۔

"صرف ایک ہی اور آدمی کو اس کا علم ہے" تاجر خاموشی سے ہنستے ہوئے بولا۔ "صرف ایک آدمی کو اور وہ نہایت باتونی اور غیرمعتبر آدمی ہے لیکن وہ تو اب یہاں سے بہت دور جا چکا ہے، بہت دور! وہ کسی سے کچھ نہیں کہے گا اور میرے اوپر تو تم پورا بھروسہ کر سکتے ہو۔ میں تمہیں اس غلطی کا ازالہ کرنے میں پوری مدد دوں گا۔"

"پھر وہی حرکت!" نصرت‌الله چونک کر بھاری آواز میں چلایا۔ "میں نہیں چاہتا۔ میں نہیں کروں گا، ہرگز نہیں کروں گا..."

چائے کے تاجر نے تحکمانہ انداز میں نصرت‌الله کی آستین پکڑکر اسے اپنی طرف کھینچا۔

"تم احمق ہو، میری بات سنو، تمہاری وہ لڑکی تو ایک چھوٹی سی، کمزور سی ٹہنی ہے جو تم بغیر کسی دقت کے آسانی سے توڑ لوگے۔ البتہ تمہیں جو کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ وہ جس تنے پر اگی ہوئی ہے اس کو کاٹ دو۔ او... ہو، چھوڑو یہ کانپنا، تھرتھرانا۔ سنو جو میں تم سے کہہ رہا ہوں، اب کے میں تمہیں کوئی خنجر تھوڑی دوں گا، تم اس کے

لائق نہیں ہو۔ اس کے علاوہ ہمیں اپنے طریقوں میں تبدیلیاں بھی کرنی ہوں گی۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو وہ مشینی کرگھے کل ٹرین سے اتارے جائیں گے۔ ہے نا؟ تم اسے اتارنے اور پھر آگے بھیجنے کے ایجنٹ ہو، گاؤں کے پاس ایک پل ہے پرانا اور وہ گر سکتا ہے، بیٹھ سکتا ہے...“

نصرت‌الله نے اپنی آستین تاجر کے ہاتھ سے کھینچ لی اور دانت کٹکٹاتے ہوئے ہونٹ یوں سکوڑتے ہوئے جیسے بس اب رو ہی پڑے گا، اس نے جلدی جلدی سرگوشی کی۔

”نہیں، میں نہیں کر سکتا، میں نہیں کروں گا۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے، مجھے جانے دیجئے۔ میں تباہ ہو چکا ہوں اور زندگی میں میرے لئے کچھ باقی نہیں رہا۔ میرا پیچھا چھوڑ دیجئے، میں دنیا میں بالکل تنہا ہوں — مجھے کچھ نہیں معلوم، مجھے بالکل کچھ نہیں معلوم۔“

اس پر ہسٹیریا کا دورہ سا پڑنے لگا۔

چائے کے تاجر نے اپنے لئے تھوڑی سی برانڈی انڈیلی اور پی، منتظر رہا کہ نصرت‌الله کو کچھ سکون ہو جائے لیکن جب اس نے دیکھا کہ ایسا ہونے کے کوئی آثار نہیں ہیں تو اس نے زور سے تھوکا اور نفرت کے ساتھ بولا:

”اوہو۔ اچھا اچھا۔ ناک پونچھو اپنی! تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن کل تم بہترین مشین کا انتخاب کرنا۔ سن رہے ہو؟ بہترین اور سب سے زیادہ قیمتی مشین۔ گھبراہٹ نہ دکھانا، جلدی نہ کرنا اور اگر غلطی ہو تو الله تمہارا حافظ ہے! تم تین گھوڑے لینا۔ سب سے طاقتور گھوڑے اور ان میں سے آگے والے پر ہڑیلے مقسوم کو بٹھانا۔ وہی ہڑیلا مقسوم جو تمہارا پرانا غلام ہے۔ اور بس، باقی سے تمہیں کوئی مطلب نہیں۔“

نصرت‌الله پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا تھا، عبا کی آستین منہ پر رکھ لی تھی اور روئے جا رہا تھا۔

اور اب، دو دن بعد وہ اپنے مکان کے سامنے اندھیرے میں کھڑا تھا۔ اس کے کانوں میں ایرگاش کی تیز آواز گونج رہی تھی اور وہ بڑی بےبسی سے سوچ رہا تھا:

"اب ایرگاش میری نسبت کا انتظام نہیں کرے گا۔ نہیں، اب نہیں کرے گا۔"
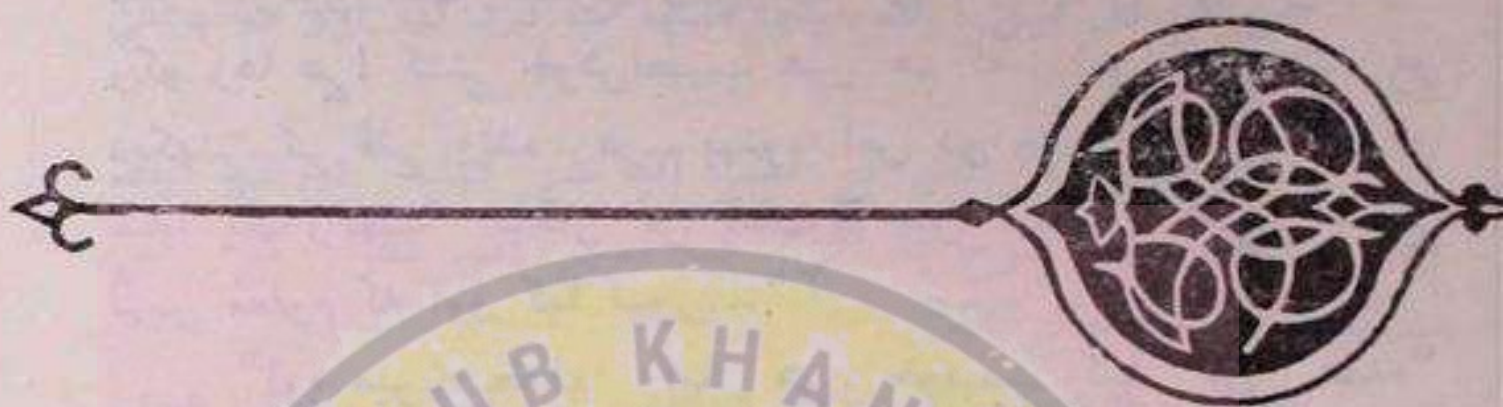
پچیسواں باب

ایک سرد صبح کو مل کی بنیاد رکھی گئی۔

تیز ہوا سے جھنڈے پھڑپھڑا رہے تھے۔ تعمیر میں حصہ لینےوالے تمام افراد بنیاد کی خندق کے چاروں طرف اکٹھا تھے۔ شہر سے ایک وفد اور ری‌پبلک کی راجدھانی سے نمائندے آئے ہوئے تھے۔ براس بینڈ کے ساز دھوپ میں چمک رہے تھے۔

اناخان کو پہلی اینٹ رکھنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس نے ایک صاف ستھرا سفید ایپرن پہنا، یفیم دانیلووچ نے اس ایپرن کے فیتے اس کی کمر میں باندھے۔ ایرگاش نے اسے لوھے کا ایک پائپ پیش کیا جس میں بنیاد سے متعلق دستاویز رکھی ہوئی تھی۔ پائپ کے بند کئے جانے کے بعد ابھی تک اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ دوبروخوتوف ایک صاف ستھری سرخ اینٹ اور ایک کرنی اور سیمنٹ لئے تیار کھڑا تھا۔

اناخان نے اینٹ اٹھائی اور اسے سر سے اونچا کیا۔ ہوائیں اس کی جوش بھری، اونچی آواز کو پھیلانے لگیں:

"ساتھیو..." یہ آواز دور نعمانچہ کے مضافات میں سنائی دی۔ "یہ پہلا پتھر ہے" اناخان نے کہا۔ "اور اسے بھن

جوراخان کے ہاتھ سے رکھا جانا چاہئے تھا۔ وہ دیکھئے، اسی بنیاد کی خندق کے بالکل سامنے ان کی قبر ہے۔ لیکن دشمن کو معلوم ہو کہ میرا ہاتھ بھی انہی کا ہاتھ ہے! اور میں چاہتی ہوں، ساتھی معمارو، اور تم، میری بہنو کہ تم کو معلوم ہو کہ میرا ہاتھ تمہارا ہاتھ ہے! یہ میں، صرف تنہا میں نہیں ہوں جو کہ اس مل کا سنگ‌بنیاد رکھ رہی ہوں بلکہ تم سب، سارا مزدور طبقہ ہماری ری‌پبلک کی اس پہلی مل کی بنیاد رکھ رہا ہے! کتنے خوش‌نصیب ہیں ہم کہ اس مسرت کو دیکھنے کے لئے زندہ رہے۔ بہنو، اس دن یعنی آج کے دن کو سدا یاد رکھنا" اناخان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "مجھے نہیں معلوم کہ اور کیا کہوں..."

"اوہ میرے خدا، کیا ہی خوب۔ کیا ہی عمدہ" دوبروخوتوف نے غیرارادی طور پر دھیرے سے کہا۔

"ذرا خیال رکھنا، اتنے جوش میں نہ آ جانا کہ سیمنٹ ہی گرا دو، سرگئی لووچ" یفیم دانیلووچ دھیرے سے غرایا وہ خود بھی بےحد متاثر ہو گیا تھا۔

"ابا زندہ ہوتے تو وہ اس وقت کیا کہتے؟" نعمانچہ کے لوگوں کو اس سنجیدگی کے ساتھ خاموش کھڑے دیکھکر ایرگاش نے سوچا۔

سب کی نگاہوں کے سامنے اناخان نے اینٹ کو بوسہ دیا اور بنیاد میں اتری۔ اس نے پائپ کو جس میں بنیاد سے متعلق دستاویز رکھی تھی، اس گڈھے میں بٹھایا جو اس کے لئے تیار کیا گیا تھا، اسے سیمنٹ سے ڈھکا، کرنی اور پھر اپنی ہتھیلی سے چکنا کیا۔ اس کے بعد اس نے اینٹ کو دونوں ہاتھوں سے اٹھاکر سیمنٹ کی گدی پر جمایا جیسے وہ کسی بچے کو گہوارے میں لٹا رہی ہو۔

اناخان نیو سے باہر نکلی تو حاضرین نے گیت شروع کیا:

ہمیں مہربانوں کی حاجت نہیں
جو عدالت کی کرسی سے ہم پر حکومت کریں
ہم محنت‌کش ہیں، رعایت ہمیں درکار نہیں،
ہمیں آپس کی محبت، رفاقت کافی ہے۔

25-2710

شام کو اناخان کے لئے ایک اور سنسنی‌خیز خبر منتظر تھی۔ آج واقعی اس کے لئے یوم مسرت تھا۔ اسے پارٹی میں قبول کر لیا گیا تھا۔

پروجیکٹ سے متعلق چھوٹی سی پارٹی سیل کے ممبران ایرگاش کے دفتر میں جمع ہوئے۔ اناخان اس میٹنگ میں موجود واحد عورت تھی۔

اس کے دل میں ایک میٹھا میٹھا سا درد تھا اور ساتھ ہی فخر کی دھڑکن۔

"اے عورت!" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "تو نے ایک ممنوع دھلیز کس طرح پار کی، کیا تجھے اس کفر کے لئے سنگسار نہ کیا جائے گا؟"

اس نے خود کو اس طرح دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے جیسے دوسرے دیکھتے تھے، اکثر اس لمحے کا تصور کیا تھا اور کئی بار اس نے جیسے اپنے آپ کو ملامت کرنے کے لئے یہ الفاظ دل ہی دل میں دوہرائے تھے:

"عورت... اے عورت... تو نے دنیا میں آتے ہی سب سے پہلے لاشعوری طور پر جو دیکھا وہ تیرے باپ کا غم‌زدہ چہرہ اور دکھیا ماں کی مایوس صورت تھی، تیری پیدائش نے انہیں غمگین کیا۔ وہ آہ بھر کر بولے: "لڑکی..." اور اس ایک لفظ نے ان کے دل کے سارے جذبات ادا کر دئے۔

"تیرا نام عورت رکھا گیا اور مقدس مذہبی کتابیں لکھنے‌والوں نے عورت پر لعنت بھیجی، دینیات کے عالموں اور ولیوں نے اس کو بددعا دی اور یہ بھول گئے کہ خود ان کو کس نے جنم دیا تھا، کس نے انہیں دودھ کی صورت میں اپنا خون پلاکر پالا تھا۔ تمام آسمانی و ارضی قانون یوں بنے کہ تجھے غلامی کی زندگی عطا کی گئی، حکم ہوا کہ مرنے کے بعد بھی تیری قبر مرد کی قبر سے ایک ہاتھ گہری کھودی جانی چاہئے۔"

"اتنا بھی کافی نہ ہوا تو اسلام کا زبردست علمبردار، ابن قطیبہ عرب کے دوردراز صحراؤں سے آیا اور اس نے گھوڑے کے بال کے نقاب کو تیرا مقدر بنا دیا۔ مدینہ سے

آنےوالا وہ شخص تیری عقلوں پر ہزار سال پرانا زہر پھیر گیا۔"

"عورت... عورت کے بال لمبے ہوتے ہیں مگر اس کی عقل چھوٹی ہے۔ جس کے بیٹا نہیں وہ جانتا نہیں، مسرت کیا ہے اور جس کے بیٹی نہیں وہ جانتا نہیں، غم کیا ہے۔" یہ تھی وہ عقل‌ودانش جس کی محکوم تیری زندگی تھی اور تیرے گیت کیا تھے؟

تو جس گلی میں پیر رکھے، میرے محبوب
اسے میں اپنی کالی زلفوں سے جھاڑوں
تو جس گلی میں پیر رکھے، میرے محبوب
اس میں آنسوؤں سے چھڑکاؤ کروں...

"تیرے گیت بھی یوں نکلتے تھے جیسے تو رو رہی ہو۔ اور سڑک پر سے تجھے جواب کیا ملتا تھا۔ بائے لوگوں کے بیٹوں کی بھکی بھکی، نشے میں چور آوازیں جو تیرے لئے قابل رشک دولھا، سب سے بہترین بر تصور کئے جاتے تھے۔ تجھ سے تو ایک اچھے گھوڑے کی قیمت زیادہ تھی کیونکہ تو تو برائے نام قیمت پر فروخت ہوتی تھی۔ تیری بہار پر خزاں کتنی جلدی آ جاتی تھی۔ اس کی کس کو پروا تھی، کس کو غم تھا، شوہر تو اپنے لئے جوان‌تر عورت خرید سکتا تھا۔"

"تو اپنی امیدوں کی دنیا میں، اپنے خوابوں تک میں جن کے متعلق تجھے معلوم تھا کہ کبھی حقیقت میں نہ تبدیل ہوں‌گے، زندگی کو اس سے مختلف تصور نہیں کر سکتی تھی! ایسا تو پریوں کی کہانیوں، داستانوں میں بھی کبھی نہیں ہوتا تھا۔ تجھے خدا اور شیطان، خوابوں اور شگونوں پر تو اعتقاد تھا مگر خود اپنی تقدیر پر اعتماد نہ تھا۔ تو یہ بھول گئی، دراصل تجھے کبھی یہ معلوم ہی نہ ہوا تھا کہ یہ مذہب اور یہ قصے کہانیاں تو سب ان لوگوں کی ایجادیں تمہیں جو..."

اور عورتوں کے اسی جمگھٹ میں سے ایک اناخان اب

جیتے جاگتے، ایک داستان کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ ایک ایسی داستان جو پہلے کسی نے کبھی نہ سنی تھی لیکن کسی نے اسے معجزہ نہیں تصور کیا۔

آج مرد، وہی مرد جن کے پیر عورتوں کو دن بھر کی مشقت کے بعد شام کو دھونے پڑتے تھے، اناخان کی بات بڑے انہماک اور احترام سے بھری ہوئی توجہ سے سنتے تھے۔

آج اناخان انہیں اپنے متعلق، اپنی زندگی کے بارے میں بتایا۔ ایک سیدھی سادی، معمولی سی زندگی دامن یادداشت سے یوں بکھری جیسے ہتھیلی پر سے راکھ نیچے بکھر جاتی ہے۔ لیکن انہوں نے ایک دوسرے کو اس طرح معنی‌خیز نظروں سے دیکھا اور یوں سر ہلائے جیسے وہ کسی ہیرو کی زندگی کا افسانہ سن رہے ہوں۔ جب وہ اپنی الجھی سلجھی کہانی کے آخر میں پہنچ گئی تو وہ لوگ خود ہی اس کے متعلق بات کرنے لگے، ان کے الفاظ میں ایسی نرمی اور گرمی تھی گویا اس کو خراج تحسین پیش کرنا ان کے فرائض میں سے ایک تھا۔

پھر مردوں نے ہاتھ اٹھائے، ان سب نے ہاتھ اٹھائے اور اناخان ان کے برابر تسلیم کر لی گئی۔

"اتفاق رائے سے منظور" یفیم دانیلووچ نے کہا اور وہ کھڑا ہو گیا۔ "مبارک ہو کامریڈ اناخان، مجھے یقین ہے آپ ایک سچی کمیونسٹ ثابت ہوں گی اور مزدور طبقے کی تحریک اور اس کے مفاد کی علمبردار۔ مجھے یقین ہے آپ اپنی بچیوں کی پرورش بھی ایسی کریں گی کہ وہ آپ کی طرح ہوں..."

پھر سب نے باری باری اناخان سے ہاتھ ملایا اور اس نے بھی ہر ایک سے کہا: "آپ کا شکریہ، میں بھی آپ کے لئے بہترین تمنائیں رکھتی ہوں۔"

اس کو امید تھی کہ اسے بتایا جائے گا کہ آئندہ وہ کس طرح رہے اور کیا کیا کرے لیکن سب کمیونسٹ اپنی اپنی جگہ جا بیٹھے اور چیرمین کی طرف نظریں اٹھائیں اور یفیم دانیلووچ نے اعلان کیا:

"ساتھیو، ہمارے ایجنڈے پر ایک اہم سوال ہے جو چوکس اور خبردار رہنے سے متعلق ہے۔"

اناخان نے خاموشی سے اٹھ جانے اور مردوں کو اکیلے چھوڑ دینے کی تیاری شروع کی، وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

یفیم دانیلووچ نے ایسی نظروں سے اسے دیکھا جیسے وہ سمجھ نہ پا رہا ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور پھر وہ ایک‌دم خوش‌طبعی سے ہنسنے لگا۔

"آنیا، تم کہاں جا رہی ہو؟ میٹنگ ختم نہیں ہوئی ہے، اپنی سیل کی میٹنگوں میں ہر کمیونسٹ کو موجود رہنا چاہئے۔"

ایرگاش بھی ہنسا اور ذرا پھکڑپن سے بولا:

"شاید کوئی ضروری گھریلو معاملہ ہوگا؟ شاید ہم لوگوں کو چاہئے کہ انہیں گھر جانے دیں؟"

دروازے کے پاس کھڑی ہوئی اناخان کی سمجھ میں فوراً تو نہیں آیا کہ وہ کیوں روکی جا رہی ہے یا یہ کہ یفیم دانیلووچ اور دوسرے لوگوں نے ایک دم سے ایرگاش کی بات پر تیوریاں کیوں چڑھا لیں: لیکن جب سبب اس کی سمجھ میں آیا تو اسے کچھ ندامت سی محسوس ہوئی اور وہ کسی اسکولی بچی کی طرح شرما گئی۔

"بیٹھ جائیے اناخان، اب ہمارے کاموں میں آپ کو برابر کا حصہ لینا ہے" یفیم دانیلووچ ایرگاش پر تیوریاں چڑھائے چڑھائے بولا۔

اناخان نظریں اٹھائے بغیر اپنی جگہ واپس جاکر بیٹھ گئی۔ اسے بےحد شرمندگی ہو رہی تھی۔ بھلا ان لوگوں نے ایرگاش کے خلاف کیوں برہمی ظاہر کی، غلطی تو اس کی اپنی ہی تھی۔ اسے سوچنا چاہئے تھا کہ کیا اس کو صرف اس لئے پارٹی ممبر بنایا گیا ہے کہ لوگ اسے مبارک‌باد دیں اور رخصت کر دیں؟ اب کیا ان لوگوں کے معاملات اس کے بھی معاملات نہیں تھے؟ مگر اس نے کیا کیا: دروازے کی طرف چل پڑی — کی وہی عورتوں‌والی حرکت کہ اسکرٹ کا

سرا درست کیا اور یوں کھسکنے لگی کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔

لیکن اب ہوگا کیا؟ "ہمارے کاموں میں حصہ لینے" کا کیا مطلب ہوا؟ کیا وہ لوگ اس سے کسی تقریر کی توقع کر رہے ہیں؟ اس کا خیال تھا کہ پارٹی کی ان اندرونی میٹنگوں میں لوگ شاید مخصوص ڈھنگ سے بات چیت کرتے ہوں گے، شاید وہ سانس بھی کسی اور ہی طریقے سے لیتے ہوں گے۔

لیکن ابھی وہ اپنے ان بکھرے خیالات کو سمیٹ بھی نہ پائی تھی کہ ایک عجیب بات ہوئی: یفیم دانیلووچ اور پھر تقریباً سب ہی ایرگاش کو پھٹکارنے لگے... پروجیکٹ پر جتنی بھی گڑبڑ ہوئی تھی اس سب کا الزام اسی پر لگایا جا رہا تھا۔ اس فورڈسن ٹریکٹر کے خراب ہو جانے اور اس بیش بہا کرگھے کے معاملے کی جسے ہڑیلے مقسوم نے پانی کے کھڈ مین الٹ دیا تھا، ساری ذمےداری اسی پر عاید کی جا رہی تھی۔

مگر یہ تو بےانصافی تھی۔ اناخان نے اپنی ابتدائی گھبراہٹ پر قابو پا لیا اور وہ سنجیدہ ہوکر سوچنے لگی۔ کیا کامریڈ لوگ واقعی ایرگاش سے اتنے ناراض تھے کہ وہ ساری گڑبڑ اور ناخوشگوار باتوں کی ذمےداری اس کے سر تھوپنا چاہتے تھے؟ یہ بھی ظاہر کیا گیا کہ جوراخان کی موت کے لئے اگر کوئی سب سے زیادہ ذمےدار تھا تو وہ مل پروجیکٹ کا چیف ایرگاش تھا۔ دشمن نے جوراخان کے سر میں پیچھے سے گولی ماری تھی اور وہ بھی دفتر کے عین سامنے۔ کمیونسٹوں نے کہا کہ یہ بھی ایرگاش ہی کی غلطی تھی۔ وہ ہر بات کا ذمےدار تھا۔

اناخان اس کی طرفداری میں دو چار الفاظ ضرور کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی حیرت اور بھی بڑھ گئی جب اس نے دیکھا کہ ایرگاش نے اپنے اوپر لگائے جانےوالے تمام الزامات کو تسلیم کر لیا اور اس نے خود وضاحت کی کہ ایسا کیوں ہوا۔

"ہاں، یہ سچ ہے: جلدبازی ہی جلدبازی ہے اور کام بہت

کم ہوتا ہے" ایرگاش ایک موٹا، ہاتھ سے بنایا ہوا سگریٹ پیتے ہوئے بولا۔ "ہم لوگ اس طرح کام کرتے ہیں جیسے بخار چڑھا ہوا ہو۔ اور میں تو سب سے زیادہ ایسا کرتا ہوں! ہر وقت جلدبازی، لب لب گڑبڑ، نتیجہ یہ ہے کہ ہم دشمن کے سامنے کوئی نہ کوئی ایسا پہلو بےنقاب کر دیتے ہیں جس کی حفاظت کا انتظام نہیں ہوتا۔ آپ سب کی طرح مجھے بھی سوچنا چاہئے کہ چوکسی اور خبرداری کی شروعات عمدہ تنظیم سے ہوتی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اس کی شروعات تم سے ہوتی ہے!" یفیم دانیلووچ نے کہا۔ "تم سے اور باقی ہم سب سے۔"

"جی، وہ تو بغیر کہے ہی ظاہر ہے" ایرگاش نے جواب دیا۔ "لیکن یفیم دانیلووچ، آپ ہی نے تو مجھے تعلیم دی تھی کہ لوگوں کو پہچانو، عوام پر بھروسہ کرو، چوکسی ایک باہمی گارنٹی ہے، چوکسی اور خبرداری کا انحصار عوام پر ہے۔"

"ہاں، مجھے اتفاق ہے۔"

"اور اتفاق سے آپ ہی اچھی، بری ہر بات میں دوبروخوتوف کے طرفدار بنتے ہیں۔"

"ہاں، ایسا میں ضرور کرتا ہوں۔"

"آپ اس کی اس طرح حفاظت کرتے ہیں جیسے مرغی اپنے چوزوں کی" ایرگاش نے بات جاری رکھی۔ "لیکن گستاخی معاف، کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ وہ سامان بھجوانے کے ذمےدار ایجنٹ قدرت‌اللہ‌ئیف سے کس طرح بہتر ہے، اگر نصرت‌اللہ، بائے کا بیٹا ہے تو دوبروخوتوف ایک روسی شریف زادے کا!"

"میں دوبروخوتوف کا اعتبار کرتا ہوں!"

"اچھا، مگر میں نے نصرت‌اللہ کو اس کام پر مقرر کیا ہے" ایرگاش جھپٹ کر بولا۔ "اور میں اس کا فیصلہ کروں گا کہ اسے برطرف کیا جائے یا نہیں! میں اس بات کو صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں: اگر میں اپنے کام کرنےوالوں کا انتخاب

نہ کر سکوں اور سب کا کام خود کروں تو پھر چیف ہونے کے لحاظ سے میری حیثیت کیا ہوگی؟"

"کامریڈ چیف، میں ایک بات سمجھنا چاہتا ہوں" یفیم دانیلووچ نے بھی ایرگاش کے برابر اونچی آواز میں کہا۔ "آپ کی رہنمائی کون سی بات کر رہی ہے: استقلال، عوام کے اوپر استقلال کے ساتھ اعتبار یا فخر اور نام و نمود کی خواہش؟ ان دونوں میں بعدالمشرقین ہے۔"

"لیکن میں اپنے فیصلوں پر اصرار کروں گا" ایرگاش نے کہا۔ "اور آپ کو اور پارٹی سیل کو میری عزت کا لحاظ کرنا چاہئے!"

یفیم دانیلووچ نے اپنے انگوٹھے سے اپنی مونچھ سہلائی۔

"دیکھو ایرگاش، عزت کا مطلب ہے صحیح فیصلے۔ ہاں، صحیح معنوں میں میرا یہی مطلب ہے!" یفیم دانیلووچ نے نرمی سے کہا۔ "تم ان دونوں کے ماضی کا مقابلہ کر رہے ہو۔ بائے کا بیٹا، روسی شریف‌زادے کا بیٹا۔ گویا ایک ہی پیڑ سے توڑے ہوئے دو بیر ہیں لیکن میں ان دونوں کے کاموں کا موازنہ کرتا ہوں۔"

ایرگاش نے ضدی انداز میں کندھے اچکائے۔

"میں نے ابھی تک تو انجینیر کو اس نوجوان کی طرح پسینہ بہاتے دیکھا نہیں۔"

اس مرحلے پر اناخان نے گرمجوشی کے ساتھ کہا:

"مگر انجینیر نیک اور شریف آدمی ہے۔"

اسے خود معلوم نہ تھا کہ اس نے کیوں یہ بات کہی، جلدی سے بولی:

"اگر میں نے یہ بات بےموقع کہہ دی ہو تو مجھے معاف کریں۔"

"کیوں؟ بےموقع کیوں؟" یفیم دانیلووچ نے جلدی سے کہا۔ "تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، اچھے لوگ اور اچھا کام۔ ان ہی پر ہمارے مشترکہ وقار کی توسیع اور استحکام کا انحصار ہے۔ ہم کمیونسٹوں کے لئے یہی سب سے بیش‌قیمت شے ہے۔ سچ ہے نہیں؟"

"اس بات پر کون بحث کر رہا ہے!" ایرگاش نے جلدی سے کہا۔

یفیم دانیلووچ کی سنہری بھنویں سکڑ گئیں۔

"ساتھیو، کیا ہم لوگ بہت جلد ہی یہ بات نہیں بھول رہے ہیں کہ ہم نے جوراخان کو کس طرح کھو دیا؟ کیا ہم اس شدید نقصان کے احساس کی شدت میں بہت جلد ہی کمی نہیں کر رہے ہیں؟ کیسی شاندار شخصیت، کتنی قیمتی زندگی کو ہم نے گنوا دیا! سچ ہے کہ اس دھکے نے بہتوں کی آنکھیں کھول دیں اور بہتوں کو ہم سے لا ملایا لیکن یہ اس حادثے کا صرف ایک پہلو ہے۔ اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔"

"ہاں، دوسرا پہلو ضرور ہے" اناخان نے اداسی سے کہا۔

اب کے پھر یہ الفاظ اس کے منہ سے خود بخود نکل گئے تھے لیکن جب ہر ایک نے مڑکر اس کی طرف دیکھا تو وہ بولی:

"آپ سب ہی دادی عنظیرت کو جانتے ہیں... وہ خاشار میں آئی تھی اور اپنے ساتھ کئی عورتوں کو بھی لائی تھی۔ پھاوڑا لے کر اس نے بھی دوسروں کی طرح کام کیا اور شکر اللہ کہتی رہی۔ لیکن غور کیجئے کہ وہ جنازے میں نہیں شریک ہوئی! اور گزشتہ کئی دن سے وہ مجھے کہیں بھی نظر نہیں آئی، کیچوئے کی طرح کہیں مٹی میں دبی چھپی بیٹھی ہے۔ دوسرے لوگ بھی اسی کی طرح کر رہے ہیں۔ ایسا کرنےوالی وہ اکیلی نہیں۔"

ایرگاش مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہاں، میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے اس بڑھیا پر کوئی توجہ نہیں دی" اس نے سگریٹ کا ٹرا کھڑکی کے باہر پھینکتے ہوئے کہا۔ "ہاں، یہ میری غلطی ہے" پھر ذرا سرپرستانہ انداز میں بولا۔ "جب تیز ہوا چلتی ہے بہن اناخان، تو ریت کے ذرے اڑتے ہی ہیں۔"

لیکن اناخان نے اور ایسی مضبوطی سے احتجاج کیا کہ وہ خود حیران رہ گئی:

"آپ غلط کہتے ہیں، بھائی ایرگاش... ریت کے ان ذروں

کو اکٹھا کرنے والے آپ نہیں تھے اور ان کو بکھیر دینا بھی آپ کا کام نہیں۔ قطعی آپ کا کام نہیں!"

ایرگاش نے بناوٹی مایوسی کے ساتھ دونوں ہاتھ پھیلا دئے۔

"میں اس کی کوشش بھی نہیں کر رہا ہوں، میری عزیز ساتھی۔ میری تو آپ جان بخش دیجئے! مجھے ویسے ہی بہت کام ہے! میرا تو اپنا ہی ایک بہت بڑا کوآپریٹو ہے، بہن صدر صاحبہ۔"

اب کے ایرگاش کی بات اناخان نے ناپسندیدگی سے سنی۔ اسے خیال بھی نہ ہوا کہ اس نے اپنی گھبراہٹ اور جھینپ پر قابو پا لیا ہے۔ ایرگاش جتنا ہی جھنجھلاتا گیا اناخان کی خوداعتمادی اتنی ہی بڑھتی گئی۔ وہ یہ بھی بھول گئی کہ وہ ایک خاص تقریر کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اب اس کے لئے ایک ایسی بات اہم معلوم ہونے لگی تھی جو بالکل مختلف اور معمولی تھی اور وہ جانتی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

"کامریڈ چیف، آپ ناراض نہ ہوں" اس نے دھیرے سے کہا۔ "میں تو آپ کے معاملات کے متعلق بھی بولوں گی۔ میں نے سوچا تھا میں ضرور ذکر کروں گی کہ..."

"ہاں، ہاں، جو آپ کا جی چاہے کہئے۔ میں سننے کو تیار ہوں! آپ بھی میرے ہی سر پر ٹوکرا الٹ دیجئے۔"

اناخان کو اپنی بات کی معقولیت کا یقین تھا، اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا:

"میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ ہم کو ایک تار ملا ہے۔ حاجیہ اور اس کے گروپ والے ماسکو سے واپس آ رہے ہیں۔"

"حاجیہ! اتنی جلدی!" ایرگاش چیخا۔

اب تو وہ نہ اپنے خیالات اپنے تک رکھ سکتا تھا، نہ جذبات! وہ تو ہمیشہ اپنا غصہ یا اپنی خوشی ہتھیلی پر لئے رہتا تھا۔ لوگ اس کی صاف‌گوئی سے متاثر ہوتے تھے حالانکہ کبھی کبھی اس میں بڑی سختی اور اکھڑپن ہوتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے لوگ اس کی طرف رجوع تھے۔

"تو کیا؟ تو کیا ان لوگوں کی ٹریننگ ختم ہو گئی؟" اس نے پوچھا۔

"ھاں۔"

"تو پھر کب... کب آپ ان کی واپسی کی امید رکھتی ھیں؟"

"وھاں سے تو وہ لوگ روانہ ھو چکے اسی لئے تو مجھے اتنی فکر اور پریشانی ھے۔ وھاں تو وہ طلبا تھے، یہاں استاد ھوں گے اس لئے ھمیں یہاں ان کے استقبال کی تیاری کرنی چاھئے اور فوراً سے پیشتر کرنی چاھئے... استقبال بھی ان کے شایان شان ھونا چاھئے۔"

"اوہ! تھوڑے سے پھول توڑنے میں کون سی دیر لگتی ھے اور عبدالصمد اپنا براس بینڈ لاکے بجا دے گا۔"

"واہ! ایسا کیوں کہتے ھیں؟" اناخان نے ایرگاش کو ڈانٹا۔ "آپ غالباً مجھے یہ تو نہیں سمجھانا چاھتے کہ فوراً ایک ٹیکنیکل اسکول کھولنے کی ضرورت کا آپ کو علم نہیں؟"

"لیکن ٹیکنیکل اسکول کے لئے جگہ کہاں ھے؟"

"سامان تو ھے نا، یہی سب سے ضروری چیز ھے۔"

"لیکن جگہ!؟ ویسے ھی قصبے میں لوگ غل مچا رھے ھیں کہ یہ لوگ تو یوں زمینوں پر چھاپے مار رھے ھیں جیسے چنگیزخاں کے تاتاروں نے زمینیں ھتھیائی تھیں۔"

"میرا خیال ھے ھم لوگ قدرت‌الله والے پرانے کارخانے کو استعمال کر سکتے ھیں" اناخان نے کہا۔ "بیچ کی دیواروں کو گرا دیں تو ایک خاصا بڑا ھال مل جائے گا۔ اس کو صاف کرکے، دیواروں میں ادھر ادھر کھڑکیاں توڑ لی جائیں، چھت کے موکھوں کو بند کر دیا جائے گا تاکہ انسانوں کے اٹھنے بیٹھنے لائق ھو جائے۔ ھال میں کرگھے اور فریمیں رکھی جائیں، اس طرح وھاں سیکھنےوالے سیکھ بھی لیں گے اور گودام میں پڑے پڑے سامان کو زنگ لگنے کا جو ڈر ھے وہ بھی نہیں ھوگا۔ میں نے اس سلسلے میں انجینیر سے بات کی تھی۔ وہ اس تجویز سے اتفاق کرتا ھے اور کہتا ھے کہ وہ جگہ نہایت ھی موزوں ھے۔"

اناخان کی بات ٹھیک تھی اور تجویز ایرگاش کو فوراً پسند بھی آئی مگر انجینیر کے ذکر نے ذرا اس کی دکھتی رگ کو چھوا۔ اچھا تو یہ کھلا کہ اناخان اور انجینیر نے اس کی پیٹھ پیچھے ہی یہ سب کچھ طے تمام کر دیا تھا۔

"ذرا ایک منٹ رکئیے" ایرگاش نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ "آخر آپ کو ان سب باتوں کی اتنی پریشانی کیوں ہو رہی ھے؟ کوآپریٹو کی صدر صاحبہ کی حیثیت سے یا تو محض مزدور عورتوں کی جوشیلی طرفدار ہونے کے ناتے؟"

اناخان نے اپنے شانے چوڑے کئے۔

"بھائی ایرگاش، آپ ہی نے تو میرا نام پارٹی ممبری کے لئے تجویز کیا ھے" اس نے سادگی سے کہا۔ "کیا بھول گئے کہ آج میں پارٹی ممبر بنا دی گئی ہوں؟"

سب کمیونسٹ پسندیدگی کے ساتھ ہنس پڑے اور اناخان اسی سنجیدگی کے ساتھ دھیمے بولتی رہی:

"اور پھر مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں عورتوں کے شعبے میں مامور کی جاؤں گی۔ جوراخان کی طرح۔"

"شاید ہمیں پھر اس موضوع پر اس وقت واپس جانا چاھئے جب آپ عورتوں کے شعبے میں مامور کر دی جائیں؟"

"مگر کیا یہ بہتر نہیں ھے کہ چیزوں کے متعلق کافی پہلے سے تیاری کی جائے" اناخان نے مسکراکر اس کی بات کاٹی۔ "کیا یہ بہتر تنظیم اور بہتر چوکسی نہ ہوگی؟"

ایرگاش نے ایک ٹیڑھی سی مسکراہٹ کے ساتھ دوسرا سگریٹ جلایا۔

"کیوں ایرگاش، کیا خیال ھے جب ہم نے اناخان کا نام تجویز کیا تو کوئی غلطی تو نہیں کی تھی؟" یفیم دانیلووچ نے ایرگاش سے تمباکو لیتے ہوئے پوچھا۔

"اگر مجھے گمان ہوتا کہ ان کا رویہ یہ ہوگا تو ذرا اور سوچتا" ایرگاش نے جواب دیا۔
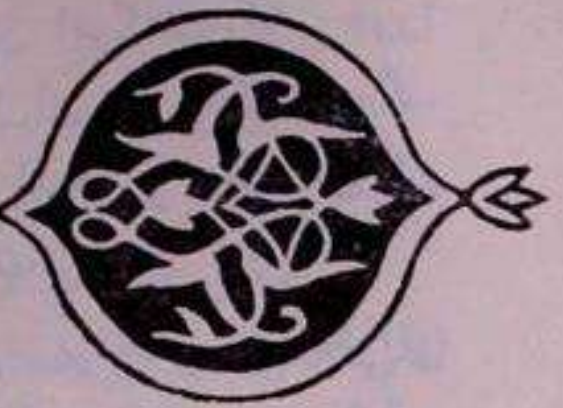
چھبیسواں باب

"چل بے! تیری کھال کو آگ لگے!"

چھوٹا سا موٹے پیٹ والا گھوڑا آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں اس کے ایک پہلو کو چمکا رہی تھیں۔ پرانا، ٹوٹا پھوٹا کھٹارا روڑےدار سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور اس کے پہیے ہچکولے کھاتے چوں چر، چوں چر کی آواز نکالتے ڈگمگاتے ہوئے اپنے چکر پورے کر رہے تھے۔ کھٹارے پر سیمنٹ لدی ہوئی تھی۔

نصرت‌اللہ آگے بیٹھا تھا اور اس کے لٹکتے ہوئے پاؤں ایک پہیے کو تقریباً چھو رہے تھے۔

"یہ میرا دسواں پھیرا ہے" اس نے چھوٹے چھوٹے گڈھوں اور اوبڑ کھابڑ راستے پر کھٹارے کے ہچکولوں سے ادھر ادھر جھولتے ہوئے بیزاری کے ساتھ سوچا۔ "آج بھر کے لئے اتنا بہت ہے... رجسٹر میں تو میں نے درج کر ہی دیا۔ میرا دسواں پھیرا ہے یہ۔ آج بھر کے لئے بہت ہے... سورج غروب ہو رہا ہے۔ آج یہ میرا دسواں پھیرا ہے، بس بہت ہوا..."

ایسا لگتا تھا کہ کھٹارے کی طرح اس کے خیالات بھی اوبڑ کھابڑ سڑک پر ہچکولے کھاتے رینگ رہے تھے۔

پھر اس نے لاپرواہی سے مکا کے کھیتوں کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ خزاں کے پہلے پالے کے مارے ہوئے پتے دھیرے دھیرے گر رہے تھے۔ جائے تعمیر پر سے گول آرا چلنے کی بھنبھناہٹ واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔

اس وقت اگر کوئی نصرت‌اللہ سے پوچھتا کہ وہ کیا محسوس کر رہا ہے تو وہ بتا نہیں سکتا تھا کہ اسے غم تھا،

خطرہ تھا یا امید تھی۔ ایرگاش نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ اتنا تو اچھا ہی ہوا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا تھا کہ پل بھر کے لئے ہی کیوں نہ سہی بشارت کو اب وہ روز دیکھ سکتا تھا۔ خدا کا شکر کہ اب وہ چائے کا تاجر بھی اسے پریشان نہیں کرتا تھا۔ ویسے اس کا جی چاھتا تھا کہ تاجر کی تھوڑی سی شراب اور پی ڈالے مگر اس کے ساتھ نہ پینا ہی بہتر تھا۔ نصرت اللہ تو یہی منایا کرتا تھا کہ اب کبھی اس سے ملاقات نہ ہو۔ ہاں، ایسا ہی ہو تو ٹھیک رہےگا۔ ہاں اور کیا، یہی ہو تو بہتر ہو، بہت بہتر ہو۔ آخر وہ چائے کا تاجر اس کا ھوتا کون تھا؟ اسے اس سے کیا لینا دینا تھا؟ نصرت اللہ تو سیمنٹ ڈھو رہا تھا۔ اسٹیشن پر لادتا اور جائے تعمیر پر لے جاکر گرا دیتا۔ اور آج تو یہ اس کا دسواں پھیرا تھا۔ سورج بھی ڈوبنے کو تھا۔ ہاں، آج کے لئے اتنا کافی تھا...

کہیں سے تھوڑی سی جھاگ دیتی ہوئی، تازی بوزا مل جاتی تو وہ کیا کچھ نہ دے دیتا۔ اس نے چٹخارہ بھرا، ہونٹ چاٹے، سست سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی۔ ہاں، اس وقت ایک بوزا ہو جاتی تو کتنا مزہ آتا، بوزا کے تصور سے ماضی کی خوشگوار یادیں تازی ہو گئیں۔ اس نے یقیناً عمر کے ساتھ، توردیمت دلال کے یہاں خوب بوزا کی پلائی کی تھی! ہاں، وہ اچھے دن تھے... اور اب عمر نہ جانے کہاں تھا؟ وہ بھی بس نصرت اللہ کی طرح ایک ناکارہ اور بےعمل آدمی تھا۔ البتہ اس میں یہ خوبی تھی کہ وہ لڑکیوں کے متعلق بڑی چٹپٹی باتیں سناکر لوگوں کو خوب لبھایا کرتا تھا۔ خود بشارت کا نقشہ کھینچنے میں اس نے کیا کیا لفاظی کی تھی: "اگر اس کا چہرہ ستر پردوں میں بھی چھپا ھو اور اس میں سے ایک پردہ اٹھا دیا جائے تو چالیس دن تک گھر میں وہ روشنی ھو کہ چراغ جلانے کی ضرورت نہ ھو..." وغیرہ وغیرہ۔ ہاں، باتیں بنانا اس کو خوب آتا تھا، اس مفت خورے کو۔ یہ صفت تو اس سے کوئی بھی چھین نہیں سکتا تھا۔ ھائے اس دنیا میں کیسی کیسی عورتیں پڑی ہیں!

نصرت اللہ نے دونوں ھاتھ اپنے سر تلے لگا لئے، سیمنٹ

پر چت لیٹ گیا اور سیاہ ہوتے ہوئے آسمان کو دیکھنے لگا۔ قدرت نے اسے آواز تو نہیں دی تھی مگر وہ گانے لگا:

میں کتنا بیقرار ہوں
تو کتنی بیقرار ہے
الگ الگ جدا جدا،
نہ تجھ کو ہے قرار نہ مجھ کو ہے قرار...

یکایک کھٹارا کچھ چرچرایا اور ایک طرف کو جھک گیا۔ نصرت اللہ نے ایک دم اٹھ کر پیچھے دیکھا۔

اس کے پاس چائے کا تاجر بیٹھا تھا اور اس نے نصرت اللہ کے کندھوں کو اپنی آہنی گرفت میں جکڑ لیا تھا۔ ایک کھسیائی ہوئی مسکراہٹ چائے کے تاجر کے سیاہ چہرے پر آئی۔

گھبراؤ مت... میں تمہارے لئے ایک اچھی خبر لے کر آیا ہوں" چائے کا تاجر دھیرے سے بولا۔ "ایسا لگتا ہے میں بڑے موقعے سے پہنچ گیا۔"

"نہیں، نہیں، میں... گھبرا نہیں رہا ہوں" نصرت اللہ نے گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

چائے کے تاجر نے بھی ادھر ادھر دیکھا۔

"ٹھیک ہے، کوئی نہیں ہے۔ میدان ایسا خالی اور اندھیرا ہے جیسے کسی درویش کا پیٹ۔ مجھے دن کا یہ وقت اور ایسے مقامات ہی ان باتوں کے لئے پسند آتے ہیں۔ میں نے تمہیں دیکھا کہ تم خوابوں میں کھوئے چلے جا رہے ہو، بڑے میٹھے خواب۔ جانتے ہو میں بھی خواب دیکھنےوالوں میں سے ہوں۔ جوانی میں تو صنف نازک کی بدولت میں نے کافی درد دل بھگتا۔ میں تو تم سے صاف کہتا ہوں: خدا کرے مجھے ان بتوں کے مظالم کا نشانہ بننا پڑے۔ خوابوں کی دنیا بسانا اور بےقراریاں اٹھانا – یہ سب کبھی کبھی ان بتوں سے بھی زیادہ پیارے لگتے ہیں۔ تم بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے..."

نصرت اللہ نے بےدلی سے ایک آہ بھری۔ لگامیں اس کے گھٹنوں پر سے پھسل گئیں۔

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں، میرے عزیز محمد سعید۔ وہ تو اتنی حسین نکل آئی ہے کہ میں اس کو دور سے بھی دیکھتا ہوں تو چکرا جاتا ہوں۔"

"دیکھا، اب تم خود ہی دیکھ لو" چائے کے تاجر نے کھیس نکالتے ہوئے سرگوشی کی۔ "اور تم ہو کہ مجھ سے چھپتے پھرتے ہو۔ تمہیں ایسا نہ کرنا چاہئے میرے دوست، آخر تم میرے علاوہ اور کس کو اپنا دل کھول کے دکھاؤ گے؟ یہاں ان لوگوں میں کون ہے جو تمہارے درد کو جانے گا سمجھے گا؟"

نصرت اللہ نے اندھیرے میں اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ دل لگی نہیں کر رہا ہے... واقعی وہ کس پر بھروسہ کر سکتا تھا؟ وہ تو دنیا میں بالکل تنہا تھا۔

"میں نے کھانے کی چھٹی میں اس کو دیکھا تھا" اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "کچھ لوگوں سے باتیں کر رہی تھی۔ اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ وہی ان لڑکوں کے سامنے بےنقاب کھڑی تھی تو میں سمجھتا کہ جنت کی کوئی حور ہے۔ آہ! معزز محمد سعید صاحب! اس وقت بھی میں اسے اپنے تصور میں دیکھ سکتا ہوں۔ میری آنکھیں اس کے دیدار سے چکاچوند ہو گئی ہیں۔ میں اس کے حسن کا شہید بھی ہو جاؤں تو مجھے کوئی پرواہ نہیں..."

چائے کے تاجر نے چٹخارہ بھرا۔

"دیکھو مجھے صاف صاف بتانا میرے ننھے بھائی، تمہیں پورا یقین ہے کہ ان لونڈوں میں سے تو کوئی اس کو نہیں پھانس لے گا؟"

نصرت اللہ طنز کے ساتھ مگر ایک عجیب سے وقار سے مسکرایا۔

"ن... نہیں... یہ پرانا زمانہ نہیں ہے... وہ تو سب کی پہنچ سے بالکل باہر ہے! وہ نہ کسی چیز سے ڈرتی ہے، نہ جھینپتی ہے۔ وہ تو بانکوں کی طرح بات اور کام کرتی ہے۔ کبھی اسے پھاوڑے سے سیمنٹ اٹھاتے دیکھئے..."

"سیمنٹ؟ تو پھر میں غلطی پر نہیں تھا" چائے کا تاجر روکھے پن سے بولا۔ "تم غور سے میری بات سنو اور خود ہی سمجھ جاؤگے کہ میں تمہارا سچا دوست ہوں۔ ویسے مجھے لفاظی تو آتی نہیں ہے۔ ہمیں فوراً قدم اٹھانا چاہئے، دیر نہ کرنی چاہئے۔"

نصرت اللہ خوفزدہ ہوکر چائے کے تاجر کے پاس سے کھسکا لیکن تاجر نے ایسا ظاہر کیا کہ اس نے اس بات کا نوٹس ہی نہیں لیا۔

"دیکھو بیٹے، میں نے تمہارے لئے ایک کام کیا ہے۔ یہ ایک قدیم مگر مجرب نسخہ ہے جو ہمارے آبا و اجداد استعمال کرتے تھے۔ جب میری جوانی تھی تو میں نے بھی اس کے استعمال سے پرہیز نہیں کیا تھا۔ کئی بار میں نے اس کی آزمائش کی ہے اور کبھی یہ ناکامیاب نہیں ہوا" اس نے اپنا کمر پٹکا ٹٹولا اور کئی عدد کالی کالی چھوٹی شیشیاں برآمد کیں۔ "یہ لو، اب یہ تو میں تمہیں کیا بتاؤں کہ مجھے اس کے کیا دام دینے پڑے۔ بس سمجھ لو کہ تمہارے لئے میری طرف سے ایک تحفہ ہے۔"

نصرت اللہ نے ان کو ہاتھ نہیں لگایا۔

"پر یہ ہیں کیا؟"

چائے کے تاجر نے کندھے اچکائے، دھیمے سے ہنسا۔

"شاید تمہیں ان کی ضرورت نہیں ہے، تو تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ لیکن ان شیشیوں میں ایک جادو کی دوا ہے اور مجھے یہ ایک درویش نے دی ہے۔ ویسے اگر تم کو اس کی ضرورت نہیں ہے تو میں اسے اس نالے میں پھینک دوں گا اور یہ میری بےوقوفی کی اچھی سزا ہوگی۔"

اس نے شیشیوں کو سر سے اوپر اٹھایا اور گویا پھینکنا ہی چاہتا تھا کہ نصرت اللہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"ٹھہرئیے، ٹھہرئیے! ایسا نہ کیجئے۔"

"نہیں، نہیں، اب تو مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ تمہاری

نظروں میں بھی دوستی کی اتنی ہی قیمت ہے جتنی تمہارے باپ کی نظروں میں تھی" چائے کے تاجر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "جب میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہیں قسمت کی ٹھوکریں نہیں کھانے دوں گا تو اس کو یقین تھوڑی آیا تھا اور تم بھی تو آخر اسی بائے کے بیٹے ہو نا، اس کے لائق بیٹے!"

"معلوم نہیں... ویسے میں ان کا... یعنی کہ یہ میرے کس کام کی ہیں؟" نصرت‌اللہ شیشیوں کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

چائے کے تاجر نے اس کو چھیڑنے کے لئے ایک شیشی کو اس کے منھ کے پاس کیا۔

"پہلے ایمان تو لاؤ! پہلے یقین تو کرو کہ یہ تیر بہ‌ہدف ہے!"

"کرتا ہوں یقین... میں نے کب کہا کہ میں اس پر یقین نہیں رکھتا..."

چائے کا تاجر نصرت‌اللہ کی طرف جھکا۔

"تم کو یہ کرنا ہوگا کہ ان شیشیوں میں سے ایک شیشی، روزانہ کنکریٹ ملانے والی مشین میں ڈال دو اور ذرا یہ احتیاط رکھنا کہ اسے ڈالتے وقت کوئی اور نہ دیکھے۔ یاد رکھنا: ایک دن میں ایک۔"

"لیکن کیوں؟ کنکریٹ مکسر میں کیوں؟"

"جہاں تک میری سمجھ میں آیا ہے تمہاری وہ محبوبہ ہی تو کنکریٹ ملائے گی؟"

"ہاں..."

"تو پھر تم کیوں بےکار کے سوالات کر رہے ہو۔"

نصرت‌اللہ نے اپنا رخسار کھجایا جس پر شیو بڑھ گیا تھا اور خشخشی سی داڑھی اگ آئی تھی۔

"مگر کنکریٹ؟ کنکریٹ کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا؟"

چائے کا تاجر آہستگی سے پیٹھ کے بل لیٹ گیا اور دھیرے دھیرے ہنسنے لگا۔ اس کی کھیسیں نکل آئی تھیں اور اس کے

دانتوں کی چمک سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جی بھر کے ہنس رہا ہے اور اس کی وہ ہنسی نصرت اللہ کے کانوں میں زہر ٹپکا رہی تھی۔

پھر ایک دم سے اس نے نصرت اللہ کی پیٹھ پر ایک دھپ مارا۔

"ارے، تم بھی بس ابھی تک بالکل بچہ ہی رہے! اگر تمہیں شہد بھی دیا جائے تو کہوگے کہ چمچے سے میرے حلق میں ٹپکا دو کہ کبھی پھنس نہ جائے۔ ذرا سوچو تو سہی کہ رقیق دوا کی یہ چھوٹی سی شیشی بھلا اتنے سارے کنکریٹ کو کیا نقصان پہنچا سکتی ہے؟"

پھر ذرا رک کر روکھے پن سے بولا:

"جیسے میں کہتا ہوں ویسے کرنا، سمجھے؟ اور پرسوں تمہارے اس آفس میں کیا ہو رہا تھا؟"

"کوئی خاص بات تو نہیں۔"

"کیوں؟ وہ لوگ کیا پارٹی کی میٹنگ کر رہے تھے؟"

"ہاں" نصرت اللہ بدبدایا۔

"ہوں؟ کیا میں نے تمہیں حکم نہیں دیا تھا کہ اپنی آنکھیں اور کان ذرا کھول کے رکھنا؟"

نصرت اللہ چپ رہا۔

"تو پھر؟" تاجر دھمکانے کے لہجے میں بولا۔

"ایرگاش سلطانوف نے دھمکی دی ہے کہ مقسوم جیسے ہی اسپتال سے نکلے گا، اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔"

"مہمل! فضول کی بکواس! اگر بارش کی وجہ سے سڑک اوبڑ کھابڑ ہو گئی، بہہ گئی تو اس قصور میں آپ کسی پر مقدمہ کیسے چلوا دیں گے۔ اچھا؟ اور؟ اور کیا ہوا؟"

نصرت اللہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

تاجر نے ایک شیشی کو دوسری سے ٹکرایا۔

"ابے پلے، میں تجھے اس نافرمانی ضد اور اڑیل پنے کی سزا دیتا ہوں۔ لے، میں تجھے خود بتاتا ہوں کہ وہاں ہوا کیا تھا۔ ان لوگوں نے تجھے اور انجینیر کو برا بھلا کہا تھا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟ میں تو تجھ سے صرف اس لئے پوچھ

رہا تھا کہ مجھے یقین ہو جائے کہ تو کتنا ناشکرا سور ہے۔ خیر، ٹھیک ہے۔ اب کے تجھے معاف کرتا ہوں، لے یہ شیشیاں، ان کو چھپا کر رکھ لے۔ اتنی باتیں ہو گئیں تو بس کافی ہے؟"

نصرت‌الله نے ہچک‌کر، وہ شیشیاں لے لیں اور اپنی عبا کی تہوں کے اندر چھپا لیں۔

"اور دیکھ، چلتے چلتے ایک دوستانہ صلاح دیتا ہوں" چائے کے تاجر نے مزید کہا۔ اس انجینیر سے ذرا خلا ملا بڑھا، اسے چائے پر بلا لے، اگر سلطانوف یا ندیژدین تجھے ناپسند کرنے لگے تو بس وہی انجینیر ہے جس کی بدولت تیری نوکری پروجیکٹ پر بنی رہے گی۔ وہ عورتوں کی طرح سیدھا سادہ اور نیک ہے اور تم دونوں ہی تنہائی کا شکار ہو۔"

نصرت‌الله نے کچھ خوش ہوکر، سینے پر ہاتھ رکھا۔

"نہایت معزز محمد سعید، آپ کا بہت شکریہ۔ میں سب سمجھتا ہوں اور میں خود بھی یہی کرنا چاہتا تھا۔"

"اچھا؟ یہ تم نے ہوشیاری کی بات سوچی تھی۔ تو تم اڑیل ہی نہیں، سمجھدار بھی ہو تو پھر ایسا کرنے میں دیر کیوں کر رہے ہو؟"

"میں اسے ضرور مدعو کروں‌گا، آپ کو یقین دلاتا ہوں... قسم کھاتا ہوں کہ ایسا کروں‌گا!"

"آمین" چائے کے تاجر نے کہا۔

گھوڑے نے لگام کو جھٹکا دیا۔ نصرت‌الله نے لگام کو اٹھانے کے لئے جھک‌کر ہاتھ بڑھایا تو گھوڑے کی دم اس کے منھ پر پھر گئی۔

"لعنت ہے، پھٹکار تم پر!"

اور جب اس نے سیدھے ہوکر گردن موڑی تو تاجر کھٹارے پر سے غائب تھا۔

اب گھوڑے کی ٹاپیں نالے پر بنے نئے پل پر بجنے لگیں، کھٹارا زیادہ تیزی اور آسانی سے دوڑنے لگا۔

ایک بھاری آواز نے نصرت‌الله کو پکارا:

"تم کبھی نہ تھکو فارورڈنٹ ایجنٹ!"

اور پھر پل پر لگے جنگلے سے الگ ہوکر ایک لمبا، بھاری، چوڑے کندھوں والا شخص، لمبے لمبے قدم اٹھاتا، کھٹارے کی طرف آنے لگا۔

نصرت اللہ کا دل سینے میں بیٹھنے لگا۔ اس نے یفیم دانیلووچ کو پہچان لیا۔

"اوہ، کامریڈ تدیژدین۔ بیٹھئے، بیٹھئے، آئیے! ھا ھا... پچ پچ... رک نا..."

"نہیں، نہیں، چلتے رہو، رکو مت" یفیم دانیلووچ نے کہا۔ "یوں سواری کرنے سے تو پیدل چلنا بہتر ھے۔ کہو، ابھی بہت سیمنٹ ڈھلائی کو باقی ھے؟"

"ھاں، پورے ایک دن کا کام تو باقی ھے ھی، کامریڈ تدیژدین۔ کوئی آدھی درجن بار، کھٹارے کے پھیرے کرنے ھوں گے۔ کام کل ختم ھو جائے گا۔"

یفیم دانیلووچ نے دھرے پر پاؤں رکھا اور اچک کر نصرت اللہ کے برابر آکے بیٹھ گیا۔

"تمھارے ساتھ کون تھا؟"

نصرت اللہ نے کانپتے ھوئے عبا کے نیچے شیشیوں کو محسوس کیا اور انہیں سینے سے بھینچ لیا۔ اس کے جبڑوں میں تشنج ھو رھا تھا اور منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل پا رھا تھا۔

"تم چپ کیوں ھو؟ کھٹارے میں تمھارے ساتھ کون تھا؟"

"ک... ک... کوئی تو... ن... ن... نہیں۔"

"کیوں جھوٹ بولتے ھو؟ میں نے باتیں کرنے کی آوازیں سنی تھیں!"

نصرت اللہ کو پسینے چھوٹنے لگے۔

"اچھا! وہ؟ وہ تو ایک بیمار آدمی تھا۔ نکما سا آدمی۔"

"نکما آدمی؟ تو پھر تم اسے گاڑی پر کیوں بٹھائے لا رھے تھے؟"

"مجھے پتہ... پ... پتہ نہیں وہ خود ھی کھٹارے میں چڑھ گیا تھا۔"

"تو گیا کہاں تھا؟"
"مجھے کیا معلوم۔ وہ کہیں چلا گیا"۔
"وہ شہر سے چڑھ کر آیا تھا اور شہر کو واپس لوٹ گیا؟"
"ن... ن... نہیں، شہر کو کیوں؟ گاؤں کی طرف بھی جا سکتا ہے!" پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور جلدی سے بولا:
"ہاں، ہاں، وہ گاؤں ہی کو جا رہا تھا... بتا تو رہا ہوں آپ کو کہ گاؤں کی طرف گیا، بوڑھا آدمی ہے، سفید داڑھی ہے اس کے۔ آپ ہی نے تو کہا ہے کہ ہمیں گاؤں‌والوں سے مل جل کر رہنا چاہئے۔"
یفیم دانیلووچ کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ آئی۔
"تو پھر تم نے اس بیچارے سفید داڑھی‌والے بوڑھے کے، اس گاؤں‌والے کے متعلق اتنی بری طرح بات کیوں کی؟"
"میں نے سوچا آپ مجھے ڈانٹیں گے... کیونکہ مجھے دیر ہو گئی ہے نا۔"
"ہوں، تو تم نے اس سے کلفے کے بارے میں باتیں کیں؟"
"یہی، ادھر کی... طرح طرح کی بات۔"
"پھر بھی۔ میں ذرا جاننا چاہتا ہوں۔"
نصرت‌الله کا دماغ بڑی تیزی اور بےچینی سے کام کر رہا تھا۔
"بھئی، ہم دونوں ایک لڑکی کے متعلق بات کر رہے تھے۔"
"ایسا ہے؟ تو تمہارا یہ سفید داڑھی‌والا بوڑھا بیمار آدمی لڑکیوں میں بھی دلچسپی رکھتا ہے؟"
"ہوں، ہاں، میرا مطلب نہیں تو!.. اُسے تو نہیں ہے دلچسپی... مگر وہ ذرا ہمدردی کر رہا تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ جن لڑکیوں نے اپنے پرنجے اتار دئے ہیں ان کی ہنسی اڑا رہا تھا۔"

"ہنسی بھی اڑا رہا تھا اور ہمدردی بھی کر رہا تھا۔ عجیب بات ہے!"

"وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اسے بہت حیرت ہے اور مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ جو لڑکیاں پرنجے نہیں پہنتیں ان کے طور طریقے کیسے ہوتے ہیں؟"

"ہماری لڑکیوں میں سے کس نے پرنجے اتارا ہے؟ بشارت نے؟"

نصرت اللہ چونک کر یفیم دانیلووچ سے الگ ہو گیا۔ وہ تو خیریت گزری کہ اندھیرے میں یفیم کو اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں نظر نہیں آئیں۔

"کیا؟ آپ نے کس کا نام لیا؟"

"بشارت!..." یفیم نے دوہرایا۔ "مگر تم کیوں اس طرح چونک پڑے؟ تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"مجھے؟ کچھ تو نہیں... مجھے تو کچھ نہیں ہوا ہے۔"

یفیم دانیلووچ اس کے نزدیک کھسکا اور اس کے چہرے میں جھانک کے بولا:

"بار برداری کے ایجنٹ، تم خود اپنی تردید کر رہے ہو۔ تم آخر ایسا کیوں کر رہے ہو؟ تم نے ابھی تک جو کچھ کہا ہے وہ جھوٹ کا ایک پلندہ ہے۔ مجھے سچ سچ بتاؤ۔ تم جھوٹ بول رہے ہو، ہے نا؟ کیا تم مجھے سچ بات بتا سکتے ہو؟ صاف صاف بتا کر سینے کا بوجھ ہلکا کر لو..."

نصرت اللہ پس و پیش میں پڑ گیا۔ اس نے سر جھکا لیا، ہونٹ کاٹنے لگا، اسے ڈر تھا کہ اسے رونا آ جائے گا جیسے چائے کے تاجر کے سامنے آ گیا تھا۔ لیکن اندھیرے نے اس کی مدد کی۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ اپنی عبا کی تہوں سے وہ شیشیاں نکال کر دور پھینک دے۔ کون جانے ان میں کیا بھرا تھا اور وہ کالے منہ کا چائے کا تاجر یکایک اتنا مہربان کیوں ہو گیا تھا۔

"تم چپ ہو... تم بات نہیں کرنا چاہتے!" یفیم دانیلووچ نے اپنی بھاری آواز میں کہا۔

"میں کر تو رہا ہوں بات۔ میں آپ کو سب کچھ بتا تو رہا ہوں" نصرت اللہ نے مبہم سا جواب دیا۔

"شاید مجھے پھر کبھی بتاؤ؟" یفیم دانیلووچ نے پوچھا۔

"میں تم سے کہنا چاہتا ہوں کہ انسان ایمانداری کی زندگی بسر کرکے ہی سکون سے رہ سکتا ہے۔

"کامریڈ ندیژدین، میں ایک ایماندار آدمی ہوں، میری بات کا یقین مانئے" نصرت اللہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ پھر بھی وہ صاف بات کہنے سے ڈر گیا۔

"نہیں" اس نے سوچا۔ "پہلے میں انجینیر سے پوچھوں گا کہ یہ دوا کنکریٹ کے لئے نقصان دہ تو نہیں ہے؟.."

"تو ہماری گفتگو پھر کبھی ہوگی۔ ایں؟" یفیم دانیلووچ نے کہا۔

"جی" نصرت اللہ نے ہونٹ ہلائے مگر آواز نہیں نکلی۔

سامنے سے روشنی دکھائی دی۔ سڑک قبرستان کے کنارے کنارے ہوتی ہوئی جائے تعمیر تک پھیلی ہوئی تھی۔ گھوڑا روندے ہوئے اس راستے کی طرف مڑ گیا جو سیمنٹ رکھے جانے والے شیڈ کو جاتا تھا۔

"خیر، اتنے کا بھی شکریہ... اچھا پھر ملیں گے" یفیم دانیلووچ نے کہا اور کھٹارے پر سے کود گیا۔

سیمنٹ اتارنے کے بعد نصرت اللہ انجینیر کو ڈھونڈنے نکلا جو اسے اپنے آفس میں ملا۔

دوبروخوتوف اکثر رات کو دیر تک میز پر بیٹھا نقشے بنایا کرتا اور کاغذ کا شیڈ لگا ہوا پیرافین لیمپ جلایا کرتا۔ صبح تڑکے ہی وہ جائے تعمیر پر پہنچ جاتا اور کام شروع ہونے کے قبل گوداموں کے آس پاس اور بنیاد کی خندق کے قریب، ہر چیز کا معائنہ کرتا، گھوما کرتا، ادھر ادھر ناپ لیتا، پھر اسے اپنی ڈائری میں نوٹ کرتا۔ تعمیر پر کام کرنے والا ہر شخص اس ڈائری کو پہچانتا تھا کیونکہ جیسے ہی فورمین لوگ کام پر آتے وہ اس ڈائری کو کھولتا اور پھر شریفانہ لیکن سخت لہجے میں ان لوگوں کے سروں پر ڈانٹ نازل ہونی شروع ہو جاتی۔

کام کرنےوالے اس کی عزت کرتے تھے اور اسے چچا "بےخواب" کہتے تھے مگر بہت سے لوگ اس بات کو مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے کہ وہ راتوں کو دیر تک جاگتا، صبح کو جلدی اٹھ بیٹھتا، بیک وقت شرافت اور سختی کا مظاہرہ کرتا اور اپنی نوٹ بک میں ہر وقت نہ جانے کیا کیا لکھتا رھتا۔

کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ افواہ کس نے پھیلائی کہ انجینیر جیسا کہ لوگ کہتے تھے، کسی روسی امیر شہزادے یا کاؤنٹ کا بیٹا اور شاید ناجائز اولاد تھا۔ اس کے باوجود وہ بےحد محنت کرتا تھا۔ یہ بات شبہہ پیدا کرنے کو کیا کافی نہ تھی؟ اور ھڑیلے مقسوم نے جب سے نالے میں مشین الٹ دی تھی تب سے تو جو انجینیر کا چہرہ ستا اور اس کا وزن گھٹنے لگا وہ سب ھی دیکھتے تھے۔ ایسا محض اتفاقاً تو ہو نہیں رھا تھا!

نصرت‌الله دفتر میں پہنچا تو انجینیر ایک نقشے پر سر رکھے، رخسار کے نیچے ھاتھ دبائے غافل سو رھا تھا۔

اس نے دھواں دیتے لیمپ کی بتی نیچے کھسکائی لیکن انجینیر کو جگانے میں اسے کئی منٹ لگے۔ یقیناً وہ کوئی خراب خواب دیکھ رھا تھا کیونکہ وہ کچھ برا رھا تھا اور پھر اس کے گلے سے کچھ غرغراھٹ کی آواز بھی آئی۔ جاگتے ھی وہ ایک دم اٹھ کھڑا ھوا اور زور سے چلایا:

"کہاں؟ کہاں؟ جلدی!.."

نصرت‌الله پر نظر پڑتے ھی اس نے فوراً جیب سے اپنی نوٹ بک نکالی اور ایک ایسی آواز میں جو ہر لحاظ سے تیز تھی بولا۔

"قدرت‌الله‌ئیف، تم نے مجھے بہت مایوس کیا... دیکھو یہ بات میرے تمھارے درمیان ھے مگر میں تو بڑا حیران ھوں۔ جب تک تم کھدائی کرنےوالے مزدور رھے تب تک تو تم نے بےداغ محنت کی۔ میں تو تمھاری مثال دیتا تھا لیکن جیسے ھی تمھیں مال اتارنے پہنچانے کا ذمےدار بنا دیا گیا تم سست پڑ گئے۔ کیا بات ھے؟ تمھیں یاد رکھنا چاھئے کہ تم کو خاص طور

پر زیادہ مستعد رہنا چاہئیے، میں اور تم - ہم دونوں بالکل ڈھیل نہیں دے سکتے! وہ دسویں کھٹارے کو لے کے تم کہاں غائب تھے؟"

نصرت اللہ فرش پر نظریں گاڑے اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

"بھائی انجینیر، آپ اتنی رات گئے تک کام کرتے رہتے ہیں" اس نے اچانک کہا۔ "آپ میرے یہاں کیوں نہیں چلتے۔ یہیں تو ہے، بس اگلا دروازہ سمجھئیے۔ میں آپ کے لئے چائے بنا دوں گا۔ کہئیے تو یہیں چائے لے آؤں۔"

دوبروخوتوف ابھی پوری طرح نیند سے بیدار نہیں ہوا تھا۔ اس نے سمجھا کہ نصرت اللہ اس کو مکھن لگانا چاہتا ہے، تیوری پر شکنیں ڈال کر اس نے دھڑ سے نوٹ بک بند کر دی۔

"مجھے تو معاف ہی کرو، شکریہ۔ دیکھو نا ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے۔"

"مگر میں چاہتا تھا" نصرت اللہ نے آواز مدھم کی۔ "میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا.."

"جو جی چاہے پوچھو، میں تمہاری خدمت کے لئے حاضر ہوں مگر میں بغیر چائے کے بھی تمہاری بات کا جواب دے سکتا ہوں۔"

"جی نہیں... وہ ایسا ہے کہ بات کچھ راز کی ہے... میں نہیں چاہتا کہ ہر کسی کو معلوم ہو۔"

دوبروخوتوف کے چہرے کا رنگ کچھ اڑ گیا، اسے صحن کی دوسری طرف سے ایرگاش کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"یہاں ہم تم اکیلے ہیں" اس نے فکرمند ہوکر کہا۔ "تم جو بات چاہو کر سکتے ہو۔"

نصرت اللہ چپ رہا۔ "کیوں؟ کیا ہوا؟ اگر چاہو تو میں تمہارے ساتھ چیف کے پاس چل سکتا ہوں۔"

"نہیں، نہیں!" نصرت اللہ نے زور سے کہا۔ "میں تو آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے، کہو، میں سن رہا ہوں۔"

"آپ میرے یہاں چلئے، وہاں ہم دونوں چائے پئیں گے، قسم سے میں آپ کو دعوت دیتا ہوں۔"

دوبروخوتوف نے اپنی ناک کا بانسہ کھجایا: وہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ قصہ کیا ہے اور ایک پیالہ چائے کی بھی طلب لگی تھی مگر نصرت اللہ بائے کا بیٹا تھا... کیا اتنا کافی نہیں تھا کہ انجینیر خود کسی روسی امیر کا ناجائز بیٹا مشہور ہو گیا تھا! اور پھر یہ دعوت بھی کچھ عجیب ہی سی لگ رہی تھی کہ "قسم سے میں آپ کو دعوت دیتا ہوں۔ یہ ایک راز ہے..."

"کامریڈ قدرت اللہ‌ئیف، یہ دعوت کچھ ناوقت سی ہے" دوبروخوتوف نے پریشانی اور گھبراہٹ سے کہا۔ "آپ ذرا مجھے ٹھیک سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ اتنی رات اور پھر چائے... میں چاہوں گا کہ آپ مجھ سے ملنے آئیں تو کم از کم نصف شب سے پہلے آئیں!"

اچانک نصرت اللہ بھی خوف‌زدہ ہو گیا۔ اسے اپنے جسم میں کپکپی سی محسوس ہونے لگی۔

انجینیر معذرت کرتا رہا لیکن نصرت اللہ خوف اور اچانک طاری ہونےوالے شدید غصے سے اس کے پیروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں کل آ سکتا ہوں۔ ہاں، آپ چاہتے ہیں تو میں کل آ جاؤں‌گا" دوبروخوتوف نے وعدہ کیا۔

نصرت اللہ کوئی جواب دئے بغیر دروازے کی طرف مڑ گیا۔

دونوں، ایک دوسرے سے جو کہنا چاہتے تھے اسے کہے بغیر رخصت ہو گئے۔ انہوں نے دل ہی دل میں ایک دوسرے سے خوف کھاتے ہوئے بات چیت اچانک روک دی۔

صحن میں نصرت اللہ کا کتا اسے دیکھکر دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا لیکن اس نے بڑے وحشیانہ انداز سے اسے ایک ٹھوکر ماری اور اس سے دور ہٹ گیا۔ پھر وہ بڑی دیر تک خوف کے ساتھ کتے کے رونے کی تیز آواز سنتا رہا۔

ستائیسواں باب

جہاں تعمیر ہو رہی تھی وہ جگہ دیکھتے دیکھتے چولا بدلتی جا رہی تھی۔

بنیاد میں سے ڈھانچہ جو ایک ترشی ہوئی جھاڑی لگتا تھا، کنکریٹ ملانے والی مشین کا بیضاوی ڈرم گرجتا ہوا گھومتا تھا۔ اس کے پاس سے کچر کچر آواز دیتی ہوئی رقیق کنکریٹ سے بھرے ٹھیلے روانہ ہوتے رہتے تھے اور بنیاد کی خندق تک بالٹیاں پہنچانے والی بوجھ اٹھانے کی کلیں چرمراتی رہتی تھیں۔ جابجا چمکدار سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی دیواریں دکھائی دینے لگی تھیں۔

"لو بھئی، ہم نے کھدائی ختم کر دی! تعمیر شروع کر دی!" پتھر کی عمارت کے معمار کہتے۔

"بنیاد کی خندق کے پاس شہتوت کا ایک پیڑ تھا جس پر زرد، نیچے کو لٹکتے ہوئے پتوں کا گول گیند جیسا تاج سا بن گیا تھا۔ اس پیڑ کے تنے پر ایک بڑی سی تختی کیلوں سے لگی تھی۔ اس پر دیواری اخبار، طرح طرح کے پوسٹر، نوٹس وغیرہ ٹنگے تھے جن میں سے کچھ ایک کی لکھائی دھندلی پڑ گئی تھی۔ یہ جگہ "سرخ گوشہ" کہلاتی تھی۔

جب پروجیکٹ شروع ہوا تھا تو نعمانچہ کا چالاک چائے خانے والا دو سماور سمیت یہاں آ گیا تھا۔ صبح سے رات تک سماور کھولتے رہتے تھے لیکن تعمیر پر کام کرنے والے مزدور، سیمنٹ اور کنکریٹ بنانے اور ڈھوانے والے اور معمار اس کی چائے نہیں خریدتے تھے بلکہ اس پانی کو ترجیح دیتے تھے جو کانسے کی ٹنکی میں بھرا رہتا تھا اور جس سے کلورین

کی ہلکی سی مہک آتی تھی۔ چائےخانےوالا کبھی کبھی اس ٹنکی کو دیکھتا اور اس کی آنکھوں میں نفرت اور چہرے پر مضحکہ‌خیز مایوسی منڈلانے لگتی۔ ٹنکی پر زنجیر سے لٹکا ہوا ٹین کا مگ سارے دن جھنجھناتا کیونکہ لوگ ہر وقت اس سے پانی پیا کرتے لیکن سنسناتے سماور کے پاس سجے چینی کے خالی پیالے اپنے دکاندار کا منہ چڑھایا کرتے۔

چائےخانےوالا گاھکوں کے لئے صدا لگاتا رہتا لیکن وہ صدا بصحرا ثابت ہوتی اور وہ بےکار اپنا مذاق اڑواتا۔

"رک جائیے مالکان، ذرا ٹھہرئے صاحب لوگو، میری ہی طرف سے ایک پیالہ چائے پیتے جائیے۔ ذرا چکھ کے تو دیکھئے، چکھنے کے کچھ دام نہیں ہیں۔ ایسی چائے تو آپ نے کبھی زبان پر نہ رکھی ہوگی!"

"رہنے دو بھائی، کون اپنے ہونٹ جلائے گا" اسے جواب ملتا۔ "ہمارے ساتھ چلو۔ آؤ تمہارے پیالوں کو کنکریٹ سے بھر دیں گے۔"

بہرحال وہ مایوس نہیں ہوا بلکہ پڑھنے کی مشق کرتا رہا، گھنٹوں اپنی توند پر ہاتھ باندھے، وہ دیواری اخبار کے سامنے کھڑا رہتا، پرانے مضمونوں، نوٹسوں کو ایک ایک لفظ کرکے پڑھتا، چٹخارے بھرتا جاتا اور واہ واہ کرتا جاتا۔

"ہوں یعنی کہ کیا سمجھے! اب اگر اسے "ساہی" کہتے ہیں تو کیا غلط کہتے ہیں۔" وہ اپنے آپ بڑبڑاتا۔ "ویسے کاغذ تو کافی چکنا ہے مگر الفاظ تو ساہی کے کانٹوں کی طرح چبھتے ہیں" پھر وہ خوشی سے قہقہہ مارکے ہنسنے لگتا۔ "بھئی کیا خوب، میں تو تمہارے والدین کو داد دیتا ہوں!"

مزدور آتے جاتے اس کو آواز دیتے: "ارے چائےخانےوالے، کیا شیطان سے گفتگو ہو رہی ہے؟"

چائےخانےوالا، دیواری اخبار پر اپنی انگلی رکھتا اور زور زور سے ایک مضمون پڑھتا جو اسے تقریباً زبانی یاد ہو گیا تھا:

"غیرذمےدار شوہر... ہر کوئی جانتا ہے کہ سوویت

دور حکومت میں عورتوں کو مردوں کے برابر درجہ حاصل ہو گیا ہے... ہوں... لیکن معمار نورمت ابن قربان... اچھا وہ والا... " چائےخانےوالا ساتھ ساتھ وضاحت بھی کرتا جاتا۔ "اچھا یہ وہ ہے ہمارے تعمانچہوالا بانکا نورمت!.. ہاں، وہی تو!.. ہاں، وہ تو قربان کا بیٹا نورمت... خود مزدور ہونے کے باوجود بھی مزدور طبقے کے ساتھ غداری کر رہا ہے کیونکہ وہ اپنی بیوی نزاکت کو... سمجھے آپ نزاکت!.. یہاں تو یہی لکھا ہے... اس کی بیوی ہے نزاکت! تو وہ اپنی بیوی نزاکت کو ٹیکنیکل اسکول میں پڑھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کہو اب کیا کہتے ہو؟ اچھا، اور سنو ذرا... اور سنو... گویا کہ وہ کوئی مزدور نہیں بلکہ مزدور سے علاحدہ ہے!" پھر وہ بڑی فتحمندی کے احساس سے زانو پر ہاتھ مارتا۔ اس طرح کی غیرذمےدارانہ حرکت پر ملامت کی جانی چاہئے... اس کو "ساھی" کہنا چاھئے! ارے ذرا دیکھنا، کیا لکھا ہے۔ ساھی... افوہ، کوئی ہنستے ہنستے مر ہی جائے۔"

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے" مزدور چائےخانےوالے سے پوچھتے جو ہنستے ہنستے نکل آنےوالے آنسو پونچھ رہا ہوتا۔

"ارے دیکھتے نہیں ہو" وہ چیخ کر جواب دیتا۔ "یہاں لکھا تو ہے صاف: نورمت، قربان کا بیٹا! یہ تو وہی ہے، ہمارا بانکا نورمت! ارے ان لوگوں کا... نورمت کے تو ایک اچھی پڑ گئی کس کے! اس ساھی کے کانٹے ہی اتنے تیز ہیں..."

دوپہر کے کھانے کی چھٹی میں چائےخانےوالے کا کاروبار کچھ چل پڑتا تھا کیونکہ شہتوت کے پیڑ کے پاس بہت سے لوگ اکٹھے ہوتے تھے۔ یہی "سرخ گوشہ" تھا۔

آج تو خاص طور سے کافی مجمع تھا۔

بشارت ایک بڑی سی دفتی لےکر آئی جس پر کئی ڈرائنگ بنے تھے۔ وہ کومسومول سیل کی سیکرٹری اور نوٹس بورڈ، دیواری اخبار اور پوسٹروں کی انچارج تھی۔ یہ بات سب کو

معلوم تھی اس لئے لوگوں نے پرمسرت لیکن پرتشویش دلچسپی سے اس کا خیرمقدم کیا۔

حسب دستور چائےخانےوالا جتنی تیزی سے ممکن تھا دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا کہ کچھ کارگزاری دکھائے۔

"ہاں تو کامریڈ صابرووا، اسے ہم کہاں لگائیں گے؟" اس نے کاروباری انداز میں بک بک شروع کی۔ "دیواری اخبار کی جگہ یہ لگے گا ؟ واہ، واہ وا... اور "ساھی" کا کیا ہوا؟ اگر اسے دیواری اخبار کے اوپر لٹکا دیں تو کیسا رہے؟ لوگ اسے بھی دیکھیں گے اور اسے بھی! کیا کہتی ہو، ٹھیک ہے نا؟ ہاں، ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے، تو پھر مجھے اجازت دی جائے کہ اس کو ٹانگ دوں۔ میرے پاس کچھ کیلیں ایسی ہیں جن میں زنگ نہیں لگے گا۔"

اس نے دفتی کو شہتوت کے تنے پر کیل سے ٹانگ دیا اور تعمیر میں حصہ لینےوالے سب اس کے آس پاس کھڑے ہوکر حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

اس پر کچھ ایسی تصویریں بنی تھیں جو ان لوگوں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ دفتی کے بورڈ کے بالکل اوپروالے سرے پر نیلے آسمان کے پس‌منظر میں، ایک سرخ ہوائی جہاز بنا تھا۔ اس کے نیچے ایک سیاہ ریلوے انجن جس کے سر سے دھواں نکل رہا تھا اور نیچے مصور نے ایک اڑتا ہوا پردار گھوڑا بنایا تھا۔ ویسے تو وہ لکڑی کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا مگر اس کے نتھنوں سے ایسی بھاپ نکل رہی تھی جیسے پریوں کی کہانیوں میں گھوڑوں کے نتھنوں سے نکلتی ہے۔ اور اس کے نیچے ایک گدھا - بالکل جیسے کوئی زندہ، اڑیل، سست رفتار گدھا کان لٹکائے چلا جا رہا ہے۔ جانے کیوں گدھے کا رنگ سبز تھا۔ اور سب سے نیچے ایک کچھوا جو بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دھوئیں سے کالی لوکٹ پیندےوالی کوئی ہنڈیا الٹی رکھ دی گئی ہے۔

کچھوے، گدھے اور گھوڑے پر جو لوگ شان سے سوار تھے ان کے بڑے بڑے سر تھے مگر چھوٹے چھوٹے جسم اور ان کے

چہرے جو بھونڈےپن سے بنا دئے گئے تھے، جانے پہچانے سے لگتے تھے۔

سب سے پہلے چائےخانےوالے نے ان سواروں میں سے ایک کو پہچانا۔ گدھےوالے سوار کے ایسی داڑھی تھی جیسے جھاڑو اور اس نے جھانک کر غور سے جو دیکھا تو فوں سے کرکے اچھل پڑا اور خوشی سے ھنسنے لگا۔

"ارے واہ! یہ تو صاف ماماجان قلی ھے! ارے یہی ھمارے نعمانچہ کا سامان ڈھونےوالا واہ وا، کیا سواری کر رھا ھے! ارے اگر وھی نہ ھو تو میں کھڑا مر جاؤں۔"

ماماجان بھیڑ میں دھکا پیل کرتا آگے بڑھا اور اس بورڈ کے پاس جا پہنچا۔

"کیا، بک بک کئے جاتا ھے، زبان سنبھال کے بولنا" وہ چائےخانےوالے پر چیخا۔ "وہ مر گیا ماماجان قلی جو ادھر ادھر سامان ڈھوتا تھا، اب تو وہ کنکریٹ ملاتا ھے!"

لیکن چائےخانےوالے پر ذرا بھی رعب نہ پڑا۔

"سفر مبارک ھو، بھائی ماماجان! خیریت سے پہنچنا اور ٹیم لیڈر سے سلام کہنا! کیا دور پردیس چلے بھائی؟" پھر گدھے کی طرف اشارہ کرکے بولا۔ "اس کی دم کے نیچے چابک مارنا، تب سرپٹ دوڑے گا۔ یہ لاش کہاں سے ملی بھیا؟"

سب لوگ ھنسنے لگے۔

اور اب تو سب ھی نے پہچان لیا کہ گدھے پر جو داڑھی‌والا سواری کر رھا تھا وہ ماماجان ھی تھا۔

کنکریٹ بھرے ایک ھاتھ سے داڑھی پکڑتے ھوئے وہ بشارت کی طرف مڑا۔

"کیوں بیٹی، اس طرح میرا مذاق اڑانے کا کیا مطلب ھے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ مذاق نہیں ھے، چچا ماماجان، یہ تو حقیقت ھے" بشارت نے فوراً جواب دیا۔ "اس میں دکھایا گیا ھے کہ ھم لوگ

کس تیزی سے کام کر رہے ہیں۔ دیکھئے ریل کے انجن یا ہوائی جہاز پر تو کوئی نہیں ہے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے؟ ہم کیسے کام کر رہے ہیں۔ ہوں... اور وہ... کچھوے پر کون ہے؟"

"وہ نوجوان کھدائی مزدوروں کا لیڈر ہے۔"

"اچھا! وہ ماماصادق ہوگا، ایں؟"

"ہاں، صورت تو ملتی جلتی ہے!"

"بالکل ملتی جلتی ہے، ہو بہو وہی ہے۔"

ماماجان بہت خوش ہوا، بھیڑ میں ماماصادق کو ڈھونڈ نکالا اور تمسخر کے ساتھ اسے آنکھ ماری۔

"اب دیکھ لے، یہ جو کچھوے پر سوار ہے نا، یہ تو ہی ہے۔"

بڑے لطف کی بات یہ ہوئی کہ ماماصادق پہلوان کہلاتا تھا کیونکہ وہ بےحد لمبا چوڑا تھا، سب ہی مزدوروں سے ہاتھ بھر اونچا اور اس وقت وہ سب کے پیچھے چھپنے کی بےسود کوشش کرنے لگا۔

"واہ بھئی واہ، ہمارے دیو نے بھی اپنے لئے کیا جگہ ڈھونڈی ہے!"

"کچھوے کی پیٹھ گول ڈھلواں ہے ماماصادق، ذرا کس کے پکڑے رہنا!"

"اسے تو اپنا بوریا بستر ساتھ لے لینا چاہئے تھا۔"

لیکن ماماجان کو اتنے سے بھی اطمینان نہیں ہوا۔

"اور گھوڑے پر کون سوار ہے، بیٹی؟"

"یہ تعمیر پر کام کرنےوالوں کا لیڈر ہے۔"

"مگر... ٹھہرو تو ذرا... یہ... یہ کیوں گھوڑے پر اور میں کیوں گدھے پر؟"

"کیونکہ وہ لوگ آپ سے زیادہ کام کر رہے ہیں چچا ماماجان، انہوں نے اپنے ہفتے بھر کے کام کا پچاسی فی‌صدی مکمل کر دیا اور آپ نے؟"

"اچھا، اچھا" ماماجان نے پھر داڑھی کھجائی اور بدبدایا۔

27—2710

"اب میں سمجھا۔ مگر مجھے ذرا یہ سمجھاؤ کہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا؟"

"ارے واہ، ہمیشہ کیوں ایسا رہے گا۔ ذرا تیزی سے کام کیجئے۔ یہ تو آپ کے اپنے اوپر منحصر ہے۔"

"تم کہتی ہو یہ ریل کا انجن خالی ہے، ہے نا بیٹی؟"

"جی ہاں، یہ خالی ہے اور ہوائی جہاز بھی خالی ہے، اگر آپ لوگ اپنے ذمے لیا ہوا کام پورا کرکے کچھ زیادہ بھی کام کر دیں تو پھر آپ ہوائی جہاز میں بیٹھ سکتے ہیں!"

اس بات پر پھر سب ایک بار ساتھ مل کر ہنسنے لگے۔

"ارے، یہ بڑے میاں تو ہو نہ ہو ریل کے انجن میں بیٹھنے کی سوچ رہے ہیں!"

"انجن کیا، ان کی نظر تو ہوائی جہاز پر لگی ہے۔"

"بھلا تعمیراتی شعبے کے مزدوروں سے تو پوچھ دیکھو بڑے میاں، شاید تمہیں اپنے گھوڑے پر بٹھا ہی لیں۔"

ماماجان نے برا مان کر تیوریاں چڑھائیں۔

"مت بے کار کو کھی کھی کرتے جاؤ! کسی اور کو بھی بولنے دوگے، ذرا دیکھیں گے کون کسے بٹھاتا ہے۔ سنو بیٹی، اگر ہم اور تیزی سے کام کریں تو تم ہماری کیسی تصویر بنواؤگی بھلا؟"

"جیسا آپ کام کریں گے ویسی ہی تصویر بنے گی۔ اور اب تو ہم ہر ہفتے یہاں تصویریں لگایا کریں گے۔"

"اچھا تو جو کہہ رہی ہو اس کو ذرا یاد رکھنا۔ اب اگر میں تمہارے مذاق کا نشانہ بننے دوں اپنے آپ کو تو میرا نام ماماجان نہیں۔ سب کے سامنے کہتا ہوں: اگلی بار دیکھنا میں ہوائی جہاز میں بیٹھا دکھائی دوں گا!"

"اچھا، جب اترنا تو گدھے کی پیٹھ نہ توڑتے جانا" چائے خانے والے نے چاپلوسی سے بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے ماماجان کو چھیڑا۔

"خاموش رہ، سماوار کے نلکے" ماماجان نے وقار کے ساتھ جواب دیا۔ "تم اپنی چائے کی خیر مناؤ، ماماجان قلی جو ادھر ادھر سامان لے جاتا تھا، وہ تو اب کنکریٹ ملائے گا۔"

"خدا کا شکر ہے کہ میری چائے تو ہر وقت تیار رہتی ہے" چائےخانےوالا کھسیانی ہنسی ہنسا۔ "میں تو اپنے پلان کو سو فی صدی پورا کر رہا ہوں۔"

ماماجان کی سمجھ میں تو نہیں آیا کہ کیاجواب دے مگر بشارت نے دیواری اخبار کا ایک تازہ پرچہ کھولا اور بڑے مزے میں بولی:

"ہم آپ کو بھی بھولے نہیں ہیں!"

"مجھ کو؟" چائےخانے کے مالک نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں، وہ جو آپ سو فی صدی اپنا کام پورا کر رہے ہیں نا۔ اس کے متعلق ایک گانا ہے۔ آپ پڑھنا پسند کرتے ہیں؟ ذرا اسے پڑھ لیجئے گا۔"

"گانا؟ کیسا گانا؟"

"معمولی سا، سیدھا سا" بشارت نے جواب دیا۔ دو کھولتے سماوروں اور ایک ٹھنڈے کاہل الوجود کے متعلق۔"

سب مزدور ہنس ہنس کے لوٹ گئے۔

"ارے دوستو" ماماجان نے اپنی ٹیم کے لوگوں سے کہا۔ "چلو بھئی، اب ہم سب کو گدھے پر سے اترنا ہے!" پھر بشارت کو ایک انگلی دکھاکر خبردار کرتے ہوئے بولا: "یاد رکھنا بیٹی، اور دیکھو تصویریں بالکل سچائی کے مطابق بننی چاہئیں۔ جو کچھ جیسے ہو ویسے ہی دکھایا جائے۔"

کنکریٹ ملانےوالے ادھر چلے گئے، جدھر کنکریٹ ملانےوالی مشین تھی۔ باقی مزدور بھی ان کے ساتھ ہی چلے گئے۔

آج کل ہر کسی کی نظر اسی مشین پر جمی رہتی تھی، بہت سے لوگوں نے تو ایسی مشین کبھی دیکھی ہی نہ تھی۔ نعمانچہ کے پرانے کاریگر سازبند، موچی، ٹھٹیرے اور بنکر، جب دیکھو تب اس مشین کو گھیرے رہتے۔ بیچ میں وہ سرمئی رنگ کا ڈرم گھومتا رہتا اور بجری، ریت اور سیمنٹ کو اپنے پیٹ میں گھول گھول کر، اپنے حلق سے کنکریٹ اگلتا رہتا۔ شروع میں تو ان کو خیال تھا کہ مشین بھی "فورڈسن" ٹریکٹر کی طرح کبھی نہ کبھی جواب دے جائےگی لیکن وہ کسی رکاوٹ

کے بغیر ٹھیک چل رہی تھی۔ اس لئے لوگ اس کے مداح ہو گئے تھے۔

اوروں کی طرح نصرت‌اللہ بھی روز کنکریٹ ملانےوالی اس مشین کو ضرور دیکھنے جاتا تھا۔ کمال کی مشین!

"اچھا، آپ سامان لانےوالے افسر تو ہیں مگر بس ذرا دور ہی سے دیکھئے گا، قریب ہم آپ کو نہیں آنے دیں گے، کنکریٹ ملانےوالے غصے سے کہتے۔ "وہ تو اچھا ہوا جو کنکریٹ کی اس مشین کو اسٹیشن سے نہیں لانا تھا۔"

نصرت‌اللہ کوئی جواب دئے، کسی سے آنکھ ملائے بغیر کھسک جاتا۔

لیکن اس دن شہتوت کے درخت کے نزدیک اس کی ملاقات بشارت سے ہو گئی۔

وہ دیواری اخبار کا ایک پرچہ وہاں لٹکا رہی تھی: اس بار چائےخانے کا مالک اس کی مدد نہیں کر رہا تھا اور بشارت مڑی تو اس نے دیکھا کہ نصرت‌اللہ اس کے پیچھے کھڑا تھا، کھانے کی چھٹی ختم ہو گئی تھی، دونوں اکیلے تھے۔ نصرت‌اللہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور آج پہلی‌بار بشارت نے نصرت‌اللہ کو اتنی قریب سے دیکھا۔

"آپ اچھے ڈرائنگ بناتی ہیں سکریٹری صاحبہ" اس کی آواز پھنسی ہوئی، بیٹھی ہوئی سی تھی، بوڑھوں کی سی! "میں اکثر آپ کو دیکھتا ہوں، آپ کے کاموں کا بڑا معترف ہوں۔"

پھر اس نے کچھ اور چکنی چپڑی باتیں کیں لیکن بشارت کو اس کی نگاہیں بڑی عجیب اور منحوس لیکن ساتھ ہی پیار اور التجا سے اتنی بھری محسوس ہوئیں کہ وہ چپ چاپ وہاں سے کھسک لی اور خوف سے بار بار پیچھے مڑ مڑکر دیکھتی رہی۔

نصرت‌اللہ کھڑا اس کو دیکھتا رہا، خود بخود بشارت کے قدم تیزتر ہوتے گئے۔

شام تک وہ نگاہیں بشارت کو پریشان کرتی رہیں اور وہ جتنا ہی ان کے متعلق سوچتی اتنا ہی گھبراتی۔

وہ خیالوں میں کھوئی کھوئی سی گھر واپس آئی۔ تب

بھی اسے ایک عجیب تشویش گھیرے ہوئے تھی جو اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

تورسنائی گنگناتی ہوئی گھر کا کام کر رہی تھی۔ ایک بار پھر وہ بےخود ہوکر، چڑیا کی طرح گانے لگی تھی یہاں تک کہ کھاتے وقت بھی گیتوں کی دھنیں گنگناتی رہتی۔

بشارت کی ماں شام کو بڑی دیر سے شہری پارٹی کمیٹی سے لوٹ کر آئی، وہ تھکی ہوئی تھی۔ جب تک اس نے منہ ہاتھ دھویا، چائے پی تب تک بشارت اسے دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ ماں سے اپنی تشویش کے متعلق کیا کہے اور کچھ کہے بھی یا چپ رہے۔

تورسنائی ماں کو پیار کرکے کوئی دھن گنگناتی ہوئی سونے چلی گئی۔ تب اناخان نے دیکھا کہ بشارت بار بار اسے دیکھتی ہے، اس نے بیٹی کو برآمدے میں آنے کا اشارہ کیا۔

"کیا ہوا ننھی، کیا بات ہوئی؟"

"کچھ نہیں امی۔"

"تم مجھ سے کیا چھپانے کی کوشش کر رہی ہو؟"

"میں کچھ نہیں چھپا رہی ہوں، امی... آپ مہربانی کرکے یہ نہ سوچئے کہ..."

اناخان نے اسے گلے لگا لیا۔

"تو کیا کوئی ایسی بات ہے جو مجھے نہیں بتائی جا سکتی۔"

"نہیں" بشارت بدبدائی۔

"کسی نے تمہیں کچھ برا بھلا کہا ہے کیا؟"

"مجھے معلوم نہیں۔"

اناخان چپ رہی تاکہ بشارت فیصلہ کر لے کہ کیا کہنا ہے۔

"امی، آپ کو یاد ہے" آخرکار بشارت نے کہا اور اسے ماں کے گرم مضبوط بازوؤں میں جھرجھری سی آ گئی۔ "آپ نے ایک بار مجھ سے پوچھا تھا کہ... یاد ہے؟"

"بیٹی، تجھے کیا ہوا ہے؟ میری جان، اوہو! میں تیرے پاس ہوں تو گھبراہٹ کیا ہے اور پھر اب تو تو بھی بڑی ہے، سمجھدار ہے۔"

"آپ نے مجھ سے پوچھا تھا..." بشارت نے پھر کہا۔
"ہاں، ہاں۔ تو؟"
"آپ نے پوچھا تھا نا؟ یاد نہیں آپ کو؟"
آخر اناخان سمجھ گئی کہ بشارت کا کیا مطلب تھا اور اب اس کی باری تھی کہ اپنے جسم میں جھرجھری روکے۔
"ہوں، اچھا!" وہ نرمی سے بولی۔ "تو پھر کیا کسی مرد نے تمہاری طرف دیکھا؟"
بشارت نے ماں کے سینے میں اپنا چہرہ چھپا لیا لیکن اناخان نے اس کو ہٹایا اور پریشان نظروں سے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔
"کون تھا وہ؟ مجھے بتا بیٹی! کون تھا؟"
"بائے کا بیٹا۔ وہ نوجوان بانکا" بشارت نے جواب دیا۔
"اوہ، وہ گیدڑ" اناخان کی زبان سے ایکدم نکلا۔ "اس نے کچھ کہا تھا؟"
"ن... ن... نہیں۔"
"تو پھر وہ بات ٹھیک ہی تھی کہ وہ میری بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا" اناخان نے سوچا۔ اور غیراختیاری طور پر اس کا ہاتھ اپنی گردن پر لگے ہوئے زخم کے نشان پر چلا گیا۔ "کل ہی مجھے اس معاملے کے متعلق کریموف سے بات کرنی چاہئے..."

اٹھائیسواں باب

دوبروخوتوف اپنے کہے ہوئے وعدے کے مطابق نصرت‌الله سے ملنے گیا، چائے پر دوبروخوتوف نے نووگورد کی اور روس کی باتیں کیں۔ نصرت‌الله چپ سنتا رہا۔
اس کی ہمت نہیں پڑی کہ انجینیر سے اس دوا کی

شیشی کے متعلق بات کرے۔ دوبروخوتوف کو محسوس تو ہوا کہ نصرت‌اللہ کچھ کہنا، کچھ پوچھنا چاہتا ہے مگر اس نے اصرار نہیں کیا۔ چائے پینے کے بعد، ایک بار پھر دونوں جدا ہو گئے اور اصل مقصد کی بات نہ ہو سکی۔ دونوں آدھے گھنٹے سے زیادہ ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہے تھے...''

نصرت‌اللہ خود بھی خوب سمجھتا تھا کہ چائے کے تاجر نے اسے جو ''دوا'' دی تھی وہ کیا ہو سکتی تھی اور یہ کہ اب سے وہ اس سیاہ‌رو تاجر کے پنجے میں گرفتار تھا اور اپنے چاروں طرف بنے ہوئے جال سے نکل نہیں سکتا تھا۔ ایک بار تو وہ غصے اور جھنجھلاہٹ میں یفیم دانیلووچ کے پاس جاتے جاتے رہ گیا۔ مگر کیوں؟ سب کچھ قبول دینے کے لئے؟ خود اپنے آپ کو بےنقاب کرنے کے لئے؟ بھلا وہ لوگ اس کی بات پر کب اعتبار کریں گے کہ وہ اپنی مرضی سے یہ سب نہیں کر رہا تھا؟ کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا؟

جب انجینیر رخصت ہو گیا تو نصرت‌اللہ نے اپنا خنجر اٹھایا اور پرانے وقتوں کی طرح اسے اپنے لانگ بوٹ میں اڑس لیا اور دھیرے دھیرے چھپتا چھپاتا وہ شہر کے ایک دور دراز حصے میں جا پہنچا۔

چاربازار علاقے میں اسے ایک پھٹیچر، گندہ اور اندھا گویا ملا جو آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائے جھوم جھوم کر مشرب کے اشعار گا رہا تھا۔ نصرت‌اللہ نے اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ کر اسے آہستہ سے اپنا نام بتایا۔

موسم بہار میں جب قدرت‌اللہ شہر سے بھاگنے کی تیاریاں کر رہا تھا تو اس نے اپنے بیٹے سے کہا تھا:

''جب حالات ناقابل‌برداشت ہو جائیں تو اس کے پاس جانا۔ وہ ہر اس بات کا انتظام کر دے گا جس کی ضرورت ہو گی۔''

نصرت‌اللہ کو کبھی گمان نہ تھا کہ اسے اس مشورے پر عمل کرنے کی ضرورت پیش آئے گی مگر اس کی ساری زندگی وہ شکل نہیں اختیار کر رہی تھی جس کی اس کو توقع تھی۔ پھر وہ اور کس کے پاس جاتا۔

اندھے نے گانا ختم کیا، اپنا جھولا اٹھایا، کراھتا اور آھیں بھرتا کھڑا ھوا اور اپنے آپ کو گھسیٹتا ٹیڑھی میڑھی چھڑی کے ذریعے راستہ ٹٹولتا ایک طرف کو چل پڑا۔ نصرت‌الله ذرا دور دور چلتا ھوا، اس کے پیچھے ھو لیا۔

جب اندھیرا ھوا تو اندھے کی آنکھوں کی روشنی واپس آ گئی اور وہ نصرت‌الله کو لے کر شہر کے باھر نکلا، تین رات مسلسل سرشام سے لےکر علی الصباح تک وہ دونوں پیدل چلتے رھے، خالی ویران، سنسان سڑکوں پر سے گزرتے، یہاں تک کہ اوش کے پہاڑوں سے بھی گزر گئے۔ نصرت‌الله اپنے رھنما کے پیچھے پیچھے چلتے رھنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکا۔آخرکار وہ اپنی منزل پر پہنچے اور نصرت‌الله اس مغنی کی آخری دعائیں لےکر رخصت ھوا۔

مگر یہ قسمت اسے کہاں لے آئی؟ اب اس مغرور کو یہ دیکھکر بےحد وحشت ھوئی کہ وہ تو آسمان سے گرکر کھجور میں اٹک گیا تھا، اسے اپنا باپ نہیں ملا اور نہ کوئی بتا سکتا تھا کہ وہ کہاں گیا۔ وہ جو اس کا رھنما تھا وہ تو اسے بسماچیوں میں پہنچا گیا تھا۔

شروع میں تو خیر اتنا ھی غنیمت تھا کہ پیٹ بھر کھانا ملتا تھا۔

بسماچیوں کے سردار قل‌خواجہ نے نصرت‌الله کا بےتکلف استقبال کیا تھا گویا وہ کوئی پرانا دوست ھے۔ چند دنوں تک سردار نے اسے اپنے پہلو میں بٹھائے رکھا اور نصرت‌الله اپنی خواھش کے مطابق خوب گوشت کھاتا اور گھوڑی کا دودھ پیتا رھا لیکن پھر یکایک سردار نے سرد مہری دکھائی اور اسے اپنے جوانوں کے پاس بھیج دیا جو ایک غار میں رھتے تھے۔

ان کی تعداد ستر تھی اور کوئی ایک ماہ سے وہ اس پہاڑی غار میں چھپے کسی بات کے منتظر تھے۔ روز دوپہر کو وہ اپنی پوشیدہ جگہ سے نکل‌کر دھوپ میں جا بیٹھتے اور اپنے کپڑوں سے جوئیں نکال نکال‌کر مارا کرتے۔ دن میں دو بار وھاں گھوڑے کا گوشت بڑے بڑے، گندے دیگوں میں پکتا اور وہ سب اس پر لینڈی کتوں کی طرح جھپٹ پڑتے اور ھڈیوں سے

گوشت کو اپنے ناخنوں سے نوچ نوچ کر کھاتے جو ناخن ابھی ماری ہوئی جوؤں کے خون سے لال ہوتے۔ سارا دن وہ سوتے اور رات کو ذرا ذرا سی بات پر جھگڑتے۔ ان جھگڑوں میں کبھی کبھی آپس میں چھرا بھی چل جاتا اور اگر کوئی جوان مرجاتا تب سردار آتا اور کسی کو پستول کا نشانہ بناکر پھر اپنے شامیانے میں واپس چلا جاتا۔ شامیانہ سردار کے خیمے کو کہتے تھے جو کینوس کا بنا ہوا تھا۔ جیسے ہی سردار جاتا جوان سب پھر اپنی وحشیانہ لڑائیاں شروع کر دیتے، وہی گوٹوں کا کھیل، عورتوں کے متعلق ایسی باتیں جنھیں سن‌کر متلی آئے اور یہ بحث کہ خود سردار کو ہی کیوں نہ مار ڈالا جائے۔

جیسے ہی نصرت‌اللہ ان لوگوں میں پہنچا اس کے متعلق ایک زہریلی افواہ گشت کرنے لگی:

"ارے یہ قل‌خوجہ کا مغبچہ ہے۔"

غار کے منہ پر ایک موٹا، تھل تھل آدمی بیٹھا تھا، اس کی پیٹھ پر پھوڑیاں تھیں اور وہ بندوق کے دستے سے جوؤں کو کچل کچل‌کر مار رہا تھا۔ نصرت‌اللہ کو دیکھ‌کر سستی کے ساتھ کہنے لگا:

"بھلا اور سردار سے کیا امید ہو سکتی تھی؟ بھلا وہ ہمارے لائق کوئی اچھا سا لونڈا بھیجتا؟ ذرا منھ تو دیکھو، اس کے تو چیچک کے داغ تک ہیں!"

ستر ڈاکوؤں نے نصرت‌اللہ کی طرف اپنے داڑھی‌دار چہرے موڑے اور اسے اپنی تیلیا نظروں سے گھورنے لگے۔ اسے فوراً یقین ہو گیا کہ ان لوگوں میں سے کوئی اس کا دوست نہیں بن سکتا اور یہاں اسے پناہ نہیں مل سکتی۔

ایک رات وہ بھی جھگڑے میں شامل ہو گیا اور ایک موٹے گنڈے کے پہلو میں خنجر بھونک دیا، پھر کچھ سوچے بغیر وہ دوڑنے لگا، تیزی سے پہاڑی بکری کی طرح اور اسی سڑک پر ہو لیا جس سے چل‌کر وہ وہاں تک پہنچا تھا۔ ویسے اسے خود تو امید نہیں تھی کہ وہ بچ سکے گا مگر بسماچیوں نے اس کو ڈھونڈنے میں ذرا دیر کی اور وہ نکل گیا۔ رات ٹھنڈی اور نصرت‌اللہ کی رفتار تیز۔ وہ بچ ہی نکلا۔

اسے اپنے شہر، اپنے نعمانچہ کی یاد بری طرح آ رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ چائے تعمیر پر اس طرح پہنچ جائے کہ کوئی اسے نہ دیکھے اور پتہ لگائے کہ اس کنکریٹ کو کیا ہوا۔ وہ تازہ دیواری اخبار دیکھنا چاہتا تھا جو بشارت نے "سرخ گوشہ" پر لگایا ہوگا۔

سارے دن وہ شہر کے باہر گھومتا رہا، قبرستان میں چھپا رہا اور انسانوں سے یوں پہلو بچاتا رہا جیسے کوئی وحشی جانور۔ پھر اسے ایک ایسی بات سوجھی جو اسے ان ساری مصیبتوں سے چھٹکارا دلا سکتی تھی، اس کی جان بچا سکتی تھی۔ کیوں نہ وہ اس چائے کے تاجر کو مار ڈالے؟ اس نے ایک پتھر پر اپنا خنجر گھس کر خوب تیز کیا۔ آخر اسے یہ خیال پہلے ہی کیوں نہ آیا؟ اب تو وہ جیسے ہی اس قابل نفرت آدمی کو دیکھے گا، اسے موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

نصرت‌اللہ نے شہر بھر میں چائے کے تاجر کی تلاش میں ایک دن اور گزارا، تمام چائےخانے اور بازار دیکھے، اس جھونپڑی کو تلاش کر لیا جہاں اس نے اسے شراب پلائی تھی۔ پر وہ کہیں نہ ملا۔

کیا وہ بھی نعیمی کی طرح بھاگ لیا؟

ایک پل کے لئے نصرت‌اللہ کا دل امید سے بھر گیا۔ کاش کہ ایسا ہی ہوا ہو! کاش کہ اس کا ماضی اب اس کے پیچھے پیچھے سائے کی طرح نہ رینگتا پھرے...

کسی راہ‌گزر پر اگی جھاڑی کی طرح دھول مٹی سے اٹا، بھوکا پیاسا، وہ اندھیرے میں اپنے گھر پہنچا، زنان‌خانے میں گیا جہاں کبھی اس کی ماں رہا کرتی تھی، جہاں اس نے اسے جنم دیا تھا اور جب وہ بچہ تھا تو اسے باپ کے غصے سے بچایا، چھپایا کرتی تھی۔

وہاں سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا اس دن جب انجینیر اس سے ملنے آیا تھا۔ ایک چائے دانی اور دو پیالے جن میں ہری چائے کی تلچھٹ پڑی تھی، ایک نیچی سی میز پر رکھے تھے۔ کھائے ہوئے تربوز کے ٹکڑے جو سڑنے بھی شروع ہو گئے تھے، فرش پر بکھرے اور طاق پر ایک سوکھی، باسی نان پڑی

تھی۔ نصرت اللہ نے مریھکوں کی طرح اسے کھانا شروع کر دیا۔
اس کا کتا فرش پر دم گھسیٹتا آیا اور رینگتا ہوا اس کے پاس پہنچ کر اس کے لانگ بوٹ چاٹنے لگا اب تو کچھ بھی ہو جائے وہ، نصرت اللہ اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا...

یکایک کتا اچھل کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور غرانے لگا۔ نصرت اللہ نے فوراً مڑ کر دیکھا۔ آخر اس کی قسمت چیت ہی گئی! چائے کا تاجر دھلیز پر کھڑا تھا۔

تاجر نے اپنا ایک ہاتھ سینے پر رکھا اور مسکرا کر گنگناتی ہوئی آواز میں کہا:

"مسافر کو گھر واپس آنا مبارک ہو۔ قل خواجہ کا مزاج کیسا ہے؟"

نصرت اللہ نے بغیر کوئی جواب دئے ایک دم اس پر حملہ کیا، اس نے زن سے اپنے لانگ بوٹ میں سے اپنا خنجر کھینچ لیا تھا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے وہ فرش پر پڑا درد سے تڑپ رہا تھا اور اس کا خنجر چائے کے تاجر کے قدموں میں پڑا تھا۔ کتا پیں پیں کرتا نوک دم بھاگا۔

"کیوں، میرے بیٹے؟ کیا تم واقعی مجھے قتل کر دینا چاہتے تھے؟" چائے کے تاجر نے خفگی کے ساتھ پوچھا۔ "کیا ایسا کرنا کوئی عقل کی بات ہوتی؟ ذرا سوچو۔ اگر تم مجھے حکومت کے ہاتھوں پکڑوا دیتے تو تم زیادہ فائدے میں رہتے!"

"میں وہ بھی کر دوں گا، آپ فکر نہ کریں" نصرت اللہ دانت پیس کر بولا۔

"ہاں، یہ ہیں کسی عقلمند آدمی کے الفاظ" تاجر نے کہا ارو پھر اس نے اپنی جیب سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ اور ایک پنسل نکالی۔

کاغذ پر عربی رسم الخط میں چند سطریں لکھی ہوئی تھیں۔ تاجر نے اس کی تہیں کھولیں اور اس کاغذ اور پنسل کو نیچی میز پر ایک پیالے کے پاس رکھ دیا۔

"انجینیر تم سے ملنے آیا تھا؟" اس نے غیر متوقع کاروباری لہجے میں پو چھا۔

"ھاں" نصرت‌اللہ نے جواب دیا جیسے کسی نے اس سے زبردستی جواب دلوایا، پھر اس نے منمناتی ھوئی آواز میں کہا: "تو کمبخت کالا شیطان، اب تو میں تیرا کہا کبھی نہیں کروں گا۔ نکل یہاں سے، دور ھو۔"

چائے کے تاجر نے زمین پر پڑا نصرت‌اللہ کا خنجر اٹھایا اور اسے غور سے دیکھا۔

"میرا کہا کیوں کروگے؟ میں تو ایک معمولی آدمی ھوں" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اب تو تمھاری بڑے بڑوں سے دوستی ھے، اب تمھیں میری ضرورت ھی کیا ھے، چھوٹے بھائی۔"

اس نے دھار پر انگوٹھا پھیرا اور ذرا لاپرواھی سے بولا: "مگر ھاں، شاید مجھ پر اب بھی ایک عنایت اور کر سکتے ھو۔ میرا ایک چھوٹا سا کام..."

نصرت‌اللہ چاروں ھاتھ پاؤں پر چلتا ھوا دروازے تک جانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے اٹھ کھڑے ھونے کی بھی مہلت نہیں ملی کیونکہ چائے کے تاجر نے اسے دھلیز پر ھی جا لیا۔

نصرت‌اللہ قدرت‌اللہ ئیف کے غائب ھو جانے کے بعد دوبروخوتوف پر مستقل ایک قسم کا خوف طاری رھنے لگا تھا۔ ھر گھڑی اسے مصیبت آ پڑنے کا ڈر لگا رھتا اور آنےوالی بدبختی کے اس احساس کی وجہ سے اس کا دم سینے میں ایسا گھٹتا رھتا تھا جیسے اسے دمہ ھو گیا ھو۔

وہ اپنے آپ کو اس قصور کے لئے معاف نہیں کر پاتا تھا کہ اس نے اس عجیب و غریب اور غمگین نوجوان کے لئے اپنے دل کے دروازے کیوں نہیں کھولے، کیوں وہ اصل گفتگو کو کسی بہتر موقعے کے لئے ملتوی کرتا رھا، اس نے کیوں یہ سوچا کہ ایسا کرنا زیادہ سمجھداری اور ھوشیاری ھوگی۔ اور اب یہ ثابت ھوا کہ اس نے اتنی دیر کی کہ اب بہت دیر ھو گئی۔

کہاں ھے نصرت‌اللہ؟ وہ کیا پوچھنا چاھتا تھا؟ وہ اسے اپنا کون سا راز بتاکر اپنا ھمراز بنانا چاھتا تھا؟ مگر اب وہ کر ھی کیا سکتا تھا سوائے اس کے کہ طرح طرح کے شبہات اور قیاس‌آرائیوں سے اپنے آپ کو اذیت پہنچاتا رھے، کڑھتا رھے اور آخری مصیبت کا انتظار کرتا رھے۔ انتظار اور انتظار...

ایسا لگتا تھا کہ ایرگاش اور یفیم دانیلووچ اس فارورڈنگ ایجنٹ نصرت‌الله کے ذکر سے بھی کتراتے ھیں یا شاید وہ انجینیر پر ایسا ھی ظاھر کرنا چاھتے تھے؟ شاید وہ انتظار میں تھے کہ وہ خود ھی قبول دے کہ اس کے اور نصرت‌الله کے کیا بات‌چیت ھوئی تھی؟ قبول دے؟ ھاں، جہاں تک دوبروخوتوف کا سوال تھا اس لفظ کے علاوہ اور کون سا لفظ استعمال ھو سکتا تھا؟

وہ اس معاملے کا ذکر ڈاکٹر ویکینتی فیودرووچ سے کرتے بھی ھچکچاتا تھا حالانکہ وہ اس کا پرانا اور عزیز دوست تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی قوت ارادی اتنی کمزور تھی کہ کچھ کرتے ھی بن نہ پڑتا تھا۔

سرگئی لووچ دوبروخوتوف کو محسوس ھوتا تھا کہ قصور تو اس کا اپنا ھی ھے مگر وہ اسے تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر پروجیکٹ پر کوئی آفت آتی تو سب سے پہلے جو شخص پھنسے گا وہ خود ھوگا لیکن یہ بھی تو ھو سکتا تھا کہ یکایک سب کچھ ٹھیک ھو جائے!

یوں دوبروخوتوف نے خود کو اپنی ذات کے خول میں سمیٹ لیا اور اپنی خاموشی سے خود ھی اذیتیں سہہ رھا تھا۔

وہ کنکریٹ ملانےوالی مشین کے پاس کھڑا تھا تو یفیم دانیلووچ اور ایرگاش اس کے پاس آئے اور یفیم نے انجینیر کے کندھے اپنے بازو میں لے لئے۔

"سرگئی لووچ، تمھیں کیا ھو گیا ھے؟ تم تو وہ لگتے ھی نہیں جو تھے۔ کیا بہت تھک گئے ھو؟ تم اپنے آپ میں کھوئے ھوئے، دن بھر ٹھنڈی آھیں بھرتے رھتے ھو۔ یہ سب تو نہیں چلے گا، میرے دوست۔ ابھی تو ھم نے بنیادیں ھی رکھنی شروع کی ھیں۔ بھلا تمھارا یہ خیال رھے گا تو چھت پڑتے پڑتے تم کس نوبت کو پہنچ جاؤگے؟"

دوبروخوتوف کو معلوم تھا کہ یفیم دانیلووچ جان بوجھ‌کر، ایرگاش کی موجودگی میں، سب کے سامنے اس سے خلوص ظاھر کر رھا ھے۔ پروجیکٹ چیف کا رویہ اس کی طرف پہلے کی طرح وھی رکھائی اور اکڑ کا تھا۔ حال میں وہ کچھ اخلاق

ضرور دکھانے لگا تھا مگر دوبروخوتوف کو محسوس ہوتا تھا کہ اس اخلاق کی تہہ میں کوئی سنگین بات ہے۔ اسے ایرگاش کا وہ اکھڑپن زیادہ پسند تھا، اس کی صاف گوئی کہیں زیادہ خوشگوار لگتی تھی۔

"یفیم دانیلووچ، اب آپ خود ہی دیکھ لیجئے" وہ زبردستی مسکراکر بولا۔ "جاڑے کا موسم آ رہا ہے، صبح کو تو ابھی سے پالا جمنے لگا ہے اور وسط نومبر سے پہلے کنکریٹ بٹھا دیا جانا چاہئے۔"

"ہاں، تم بالکل ٹھیک کہتے ہو" یفیم دانیلووچ نے اتفاق کیا۔ "ایسا نہ ہوا تو ہم لوگ اٹک کر رہ جائیں گے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بالکل ہمارے چیف کے نقش قدم پر چل رہے ہو جو ہمیشہ ہر چیز سے ناخوش رہتا ہے۔ میں آپ کی جگہ ہوتا تو میں تو ایسا نہ کرتا۔ کنکریٹ والے بڑے تیزی سے کام کرکے سب کے برابر آ رہے ہیں۔ ماماجان نے تو بڑی سنجیدگی سے ہوائی جہاز میں بیٹھنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔"

"جی ہاں، اور مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے" دوبروخوتوف نے سوالیہ نگاہیں ایرگاش پر جماتے ہوئے کہا۔

ایرگاش نے منہ بناکر دوبروخوتوف کے ناک کے بانسے پر نگاہیں جما دیں۔

"آپ کو یقین ہے نا کہ آپ اس بدبخت کی طرح بھاگ تو نہیں لیں گے؟" اچانک اس نے پوچھا۔

شاید ایرگاش نے یہ بات مذاق میں کہی ہوگی کیونکہ یفیم دانیلووچ نے دوبروخوتوف کے پہلو میں ایک دوستانہ ٹھوکا دیا۔ لیکن سرگئی لووچ نے کوئی جواب نہیں دیا، بس سر جھکا لیا۔ ایرگاش نصرت‌الله کے سلسلے میں اپنے نیک ارادوں کے مدنظر ناراض تھا، اس کو ایسا لگا کہ اس کی ہتک ہوئی تھی کیونکہ اس نے نصرت‌الله پر بھروسہ کیا تھا، اس کی مدد کی تھی اور اسی لئے اب اس کی بےاعتباری کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ اس پس‌منظر میں اس نوعیت کا مذاق تکلیف‌دہ تھا۔

ماماجان، کام کے بعد روز دوبروخوتوف کے پاس جاتا تھا

یہ پوچھنے کے لئے کہ انجینیر آفندی کنکریٹ کا کام کرنےوالی اس کی ٹیم سے خوش ہیں کہ نہیں۔ بہت سے مزدور دوبروخوتوف کو "انجینیر آفندی" کہتے تھے۔ سرگئی لووچ فوراً اپنی نوٹ‌بک کھولتا اور ماماجان اسی وقت انجینیر کی جان چھوڑتا جب اسے یقین ہو جاتا کہ کام کے متعلق صحیح اعداد کا اندراج کیا گیا ہے۔

"گزشتہ ہفتے وہ تصویر میں مجھے ہوائی جہاز پر بیٹھا نہیں دکھانا چاہتی تھی" بشارت کے متعلق وہ کہتا۔ "اب کے ہفتے وہ میری تصویر بنا دےگی، انجینیر آفندی؟ یعنی‌کہ مجھ کو ہوائی جہاز میں بیٹھا ہوا؟ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"ہاں، میرا ایسا ہی خیال ہے۔"

"واہ، پھر تو میں اپنی داڑھی کو لال ہوائی جہاز پر دیکھوں‌گا۔ ہاں، مجھے اس کا یقین ہے۔"

"لیکن تعمیراتی مزدوروں کا لیڈر میرا راستہ روک‌کر میری جگہ تو نہ لے لےگا؟"

"مجھے اس میں شک ہے، آگے تو آپ ہی ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ہے نا؟"

"ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔"

ماماجان نے اپنی داڑھی مٹھی میں پکڑکر کھینچی اور ذرا تجسس کے ساتھ پوچھا:

"یہ جو سنا جاتا ہے کہ آپ کسی روسی امیر کے بیٹے ہیں تو کیا یہ ٹھیک ہے؟"

سرگئی لووچ کا دل اتنا ٹوٹا سا تھا کہ اسے غصہ بھی نہیں آیا حالانکہ اس کا جی چاہا کہ چیلنج کرنےوالے انداز میں کہے:

"نہیں، یہ بالکل صحیح نہیں ہے، کنکریٹ ملانےوالے آفندی!" مگر اس کے لبوں پر ایک غمگین سی مسکراہٹ آئی اور وہ پھٹاک سے نوٹ‌بک بند کرکے آگے بڑھ گیا۔

ماماجان اس کے پیچھے دوڑا، اسے جا پکڑا اور اس کی آستین کھینچی۔

"کیا میں نے آپ کو ناراض تو نہیں کر دیا جناب؟ آپ کے والد کو کچھ ہو گیا ہے کیا؟ میں نہیں جانتا تھا" ماماجان

نے رک رک کر کہا۔ "آپ... خفگی کی وجہ سے وہ اپنی نوٹ بک میں جو میرے نمبر ہیں وہ تو نہیں کاٹ دیں گے؟"

"نہیں، نہیں، بالکل نہیں" سرگئی نے بدبداکے کہا۔ "اور پھر جلدی جلدی قدم اٹھاکر نکل لینے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن اس کے متعلق یہ بے کار باتیں، یہ جھوٹ افواہیں پھیلائیں کس نے؟ کوئی بہت ہی نیچ ذہنیت اور ذلیل طبیعت کا آدمی ہوگا۔ جس ہوا میں ایسے لوگ سانس لیتے ہوں وہاں تو سانس لینا بھی ذلت ہے، ہتک ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ بری بات یہ تھی کہ ماماجان جیسے سیدھے سادے لوگوں کو ان باتوں پر اعتبار آ جاتا تھا۔

آہ، کاش وہ ماماجان کو یقین دلا سکتا کہ وہ بھی اس کی طرح لال ہوائی جہاز میں بیٹھا نظر آنے کے لئے کیا کچھ نہ دے دیتا لیکن پیچھے مڑکر دیکھا تو ماماجان اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا اور اس کی طرف عجیب سہمی ہوئی بے اعتبار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کیا انجینیر نے اس اچھے انسان کی خوشی ملیامیٹ کر دی تھی؟

ایک ہفتے سے کنکریٹ والوں کا لیڈر اپنی پنڈلی تک لمبی عبا کے گرد کمر میں ایک نہیں بلکہ تین تین پٹکے باندھا کرتا تھا اور اسے محسوس ہوتا تھا کہ اسے بھی فخر کے مظاہرے کا حق حاصل ہو گیا تھا۔ اس کے آباواجداد میں سے کسی کو نہ کبھی ایسی عزت حاصل ہوئی تھی، نہ مسرت۔ انہوں نے نہ کبھی کسی مل کے بنانے میں حصہ لیا تھا، نہ کنکریٹ ملانے میں اور ان میں سے کسی نے ایسا کارنامہ نہیں انجام دیا تھا کہ ان کو گدھے کی جگہ ہوائی جہاز پر بیٹھنے کا رتبہ حاصل ہو جائے۔ بھلا کون سوچ سکتا تھا کہ ادھر ادھر سامان ڈھونے اور قلی گیری کرنےوالا ماماجان جو ایک سامان ڈھونےوالے اور قلی گیری کرنےوالے کا بیٹا، اور سامان ڈھونے اور قلی گیری کرنےوالے کا پوتا تھا، وہ کوئی ایسے کام کرےگا کہ لوگ اس پر رشک کرنے لگیں!

دوبروخوتوف ماماجان کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا تھا اور جس کام سے ماماجان قلی کو عزت اور مسرت حاصل ہو رہی

تھی اس میں حصہ لینے پر فخر محسوس کرتا تھا اس لئے یہ بات اور بھی تلخ تھی کہ ماماجان اس کے جذبات کو بالکل نہیں سمجھتا تھا۔ سرگئی دوبروخوتوف نے اس آفت کے انتظار میں جس کا آنا یقینی تھا، دو ھفتے بڑی اذیت کے ساتھ کاٹے۔ اور تب طوفان آیا۔ اس کا آنا ناگزیر تھا۔

جب اینٹوں کی دیوار چھے فٹ اونچی اٹھ چکی تو یکایک اس میں ایک بڑی سی درار پڑ گئی اور اس کا ایک حصہ اس طرح بیٹھ گیا جیسے اس کی بنیاد کنکریٹ پر نہیں بلکہ بالو پر رکھی گئی ہو، ریت پر کھڑی کی گئی ہو۔

دوبروخوتوف نے دیوار کو بیٹھتے نہیں دیکھا۔ جب وہ موقعے پر پہنچا تو سارے مزدور اینٹے کی اس تعمیر کو گھیرے کھڑے تھے، زور زور سے چیخ رہے تھے، گالیاں دے رہے تھے، کوئی کسی کی نہیں سن رہا تھا، کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ماماجان خندق میں بیٹھی بیٹھی ہوئی دیوار کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے درار سے کنکریٹ لی اور اسے ہاتھ سے دبایا۔ وہ ہاتھ میں یوں چورم چور ہو گئی جیسے کچے چونے کے ٹکڑے۔

"نکل وہاں سے! دیوار بیٹھے گی تو چٹنی ہو جائے گا، جلدی نکل!" لوگ چیخ چیخ کر ماماجان سے کہہ رہے تھے۔

لیکن ماماجان کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

بار بار وہ سوکھی کنکریٹ کے ٹکڑے اٹھاتا اور اپنے ہاتھوں میں دبا دباکر ملتا اور وہ بالکل ریت ہو جاتے۔ پاگلوں کی طرح وہ مسلسل یہی کئے جا رہا تھا۔

دوبروخوتوف نے ماماجان کے ہاتھوں کو دیکھا تو لرزنے لگا۔ کاش وہ یہ منظر کبھی نہ دیکھتا، اس سے پہلے وہ پھانسی لگاکر مر گیا ہوتا تو کیوں وہ یہ سب دیکھتا اور کیوں اس کا دماغ سوچنے سے ماؤف ہو جاتا۔ یہ سب کیا تھا؟

ھاں، یہی تو تھی وہ ناگہانی مصیبت۔ یہی تو تھی وہ بات جسے نصرت‌الله چھپا رہا تھا۔ کیسا شیطان، نہیں شیطان کیا،

قاتل! دوبروخوتوف کو تو اس نے مار ڈالا۔ اسے کہیں کا نہ رکھا۔ آہ خاتمہ، خاتمہ آ پہنچا۔ یہی تھی موت، یہی۔

ماماجان نیو میں سے کودکر نکلا اور اس نے اپنی مٹھی سے انجینیر کے سینے پر ایک ٹھوکا دیا، مٹھی میں ریت ہو جانےوالی کنکریٹ تھی۔

"یہ کیا ھے؟ میں کہتا ہوں یہ کیا مذاق ھے؟" اس نے کہا۔ "میں نے کیوں محنت کی تھی یہ مجھے بتاؤ ذرا؟ میں نے کیوں اپنا جی جان اس میں جھونکا؟ کیوں؟ بتاؤ، بتاؤ مجھے!"

مزدور یک‌زبان، یک‌آواز ہوکر زور سے چیخے:

"تخریب‌کاری!"

"ھمیں دھوکا دیا جا رہا ھے!"

"یہ لوگ ھمیں الو بنا رہے ھیں!"

"تمہاری آنکھیں کہاں تھیں؟"

"ھائے، سب کچھ تباہ ہو گیا!"

"ھم نے رات دن مشقت کی، پسینہ ھماری پیشانیوں پر سیاہ پڑ گیا..."

"ارے اب فضول بات سے کیا فائدہ!"

اتنے میں تعمیر کے دوسرے حصوں سے کچھ اور مزدور آ پہنچے اور سب کے ہاتھوں میں وہ بھربھری کنکریٹ تھی جس سے ریت بھی بہتر تھی۔ سب نے اسے انجینیر کو دکھایا اور اس کے سامنے سرمئی ڈھیلوں کو ہاتھ سے مل مل‌کر ریت کرکے دکھایا۔

دوبروخوتوف پتھر کی طرح بےحس سب کچھ دیکھتا سنتا رہا، اس کے دھوپ سے سنولائے تانبے کے رنگ کے، خاک دھول سے اٹے چہرے پر پسینے کے بڑے بڑے موتی چمکنے لگے لیکن دل سرد اور خالی تھا۔ اب وہ ہر بات سے بےنیاز ہو چکا تھا کیونکہ اسے یقین تھا، اس کی تقدیر پر مہر لگ گئی۔ اب وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔

ھڑیلا مقسوم سب کو ڈھکیلتا سامنے آیا اور سب سے زیادہ

زور سے چیخ کر، مکا تان کر، منھ سے جھاگ کی چھینٹیں اڑاتا ہوا چلایا۔

"میں تو پرانا غلام ہوں مگر میں نے سوچا تھا میری قسمت میں بھی روشنی آ گئی! میں نے اپنی جان کی پرواہ نہیں کی، اسپتال میں تقریباً مر گیا! مگر ہم نے اپنا پسینہ کس چیز کے لئے بہایا؟ ہم نے کس بات کے لئے مشقت کی؟ ایسے کام پر ہزار بار لعنت ہے!"

ماماجان نے اپنے آپ کو دوسروں سے زیادہ سمجھدار اور چوکنا ثابت کیا۔

"ٹھہر، ہڑیلے" اس نے ہڑیلے کو روکتے ہوئے کہا۔ "تو کیوں گلا پھاڑ رہا ہے؟ ہمیں ہر چیز کو دیکھنا ہے، ہر چیز کا معائنہ اور جانچ کرنا چاہئے..."

لیکن ہڑیلا مقسوم کب چپ ہونے والا تھا۔

"دیکھو، مجھے ہاتھ نہ لگانا" وہ باریک آواز میں زور سے چیخا۔ "تم خود نہ اپنا منھ بند رکھو، بڑے آئے انجینیر کے لاڈلے! ہم سب تمہیں اس کے ساتھ دیکھ چکے ہیں کہ اس کی نوٹ بک میں جھانک جھانک کر دم ہلا رہے تھے! لیکن میں نے تو بڑی مصیبت بھگتی ہے۔ میں تو حق رکھتا ہوں کہ کہوں! تم بھلا لوگوں کا منھ کیسے بند کر لوگے جی؟"

"میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ہر طرف دیکھ کر ہر بات کو سوچ سمجھ کر ہمیں سب جانچ کرنی چاہئے" ماماجان گھبرا کر بولا۔ "زبان لمبی بیڑا غرق۔"

"جانچ کی کوئی ضرورت نہیں! ہم اندھے نہیں ہیں اور اب تو بالکل ہی ہماری آنکھیں کھل گئی ہیں!" مقسوم نے ماماجان کو اور بولنے ہی نہیں دیا۔ "یہی ہے ستیاناسی یہ تمہارا انجینیر! میں نے اپنی آنکھوں سے اس کو بائے کے بیٹے نصرت اللہ کے ساتھ چائے پیتے دیکھا تھا۔ میں قسم کھاکے کہتا ہوں میں سچ بول رہا ہوں۔ ایک غائب ہو گیا ہے اور دوسرا رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ وہ تو دیکھ ہی سکتے ہیں کہ یہ امیر طبقے کا ہے، یہ بورژوا ہے۔ یہ ایک روسی امیر

کا بیٹا ھے، یہ خون چوسنے والوں کی اولاد ھے۔ دیکھو نا اس کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں۔"

"اے انجینیر، چلو، اب صفائی دینا شروع کرو! اس بار خاموشی تمہیں نہیں بچا سکے گی!" مزدور پھر ایک ساتھ چلانے لگے۔

لیکن دوبروخوتوف کچھ نہیں بولا، بے یار و مددگار اور بدحواس وہ آنکھیں پھاڑے چاروں طرف، ایک ایک کو تکتا تھا۔ پھر کسی نے اس کی آستین کھینچی اور ھڑیلے مقسوم نے اس ستیاناسی کی پیٹھ پر دو چار گھونسے جڑ دئے۔

"دیکھو لوگو!" وہ جذبات کی شدت سے آہ و زاری کرنے لگا۔ "ارے اسی کنکریٹ سے اس بدمعاش کا پیٹ بھر دو، لاؤ مجھے دو کنکریٹ، میں بھرتا ہوں اس کے پیٹ میں۔ گناہ میرے سر۔"

پھر ایک تیز، اونچی، تحکمانہ آواز ابھری جس سے مقسوم کی آہ‌وزاری اور لوگوں کا گڑبڑ اور شور ایکدم تھم گیا۔

ایرگاش اپنی لال، بھاری گردن، کسی بیل کی طرح جھکائے راہ دیتی ہوئی بھیڑ میں سے قدم بڑھاتا مقسوم کی طرف بڑھا۔

"ارے کھٹمل، طفیلی، دوسروں کو پھانسنے والا" اس نے زور زور سے کندھے جھٹکتے ہوئے آگ بگولا ہو کے کہا۔

وہ مقسوم کے سر پر آ پہنچا جو اس کے سامنے دبک کر رہ گیا۔ پھر اس نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھتے اور تن کر کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا:

"کیا چاھتا تھا؟ پھر تو ذرا کہہ؟ کون سا گناہ اپنے سر لے رہا تھا؟ نکل یہاں سے، بائے کی ھاں میں ھاں ملانے والا، خوشامدی!.. بھاگ یہاں سے! نکل جانے دو اس کو..." مقسوم گرتا پڑتا جتنا تیز ہو سکا، جائے تعمیر سے بھاگ کھڑا ہوا۔

"کہاں ھے انجینیر؟"

ماماجان ایک طرف کو ہو گیا اور ایرگاش نے دوبروخوتوف کو دیکھا جس کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور جو بے حد کمزور اور دبلا لگ رہا تھا۔

وہ اس کے برابر میں کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنی آواز اتنی بلند کی کہ وہ جائے تعمیر کے اس سرے سے اس سرے تک پہنچنے لگی:

"تم میں سے کس نے اس شخص کو ہاتھ لگایا تھا؟ کس نے اس کی ذلت کی تھی؟ میں تم سب سے پوچھتا ہوں، کس نے ایسا کیا؟"

کئی آوازوں نے الگ الگ جواب دئے:

"یہ تباہ کرنے والا ہے، چیف۔"

"دیکھئے کیا ہوا ہے۔"

"دیکھئے ذرا اس کنکریٹ کو۔"

اس مرحلے پر دوبروخوتوف نے بولنا شروع کر دیا۔

"یہ لوگ ٹھیک کہتے ہیں" اس نے واضح طور پر کہا۔ "مسالے کو میں نے جانچا تھا۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ ہاں، یہ میرا ہی قصور ہے۔"

"سنا تم نے؟ تسلیم کر لیا نا اس نے! اس سے غلطی ہوئی۔ اب سارا قصور کسی اور پر تھوپنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"میری بات سنو" ایرگاش گرجا۔ شور ایک دم تھم گیا۔ "میں اس آدمی کی ضمانت لیتا ہوں! سمجھے؟ ہر کسی نے سمجھ لیا نا کہ میں نے کیا کہا؟ میں اسے اپنی جان کے عوض اپنی ضمانت میں لیتا ہوں! اب کسی کو اس معاملے میں کچھ صفائی درکار ہے؟"

ماماجان سب کی طرف سے بولا: "آپ ٹھیک کہتے ہیں چیف! خربوزے کو دیکھ کے خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، ہڑیلے مقسوم نے ہم لوگوں کو غلط راہ پر لگا دیا۔ انجینیر کسی امیر ہی کا بیٹا کیوں نہ ہو کوئی اس کو انگلی نہیں چھوائے گا۔ انجینیر آفندی، دل مضبوط رکھئے!" پھر ایرگاش سے صفائی دینے لگا: "ہم لوگوں کے ہوش حواس ٹھکانے نہیں رہے تھے۔ یہ چوٹ بھی تو کتنی زبردست ہے چیف! یہ بڑا زبردست صدمہ ہے۔"

ایرگاش نے ایک بازو اٹھاکر فوجی انداز میں حکم دیا:

"اچھا اب سب لوگ اپنے کام پر واپس جائیں، یہ افراتفری، یہ گھبراہٹ، بوکھلاہٹ ہم لوگوں کو زیب نہیں

دیتی۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ لوگوں میں کوئی سراسیمگی پھیلے۔ پھر دوبروخوتوف کی طرف مڑکر بولا: "اچھا؟ تو آؤ انجینیر، چلو ذرا معائنہ ہو جائے۔ مجھے بھی تو وہ کچھ دکھاؤ جس کا الزام اپنے سر لے رہے ہو۔"

انجینیر نے اپنے لرزتے لبوں کو جنبش دینے کی شدید مگر بالکل ناکام کوشش کی اور بڑی بےبسی سے ایرگاش کی طرف دیکھا۔ ایک بار پھر اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا، البتہ دو دھندلے سے قطرے جو نہ جانے آنسو تھے یا پسینہ، ڈھلکتے ہوئے اس کے بیٹھے ہوئے رخساروں پر سے گزر گئے۔

اسی روز نصرت اللہ کی لاش ملی۔ اس کا گلا کٹا ہوا تھا اور وہ اپنے ہی کمرے میں جمے، سوکھے، سیاہ خون میں لت پت پڑا تھا۔

لاش کے پاس رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی میز پر ایک پرچے پر عربی رسم الخط میں کچھ لکھا رکھا تھا۔ پرچے پر خون کے دھبے تھے۔

ایرگاش نے یفیم دانیلووچ اور دوبروخوتوف کو اس تحریر کا ترجمہ سنایا۔ تین سطریں تھیں:

"تم سب پر لعنت ہو۔ میں تو کام کرنا چاہتا تھا۔ انجینیر نے مجھے اپنے جال میں پھنسا لیا۔ اس روسی سور پر خدا کی مار۔ بہرحال مل تو اب گر ہی جائے گی۔"

دفتر کے باہر مزدوروں کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا، پرچے میں جو کچھ لکھا تھا اس کا فوراً ہی لوگوں کو پتہ چل گیا اور اب تو مزدوروں کا غصہ ٹھنڈا کرنا ناممکن ہو گیا۔ وہ مطالبہ کر رہے تھے کہ انجینیر کو فوراً گرفتار کیا جائے کیونکہ ایک مستند گواہ نے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ ویسے مرنےوالا بھی بدمعاش ہی تھا مگر خیر، اس نے تو خودکشی کرکے اپنے خون کی قربانی دےکر اپنا گناہ دھو ڈالا تھا۔

"ھڑیلا مقسوم پھر بھیڑ میں آ پہنچا اور دیوار سے لگا لگا

کبھی ادھر، کبھی ادھر جاتا اور بڑے ھی غمناک انداز میں ماتم کر کرکے، سینہ پیٹ پیٹ کے چیختا جاتا۔

"میں نے کیا کہا تھا؟ میں نے آپ لوگوں سے کیا کہا تھا؟ میں نے قسم کھائی تھی که میں نے اس کو انجینیر کے ساتھ چائے پیتے دیکھا ھے۔ مگر آپ لوگوں نے میری بات کا یقین ھی نہیں کیا۔ اچھی بات ھے، اور کسی بےچارے غلام کو دھتکارکر بھگا دو۔ ارے میں نے کیا مصیبتیں نہیں اٹھائی ھیں۔ میرے باپ نے اور بائے نے کیا مجھ پر ظلم نہیں توڑے ھیں۔ اچھی بات ھے، آپ لوگ بھی مار لیجئے۔ ایک مسلمان کو سچ بات کہنے پر مار لیجئے، چھین لیجئے، اس سے اس کی روٹی کا آخری ٹکڑا بھی چھین لیجئے۔"

ایرگاش مردہ نصرت‌الله کے پاس کھڑا اپنے ھونٹ کاٹ رھا تھا اور اس کے دونوں ھاتھ اس کی فوجی پیٹی میں ٹھنسے ھوئے تھے۔ جب سے اس نے وہ پرچہ پڑھا تھا وہ مستقل دانت پیس رھا تھا۔

"سرگئی لووچ، آخر یہ سارا معاملہ کیا ھے؟"

یفیم دانیلووچ نے خون کے دھبے پڑا کاغذ بار بار ھاتھ میں الٹتے پلٹتے ھوئے کہا۔

"مجھے کچھ نہیں معلوم" دوبروخوتوف نے مضطرب سی آواز میں کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رھا ھے اور میرا دماغ بالکل اس کے جوڑ بند بٹھا نہیں پا رھا ھے۔"

"مگر آپ خط تو پہچان سکتے ھیں؟ اسی کا لکھا ھوا ھے؟"

"لگتا تو ایسا ھی ھے، اسی کی لکھائی معلوم ھوتی ھے۔"

"میں چاھتا ھوں آپ بالکل یقین کر لیں! خوب غور سے دیکھئے، یہ تو سچ ھے که اس پر کوئی دستخط نہیں ھیں مگر آپ نے اسے دستخط کرتے اپنا نام لکھتے دیکھا ھے۔"

"ھاں، دیکھا تھا۔ اور میرا خیال ھے یہ اسی کی لکھائی ھے۔"

"آپ سمجھ رھے ھیں که آپ کیا کہہ رھے ھیں؟ ھوش میں آئیے، ھم لوگوں کو یہ سارا معاملہ مزدوروں کو سمجھانا ھے..."

دوبروخوتوف کے لبوں پر ایک غمگین سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں نہیں جانتا کہ اور کیا کہوں۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں ویسا کیجئے۔"

"ہاں، یہ اسی کی لکھائی ہے، یہ ایک حقیقت ہے!" ایک ٹھہری ہوئی، پرسکون آواز دروازے کے پاس سے سنائی دی۔

سب ادھر کو مڑ گئے، بالکل سیاہ رنگ کا سوٹ پہنے ایک نوجوان دروازے پر کھڑا تھا اور اس کے پیچھے میلیشیا کا ایک آدمی جو اس کے کندھوں پر سے جھانک رہا تھا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کامریڈ کریموف؟" یفیم دانیلووچ نے غصے سے کہا۔ "پہلے کم از کم پڑھ تو لیجئے کہ کیا لکھا ہے۔ آپ نے ابھی کچھ دیکھا تو ہے نہیں۔"

کریموف نے بڑی بےنیازی کے ساتھ پرسکون انداز میں اس پرچے کو ہاتھ لگائے بغیر اس پر ایک نگاہ ڈالی۔ پھر کمرے میں چاروں طرف غور سے دیکھا اور خاص کر لاش کو جس کے سرد، کھلے ہوئے ہاتھ میں خنجر تھا۔

"میں اس تحریر کو، اس لکھائی کو پہچانتا ہوں۔ ہاں یہ اسی کی لکھائی ہے کامریڈ ندیژدین" کریموف نے اپنی آنکھیں سکوڑتے ہوئے دوہرایا۔

"میں یہ نہیں مانتا۔ میں اس کا بالکل یقین نہیں کرتا۔ سنا آپ نے؟ مجھے ہرگز یقین نہیں ہے! یہ تو کوئی بڑی گہری چال ہے" ایرگاش چیخنے لگا اور اس نے کریموف کی طرف قدم بڑھایا۔ لیکن کریموف نے اس کو ایسی خبردار کرنےوالی نگاہوں سے روکا کہ وہ فوراً خاموش ہو گیا۔

"آپ حقائق سے دامن نہیں بچا سکتے" کریموف معنیخیز لہجے میں بولا۔ "مہربانی کرکے آپ مداخلت نہ کریں کامریڈ سلطانوف۔ بہتر ہوگا کہ آپ تھوڑا صبر کریں۔ اب ہم منزل سے ایک قدم ہی دور ہیں۔ یہ پرچہ آپ کو کہاں ملا تھا؟"

"میز پر۔"

"تو اس کو وہیں رکھ دیجئے اور میں چاہتا ہوں کہ

سب لوگ کمرے کے باہر نکل جائیں۔ کامریڈ میلیشیا کے سپاہی، دیکھئے کسی کو اندر نہ آنے دیجئے گا۔"

"بہت اچھا، کامریڈ کریموف۔"

پھر کریموف دوبروخوتوف کی طرف مڑا۔

"اور آپ انجینیر صاحب... آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے۔ میرے پیچھے آئیے۔"

"لیکن میں بالکل بے گناہ ہوں، کامریڈ... میں آپ سے اپنی عزت کی قسم کھاکر کہتا ہوں، میرا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے" دوبروخوتوف نے اس طرح کہا جیسے بخار میں ہذیاں بک رہا ہو۔ "میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا! مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ایرگاش! یفیم دانیلووچ۔"

"جاؤ، جاؤ، پریشان نہ ہونا" آہستہ سے یفیم دانیلووچ نے اس سے کہا۔ "اور ابھی کوئی بیان نہ دینا۔"

"اے، آپ ندیژدین!" کریموف نے اس کو سختی سے روکا۔ "چلئے آپ۔ آپ کا اب یہاں کوئی کام نہیں ہے۔"

جیسے ہی کریموف انجینیر کو ساتھ لئے، بپھرے ہوئے مزدوروں کے مجمعے سے گزرتا ہوا باہر نکلا، ہڑیلا مقسوم احاطے سے غائب ہو گیا۔

خوشی کے مارے تقریباً ناچتا ہوا وہ دھول بھری سڑک پر تیزی سے شہر کی طرف چل دیا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ اڑا جیسے اس کے پر لگ گئے ہوں۔

چائے کے تاجر نے اس کو سختی سے حکم دے رکھا تھا کہ اس سے ملنے نہ آئے۔ "اگر تم نے مجھ تک پہنچنے کی ہمت کی" اس نے آگاہی دی تھی، "تو اسی جگہ گولی سے اڑا دوں گا"۔ لیکن یہ خبر اتنی زبردست اور اس قدر خوشی کی تھی کہ وہ اسے اپنے دل میں کیسے رکھ سکتا تھا؟ اور پھر یہ بھی کہ اب کس بات کا ڈر تھا۔ چیکا* تو غلط سراغ پر چل ہی پڑی تھی۔

---

* کل روس غیرمعمولی کمیشن جو انقلاب دشمنی، تخریب‌کاری اور نفع خواری کی روک تھام کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ مترجم۔

اور مقسوم نے اس عورت کی طرف ذرا سی بھی توجہ نہ کی جو پرنجے پہنے اس سے ٹھیک بیس قدم کے فاصلے پر برابر اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ عورت کے کپڑے پھٹے چتھڑا چتھڑا تھے اور وہ خاک دھول میں اٹی تھی اور اس کی ایسی جو بےشمار دوسری عورتیں تھیں ان میں کسی طرح الگ نہیں سمجھی جا سکتی تھی۔ لیکن اگر کوئی اسے غور سے دیکھتا تو یہ سمجھ جاتا کہ اپنے قد اور جسم کے حساب سے وہ ذرا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہی تھی۔

پرنجے کے اندر ایک مضبوط عورت گامزن تھی!

انتیسواں باب

اسی شام کو "ماسکووالے" - حاجیہ، رضوان خالہ وغیرہ... آئے اور ان کا استقبال کیا گیا۔ شہر بھر اور آس پاس کے مواضعات سے عورتیں پھول لے لےکر اسٹیشن پہنچیں۔ لیکن استقبال ویسا نہیں ہوا جیسا لوگ سوچ رہے تھے کہ ہوگا، نہ عبدالصمد اپنا براس بینڈ لایا، نہ استقبالی تقریریں ہوئیں۔

صرف ایرگاش کے رویے سے ایسا لگ رہا تھا گویا جائے تعمیر پر کوئی ناخوشگوار بات ہوئی ہی نہیں ہے۔ جیسے ہی اس نے حاجیہ کو ریل کے ایک ڈبے کے پائدان پر دیکھا وہ بےتحاشہ ادھر لپکا۔ سب کے سامنے اسے گلے سے لگا لیا اور قبل اس کے کہ وہ اپنے کو چھڑائے، اس کے دونوں گالوں کا بوسہ لے لیا۔ پھر اپنی ماں کے پاس گیا اور اسے بھی گلے لگایا مگر ذرا کم جوش کے ساتھ۔

یفیم دانیلووچ، رضوان کا سامان اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے اٹھاکر موٹر میں رکھا۔ ایرگاش نے حاجیہ کا سامان

اٹھایا اور جس نے بھی مدد کرنے کی پیش‌کش کی اسے بھگا دیا۔ راستے میں اس نے کتابوں والے بکس کے وزن کی شکایت کی اور بار بار پوچھا کہ سچ بتاؤ اس میں کپڑے ھی تو نہیں بھرے ھوئے ھیں۔ "بھئی تم لوگ تو اب دارالحکومت میں رھنے کی عادی ھو گئی ھوں‌گی، ضرور بورژواؤں کی طرح بکس بھر کے کپڑے لائی ھوں‌گی...."

اناخان کو ایرگاش کے اس رویے پر تعجب ھو رھا تھا۔ اگر اور کوئی وقت ھوتا تو ایرگاش کی یہ معصوم، طفلانہ خوشی اسے اچھی لگتی لیکن اس وقت تو صرف اسے غصہ آ رھا تھا۔ یفیم دانیلووچ بھی اس کے لئے ایک معما سا بن گیا تھا۔

اس نے بس اتنا ھی کہا کہ حاجیہ اور دوسروں کو سامان وغیرہ کھولنا ھوگا اور اتنے لمبے سفر کے بعد آرام بھی کرنا چاھئے اور پھر وہ ان لوگوں سے رخصت ھو کر اپنے گھر چلی گئی۔

دوبروخوتوف کے ساتھ جو کچھ ھوا تھا اس کی طرف سے وہ اپنے ذھن کو ھٹا نہیں پا رھی تھی۔

وہ چاھتی تھی کہ اپنے خیالات کے ساتھ وہ تنہا چھوڑ دی جائے لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ خیالات بھی تو نہایت پریشان‌کن تھے اور ان پر غور کرتے جانے سے سکون کے بجائے اضطراب ھی ھاتھ آتا تھا۔

"کیا یہ سچ ھو سکتا ھے؟" مٹھیاں بھینچتے ھوئے اس نے سوچا۔ "کیا دوبروخوتوف کو سمجھنے میں مجھ سے اتنی سخت غلطی ھوئی؟ میں نے اس کی تعریف کی تھی، مجھے یہ دیکھ کر خوشی ھوتی تھی کہ اس کے کام کا نتیجہ اچھا نکل رھا ھے اور اسے تھکا ھوا اور اداس دیکھتی تھی تو مجھے رنج ھوتا تھا۔ وہ کتنا نیک، کتنا حلیم، کیسا سمجھدار آدمی ھے۔ وہ تو کسی چیونٹی کو بھی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ میں نے تو ایسا خاکسار آدمی کبھی دیکھا ھی نہیں۔ بعض بنکر عورتیں تک اس سے زیادہ تیز اور جھگڑالو ھیں۔ وہ کتنا شاندار کارکن ھے! اور یہ آدمی غدار نکلا، تباہ‌کار نکلا؟ سرگئی لووچ ایک مجرم جو رنگے ھاتھوں پکڑا گیا؟ وہ اس کی نیکی، بے‌غرض طبیعت اس کی جوش سے بھری، ذھانت سے پر تقریریں عوام اور

پروجیکٹ پر عوام کی محنت اور پروجیکٹ کو کامیاب بنانے کی لگن سے اس کی ہمدردی - کیا یہ سب کچھ جھوٹ تھا؟ دکھاوا تھا؟ کیا اس کی پوری زندگی ایک ریاکاری کی زندگی تھی؟ لیکن کیا کوئی انسان اس حد تک دکھاوا کر سکتا ہے؟ کیا وہ جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتی تھی، دل سے محسوس کرتی تھی، وہ سب جھوٹ تھا، سب غلط تھا؟"

اناخان نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ کیا میں اتنی سادہ‌لوح، اتنی بیوقوف ہوں؟ کیا میں اس قدر اندھی ہوں؟"

اس نے شکر کیا کہ گھر پر اس کی بچیاں نہیں تھیں جو اس کی یہ گھبراہٹ، یہ پریشانی دیکھتیں!

اسٹیشن پر یفیم دانیلووچ نے کچھ عجیب ہی طریقے سے دوبروخوتوف کے متعلق بات کی تھی جیسے بات ٹال دینا چاھتا ہو اور کچھ اشارہ بھی کیا تھا جو سمجھ میں نہیں آیا۔ "ہم لوگ ایک تباہ‌کار سے بالکل بےنیاز رہے۔ ایں، آنیا؟" اس نے دھیمے سے کہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ "لگتا ہے ہم لوگ کافی چوکنا نہیں رہے!" اناخان کو ایسا محسوس ہوا کہ یفیم کی آنکھوں اور مسکراہٹ سے کچھ اور لگتا تھا جبکہ الفاظ کچھ اور تھے۔ تو پھر اس کی بات کا مطلب کیا تھا؟ وہ ایک دم مسکرانے کیوں لگا تھا؟ بھلا مسکرانے کی کیا بات تھی؟

صاف ظاہر تھا کہ جو کچھ ہوا تھا اس پر یفیم دانیلووچ کو شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ کاش وہ اکیلے میں اس سے بات کرنے کا موقع حاصل کر سکتی، دونوں نے اپنے آپ کو سب سے زیادہ دھوکا دیا تھا کیونکہ دونوں ہی انجینیر سے محبت کرتے تھے۔ ایرگاش نے تو شروع ہی سے دوبروخوتوف پر اعتبار نہیں کیا تھا اور یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی کہ آج وہ فکرمند نہ تھا۔ وہ انجینیر کو ناپسند کرتا تھا اور اب تو ایسا لگ رہا تھا کہ اسی کا خیال ٹھیک تھا۔ اناخان کی تیوری پر بل پڑ گئے: ایرگاش صحیح تھا مگر اس کا یہ صحیح ہونا اس وقت اناخان کو کتنا زیادہ کھل رہا تھا۔

رنج اور احتجاج کا ایک ایسا عجیب سا جذبہ اس پر

طاری ہوا جس کی وضاحت وہ نہیں کر سکتی تھی۔ آخر یہ سب کچھ یوں کیوں ہوا؟ اسے انجینیر کی حالت پر رنج تھا۔ ہاں، رنج! لیکن اس رنج کی وضاحت کیونکر ہو سکتی تھی؟ اسے ایرگاش پر تو غصہ آ رہا تھا جو اپنی جوان محبت میں مست تھا، جس کا دل صاف تھا اور ایک کمینے، چھپ کر جرم کرنےوالے سے خود اسے ہمدردی ہو رہی تھی۔ کیوں؟ اس کی عقل انجینیر کی مذمت کرتی تھی۔ کیا وہ اس کے برعکس کچھ کر سکتی تھی! مگر اس کا دل؟ اس کے دل میں کوئی غصہ کیوں نہیں تھا؟ تو پھر کیا یہ ظاہر تھا کہ وہ ایک بری کمیونسٹ تھی؟ وہ چوکنا نہیں تھی، اس میں مزدور طبقے کے جذبات کا فقدان تھا۔ صحیح شعور کی کچھ کمی تھی۔

یا پھر یہ تھا کہ وہ حد سے زیادہ متاثر ہو گئی تھی — کیونکہ وہ عورت تھی؟ ہمیشہ سے، ہر دور میں، لوگ یہ دیکھتے آئے ہیں کہ عورت کو اپنے اس دشمن پر بھی رحم آ جاتا ہے جو اس کی محبت اور وفاداری کو نظرانداز کرتے ہوئے اس کی زندگی تباہ کر دیتا ہے۔

"اف، یہ تو حد ہو گئی!" اناخان پیچ و تاب کھاتی اٹھی اور کمرے میں چکر کاٹنے لگی۔

پھر اس نے تولیہ اٹھایا اور منہ دھونے باہر چلی گئی۔ اس کا منھ ایسا تپ رہا تھا جیسے اسے بخار چڑھا ہو۔ تو اس نے سوچا کہ پانی کے چھپکے دینے سے اچھا لگے گا۔ اس نے باہری دہلیز پر حاجیہ کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی جیسے ہچکچا رہی ہو کہ اندر آئے کہ نہ آئے۔

"حاجیہ، تم کیا مجھ سے ملنے آئی ہو، بی‌بی؟"

لڑکی نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا:

"بہن اناخان، میرا اس سے جھگڑا ہو گیا۔ ہم دونوں پھر لڑ پڑے۔ اچھا ہی ہوا اور... بات یہ ہے کہ مجھے پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا۔ اور میں اب آپ کے پاس آ گئی ہوں کہ آپ سے کہہ کر اپنا دل ہلکا کروں۔"

اناخان کو ایک عجیب سی تھرتھری ہوئی، ایک خوشی سی محسوس ہوئی لیکن یہ کیسی ظالم خوشی تھی۔

تو صرف وہی ایک نہیں تھی جسے غم تھا!

"تمہارا کس سے جھگڑا ہو گیا؟ آؤ بیٹھو، مجھے بتاؤ۔"

"ایرگاش سے، اور کس سے ہوتا؟" حاجیہ نے جواب دیا۔

"اوہو، ایرگاش سے!" اناخان نے مسکراتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا۔ "تو اس کی ایرگاش سے لڑائی ہو گئی!"

"بہن اناخان، اب کیا ہوگا؟" حاجیہ نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔ "اور نعمانچہ میں یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

اناخان اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر کے اندر لے گئی۔

"تو کس بات پر جھگڑا ہو گیا؟"

"مجھے تو خود ہی کچھ نہیں معلوم کہ شروع کیسے ہوا۔ شاید ہم دونوں کی قسمت میں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ہی نہیں۔ میں نے اس سے کہا:

"کیوں ایرگاش؟ میں نے تو دیکھئے جو کہا تھا وہ پورا کر دیا۔ ہم بنکر آپ کو دھوکا نہیں دیں گے، ٹریننگ ختم ہو گئی ہے، کام کے لئے تیار ہیں اور آپ پورا بھروسہ کر سکتے ہیں کہ جو لوگ ٹریننگ پاکے آئے ہیں وہ کرگھوں کو خراب نہیں کریں گے۔ اب آپ اپنی کہئے، مل کہاں ہے؟" اس نے جواب دیا: "جس دن تم آئیں اسی دن جائے تعمیر پر کچھ گڑبڑ ہو گئی تو سمجھو کہ دوہری مایوسی ہوئی..." آپ سے سچ کہتی ہوں اس بات پر مجھے کچھ غصہ آ گیا اور میں نے ذرا زور سے اس کو جواب دیا: "مایوسی کیسی؟ آپ کہتے ہیں مایوسی؟ مگر سوال یہ ہے کہ آپ نے اس حد تک چیزوں کو اپنے ہاتھ سے کیوں پھسل جانے دیا؟ آپ نے دیوار کو گر جانے دیا۔ آپ تو چیف ہیں نا؟ تو پھر جب وہ تباہ‌کار کنکریٹ میں گڑبڑ کر رہے تھے، اس وقت آپ کہاں تھے؟ جوراخان کے سر میں پستول مار دی گئی تو کیا وہ بھیانک سبق کافی نہیں تھا جو اتنے غافل ہو گئے؟"

"تو ٹھیک کہتی ہے میری ننھی بہن۔ تو جو کچھ کہہ رہی ہے وہ ٹھیک ہے" اناخان جلدی سے کہہ اٹھی۔

"پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ تو خود ہی بہت شرمندہ ہے۔ ویسے وہ بڑا خوددار آدمی ہے اور ضرور لوگوں نے اس

کو بہت کچھ کہا ہوگا۔ اوپر سے میں بھی اسی کو ملامت کرنے لگی۔ بے شک اس سے تکلیف ہوتی ہے مگر ذرا سوچئے بہن اناخان۔ ریل کے اس لمبے سفر میں راستے بھر ہم ان ہی دیواروں کے خواب دیکھتے رہے اور یہاں آکر کیا نظر آیا کہ وہ بیٹھ گئی ہیں... کیا میں یہ کہنے کا حق رکھتی ہوں کہ ایرگاش کی وجہ سے مجھے کتنی تکلیف پہنچی ہے اور میں کتنی شرمندہ ہوں؟"

اناخان مسکرائی۔

"کیا تم نے اس سے یہ سب کسی میٹنگ میں کہا؟"

حاجیہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس بات کا کیا مطلب ہے۔

"نہیں، کسی میٹنگ میں نہیں" لڑکی نے ایک بار پھر نظریں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ "ہم دونوں باغ میں ٹہل رہے تھے تو بس یہ باتیں ہو گئیں۔ ہم دونوں آلو بخارا کے پیڑ کے نیچے کھڑے تھے۔"

اناخان کو یہ گفتگو سن کر بڑا اطمینان ہوا۔ یہ ایک لڑکی کے الفاظ تھے ایک بانکے چھبیلے کے متعلق جو اس سے ملاقات کے لئے بہ عجلت سے مقررہ جگہ پر پہنچا تھا۔ اور اتفاق دیکھئے کہ کسی پھلدار درخت کے نیچے یہ بحث ہو گئی!

اناخان دھیرے دھیرے حاجیہ کے پاس گئی، اس کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے اور پہلے ایک آنکھ پر پیار کیا، پھر دوسری پر۔ اسے حاجیہ کی ندامت اور اس کے غصے پر پیار آ رہا تھا۔

پھر اناخان دیوار پر لگے گھڑیال پر نظر ڈالی۔ ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ "اگر رات بھی ہو گئی ہے تو کیا ہوا، اگر میں نے فوراً ایسا نہیں کیا تو کیا حرج ہے" اس نے سوچا۔ "اس کام کے لئے کبھی بھی نہیں کہا جا سکتا کہ بہت دیر ہو گئی۔"

"اچھی بات ہے" اناخان نے کچھ ایسے روکھے پن سے کہا کہ حاجیہ کو ذرا تعجب ہوا۔

"مجھے معاف کرنا، مجھے فوراً جانا ہے کیونکہ ایک اشد ضرور کام ہے۔"

"لیکن آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا، بہن اناخان..."

"میں تمہیں جواب دوں گی، تمہیں میرا جواب معلوم ہو جائے گا، فکر نہ کرو" اناخان نے مضبوطی سے کہا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی: "تم چاہو تو میرے ساتھ چل سکتی ہو۔ ہم دونوں ساتھ ہی چلیں گے۔"

پھر اس نے پیرافین لیمپ بجھایا اور دونوں باہر سڑک پر نکل آئیں جہاں چاندنی پھیلی تھی۔

دونوں خاموشی کے ساتھ چلتی رہیں۔ حاجیہ نے کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ وہ سوچ رہی تھی کہ اناخان کوئی بہت ضروری کام کرنے جا رہی ہے۔

"اگر وہ سو رہا ہوگا تو میں اسے جگواؤں گی۔ ویسے آج کی رات وہ سکون سے سو بھی نہیں سکتا" اناخان نے سوچا۔ "میں صوفیہ کو بھی جگا دوں گی۔ اور میں اس کی آنکھیں کھول دوں گی کہ اس کے شوہر کی حقیقت کیا ہے اور پھر دیکھیں گے کہ اس کے بعد بھی وہ یفیم کی کتنی عزت کرتی ہے!"

اناخان نے پکا ارادہ کر لیا تھا اور وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ کریموف نے سرگئی لووچ کو گرفتار کر لیا تھا مگر یفیم دانیلووچ نے کیا کیا؟ اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی! اس کی زبان گنگ ہو گئی! کیا اسی کو وہ چوکسی اور خبرداری کہتا تھا؟ اسی سے اس کی مراد تھی کہ لوگ چوکنے رہیں؟ وہ تو سرگئی کو جانتا تھا، اس پر بھروسہ کرتا تھا، اس سے محبت کرتا تھا۔ اور اس نے اس کی ذرا بھی طرفداری نہ کی، اس کی کچھ بھی حمایت نہ کی؟

اگر صوفیہ یا اناخان پر ہی کسی کو شک ہو گیا ہوتا، کوئی جھوٹا الزام لگا دیا جاتا تو کیا ہوتا؟ تب بھی وہ خاموش رہتا؟ ان کی حمایت کرتے بھی اسے شرم آتی؟ کیا اس نے اپنے دوستوں، اپنے پارٹی کے ساتھیوں سے کہا ہوتا: "ہم سے ایک تباہ کار کو پہچاننے میں لاپرواہی ہوئی؟ ہم کافی چوکنے نہیں رہے؟" اور بس!

اور ایرگاش... وہ تو بڑا گرمجوش، بڑا نڈر ہے نا... تو

اس کی ساری محبت اور همت کیا هوئی؟ اناخان نے سنا تھا کہ جیسے هی دیوار گرنے کا پتہ چلا تھا اس نے کہا تھا کہ وہ اس آدمی کی ضمانت لیتا ہے۔ هاں، یہ رویہ اس کا ضرور ایک مرد کا تھا، ایک چیف کا تھا، ایک کمیونسٹ کا تھا! مگر اب وہ لوگوں سے کیا کہے گا؟ جیسے هی اس نے نصرت‌الله کے هاتھ کا لکھا پرچہ دیکھا ویسے هی دم دبا لی۔ اور اسی حالت میں اس نے ایک لڑکی کے سامنے جانے کی همت کی؟! آخر وہ بانکا اپنے کو کیا سمجھتا تھا۔ اس بھولی بھالی لڑکی کو بےوقوف بنانا چاهتا تھا وہ؟

نصرت‌الله کی موت سے اناخان لرز گئی تھی لیکن اس کا یہ پرچہ لکھنا سخت کمینہ‌پن تھا۔

ماماجان نے اناخان کو بتایا تھا کہ جب دوبروخوتوف کو گرفتار کرکے لے جایا جا رہا تھا تو اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ قصوروار نہیں ہے، مدد کے لئے بھی درخواست کی تھی لیکن کریموف نے اسے زور سے ڈانٹ دیا تھا۔ اس کے پاس میلیشیا کے ایک سپاهی کو کھڑا کر دیا تھا اور کوئی اس سے هاتھ ملانے کی بھی جرأت نہ کر سکا۔ اب کم از کم اتنا تو کہا هی جا سکتا تھا کہ ایسا کرنا کتنی سنگدلی کی بات تھی، کیسی انسانیت سے گری هوئی حرکت تھی۔ اناخان ایک ایماندار محنت‌کش کو، ایک محبت بھرے دل کو یوں کھلونا نہ بننے دے گی، وہ اسے قربانی کا بکرا نہ بننے دے گی۔ اناخان اپنا فرض ادا کرکے رہے گی۔

سڑک سے هی اس نے دیکھ لیا کہ یفیم کے یہاں بھی سب جاگ رہے هیں۔ وہ لوگ چائے پی رہے تھے۔ صوفیہ اپنی بچی کو گود میں لئے تھی؛ اس کی بچی خوب موٹی، تازی تھی اور اب اپنی ماں کی گود میں بیٹھ سکتی تھی۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس گھر میں خوب امن چین، خوشحالی ہے... خیر ٹھہرو دوستو، ذرا میں تم سے نبٹ لوں!

"یفیم دانیلووچ، اگر میں آپ کو پہلے سے جانتی نہ هوتی" اناخان کمرے میں داخل هوتے هی بولی۔ "اور اگر آپ میرے صابر کے اور بعد میں میرے اپنے بھی استاد نہ هوتے تو

میں اس وقت آپ سے ملنے کبھی نہ آتی! میری طرف یوں مت دیکھئے... ہاں، میں وہی بات دوہرانے آئی ہوں اور دوہراؤں گی... کیا میں آپ سے پوچھ سکتی ہوں کہ یہ کریموف کون صاحب ہیں؟ اگر یہ چیکا کے کوئی آدمی ہیں تو پھر ان کا پہلا فرض تو یہ ہو جاتا ہے کہ وہ ایماندار لوگوں کی پشت‌پناہی کریں..."

"اور یہ شخص اپنا یہ فرض بےحد عمدگی کے ساتھ انجام دے رہا، آپ یقین مانئے۔ میں ذاتی تجربے کی بنا پر یہ بات کہہ رہا ہوں" اناخان کے پیچھے سے کسی جانی پہچانی آواز نے آہستگی سے کہا۔

اناخان چیخ مار کے مڑی۔ انجینیر دوبروخوتوف شرماکر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوا کمرے کے کونے میں رکھی ہوئی کرسی سے اٹھا اور اس کے پاس آیا۔ ہاں، اناخان سے غلطی نہیں ہوئی تھی۔ وہ سرگئی لووچ ہی تھا دبلا پتلا، زرد مگر خوش اور مسکراتا ہوا۔

اناخان اتنی بوکھلا گئی کہ اس نے سوچا بھی نہیں کیا پوچھ رہی ہے، ایک‌دم بولی:

"سنئے تو، آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"میں ان لوگوں کو بتا رہا ہوں" سرگئی لووچ نے جواب دیا۔ "کہ چیکا کے کارگزاروں نے کتنی جلدی اصلی مجرم کو پکڑ لیا۔ اور جو کچھ مجھے آج دکھایا گیا ہے اسے میں ٹھیک سے سمجھا ہوں تو وہ شخص بےحد عیار، چالاک اور ظالم بدمعاش ہے۔"

"بدنصیبی بس اتنی ہوئی کہ چیکا والوں نے پھر بھی دیر کر دی، جتنی جلد ہم چاہتے تھے کہ وہ پکڑا جائے اتنی جلد نہیں پکڑا جا سکا" یفیم دانیلووچ نے کن‌انکھیوں سے اناخان کو دیکھتے ہوئے، مونچھوں میں اپنی شریر مگر مہربان مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے کہا۔

اناخان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ جب اس کی نگاہیں گھبرائی ہوئی حاجیہ پر پڑیں تو اس کا ذہن ایک ہیجانی کیفیت سے سوچنے لگا: اس نے اپنے دوست یفیم دانیلووچ سے

کیا کہا تھا؟ کیا وہ سمجھتا تھا کہ اناخان اس وقت کیوں یہاں آئی ہے؟

دوبروخوتوف نے اناخان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر نرمی سے دبایا۔

اناخان کو صاف نظر آیا کہ دوبروخوتوف فوراً اس کے جذبات کو سمجھ گیا اور آخر وہ سمجھ کیوں نہ جاتا، بچہ تو نہیں تھا۔

"شکریہ" دوبروخوتوف نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کا شکریہ۔ آپ جانتی ہیں کس بات کے لئے؟ محبت بھری پناہ کے لئے اور میں کہوں گا کہ ڈھارس کے لئے جو آپ نے تنہائی کے ستائے ہوئے ایک آدمی — ایک ناکامیاب، مایوس انسان کو، ایک روسی امیر کی ناجائز اولاد کو بخشی۔ اپنی جسارت کی معافی چاہتا ہوں لیکن ہمارے یہاں قاعدہ ہے کہ ہم جس عورت کا انتہائی احترام کرتے ہیں، جسے باوقار و آبرودار مانتے ہیں اس کے ہاتھ کا بوسہ لیتے ہیں۔ میں آپ کو ہاتھ لگانے کی گستاخی نہ کروں گا۔ البتہ اپنے تصور میں آپ کے ہاتھوں کا بوسہ لیتا ہوں، کامریڈ اناخان... کیونکہ آپ... کیونکہ آپ... کیسے کہوں، الفاظ نہیں ملتے..."

"کیونکہ یہ بڑی نیک خاتون ہیں!" یفیم دانیلووچ نے جملہ پورا کیا۔

بالکل بالکل... بالکل یہی بات!"

"آؤ آنیا، چائے پیو" یفیم دانیلووچ نے کہا۔ "حاجیہ، تم بھی بیٹھو نا، ہمارے ساتھ چائے پیو۔ آؤ آنیا، تم پیوگی تو شاید انجینیر کو بھی تمہاری طرح چائے پینے کی ہمت ہو۔ ورنہ یہ بےچارہ میزبان کی شکر کی خیر منا رہا ہے کہ سب ختم ہو جائے گی۔ یہ ڈرتا ہے کہ کھا پی کے ہمارا دیوالہ نکال دے گا۔ ویسے میں سوچ تو خود بھی یہی رہا تھا کہ اگر اس نے کھانا پینا شروع کر دیا تو واقعی دیوالہ نکال دے گا۔ دیکھو نا، بےچارہ کتنا دبلا پتلا ہے۔"

اناخان دوبروتوف کی طرف دیکھے بغیر میز کے پاس بیٹھ

گئی اور حاجیہ کو بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔ تب انجینیر بھی شرماتا ہوا اٹھا اور کسی اسکولی بچے کی طرح دبا، سہما، میز کے پاس جاکر اناخان کے سامنے بیٹھ گیا۔

"بڑی دیر ہو گئی ہے صوفیہ، اور تم نے بچی کو ابھی تک نہیں سلایا" اناخان نے کہا اور پھر یہ محسوس کرکے جھینپ گئی کہ اس کی اپنی آواز ابھی تک کپکپا رہی تھی۔

"اب روز روز ایسی اچھی خبریں کہاں ملتی ہیں، میری جان" صوفیہ نے چائے کا ایک پیالہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

جب سب لوگ چائے پینے لگے تب دوبروخوتوف نے اناخان کو بتایا کہ کس طرح کریموف اس کو لے کر چیکا پہنچا اور اپنے آفس کا دروازہ اندر سے بند کرتے ہی اس نے دوبروخوتوف سے پوچھ گچھ کرنے کے بجائے اس کو ایک دم گلے لگا لیا، بالکل اسی طرح جیسے ایرگاش اور یفیم دانیلووچ اسے گلے لگایا کرتے تھے، پھر کہنے لگا: "میں آپ کو ایک چیز دکھاتا ہوں، پھر آپ کو یہ جتنا صدمہ پہنچا ہے یہ غائب ہو جائے گا!" پھر دونوں انتظار کرتے رہے، دیر تک انتظار، یہاں تک کہ دونوں نے مل کر سگریٹ کا ایک پورا پیکٹ پھونک ڈالا۔ آخر انہیں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کریموف دروازے کی طرف لپکا، ایک آدمی جس کا رنگ کوئلے کی طرح سیاہ تھا، اندر لایا گیا، دنیا کا کوئی ماہر اجسام سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ آدمی یورپین ہے۔ اس جلوس کے آخر میں ایک لمبا، نوعمر روسی لڑکا تھا جو بے حد خوش اور بڑے ترنگ میں تھا۔ وہ پرنجے پہنے تھا۔

"آداب بجا لاتا ہوں" کریموف بولا۔ "خوش آمدید، آخرکار ہماری ملاقات ہو ہی گئی، جنٹلمین" سیاہ چہرے والے آدمی نے مشرقی آداب کے مطابق جھکتے ہوئے جواب دیا: "معاف کیجئے گا چیکا صاحب، میں ایک افغان ہوں، میرا نام محمد سعید ہے۔ اور میں چائے کی تجارت کرتا ہوں..." روسی نوعمر لڑکے نے ایک جھٹکے کے ساتھ پرنجے اپنے کندھوں سے اتار پھینکا اور کریموف کے ہاتھ پر ریشمی گوٹ کا ایک ٹکڑا رکھ دیا جو کسی

لبادے پر سے ادھیڑی گئی تھی۔ جھوٹ موٹ کے افغان کے جسم پر جو لبادہ تھا اس پر گوٹ نہیں ٹکی تھی البتہ کالر کے کنارے کنارے دھاگے، ادھڑے ادھڑے سے نکلے ہوئے تھے۔ نوعمر لڑکا بولا: "اس نے اس ٹکڑے کو دانت کاٹنے اور پھر کھا جانے کی کوشش کی تھی، میں نے زبردستی باز رکھا..." کریموف نے کوٹ کی سیون کو ٹٹولا۔ "اوھو، اس میں تو زھر کی شیشی معلوم ھوتی ھے۔ یہ... یہ پروسک ایسڈ... یہ زھریلی دوا آپ کس لئے رکھے ھوئے تھے، جناب چائے کے تاجر صاحب؟"

"میں نے تو یہ لبادہ مشھد میں ایک درویش سے خریدا تھا۔ خدا جانے اسے کس نے بنایا تھا اور کس کے لئے بنایا تھا۔"

"ٹھیک ھے!.." کریموف نے کہا اور پھر اشارہ کیا تو آپ جانتی ھیں کمرے میں کون لایا گیا؟ پہلے تو مقسوم — وھی جو مل کی تعمیر پر مزدوری کرتا تھا۔ وہ اتنا کانپ رھا تھا کہ اس کے نیچے فرش کی لکڑی بھی کانپ رھی تھی۔ اور پھر لایا گیا ٹیچر نعیمی۔

بعد میں کریموف نے دوبروخوتوف کو بتایا کہ نعیمی بڑا بدمعاش نکلا۔ اس نے کئی لوگوں کو بدنام کیا اور ان کے متعلق افواھیں اڑائیں مگر چائے کے تاجر کے ساتھ غداری نہیں کی۔ چائے کے تاجر نے خود ھی اپنا معاملہ بگاڑ لیا۔

جب اس نے نعیمی کو دیکھا تو پاگل کتے کی طرح اس پر جھپٹا جیسے اس کا گلا دبوچ لے گا، ایک بار پھر روسی لڑکے نے زبردستی اسے ایسا کرنے سے باز رکھا...

اناخان بیچ میں بولے بغیر یہ باتیں سن رھی تھی اور انجینیر یہ باتیں کچھ اس انداز سے کہہ رھا تھا جیسے وہ صرف اسی سے مخاطب ھو، جیسے چائے کی میز پر کوئی اور شخص موجود ھی نہ ھو۔ اناخان نے اپنے دل میں کچھ عجیب ناقابل فہم سا درد محسوس کیا۔

حاجیہ جو بڑے غور سے اناخان کو دیکھ رھی تھی، اب چائے کے پیالے کو تکنے لگی۔ اب اس لڑکی کی سمجھ میں کچھ کچھ آ رھا تھا کہ یہ سب قصہ کیا ھے۔

"کریموف نے تو میری اتنی عزت کی" دوبروخوتوف بولا۔ "ایسا لگتا تھا میں نے ہی دشمن کو تلاش کیا اور اس کی قلعی کھولی ہے جیسے میری گھبراہٹ اور میری قابل رحم مایوسی میں بھی کچھ ہوشیاری تھی۔"

"یہ تو کریموف کا نقطۂنظر ہے" یفیم دانیلووچ بیچ میں بول اٹھا۔ "لیکن اگر ذرا وسیع تر پس منظر میں دیکھا جائے تو ایمانداری کی بات یہ ہے کہ یفیم ندیژدین کو ان تمام واقعات کے لئے سب سے زیادہ قصوروار ٹھہرایا جانا چاہئے، جوراخان کو مجھے کمیسار نہ کہنا چاہئے تھا کیونکہ میں اس کے لائق نہیں تھا کہ یہ عزت مجھے بخشی جاتی۔ ہم نے سیاسی کام کی طرف سے لاپرواہی برتی اور اسے بشارت اور اس کے دیواری اخبار اور عبدالصمد اور اس کے کومسومولوں کے حوالے کر دیا۔ وہ لوگ تو جو کچھ کر سکتے ہیں وہ اپنے بھر کر ہی رہے ہیں اور ان سے اس سے زیادہ کی توقع نہیں کی جا سکتی لیکن ہم جو ان سے عمر اور تجربے میں بڑے تھے وہ، یہ تو میں نہیں کہوں گا کہ بالکل لاپرواہ ہو گئے مگر ہاں مطمئن ضرور ہو گئے۔ ہمارا کہنا یہ تھا کہ ہمارے پاس وقت نہیں، ہم نے اکیلے کام کیا۔ جہاں کام میں باہمی تال میل نہ ہو، جہاں ایک ایماندار آدمی کو طعنے دئے جائیں، چھیڑا جائے، اسے کسی روسی امیر کی اولاد کہا جائے چاہے وہ پیار سے، بغیر کدورت کے جہالت ہی سے جو ہمارے ضمیر میں بار کی حیثیت رکھتی ہے، کہا جائے۔ جہاں ایسی "چھوٹی چھوٹی باتوں" کو ٹال دیا جائے، ان پر دھیان نہ دیا جائے، وہاں دشمن کو تو اپنی سی کرنے کا موقع ملے گا ہی۔"

اناخان نے ایک اضطرابی کیفیت کے ساتھ مٹھیاں بھینچ لیں۔

"یفیم دانیلووچ، آپ شاید یقین نہ کریں مگر بالکل یہی بات میں آپ سے کہنےوالی تھی۔"

"کتنے افسوس کی بات ہے کہ کامریڈ ایرگاش اس وقت ہمارے ساتھ نہیں ہیں" دوبروخوتوف نے بڑی گرمجوشی سے کہا۔

"وہ اب ہمارے یہاں اپنی شکل نہیں دکھاتا" صوفیہ نے

کہا۔ "آپ کو تو یفیم چائے پلا رہے ہیں لیکن ایرگاش اگر آ جاتا تو اس کو تو ایک ڈانٹ ہی پلاتے۔"

حاجیہ ان الفاظ پر چونک پڑی مگر اس کا چونکنا صرف اناخان نے دیکھا۔

اناخان کا جی چاہا اس لڑکی کو گلے سے لگا لے اور اس سے کہے: "جاؤ۔ ایرگاش کو کچھ محبت، کچھ نرمی کی ضرورت ہے۔ اس کی اداسی دور کرو، اسے اس وقت تمہاری ہمدردی کی اشد ضرورت ہے۔"

مگر اناخان نے اپنے آپ کو روک لیا اور سوچا کہ اس وقت حاجیہ خود ہی جو کچھ فیصلہ کرے گی وہ درجن بھر ناصحوں کے مشوروں سے بہتر ہوگا۔
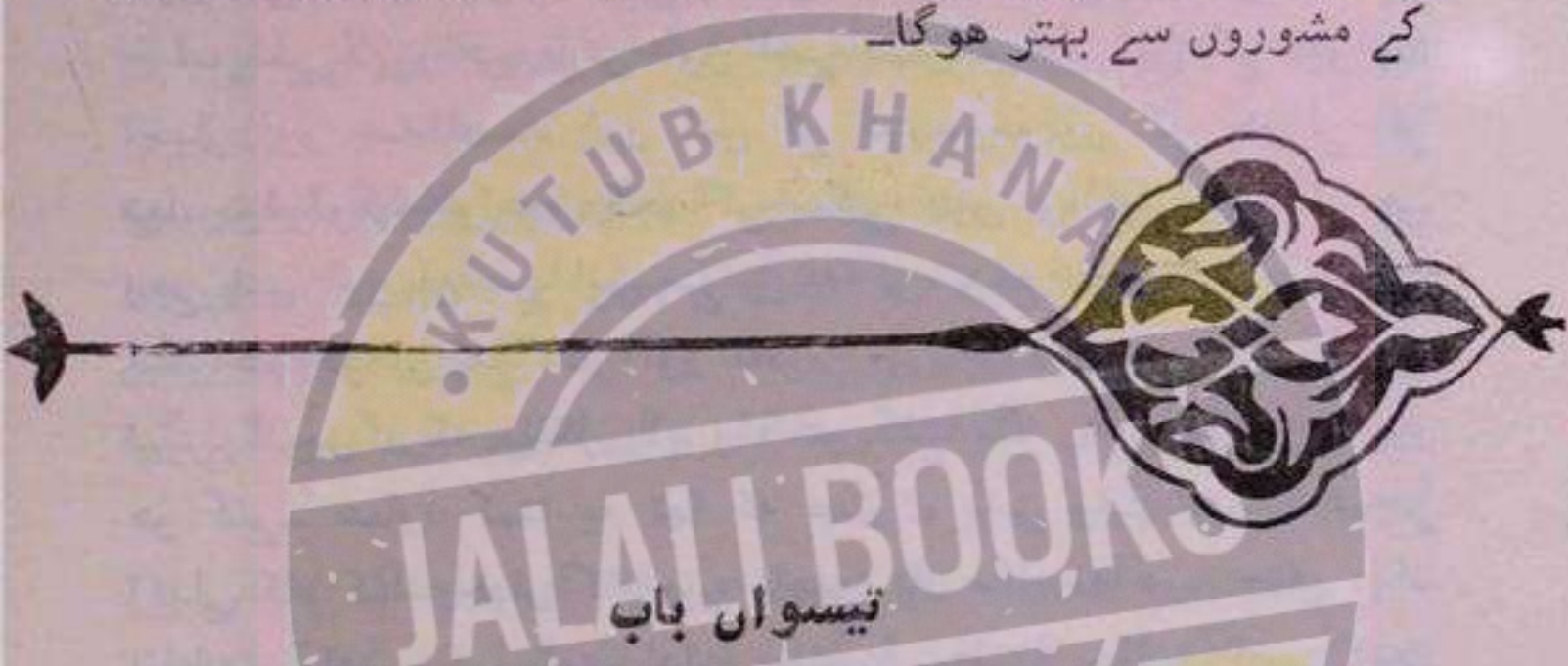
تیسواں باب

اس سال موسم‌خزاں میں کافی سردی تھی۔ ہوا اپنی سانسوں میں جاڑے کا دم بھرتی تھی۔ پیڑوں نے اپنی پتیاں کب کی گرا دی تھیں اور ابرآلود آسمان دن کو سرد بوچھاروں یا برف‌باری کی دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی سورج نکلتا تھا تو تعمیر کرنے‌والوں کو ٹخنوں ٹخنوں کیچڑ میں کھڑے رہ‌کر کام کرنا ہوتا تھا۔ رات کو ان کو یہ ڈر رہتا تھا کہ پالا جم جائے گا، پانی کے نلوں میں یخ بیٹھ جائے گی۔

اب جائے تعمیر پر چوبیسوں گھنٹے کام ہوتا تھا اور دن کو جتنے آدمی کام کرتے تھے اتنے ہی رات کو بھی کام کرتے۔

"پارٹی سیل نے کہا ہے" ماماجان کنکریٹ‌والی اپنی ٹیم کو سمجھاتا، "ہم بہت جلد اس زخم کو بھر لیں گے، ہم دشمن کو شکست دے‌کے رہیں گے۔" پھر اپنی داڑھی میں مسکراکر

بولا: "یہ جو رات کی شفٹ شروع کی گئی ہے نا یہ ان لوگوں کے لئے ہے جنہیں اپنے کام سے عشق ہے۔"

ماماجان نے آخرکار اپنی منزل پا لی تھی اور ہوائی جہاز میں بیٹھ گیا تھا لیکن جائے تعمیر پر جوش و خروش کی فضا ایسی نہ تھی کہ اسے بہترین تصور کیا جاتا۔ اس تخریب‌کاری کا اثر صرف کنکریٹ پر ہی نہیں پڑا تھا بلکہ "خاشار" کے بعد جو جوش لوگوں میں پیدا ہوا تھا وہ پھر سے حاصل کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ ایسا لگتا تھا کہ شہری حکام نے پروجیکٹ سے متعلق اپنے رویے میں بھی کچھ تبدیلی کر دی تھی۔ پہلے جو کام ایرگاش کے ایک ٹیلیفون سے ہو جاتا تھا، اس کے لئے اب دوہری بھاگ دوڑ کرنی پڑتی تھی۔

ایرگاش پر ایک عجیب اضطرابی کیفیت طاری رہتی تھی اور وہ ہر وقت بڑبڑاتا رہتا۔ اس کے آفس میں صبح تک لیمپ جلتا رہتا اور سگریٹ کا دھواں کہرے کی طرح کمرے میں بھرا رہتا۔ ایرگاش کے موسم کی سختیاں جھیلے ہوئے چہرے پر چھوٹی سی خشخشی لہردار داڑھی بڑھ آئی تھی، کچھ ویسی جیسی جپسی لوگوں کی ہوتی ہے۔ صورت سے اس کی عمر زیادہ لگنے لگی تھی لیکن وہ پہلے سے زیادہ مستقل‌مزاج ہو گیا تھا۔ زیادہ سختی سے مختلف کاموں کی نگرانی کرتا، نہ کسی کو بخشتا، نہ کسی کو چین سے بیٹھنے دیتا۔

اکثر ٹیلیفون پر کچھ اس قسم کی گفتگو ہوا کرتی:

"سنو، میرے پیارے کامریڈ، یہ آدھی رات کو مجھے سوتے سے اٹھا دینے کا حق تمہیں کیسے حاصل ہو گیا ہے؟ یہ تیسری رات تم نے ایسا کیا ہے۔ میں نے تو اکسچینج سے کہہ دیا ہے کہ رات کو میرا نمبر تم سے نہ ملایا جائے لیکن معلوم ہوتا ہے تم نے آپریٹروں کے ساتھ سازش کر لی ہے، یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ یہ تو تمہاری شرارت ہے اور کچھ نہیں!.. نہیں، میں نے کہہ دیا نا کہ میں تمہارے لئے مزدوروں کا انتظام نہیں کر سکتا، سمجھے؟ اب بہت جلدی مجھے خود ہی برف پالے سے نبٹنا ہوگا! اگر تم نے میرا پیچھا نہ چھوڑا تو میں شہری پارٹی کمیٹی بیورو میں تمہاری شکایت کر دوں گا۔"

"بیورو میں کیوں شکایت کریں آپ" ایرگاش جواب دیتا۔ "یہیں آکر میرا گلا کاٹ دیجئے نا، اگر آپ ایسا کریں تو زیادہ بہتر رہے گا۔"

"گلا تو اپنا تم نے خود ہی کاٹ لیا۔ اب اپنا کیا دوسروں کے سر مت تھوپو!"

"میں کسی کے سر کچھ نہیں تھوپ رہا ہوں لیکن جب تک یہ جدوجہد جاری ہے میں آپ کو سونے نہیں دوں گا۔ میں لگی لپٹی نہیں رکھتا، صاف صاف آپ سے کہہ رہا ہوں۔ اچھا تو پھر ہم دونوں کا کس بات پر اتفاق ہوا؟ مجھے پانچ آدمیوں کی فوراً ضرورت ہے۔"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ میں رسیور رکھ رہا ہوں۔"

"اچھا ذرا رکھ کے دیکھئے رسیور، پھر میں بڑے شوق سے سننے کو تیار رہوں گا کہ آپ جیسا عقلمند آدمی بھلا سٹی پارٹی کمیٹی بیورو میں کہتا کیا ہے، دیکھتے ہیں۔"

ایرگاش اپنے ماتحتوں کو بھی چین نہیں لینے دیتا تھا۔ جن مزدوروں کی اسے ضرورت ہوتی، انہیں اپنے "پڑوسیوں" سے چھین لے جاتا لیکن دوبروخوتوف سے بولا:

"ذرا تحائف کے بھروسے نہ رہئے گا آپ۔ کہے دیتا ہوں، اب ہمیں اور ٹریننگ پائے ہوئے کام کرنے والے کوئی نہیں دینے والا۔ اس لئے جو لوگ آپ کے پاس ہیں، ان ہی سے کام چلائیے۔"

"لوگ تھک گئے ہیں" سرگئی لووچ شکایت کرتا۔ "ان میں سے کئی کے دل سے تو اب تک یہ بات نہیں اتری ہے کہ ان کے ساتھ سخت دھوکا ہوا۔ میں ان کے اس جذبے کو اچھی طرح سمجھتا ہوں، چھے ہفتے کی محنت رائگاں گئی۔ رات کی شفٹ میں بہت کم کام ہوتا ہے..."

"میں کم از کم یہ تو بالکل نہیں سننا چاہتا کہ تم بھی تھک گئے ہو۔ یہ بھلا آرام کرنے کا وقت ہے؟ یہ تو جنگ ہے، جنگ اور جنگ میں بڑبڑانے کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے؟"

ایک دن دوبروخوتوف نے ایرگاش کو رپورٹ دی:

"کیا آپ نورمت کو جانتے ہیں؟ وہ ہر روز بیچ شفٹ میں کام بند کر دیتا ہے۔"

"نورمت؟" ایرگاش پھٹ پڑا۔ "کیا میں نورمت کو جانتا ہوں؟ یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟ اور آپ خود؟ آپ خود کیا کر رہے ہیں؟ کیا آپ تخریب‌کاروں کے پیچھے گھسیٹتے چلے جائیں گے؟ یہ تو صریحاً تخریب‌کاری ہے! میں ابھی ابھی تم دونوں کو ٹھیک کرتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ!"

ایرگاش دھما دھم کرتا دفتر سے نکلا اور کمروں کے سامنےوالے راستے میں یفیم دانیلووچ سے ٹکرا گیا۔

"جلدی کیا ہے؟ کہاں ہے تمہاری تخریب‌کاری؟ ہاں، ہاں، تخریب‌کاروں کو ضرور چابک لگاؤ!" یفیم دانیلووچ گلے لگاتے ہوئے چیخا۔

یفیم دانیلووچ ایک ہفتے سے جائے تعمیر پر نہیں آیا تھا۔ اس لئے اس وقت اس کو دیکھ کر ایرگاش خوشی کے مارے حیران رہ گیا۔ یفیم کو پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے سمرقند بلایا تھا اور ایرگاش کو امید تھی کہ کمیسار جلدی ہی واپس آ جائےگا مگر اسے دیر لگ گئی تھی۔ ادھر ایک ہفتے سے ایرگاش کو اس کے انتظار میں نیند نہیں آتی تھی۔

لیکن یفیم دانیلووچ کا اس نے جس انداز سے خیرمقدم کیا وہ دور دور بھی پرسکون نہیں تھا۔

"اچھا، اچھا، تو ٹھہرئیے وہ آپ یکایک کہاں سے ٹپک پڑے!؟ کس ٹرین سے آئے آپ؟"

"عام ٹرین سے۔"

"کیا وہ لیٹ تھی؟"

"نہیں، بالکل ٹھیک وقت پر آئی، ایک منٹ دیر سے نہیں۔"

"تو اب تک آپ کہاں تھے؟ یہ بات تو میری سمجھ ہی میں نہیں آئی۔ خیر، اچھا جلدی سے بتائیے، ہاں کیا ہوا؟ کیا آپ کو بہت جھاڑ پڑی؟"

"شرطیہ، اس شہر سے کہیں زیادہ، میں تو ابھی تک چکرایا ہوا ہوں مگر وہ لوگ ہمیں زیادہ مدد بھی دینےوالے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہا کہ وہ ہمیں پھر سے ہمارے پیروں پر کھڑا کر دیں گے مگر اس آگاہی کے ساتھ کہ

ہم کوئی اور ٹھوکر نہ کھائیں گے۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ تجربے کار معماروں اور مستریوں کی ایک پوری ٹیم بھیجیں گے۔ کل ۳۰ آدمی ہوں گے۔"

"تیس!" ایرگاش اور دوبروخوتوف دونوں کی آواز ایک ساتھ گونجی!

"ہاں، ہاں، تیس آدمی!" یفیم دانیلووچ نے اپنی بات دوہرائی۔

"لینن گراد کی استیپان خالتورین نامی مل ہماری نگرانی کرنے والی ہے۔ وہ لوگ ہمیں دو ٹرک، ایک کرین دیں گے اور..." اس نے جیب سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور اسے کھولا۔ "لو، اسے پڑھ کر دیکھو، جو جو سامان ملنے والا ہے اس کی پوری فہرست اس میں لکھی ہے..."

ایرگاش اور دوبروخوتوف نے ایک ساتھ وہ کاغذ یفیم دانیلووچ کے ہاتھ سے اچک لیا اور پھر ایک دوسرے سے چھین چھین کر جلدی جلدی پڑھنے لگے۔

"لو بھئی، اب آ گئے تحفے اب کہو" انجینیر بولا۔

آخر ایرگاش نے اس سے وہ کاغذ لیا اور اسے ہوا میں لہرا لہرا کر، خوشی کے مارے چیخا:

"مگر میں یہ پوچھتا ہوں، یفیم دانیلووچ کہ اتنی اچھی خبر کو جیب میں لئے ہوئے آپ اتنی دیر سے کہاں غائب تھے؟ سچ کہا جائے تو آپ کو سخت سزا ملنی چاہئے۔ آخر تھے کہاں آپ؟"

"میں ذرا چائے پی رہا تھا" یفیم دانیلووچ نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"کیا کہا؟"

"میں نے کہا، میں چائے پی رہا تھا ذرا۔"

"تو آپ چائےخانے میں بیٹھے تھے؟ تازہ دم ہو رہے تھے اور..."

"لیکن تمھیں کیسے خیال آیا کہ میں چائےخانے میں تھا۔ میں تو یہاں تازہ دم ہو رہا تھا، یہاں "سرخ گوشہ" میں، کنکریٹ ملانے والی مشین کے پاس، میں مزدوروں سے بات کر رہا تھا، بھئی۔ اور واقعہ تو یہ ہے کہ انھیں بھی یہ خبر بہت

اچھی لگی اور ان کا دل بہت بڑھ گیا۔ تمہاری طرح وہ بھی اچھل کود کرنے لگے اور اپنی مسرت ظاہر کرنے لگے۔ ان کو بھی تو خوشی کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی ہم لوگوں کو۔ تم نے ہمارا شوروغل نہیں سنا؟"

ایرگاش نے اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے خفگی ظاہر کی:
"اچھا، اچھا... ابھی میں آپ کو بتاؤں گا۔"

"تم مجھے کیا بتاؤگے؟" یفیم دانیلووچ نے اس کی بات کاٹی۔ "تم تو بس ہر وقت، "میں" "میں" کیا کرتے ہو۔ چیف، اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو تمہاری طرح اتنا "میں" "میں" نہ کرتا۔ آخر اس کی بنیاد کیا ہے؟ تمہیں اس "میں" کی ضرورت کیوں ہے؟ میری بات سنو دوست، تمہیں کچھ اور زیادہ عوام کے قریب جانا چاہئے ــ ماماجان کے قریب اور اس نورمت کے قریب جسے تم تخریب‌کار کہہ رہے ہو۔ میری تو ایمانداری سے یہی رائے ہے۔ یہ جو تمہاری اضطرابی حالت ہے، یہ جو تمہارے اعصاب پر ہر وقت تناؤ رہتا ہے، یہ تبھی ٹھیک ہوگا۔"

نورمت کا نام سن کر ایرگاش بپھر پڑا۔

"اچھا یہ بات ہے؟ تو مجھے نورمت سے قریب ہونا چاہئے، وہ جو کوکنار کا دیوانہ ہے، بڑا مذہبی بنا پھرتا ہے۔ عوام سے آپ کی مراد نورمت جیسے لوگوں سے ہے؟ عوام سے قریب؟ یہ آپ کی مراد نورمت جیسے لوگوں سے ہے؟ عوام سے قریب؟ یہ خیال میں میں کیا ہوں پھر؟ میں خود عوام ہوں کیونکہ میں بیچوں بیچ عوام میں سے جست بھر کے ابھرا ہوں!"

"جست بھر کے اوپر ابھرے ہو؟" یفیم دانیلووچ نے جس پر ایرگاش کے غصے کا کچھ اثر نہیں ہوا تھا، اطمینان سے پوچھا۔ "اب جست ہی نہ بھرتے رہو چیف، ایسا نہ کرو، تب ہی تمہیں زمین پر اپنے پاؤں مضبوطی سے جمانے کا یقین ہو سکے گا۔"

ایرگاش کو ایک‌دم ہنسی آ گئی۔ اس کا تھکا ہوا چہرہ یوں روشن ہو گیا جیسے کسی تاریک بادل کا سایہ یکایک ہٹ گیا ہو۔

"آپ کا تو میرے اوپر وہی اثر ہوتا ہے جو پھنسی بندوق پر تیل کا" اس نے اپنی لہریا داڑھی کھجاکے کہا۔
"میں آپ سے بحث نہیں کر سکتا۔"
"صاف کہو نا کہ تم یفیم دانیلووچ سے بحث کرنا ہی نہیں چاہتے" سرگئی لووچ نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ "بےباکی سے کام لو نا۔"
"میں اپنی بات ہمیشہ بےباکی سے کہتا ہوں" ایرگاش غرایا۔
"مگر تمہیں اپنی غلطیاں تسلیم کرنی چاہئیں" یفیم دانیلووچ نرمی کے ساتھ اپنی بات پر اصرار کرتے رہے۔ "اور وہ بھی لوگوں کے سامنے، نہ انہیں عوام سے چھپاؤ نہ اپنے آپ سے۔ ایسا کرکے ہم زیادہ کمزور نہیں، زیادہ مضبوط ہوں گے، کم از کم میں تو فوراً ہی یہ راستہ اختیار کرنے والا ہوں۔ کل ہی، عام میٹنگ میں۔"
"میرے لئے بھی یہی سمجھ لیجئے" ایرگاش نے کہا۔ "البتہ یہ جانے رہئے گا کہ نہ تو مجھ سے جھوٹ بولا جائے گا اور نہ ہی میں کوئی چالاکی کروں گا۔ خصوصاً کسی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے چکنی چپڑی باتیں تو بالکل نہ کروں گا۔ جو میں نہیں کرسکتا سو نہیں کر سکتا۔ معاف کیجئے گا، مجھے نہ یہ فن سکھایا گیا ہے اور نہ ہی میں اسے سیکھنے کا شوقین ہوں۔ اور جہاں تک اس بانکے نورمت کا سوال ہے تو آپ یقین رکھئے کہ میں اپنے طریقے پر اس کو ٹھیک کروں گا، مجھ سے تین پانچ کرے گا تو ٹھوکر مارکے نکال دوں گا، کسی اور کو بےوقوف بنائے۔ میں اپنا ٹائم ٹیبل پانچوں وقت کی نماز یا موذن کے اذان کے حساب سے نہیں بنانے والا۔ جائے، موذن سے نوکری مانگے، میرا خزانچی اسے کچھ نہیں دے گا۔"
یفیم دانیلووچ نے بےاعتباری کے ساتھ سر ہلایا۔
"تم کسی آدمی کو محض اس وجہ سے نہیں برطرف کر سکتے کہ وہ مذہبی ہے۔"
"میں کسی کا روحانی مرشد نہیں ہوں۔ میں کسی کو پروجیکٹ سے مفت کی تنخواہ نہیں لینے دوں گا۔"

"افوہ، اب تمہاری بات کیسے کسی کی سمجھ میں آئے" یفیم دانیلووچ نے حیرت سے پوچھا۔ "ایک طرف تو تم ایک ایک مزدور کے لئے جھینکتے ہو، لڑتے ہو، ایک ایک کارکن کو پکڑتے پھرتے ہو اور دوسری طرف ایک آدمی کو نکال باہر کر دینے پر تیار ہو۔"

"دراصل یہ ایک خرابی سے دوسری خرابی پیدا ہونے کا چکر ہے" دوبروخوتوف نے رواروی میں تبصرہ کیا۔

ایرگاش نے اس کو ناراضگی کے ساتھ ترچھی نظروں سے دیکھا مگر یفیم دانیلووچ نے ایرگاش کا کندھا پکڑ لیا، اسے اپنی طرف گھمایا اور فکرمندی کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جھانکا جو نیند کافی نہ ملنے کی وجہ سے سوج گئی تھیں۔

"اے دوست، یہ کیا ہے! تمہاری ناک لٹک رہی ہے اور کانوں سے چاندنی جھانک رہی ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے داڑھی بھی بڑھا رکھی ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ کتنے دن سے حاجیہ سے نہیں ملے ہو؟"

ایرگاش نے تھکن سے کندھے ڈال دئے۔ یفیم دانیلووچ کا خیال درست تھا جب ایرگاش فوج میں تھا تو دریاؤں کے دلدلی کناروں پر رات دن کی جھڑپوں میں حصہ لیتے وقت اسے ایشیائی ملیریا نے آ دبوچا تھا اور وہ بےحد تھک گیا تھا، کمزور ہو گیا تھا اور وہی چیز اس ایک ہفتے میں پھر عود کر آئی تھی جب یفیم غیرحاضر تھا۔ ایرگاش کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور اسی وجہ سے وہ داڑھی نہیں بنا سکتا تھا لیکن وہ اس سب سے بےنیاز بھوت کی طرح کام میں لگا ہوا تھا۔

"کیا یہ بیماری تم کو تھکا رہی ہے؟" یفیم دانیلووچ نے پوچھا۔

"ایرگاش کچھ بدبدایا، سر ہلاکر انکار کیا۔

دوبروخوتوف بولا:

"ان کی بات کا بالکل یقین نہ کیجئے گا۔ ویسے ان میں جھوٹ بولنے کی صلاحیت تو نہیں ہے مگر اس وقت یہ پوری طاقت سے جھوٹ بول رہے ہیں۔"

یفیم دانیلووچ نے ایرگاش کے کندھے پر ایک دھپ دیا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔

"چلو، اب تم سیدھے چل کر بستر پر لیٹو، ہم لوگ تمہارا کام سنبھالیں گے۔"

"ہاں، ہاں" سرگئی لووچ نے کہا۔ "اب جب کہ یفیم دانیلووچ آ گئے ہیں تو تمہیں فکر کی کیا ضرورت ہے۔"

ایرگاش نے کچھ جواب نہیں دیا۔ بس ان سے کچھ آگے بڑھ گیا کیونکہ وہ گھر بالکل نہیں جانا چاہتا تھا، جا ہی نہیں سکتا تھا۔

اس نے وہ کاغذ اپنی لکھنے کی میز پر رکھ دیا جو یفیم دانیلووچ نے اسے دیا تھا۔ ماتھے سے پسینہ پونچھا اور کرسی پر اس طرح ڈھے پڑا کہ کرسی اس کے بوجھ سے چرچرانے لگی۔

یکایک باہر سے کسی نے پکارا اور پھر دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آواز آئی، کوئی بھاگتا ہوا دفتر کی طرف آ رہا تھا، پھر دھڑ سے دفتر کا دروازہ کھلا اور ماماجان نظر آیا۔

وہ سر سے پاؤں تک کیچڑ میں پتا تھا اور جوتے بھی کیچڑ سے بھرے پھچا پھچ کرتے، فرش میں چپکتے جا رہے تھے۔ ہانپتا ہوا وہ کیواڑ کی ٹیک پر رکا اور اس کے منہ سے نکلا:

"پانی!

ایرگاش اچھل کے کھڑا ہو گیا۔

"کیا پانی جم گیا؟"

ماماجان نے دونوں بازو بے بسی کے انداز سے پھیلا دئے، پھر اپنے کینوس کے دستانے اتارے۔ وہ ابھی تک بے تحاشا ہانپ رہا تھا۔

"نہیں، آج تو ایسا کچھ پالا بھی نہیں۔"

"تو پھر کیا ہوا ہے؟"

"پانی چلا گیا ہے، چیف! کنکریٹ ملانے والی مشین نہیں چل رہی ہے۔ ہم لوگ آدھے گھنٹے تک اس میں جان لڑاتے رہے مگر پانی آتا ہی نہیں۔"

"سب پائپ ٹھیک ہیں؟"

"یہی تو بات ہے، پائپوں میں کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔"

"اور کنکریٹ ملانےوالی مشین؟"
"وہ تو گھوڑے کی طرح کام کرتی ہے!"
"یقیم دانیلووچ واٹر ورکس آفیس کو فوراً اطلاع کیجئے" ایرگاش نے جلدی سے کہا اور مڑکر انجینیر کو ڈھونڈنے لگا۔
لیکن انجینیر نے تو دوڑنا شروع بھی کر دیا تھا۔ ایرگاش بھی اس کے پیچھے دوڑا۔
ماماجان اپنے بھاری لانگ بوٹ بھدابھد کرتا ایرگاش کے ساتھ بھاگنے لگا۔
"ان لوگوں نے تو ہمیں بغیر رسی کے باندھ دیا ہے۔ چیف، میں نے ان مزدوروں سے اتنی بحث کی جو کہہ رہے تھے کہ "رات کی شفٹ نہیں ہونی چاہئے" مگر اب دیکھئے وہی ہوا جو وہ لوگ کہہ رہے تھے۔ بیس مزدور آدھے گھنٹے سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ اب میں ان کو کیا منہ دکھاؤں؟ چھوٹا بنوں ان کے سامنے؟ ہائے کیسی ذلت ہوئی ہے!"
جائے تعمیر پر سے غصے سے بھری آوازیں، ٹھنڈی چبھتی ہوا کے تیز جھونکوں کے ساتھ پھیل رہی تھیں۔ کھمبوں پر لٹکتے لیمپ ان جھونکوں سے جھول رہے تھے جو کبھی بالکل بجھ جاتے، کبھی کبھی جلنے لگتے اور مدھم سی سرخ روشنی پھیلاتے۔ ان کے نیچے پرچھائیاں ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں، انسانوں کے سائے حیران، پریشان ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔
کنکریٹ مکسر کے پاس مزدور بیلچے اور ٹھیلے لئے کھڑے تھے۔ اندھیرے میں سے، چندھی روشنی کچھ چہروں کو اجاگر کر رہی تھی جن پر غصہ تھا۔ کچھ دھاری‌دار عبائیں دکھائی دے رہی تھیں جو کمر پر سمیٹ کر کسی ہوئی تھیں۔ کچھ مزدور زور زور سے گالیاں بک رہے تھے، کچھ کوس رہے تھے۔
ایرگاش ٹھیلوں کو پھلانگتا ہوا کنکریٹ ملانےوالی مشین کے پاس پہنچا۔ ایک نوجوان مزدور نے جو مشین کو چلا رہا تھا، اپنی جگہ خالی کی جس پر ایرگاش بیٹھ گیا۔ اس نے پہیے کو گھمایا تو بجری اور ریت اور سوکھی سیمنٹ کنکریٹ‌مکسر کے حلق سے باہر گرنے لگی۔ پانی کی ایک بوند نہیں تھی۔

ایرگاش نے اپنے سر پر ٹنگے لیمپ کو نیچے جھکایا کہ پانی ناپنے کے آلے کو ٹھیک سے دیکھ سکے، پھر ٹنکی میں جھانکا اور اس کی زور زور سے کوسنے کی آواز ٹنکی کے اندر گونجنے لگی۔

"کہاں ہے انجینیر؟"

"وہ پائپوں کا معائنہ کر رہا ہے۔"

پھر کوئی دوڑتا ہوا آیا، اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی اور اس کا لبادہ کمر تک پانی سے تر تھا۔

"پلمبر کی ضرورت ہے! پلمبر کہاں ہے؟ ارے کوئی پلمبر کو تو بلاؤ کہیں سے۔"

ایرگاش اس آدمی کے پیچھے بھاگا، بہت سے کنکریٹ مزدور ایرگاش کے پیچھے دوڑے۔

وہ لوگ وہاں رک گئے جہاں سے پکی سڑک شہر کو جاتی تھی۔ پانی کا ایک بڑا سا گڈھا ان کے سامنے تھا۔ اندھیرے میں انھوں نے دیکھا کہ سرگئی دوبروخوتوف گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑا تھا اور پانی کے خزانے کا لوہے کا ڈھلا ہوا ڈھکن اس کے برابر میں ترچھا کھڑا تھا۔

"ہم لوگوں کو پلمبر کی ضرورت ہے، میرے خیال میں والو ڈھیلے ہو گئے ہیں" انجینیر نے کہا۔

"یفیم دانیلووچ واٹر ورکس آفیس کو فون کرنے گئے ہیں مگر مجھے یقین نہیں کہ اتنی رات گئے وہ انہیں ان کی جگہ سے کھسکا سکیں گے۔"

"ارے اب صبح تک تو ہم لوگوں کو کسی مدد کی امید نہ رکھنی چاہئے" ماماجان غرا کے بولا۔

نوجوان موٹر میکینک آگے بڑھا۔ اس نے لانگ بوٹ اتار لئے تھے اور روئی پڑا دگلا اتار رہا تھا۔

"اچھا۔ ذرا مجھے بتاؤ کیا کرنا ہے؟ میں کوشش کرتا ہوں۔"

وہ پانی میں اترگیا، پاؤں سے خزانے کو ٹٹولا اور پھر اس کے اندر اترنے لگا۔ دوبروخوتوف اور ایرگاش نے اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اس کی مدد کی۔

وہ سینے تک پانی میں اترا تھا کہ چیخا:
"مل گیا، مل گیا، یہ رہا، میں اسے پاؤں سے ٹٹول سکتا ہوں۔ اس میں سے پانی کی تیز دھار نکل رہی ہے جو برف کی طرح سرد ہے!"
"کامریڈ سلطانوف" کسی آواز نے زور سے پکارا۔ "کیا آپ مہربانی کرکے ادھر آئیں گے، میرے پاس۔"
یہ یفیم دانیلووچ کی آواز تھی۔ ایرگاش پانی کے گڈھے سے باہر نکلا۔
"ایسا لگتا ہے کہ آپ بیمار پڑکر ساری ذمےداریوں سے اپنی جان بچانا چاہتے ہیں" یفیم دانیلووچ غصے کے ساتھ بولا۔
"وہ والو جو ہے نا۔ ہم لوگوں کو پلمبر کی فوراً ضرورت ہے۔ وہ لوگ فون پر ملے؟" ایرگاش نے پوچھا۔ اس کے دانت کٹکٹا رہے تھے۔
"ہاں، ہاں! ملے، ابھی آتا ہے پلمبر اور ڈاکٹر بھی۔"
اس کے بعد کیا ہوا یہ ایرگاش کو بس خواب سا یاد تھا۔ اسے کچھ ہوش نہ تھا کہ وہ کس طرح گھر لے جایا گیا، کس نے اسے بستر پر لٹایا۔ وہ سرسامی کیفیت میں هذیاں بک رہا تھا۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ حاجیہ اس کی عیادت کو آئی ہے اور پلنگ کے پاس بیٹھی اس کا ہاتھ تھامے، اس کے جلتے ماتھے پر ٹھنڈی بھیگی پٹیاں رکھ رہی ہے لیکن یہ سب کیا صرف خواب تھا؟
اسے اچھی طرح یاد تھا کہ حاجیہ کی آنکھوں میں جو اس پر جمی ہوئی تھیں تشویش اور ہمدردی تھی۔ اسے یاد تھا کہ اس نے بلند آواز میں بڑے جذبے کے ساتھ سرگوشی کی تھی: "میری جان، میرے محبوب، کاش تم اندازہ کر سکتے کہ میں تمہیں کتنا چاہتی ہوں، تم سب سے زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ ایماندار، سب سے زیادہ خوبصورت آدمی ہو..." اسے یاد تھا کہ حاجیہ نے اسے پیار کیا تھا اور کس طرح اس کے پیار کرتے ہی اس کے کان بجنے لگے تھے جیسے بہت سی بندوقیں ایک ساتھ دغ رہی ہوں۔

لیکن جب اس کی آنکھ کھلی تو جسے اس نے اپنے پاس دیکھا وہ اس کی ماں تھی۔

"کیوں بیٹے، اب طبیعت کچھ ٹھیک لگتی ہے؟ تم پورے دو دن سوتے رہے۔ بھوک لگی ہے؟ میں تمہارے لئے کچھ لاتی ہوں۔"

"دو دن سویا میں؟" ایرگاش نے سوچا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہیں؟ شاید مجھے یہ تو نہیں بتا سکیں گی کہ پانی بالآخر آیا کہ نہیں، وہ کنکریٹ مکسر چلا کہ نہیں؟"

اس نے چاروں طرف دیکھا، پلنگ کے سرہانےوالی میز پر دواؤں کی پڑیاں اور شیشیاں رکھی تھیں۔ ہاں تو ان لوگوں نے آخرکار اسے بیمار بناکر لٹا ہی دیا نا۔ اس نے ان لوگوں کو ایسا کیسے کرنے دیا؟ وہ غافل ہو گیا، چوکنا نہیں رہا وہ۔ اور وہ اپنی چال چل گئے، شیطان کی مار!

اس نے کندھوں پر سے کمبل اتار پھینکا اور ایک جھٹکے کے ساتھ خود کو کچھ اٹھایا مگر دوسرے لمحے پھر تکیوں پر گر پڑا۔ اس کا سر کنکریٹ مکسر کی طرح گھوم رہا تھا اور کنپٹیوں میں ایسی گھوں گھوں ہو رہی تھی جیسے کنکریٹ مکسر کی طرح اس کی کھوپڑی کے اندر بھی بجری بھری ہوئی ہو۔ بڑی دیر تک آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا رہا، سارے جسم میں ایسی دکھن تھی جیسے کسی نے خوب ہی پیٹا ہو۔

اس کی ماں ایک بڑے پیالے میں شوربہ لےکر آئی اور اس کے پینے سے ایرگاش کے ہونٹوں میں ایک گرمی، نرمی اور تازگی سی آ گئی، حلق اور سینے کو بھی سینک سی محسوس ہوئی۔

"پی لے بیٹا، سب پی لے" ماں نے پیالے کو ٹیڑھا کرتے ہوئے کہا۔ "تو نے ایک ہفتے سے کچھ نہیں کھایا ہے، یہ شوربہ تو حاجیہ تیرے لئے پکاکر رکھ گئی تھی۔"

"یہ کیا بےکار بات ہے۔ ایک ہفتے سے!" ایرگاش نے سوچا۔ "حاجیہ نے کیا پکایا ہے؟ ہمیں تو ایک پلمبر کی ضرورت ہے۔ وہ والو ڈھیلا پڑ گیا ہے نا..."

"میں جاکے ان لوگوں کو بتاتی ہوں کہ تم جاگ پڑے

ہو" اس کی ماں نے کہا اور خالی پیالہ لے کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ ایرگاش نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

پھر بڑی احتیاط سے اپنی ہر حرکت کو ناپ تول کے وہ چپ‌چاپ بستر پر سے اٹھا اور کپڑے پہنے۔ اب کے چکر نہیں آیا بس ایسا لگتا تھا کہ کنپٹیوں کو ہوا کے جھونکے چھو رہے ہیں اور اس کی پیٹھ پسینے سے تر ہو گئی تھی۔

باہر خنکی تھی۔ دھوپ چھتوں پر آڑی جھکی ہوئی تھی اور اس خنکی سے کچھ قوت سی محسوس ہوتی تھی۔ ایرگاش سیدھا کھڑا ہوا تو اسے ایک جھرجھری سی آئی۔

"ہونہہ، سب نے مل‌کر یہی سوچ لیا کہ مجھے بستر میں لٹاکے رکھیں گے، بڑے آئے، دیکھو تو کیسا ان کو دکھاتا ہوں!"

تھوڑی دور، بس ماماجان کے گھر تک گیا تھا کہ کلہاڑی چلنے کی آہٹ آئی۔ اس کا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟

اس نے بڑی کوشش سے پھاٹک کو آدھا کھولا اور صحن میں جھانک‌کر دیکھا۔

"اخاہ، بھائی ماماجان، تم ہو! کیا کر رہے ہو؟"

کمر میں ایک رسی باندھے، سر سے پاؤں تک قلعی چونے میں پتا ہوا ماماجان، برآمدے کی سیڑھیوں کو ایک کلہاڑی سے برابر کر رہا تھا۔ وہ کلہاڑی زمین پر پھینک‌کر ایرگاش کی طرف بڑھا۔

"کہئے چیف، سلام۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ آپ کا چہرہ بڑا زرد لگ رہا ہے..."

ایرگاش نے اس کی بات کاٹ دی:

"میں تم سے پوچھتا ہوں تم آج کام پر کیوں نہیں گئے؟"

"میں رات کی شفٹ سے ابھی آیا ہوں۔"

"اور تم اپنے گھر پر سفیدی کر رہے ہو۔ یہ تو مجھے بھی نظر آ سکتا ہے۔ مگر شفٹ کیا ختم ہو گئی؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ چیف بیمار پڑ جائے تو تم ٹہلتے پھرو۔ ایں؟ کیا تم بھی بانکے نورمت کے نقش‌قدم پر چلنا چاہتے ہو؟ تم... تم جو کہ ایک ٹیم کے لیڈر ہو!"

ماماجان نے کھسیاہٹ اور گھبراہٹ کے مارے نظریں زمین پر گاڑ دیں۔

"مین نے تو بس ایک ھی گھنٹے کی چھٹی لی ھے، چیف۔ اس دوران موٹر میکینک کو انچارج بنا آیا ھوں اور وہ اچھی طرح کام سنبھال لے گا۔ ھاں، یہ واقعہ ھے اور کسی کو میری کمی بھی نہ محسوس ھوگی کہ میں بس ابھی کے ابھی پہنچ جاؤں گا۔ اس مرمت میں مجھے زیادہ دیر تھوڑی لگے گی۔"

ایرگاش کو غصہ آ گیا اور غصے سے طاقت محسوس ھوئی۔

"اچھا اب میری سمجھ میں بات آئی" اس نے ھانپتے ھوئے کہا۔ "تو تمھارا گھر اور گھریلو معاملات تمھارے لئے کام سے اور مل سے زیادہ اھمیت رکھتے ھیں؟ تم اپنے گھر اور سامان کی صفائی پتائی کرتے رھو اور تمھیں کیا پڑی ھے کہ مل بنے کہ نہ بنے۔"

"بس مین چل ھی پڑا سمجھو، چیف" ماماجان شرمندگی کے ساتھ کمر کی رسی کھولتے ھوئے بولا۔ "ویسے اگر تم سچ بات سننا چاھتے ھو تو وہ یہ ھے کہ میرا دل بہت رنجیدہ ھے۔ آخر میں کس لحاظ سے بانکے نورمت یا چائےخانےوالے سے کم ھوں؟ تم خود ھی فیصلہ کرو۔ دیکھو کیا ھو رھا ھے۔ مہمانوں کو بانکے نورمت اور چائےخانےوالے کے یہاں ٹھہرانے کا تو سوچا جا سکتا ھے پر میرے یہاں نہیں۔ کیا یہ انصاف ھے؟ آخر کیوں ان کی اتنی عزت بڑھائی جا رھی ھے اور مجھے کیوں ذلیل کرکے دکھ دیا جا رھا ھے؟ میں مانتا ھوں کہ یہ مہمان دور دراز سے آ رھے ھیں، لوگ کہتے ھیں وہ لینن‌گراد سے آئیں گے۔ ھیں نا؟ اور میں آپ کی آنکھوں میں دیکھ سکتا ھوں کہ میری یہ بات ٹھیک ھے۔ لیکن یفیم دانیلووچ نے جو یہ کہا تو کیوں کہا کہ تمھارا گھر چھوٹا ھے اور پھر تمھارے یہاں بچے ھیں۔ اگر میرے یہاں بچے ھیں تو کیا ھوا؟ اس سے کیا فرق پڑتا ھے؟ دیکھو نا، وہ ادھر ایک سائبان پڑا ھے۔ میں اور میرے بال بچے اس میں جا سکتے ھیں۔ پورا گھر مہمانوں کو دے سکتا ھوں۔ آؤ، گھر کے اندر آکے دیکھو، میں نے اپنے ھاتھ سے کتنی اچھی سفیدی کی ھے ذرا تم ھی دیکھ‌کے بتاؤ

کیسی ہے۔ میرا گھر چھوٹا ہے تو کیا ہوا، میرے دل میں تو بہت جگہ ہے!"

ایرگاش خاموشی کے ساتھ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا، اس کے پیر کچھ لڑکھڑا سے رہے تھے، دماغ گڑبڑا رہا تھا۔

"اچھا تو وہ لوگ اب آنے ہی والے ہیں؟" اس نے پوچھا اور یکایک اس پر کمزوری کا دورہ سا پڑا۔

"یہی تو ساری مصیبت ہے" ماماجان نے جواب دیا۔ "طے یہ ہوا ہے کہ ان کے ٹھہرنے کو یہیں نعمانچہ میں ہی جگہ دیکھی جائے۔ بہت اچھی بات ہے، ہے نا؟ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے میں بھی اسے ٹھیک مانتا ہوں مگر کسی نے میرے دروازے پر دستک کیوں نہیں دی گویا کہ میں نعمانچہ میں رہتا ہی نہیں ہوں۔ ایں؟ آخر ان لوگوں نے میرا شمار برے لوگوں میں کیوں کیا؟ مجھ میں کیا کمی ہے؟"

ایرگاش چپ رہا۔ ماماجان اس کی خاموشی کو خفگی سمجھا۔

"بس میں ایک منٹ میں کام پر جاتا ہوں چیف، ابھی جاتا ہوں..."

ایرگاش نے اپنے ہاتھ کے ایک کمزور اشارے سے اس کو روکا اور خود کو گرنے سے بچانے کے لئے برآمدے کے ایک کھمبے کا سہارا لیا۔

"بھائی ماماجان، مجھے معاف کر دو" اس نے کہا۔ "مجھے تمہارے اوپر یوں ٹوٹ نہیں پڑنا چاہئے تھا۔ مت جاؤ، اپنا کام پورا کر لو، تمہاری ٹیم ہم لوگوں کو دھوکا نہیں دے گی۔ یہ میں جانتا ہوں۔"

ماماجان پریشان ہوکر اس کے پاس آیا اور اس کا بازو تھام لیا۔

"بھائی ایرگاش، کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

"فکر نہ کرو، مجھے تم پر بھروسہ ہے۔"

ماماجان نے سر ہلایا۔

"ارے، تم تو تپ رہے ہو، بھائی ایرگاش۔ تم بہت جلدی بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔"

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں، تمہاری ٹیم بہت اچھی ہے" ایرگاش نے سرگوشی کی۔ اس کی قوت ختم ہو چکی تھی۔
ماماجان نے سہارا دے کر اسے گھر پہنچایا۔
راستے بھر ایرگاش اپنے خیالات کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتا رہا: "یاد نہیں کہ میں نے اسے سلام کیا تھا کہ نہیں؟" مگر اسے کچھ یاد نہ آیا۔
"بتاؤ ماماجان، تمہارا بڑا بیٹا اسکول جاتا ہے؟" ایرگاش نے بے ربط انداز میں پوچھا۔
ماماجان چونک پڑا، چیف کو کیسے معلوم ہوا کہ اس کا بڑا بیٹا نو برس کا ہو گیا ہے۔
"میں نے سنا ہے کہ وہ تمہارا گود لیا ہوا بیٹا ہے۔ یہ بھی سنا ہے کہ تم اسے اسکول نہیں بھیجنا چاہتے۔"
"ہاں" ماماجان نے شرمندگی سے دوسری طرف منھ کرتے ہوئے تسلیم کیا۔ "ہاں، مگر اس موسم بہار میں تو میں نے اسے اسکول میں داخل کر دیا۔ چیف، سچ کہتا ہوں۔ اور اس نئے اسکول میں کیا ہے۔"
"تم نے بہت اچھا کیا۔ ہاں ہاں، مجھے تم پر اعتبار ہے، میں تمہاری بات کا یقین کرتا ہوں" ایرگاش بڑبڑایا۔
گھر کے اندر سے ایرگاش کی ماں نکل کر ایرگاش کی طرف دوڑی، اس کے پیچھے ایک سروقد لڑکی تھی جس کی چوٹیاں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔
"حاجیہ، میری اپنی حاجیہ" ایرگاش نے بڑی بےبسی کے ساتھ ماماجان کے بازوؤں میں جھولتے ہوئے سوچا۔
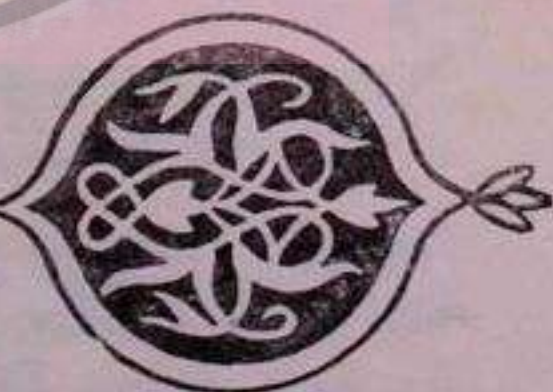
اکتیسواں باب

آج کل گھرداری کا زیادہ‌تر انتظام تورسنائی کے ہاتھ میں تھا۔ بشارت تو بس اپنی نیلی اوپری پوشاک پہن لیتی جو اس

نے "اپنے" پیسے سے خریدی تھی اور صبح ہی صبح گھر سے نکل جاتی، دوپہر کو کھانا کھانے یا اپنی بہن کو حساب سکھانے واپس آتی۔ بشارت کا دماغ حساب میں خوب چلتا تھا۔ تورسنائی اپنی بہن کی تعریف میں کہتی: "وہ تو یوں سوالات نکالتی ہے جیسے سورج‌مکھی بیج ٹھونگ رہی ہو۔" ٹیکنیکل اسکول میں جو لوگ پڑھاتے بھی تھے اور ساتھ ہی کام بھی کرتے تھے وہ اناخان سے کہتے: "یہ ہے تو لڑکی مگر مردوں کی طرح باتوں کو سمجھتی اور ذہن‌نشیں کرتی ہے۔ یہ تو مشینوں کو سمجھتی ہے۔"

ہاں، اناخان کی لڑکیاں بڑی اور سمجھدار ہوتی جا رہی تھیں...

ادھر کچھ عرصے سے بشارت کو خود بھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ بڑی ہو گئی ہے۔ اس کی شرارتیں کم ہو گئی تھیں۔ اپنی صورت شکل اور رکھ رکھاؤ پر بھی وہ زیادہ دھیان دینے لگی تھی اور ایسی باتیں بھی اس کی سمجھ میں آنے لگی تھیں جن کی وہ پہلے کوئی پرواہ نہ کرتی تھی۔ ابھی چند روز ہوئے حاجیہ نے جو پہلے کبھی بشارت سے اپنے راز نہیں بتاتی تھی، بشارت سے کہا تھا: "ایرگاش بیمار ہے اور میرا خیال ہے کہ کومسومول کی سکریٹری کی حیثیت سے تمہیں اس کی عیادت کو جانا چاہئے۔" بشارت اپنی دوست کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ حاجیہ ایرگاش کی تیمارداری کر رہی تھی۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر اسے شرم آتی مگر وہ بار بار ایرگاش کے پاس اکیلی کیسے جاتی۔ ایرگاش اور دوسرے لوگ سوچتے کہ اس کو ایرگاش سے عشق ہو گیا ہے۔ خود ایرگاش کو بھی یہ موقع نہ ملنا چاہئے تھا کہ اس کے دماغ میں ہوا بھر جائے۔ چنانچہ حاجیہ ایرگاش کے یہاں جاتی تو بشارت کومسومول کے سکریٹری کی حیثیت سے اس کے ساتھ ہو لیتی۔

تورسنائی کی مسلسل گاتی ہوئی آواز کو سننا اناخان کی زندگی کی ایک خاص مسرت تھی۔ وہ بچی گھر کا کام کرتے وقت بھی گنگناتی، کھانے کی میز پر نوالہ منہ میں ہوتا اور وہ

بلی کے بچے کی طرح آواز نکالتی گنگناتی رہتی۔ بشارت اور اناخان، دونوں ہی اس کی اس حرکت پر ہنسا کرتی تھیں لیکن تورسنائی کیا کرتی۔ اس نے ایک دم سے بہت سے گیت یاد کر لئے تھے اور سب کو گانے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔

ویسے اطراف میں حالات کچھ پہلے سے خراب ہی تھے۔ بانکے نورمت کی بیوی نزاکت نے پھر پرنجے پہننا شروع کر دیا تھا اور بالکل فطری طور پر لوگ اس کے متعلق بات کرنے لگے تھے۔ یہ واقعہ مل کی دیوار گرنے کے چند ہی دن بعد ہوا تھا لیکن اناخان یفیم دانیلووچ کے ان الفاظ کو تکلیف کے ساتھ یاد کرتے ہوئے اس معاملے سے ذرا الگ ہی رہی کہ "دیکھو بھئی، ہم لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ..." اسے کوآپریٹو میں نزاکت سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا کیونکہ نزاکت اس طرح الگ تھلگ رہتی جیسے وہ کوئی اجنبی یا غیر تھی۔

آخرکار اناخان نے فیصلہ کیا کہ نزاکت کے گھر جاکے اس سے بات کرے گی۔

جھٹپٹا بڑھ گیا تھا اور بانکے نورمت کے صحن میں سفیدے کے پرانے سیاہ پیڑ کی ننگی شاخوں میں ہوا آہیں بھر رہی تھی۔ اناخان نے خاص طور پر یہ دیکھا کہ سارسوں نے اس پیڑ کو چھوڑ دیا ہے۔ ان کے بڑے سے گھونسلے پر کوے قابض ہو گئے تھے جو رات کا بسیرا لینے سے پہلے بھننگ پر چکر کاٹتے ہوئے شور مچا رہے تھے۔

پھاٹک پر اناخان نے لمبی سی عبا پہنے ہوئے کسی شخص کو جھکے کھڑے دیکھا۔ ایک باریک چیں چیں آواز، گھروالے کو احترام کے ساتھ پکار رہی تھی: "نورمت‌الله... اجی ملا نورمت!" صحن سے کسی نے جواب نہیں دیا۔ لگتا تھا گھروالا کہیں گیا ہوا ہے مگر یہ تھا کون جو اسے اتنے احترام کے ساتھ آواز دے رہا تھا۔ اناخان نے غور سے دیکھا تو نیلی مسجد کے امام کو پہچانا اور اس نے سوچا: "سارس کے گھونسلے میں کوے ہیں اور دروازے پر گدھ منڈلا رہا ہے۔" اگر امام اس

وقت نورمت کے دروازے پر دستک دے رہا تھا اور اسے اتنے احترام سے پکار رہا تھا تو ضرور امام کی مالی حالت خراب ہوگی۔

کئی آوازیں دینے پر بھی کوئی جواب نہ ملا تو امام آہستہ آہستہ کچی دیوار کے سہارے سہارے چلنے لگا۔ وہ بوڑھوں کی طرح ڈگمگاتے قدموں سے ایک لمبے موٹھدار سیاہ عصا کو ٹیکتا لمبے عمامے کے نیچے پیٹھ جھکائے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ لیکن اناخان کو معلوم تھا کہ یہ گدھ ضعیفی کا صرف ڈھونگ رچا رہا تھا۔ دراصل امام خاصا ہٹا کٹا اور طاقتور تھا۔ ملتی تو پوری بھیڑ ہضم کر جاتا۔ لوگ کہتے تھے وہ بےحد پیٹو ہے۔

اناخان دستک دئے بغیر اندر صحن میں چلی گئی۔

نزاکت گائے کے لئے سانی ملا رہی تھی۔ اس نے اناخان کو دیکھا تو اپنی شلوار میں اڑسا ہوا قمیض کا دامن نکال لیا اور چڑھی ہوئی آستینیں نیچے کو گرا لیں۔

"اندر آ جائیے بہن اناخان" اس نے دھیرے سے کہا۔ وہ اناخان کی طرف ایک پہلو کئے کھڑی تھی اور نظریں زمین پر جمائے تھی۔

"اس نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ اس کے یہاں میں آؤں گی، اسے میرا آنا اچھا بھی نہیں لگا" اناخان نے سوچا اور اسے نزاکت کی وہ کیفیت یاد آئی جب نورمت نے اسے پیٹا تھا۔

حیرت تھی کہ یہ نوجوان عورت پچھلے چند ماہ میں کس قدر بدل گئی تھی۔ جوراخان کے جنازے پر اور بعد میں کوآپریٹو میں اس کا رویہ بالکل ہی مختلف تھا۔ اناخان کو اس سے ملنا عجیب سا لگ رہا تھا اور اس احساس سے اسے دکھ ہو رہا تھا۔

"میں جاننا چاہوں گی کہ یہ ہمارے قابل فاضل امام صاحب، اللہ ان کے قدموں میں برکت دے، یہاں کیوں تشریف لائے تھے؟.." اناخان نے اپنی آواز میں طنز کی کاٹ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے میرے شوہر کو مغرب کی نماز کے لئے بلانے آئے ہوں گے۔"

"ایسا ہے! تمہارا مطلب ہے کہ وہ ایک ایک کو نماز کے لئے بلانے کے واسطے گھر گھر جاتے ہیں۔ اب یہ تو مجھ سے نہ کہنا کہ وہ نورمت کی انگلی پکڑکر اسے لے جاتے ہیں۔"

نزاکت نے جس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں، تیزی کے ساتھ کن‌انکھیوں سے اناخان کو دیکھا۔

"نہیں، ایسا تو وہ نہیں کرتے۔ ہمارا گھر ان کے راستے میں پڑتا ہے تو ذرا جھانک لیتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے ان کا اور نورمت کا راستہ ایک ہی ہے؟" اناخان نے پوچھا۔

نزاکت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

گائے نے چارہ چبانے میں زور زور کی آواز نکالتے ہوئے گردن موڑکر اپنی مالکہ کو دیکھا۔ نزاکت دھیرے دھیرے گویا بےدلی سے چلتی ہوئی چبوترے تک گئی اور اس پر پڑے گدیلے کی سلوٹیں برابر کیں۔

"آئیے، بیٹھئے۔"

اناخان بیٹھ گئی۔ برآمدے کے رنگے ہوئے ستونوں پر سرخ مرچوں کے گچھے، مکا کے بھٹوں کی گلیاں اور مٹی کی ہنڈیاں لٹکی تھیں۔ ان میں جلد دھی جمانے کے لئے دودھ رکھا تھا۔ صحن صاف ستھرا، جھاڑو دیا ہوا تھا مگر برآمدے کی سیڑھیوں کے اوپر ہی ایک کیل میں ایک نیا سرخ رنگ کا پرنجے لٹکا تھا جس کا لال رنگ بہت ہی اچھا لگ رہا تھا جیسے سجاوٹ کی کوئی چیز ہو! تو نزاکت نے اپنے سنگار کا، اپنی جوانی کی زیبائش کا یہ طریقہ سوچا تھا! جھٹپٹے کی دھند میں اس پرنجے کا رنگ سیاہی مائل لگ رہا تھا۔

"تم میرے ساتھ نہیں بیٹھوگی؟" اناخان نے پوچھا۔ اس کا دل بہت غمگین ہو رہا تھا۔ "کیا تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاھتیں، کیا ہم دونوں کے درمیان گفتگو کے لئے کچھ نہیں رہا؟"

نزاکت نے کوئی جواب دئے بغیر پیرافین لیمپ روشن کیا اور چبوترے کے کنارے پر یوں احتیاط سے آکر بس ٹک گئی گویا چبوترہ اس کے بوجھ سے ٹوٹ جائے گا۔

چراغ کی مدھم روشنی میں صحن جس کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں تھیں، ایک اندھیرے گڈھے کی طرح لگ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ خزاں کی خنکی بھی ان اونچی دیواروں کو پھلانگ کر نہیں آ سکتی لیکن آسمان پر بڑے بڑے چمکتے ستارے کافی نیچے کی طرف جھکے ہوئے لگتے تھے!

اناخان نے نزاکت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔

"مجھ سے سچ کہنا میری بہن۔ کیا تمہیں اس بات پر شرم نہیں آتی کہ مجھ سے کتراتی رہتی ہو اور ہم لوگوں سے اپنے خیالات چھپاتی ہو؟ کیا ہم سب نے جوراخان کے جنازے پر یہ قسم نہیں کھائی تھی کہ ایک دوسرے سے محبت کریں گے، ایک دوسرے کی حفاظت کریں گے، ایک دوسرے پر اعتبار کریں گے؟ یا لوگ جو کہتے ہیں وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ہم عورتوں کی یادداشت بڑی کمزور ہوتی ہے؟ تم میں یہ سردمہری کب سے آئی؟ کیوں آئی، کیوں آئی؟"

نزاکت نے ایک سسکی لی، اپنا منھ دوسری طرف کر لیا اور اپنا ہاتھ چھڑانے لگی مگر اناخان نے نہیں چھوڑا۔

"تم نے تو اپنا پرنجے آگ میں جھونک دیا تھا۔ اسے پیروں سے کچل دیا تھا۔ کیا کسی نے تم پر زبردستی کی تھی کہ تم ایسا کرو؟"

"نہیں" نزاکت نے دھیرے سے کہا۔

"تم نے اپنی مرضی کے خلاف کیا تھا؟"

"نہیں، نہیں!" نزاکت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو پھر تمہیں تھوک کر چاٹنے پر کس نے مجبور کیا؟"

نزاکت چپ رہی۔

"کیا تم چاھوگی کہ دوسری عورتیں بھی ایسا ہی کریں؟ اچھی بات ہے، جوراخان کی یاد کا مذاق اڑاؤ! اس نے تو اپنی زندگی تمہاری خوشی کے لئے قربان کی تھی؟"

نزاکت نے التجا بھری نظروں سے اناخان کی طرف دیکھا جیسے کہنا چاہتی ہو: "مجھے اتنی اذیت نہ دے میری بہن، مجھے معاف کر دے" لیکن دوسرے ہی لمحے میں اس نے سر ہلایا جیسے ڈر گئی ہو اور رک رک کے بولی:

"کسی کا قصور نہیں ہے، میں نے جو کچھ کیا اپنی مرضی سے کیا۔"

اناخان نے نزاکت کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

"تو کیوں مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر رہی ہے بہن؟ میری بہن، دنیا میں تو دو انسانوں کو بےوقوف نہیں بنا سکتی: ماں کو اور ایماندار دوست کو۔ اچھا میری طرف نظر اٹھا، میری آنکھوں میں دیکھ۔"

نزاکت نے آنسوؤں سے تر پلکیں اٹھائیں اور پھر جیسے ٹوٹ کر اناخان سے لپٹ گئی، چاروں طرف دیکھ کر ایک بار لرز اٹھی اور پھر بولی:

"تم نے سنا ہے... وہ... وہ نوریہ والی بات۔"

یہ نام ہر ایک کے لبوں پر تھا اور اس کے ذکر سے لوگ کانپ اٹھتے تھے۔

نوریہ نمنگان کی ایک لڑکی تھی جس نے ارادہ کیا کہ سمرقند جاکر انسٹی ٹیوٹ میں پڑھے اور اس گناہ پر اس کے بھائی حسن الدین نے جسے مذہب کا جنون تھا، اسے گائے کے باڑے میں زندہ دفن کر دیا۔ اس نے چار دن تک بہن کو اذیت دی — پہلے دن اسے کمر تک گاڑا، دوسرے دن سینے تک، تیسرے دن گلے تک اور چوتھے دن مذہب کے اس وفادار معتقد نے اپنی بہن کے خاک دھول سے بھرے، سر پر مٹی کا آخری پھاوڑا انڈیل کر اسے اس جگہ دفن کر دیا جہاں وہ تڑپ تڑپ کر مر گئی۔

حسن الدین کو یقین تھا کہ اس نے جو کچھ کیا وہ درست اور مقدس کام تھا۔ چاروں دن جبکہ اس کی بہن اس گائے کے باڑے میں اس کے ہاتھوں دم توڑ رہی تھی، وہ خود برابر پنجوقتہ نماز ادا کرتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ خدا نے اس کی یہ نمازیں قبول کی ہوں گی۔ رات کو چین کی نیند سوتا اور

خدا کے کسی فرشتے نے اس کی نیند میں کوئی خلل پیدا نہیں کیا۔ ان چار دنوں تک اس نے گائے کو اور کہیں باندھا تاکہ ایک عورت کی کراہ اور آہ سے اس کے دودھ پر اثر نہ پڑے اور اس کے خیال میں اسلام کے لحاظ سے اس کی یہ حرکت بالکل جائز تھی۔ مومنوں کے قانون کے مطابق اس کے خیال میں، اس حرکت پر اسے اگلی دنیا میں جنت کی خوش آئند اور مبارک• زندگی اور حوروں کا ایک پورا حرم کا ملنا چاھئے تھا۔

اناخان جانتی تھی کہ نزاکت اپنے شوہر کے ساتھ خوش تھی لیکن کیا نزاکت کے دل میں اندر کہیں یہ خدشہ تھا کہ نورمت کے ذہن میں بھی ایک حسن الدین چھپا بیٹھا ھے؟

اور غالباً نزاکت بھانپ گئی کہ اناخان کیا سوچ رہی تھی کیونکہ وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے دونوں بازو لہرائے۔

"آپ نورمت کے بارے میں کوئی برا خیال دل میں نہ لائیے۔ میرا نورمت ایسا نہیں ھے، میں جانتی ہوں وہ ایسا نہیں ھے۔"

"یہ اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کر رہی ھے" اناخان نے سوچا۔ "بھلا تمھاری اس وکالت کی کیا ضرورت ھے میری بہن۔"

نزاکت نے نظریں جھکا لیں، بےبسی سے بازو گرا لئے۔

"مگر دیکھئے، ایسے موقعوں پر انسان کو خود ہوش نہیں رہتا کہ وہ کر کیا رہا ھے ورنہ تو اپنی بہن پر خود ھی کوئی کس طرح ایسا ظلم ڈھا سکتا ھے؟ جب نوریہ کے بھائی کی عقل ٹھکانے آئی تو اس نے ہزاروں بار توبہ کی اور بےحد پچھتایا اور خون کے آنسو رویا اور پھر پاگل ہو گیا۔ یہاں تک کہ ججوں نے بھی یہی کہا کہ اب اس کو کیا کریں، اس کا تو دماغ ھی چل چکا ھے۔"

"لیکن تم سے یہ بات کس نے کہی؟" اناخان نے روکھےپن سے پوچھا۔ پھر خود ھی اندازہ لگا لیا: "نیلی مسجد کے امام نے؟"

"ھاں، عبدالمجید خواجہ نے خود کہی۔ وہ نورمت کو یہ سب بتا رہے تھے۔ ابھی حال ھی میں وہ نمنگان گئے تھے نا، تو وھاں اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ کے آئے ھیں کہ کس طرح نوریہ کا بھائی چتھڑے لگائے رات دن گلیوں میں مارا مارا پھرتا ھے اور کتنی پریشانی اور تکلیف میں ھے" نزاکت نے ایک بار پھر نظریں اٹھاکر چاروں طرف دیکھا۔ "آپ یقین نہیں کریں گی مگر اب نورمت اپنے آپ سے ڈرتا ھے۔ جب میں نے پرنجے اتارا تو اس نے مجھ سے تو کچھ نہیں کہا مگر جیسے کچھ کھو سا گیا تھا اور اگر خدا کسی کو گناھگار سمجھتا ھے تو پھر اسے تباہ کر دینے کا کوئی راستہ نکال دیتا ھے" اس نے مشکل سے تھوک گھونٹا اور دبی زبان کہنے لگی۔ "ھو سکتا ھے کہ خدا نورمت کو بھی اسی طرح عقل سے محروم کر دے جس طرح اس نے حسن‌الدین کو کر دیا اور پھر نورمت بےسوچے سمجھے مجھے بھی مار ڈالے اور اپنے کو بھی تباہ و برباد کر لے، تو... اس لئے تو میں ھر وقت نورمت کے ایک ایک قدم پر خیر مناتی ھوں اور ھر وقت اس کی نگرانی کیا کرتی ھوں اور آپ ھی بتائیے، اگر میں ھی اس کے دل کو ڈھارس نہ دلاؤں گی تو کون دلائے گا؟ وہ خود ھی اتنا پریشان ھے، بےچارہ خود کو تھکا مارا ھے، سارے سارے دن عبادت کرتا رھتا ھے۔ ملاؤں کی طرح اسے تو اتنی دعائیں کبھی آتی بھی نہیں تھیں..."

اناخان نے اداسی سے نزاکت کو دیکھا۔ یہ عورت اپنے شوھر میں بدترین خرابیوں کے پیدا ھونے پر خائف تھی۔ اسے شبہہ تھا کہ اس کا شوھر کہیں حسن‌الدین نہ ھو جائے مگر پھر بھی وہ اس کی حرکتوں کی طرفداری کئے جا رھی تھی۔ کیا کرتی بےچاری، شوھر سے محبت کرتی تھی۔

"اور ان امام صاحب نے کتنے دنوں سے تمھارے یہاں آنا شروع کیا ھے؟" اناخان نے پوچھا۔

"بس اسی دن سے جس دن جوراخان کا قتل ھوا تھا۔ بس ٹھیک اسی دن سے۔"

"اور تم نہ کبھی میرے پاس آئیں، نہ مجھ سے اپنی پریشانیوں کا ذکر کیا، نہ مجھ سے کوئی صلاح کی۔ کیا اکیلے

اکیلے ان باتوں کو بھگتنا تمہیں زیادہ آسان لگا یا تم ان چیزوں کا ذکر مجھ سے نہیں کرنا چاہتی تھیں؟"

"میں چاہتی تھی کہ آپ کے پاس آؤں۔"

"اس کے معنی یہ ہیں کہ تم خوف‌زدہ تھیں۔ کیا امام تمہیں بھی دھمکاتا رہا ہے؟"

"میں... میں نہیں جانتی..."

"اچھا تو تمہیں جو کچھ معلوم ہو وہ مجھ کو بتاؤ جب تک بتاؤ گی نہیں میں یہاں سے نہ جاؤں گی۔"

اور نزاکت نے اسے بتایا۔

امام عبدالمجید خواجہ کبھی بھی اس خاندان سے بے تکلف نہیں تھا اور نورمت صرف جمعے کی نماز کے لئے محض رسم ادا کرنے جایا کرتا تھا۔ جہاں تک امام کا تعلق تھا نورمت بھی اور لوگوں میں سے ایک تھا اور اگر وہ اس کے سلام کا جواب دے دیتا تھا تو سلام تو اسے بہت سے لوگ کرتے تھے۔

پھر یکایک ایسا ہوا کہ مسجد جاتے ہوئے امام نورمت کے گھر کے سامنے سے گزرتا تو وہ عالم و فاضل بزرگ شخص ایک معمولی آدمی کو جو کسی بھی لحاظ سے دیندار مسلمان نہ تھا، یعنی نورمت کو آواز دینے لگا۔ بلاوجہ ہی اس کی خیریت پوچھنے اور اس کی عزت بڑھانے لگا۔ بانکا نورمت یکایک ملا نورمت‌الله بن گیا۔

"ملا نورمت، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اب بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں" پھاٹک کے پاس نورمت کا انتظار کرتے ہوئے امام نے ذرا غمگین لہجے میں کہا۔ "اکیلے رہنا اب بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں "سفر در پیش را ہم‌سفر بائید" – سودمند بات‌چیت کسی مسلمان کی ضعیفی میں تسکین کا واحد ذریعہ ہوتی ہے۔"

امام کبھی کبھار صحن میں بھی آ جاتا اور اپنے میزبان کے ساتھ ایک دو پیالے چائے بھی پی لیتا۔ امام بہت بے‌تکلف ہوتا گیا اور پھر اس کی گفتگو تو شگفتہ ہوتی ہی تھی۔ بانکے نورمت کو محسوس ہونے لگا کہ میں بھی کچھ ہوں جو اتنا بڑا امام میرے گھر آتا ہے۔ "جب وہ شریعت کا بیان کرنے لگتے ہیں

تو بس میرا تو منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ھے" اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "ان کی یادداشت تو کمال کی ھے، بس ذرا نگاہ جھکاکر داڑھی کو دیکھا اور بولنے لگے جیسے کتاب پڑھ رھے ھیں گویا کہ سب کچھ ان کی داڑھی پر لکھا ھے۔"

ایک دن امام ذرا ناوقت آیا یعنی جمعے کی نماز کے بعد۔ اس سے ایک دن پہلے ھی نورمت کو مل پروجیکٹ میں نوکری دی گئی تھی، نورمت کو اپنا کام اتنا پسند آیا تھا کہ وہ جمعے کی نماز میں جانا ھی بھول گیا۔

امام کے رویے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بات سے پریشان ھے۔ بائیں ھاتھ کو عبا میں چھپائے، دھنے سے اپنی داڑھی سہلاتا، پھاٹک پر ھی نورمت سے بولا:

"کل صبح کی نماز کے بعد ھی مجھے پہلے سے آگاھی ھوئی کہ کوئی مصیبت آنےوالی ھے اور مجھے بالکل سکون نہیں ھے۔ آج بھی وہ آگاھی مجھ پر طاری ھے۔ لگتا ھے کہ کچھ ھو کے رھے گا۔ میں سارے وقت تمہارے متعلق سوچتا رہا ھوں۔"

نورمت نے سینے پر ھاتھ رکھکر اس سے اندر آنے کو کہا اور چبوترے پر لے جاکر بٹھایا، امام آلتی پالتی مار کے بیٹھا، ایک لمبی سی دعا پڑھی اور پھر سنجیدگی سے بولا:

"میرے دوست، سارس جو ھوتا ھے وہ جنت کا ایک پرندہ ھوتا ھے اور یہ محض اتفاق نہیں کہ سارس نے تمہارے آنگن کے اس پیڑ کو اپنے گھونسلے کے لئے منتخب کیا ھے۔ کسی زمانے میں ھزارشیخ نے جو میرے خاندانی پیر تھے، اس پیڑ کی دیکھ بھال کی تھی۔ میں دیکھ رہا ھوں کہ تمہیں اس بات کا علم نہیں ھے۔"

نورمت نے جن نگاھوں سے اس قدیم سیاہ رنگ کے سفیدے کے پیڑ کو دیکھا اور اس کی کیڑوں سے کھائی چھال پر نظر ڈالی ان میں صاف حیرت جھلک رھی تھی۔ یہ تو واقعی بڑے تعجب کی بات تھی، وہ بچپن سے یہاں پلا بڑھا اور اسے کبھی یہ نہ معلوم ھوا کہ یہ پیڑ مقدس تھا۔ واقعی دنیا ایک حیرت گاہ ھے، کیا کیا یہاں ھوتا ھے کہ جو جلد انسان کی سمجھ میں آ نہیں سکتا...

31—2710

پھر امام یکایک جیسے خوف سے ھچک گیا، اس کی بکرے کی سی داڑھی چمڑے میں چھید کرنے کی ستالی کی طرح آگے نکل آئی اور اس نے سفیدے کی پھننگ کی طرف اشارہ کیا۔

"ھائے، ارے یہ میں کیا دیکھ رھا ھوں۔ ذرا غور تو کرو" اس نے اپنے الفاظ کو کھینچتے ھوئے کہا۔ "اچھا تو یہ تھی وہ پیش آگاھی... دیکھا تم نے؟ سارس اپنا گھونسلا چھوڑ کر چلا گیا۔ اس پرندۂ ایمانی نے تمہیں خیرباد کہہ دیا، ملا نورمت۔ یہ تو بڑا برا شگون ھے۔ آہ میرے عزیز دوست، تمھارے گھر پر نو کوئی نحوست منڈلا رھی ھے۔ ایسا ھی ھوتا ھے کہ جہاں گناہ ھوتا ھے سارس وھاں سے اڑ جاتا ھے کیونکہ گناہ کے بعد سزا آنی لازمی ھے۔ اے ملا نورمت، میرا فرض ھے کہ میں تمہیں خبردار کر دوں، سمجھا دوں۔"

نورمت نے گستاخی سے ناک بھوں چڑھائی۔ اس کی آنکھوں میں اس شخص سے خوف اور مخالفت جھلکنے لگی جو اس کے لئے خبر بد لےکر آیا تھا۔ امام بھانپ گیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ نورمت کا خوف تو بڑھے مگر اس کی مخالفت گھٹ جائے۔

وہ جانتا تھا کہ نورمت اور اس کی بیوی نمنگان کے رھنےوالے ھیں اور اگر انسان کے وطن مالوف پر کوئی مصیبت آئے تو وہ اس کے دل کو بہت لگتی ھے۔ امام نے بیان کیا کہ کس طرح ایک نمنگان کے ھی خاندان کو سارس چھوڑ گیا تو اس کے بعد ھی ان لوگوں پر تباھی آ گئی۔ نورمت اور نزاکت سنتے رھے اور ڈر کے مارے ان کے جسم ٹھنڈے پڑ گئے۔ افوہ، یہ سب کچھ نمنگان میں ھوا!

نزاکت اپنے بچپن کے وطن کو بڑے پیار سے اور بےحد یاد کرتی تھی۔ شادی کے بعد سے وہ کبھی میکے نہ جا سکی تھی۔ نورمت گونگا بنا سفیدے کے پیڑ کو تک رھا تھا۔ اس کے تلے کوڑا کرکٹ ڈھیر تھا، گوبر کے اوپلے پڑے تھے اور اب یہ کمبخت... میرا مطلب ھے، اے خدا معاف کرنا... یہ مقدس پیڑ...

امام نے یوں ہی رواروی میں یہ اطلاع بھی دے دی کہ وہ خود بھی نمنگان کا رہنےوالا تھا اور اس بات کی وجہ سے وہ یکایک اپنے سامعین کو بےحد پیارا ہو گیا۔ اس کے علاوہ اور ہوتا بھی کیا! یہ معزز و پاکباز آدمی ان کا ہم‌وطن تھا۔ پھر امام نے بڑی اپنائیت کے ساتھ نورمت اور نزاکت سے ان کے رشتےداروں کی خیر خبر دریافت کی۔ دونوں نے نہایت خوشی کے ساتھ اپنے چچاؤں، چچیوں، داداؤں، دادیوں اور چوتھی نسل تک جتنے بھی افراد ان کو یاد آئے سب کی فہرست پیش کر دی۔ کتنی حیرت کی بات تھی، واقعی یہ دنیا ایک عجائب‌خانہ ہے! کتنی بری بات ہے کہ لوگوں کو نہ اپنے رشتےداروں کا پتہ ٹھکانہ معلوم رہتا ہے، نہ خود رشتےدار یاد رہتے ہیں! اگر امام اس وقت یہ ذکر نہ چھیڑتا تو بھلا انہیں کیا پتہ چلتا کہ نزاکت کی سب سے پیاری خالہ اور امام کی دادی یہ دونوں ایک ہی گاؤں قاراتاغ کی رہنےوالی تھیں اور یہ کہ نورمت کے بھائی کا پوتا، امام کی ساس کے لےپالک بیٹے کا قریبی رشتےدار ہے۔ ہاں، یہ سب دیکھنے کو ذرا گہری نظر چاہئے تھی! عبدالمجید خواجہ نے اپنے اعلا شجرۂ نسب کو بھی نہیں بخشا بلکہ ادھر ادھر کچھ کاٹ چھانٹ کی، کچھ گھٹایا بڑھایا اور آخر میں یہ ثابت ہو گیا کہ وہ تو اپنے میزبان اور اس کی بیوی کا خون کا رشتےدار ہے۔ ظاہر تھا کہ دونوں نے اسے اپنے لئے باعث صد افتخار سمجھا۔

اس جمعے کے بعد سے امام اکثر بانکے نورمت کے یہاں آنے لگا۔ اس جمعے کے بعد سے خوف اور گناہوں کی سزا کا اندیشہ مستقل طور سے گھر پر چھا گیا۔

نورمت نے اپنا لکڑی کا تخت جس پر وہ آنگن میں سوتا تھا، سفیدے کے پیڑ کے پاس سے ہٹاکر دور بچھا لیا۔ راتوں کو وہ بےچین نیند سوتا اور سوتے میں چیخ چیخ اٹھتا۔ اسے خواب میں نظر آتا کہ سفیدے کا پیڑ اس کی گنہگار کھوپڑی پر اڑا اڑا دھم ہو رہا ہے۔ وہ جاگ جاتا اور صبح ہونے تک اس کی عظیم‌الشان ڈالیوں کو تکتا رہتا، اپنے گناہوں پر غور کرتا اور انہیں تولتا رہتا۔ اپنے ہی نہیں اپنی بیوی، اپنے

باپ، اپنے بھائیوں سب کے گناھوں کے متعلق سوچتا رھتا۔۔۔ اور اگر کبھی ایسا ھوتا کہ پرانے وقتوں کی ھوک اٹھتی اور وہ خشخاش کے وزن برابر بھی کوکنار کھا لیتا تو اسے بھیانک خواب دکھائی دیتے کہ قدیم سفیدے نے اپنی گرھیں پڑی شاخیں بڑھاکر اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا ھے۔ اس کا سینہ دبائے دے رھا ھے اور اسے اٹھاکر سیدھا جھنم میں لئے جا رھا ھے۔ آگ کے ایک اتھاہ غار میں جھاں بھت سے شیطان ناچ رھے ھیں، ان کے جسم پر بڑے بڑے سیاہ روئیں ھیں اور آنکھیں لال انگارا ھو رھی ھیں۔۔۔

پھر قاراتاغ سے وہ تباہ‌کن خط آیا۔ اسی گاؤں سے جھاں نزاکت کی خالہ رھتی تھی۔

نورمت سوچ ھی رھا تھا کہ اسے کس کے پاس لے جاکر پڑھوانا چاھئے کہ پھاٹک پر ایک جانی پھچانی آواز سنائی دی: "نورمت‌الله ھو"، امام بڑے وقت سے آیا۔ اسے دیر نھیں ھوئی تھی۔

وہ ایک ھاتھ میں اپنا عصا لئے تھا، دوسرے میں مخسیاں، سھج سھج وہ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا، آلتی پالتی مارکے بیٹھا، عبا کی لمبی آستینیں جلدی جلدی چڑھائیں، ناک چھنکی اور عینک لگائی۔

"آمین!" وہ نورمت اور نزاکت سے مخاطب ھوکر بولا۔ وہ دونوں بڑے احترام سے ھاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑے تھے۔ عینک ان بےچاروں کے لئے انتھائی لیاقت و فضیلت کی نشانی تھی!

خط ایک لال حاشیےوالے چکنے سے کاغذ پر لکھا ھوا تھا اور دعاسلام سے شروع ھوتا تھا۔

امام نے پھلے وہ خط خود پڑھا اور اس کے میزبانوں نے خوشی کی اس لھر کو نھیں دیکھا جو یکایک اس کے چھرے پر آئی۔ پھر ایک‌دم اس نے لمبا منھ بنایا اور اس کی داڑھی ھلنے لگی۔ بیٹھے ھی بیٹھے اس نے اپنا منھ کعبے کی طرف موڑا اور دعا کے لئے ھاتھ اٹھائے:

"اے رحیم و کریم پروردگار" امام نے مایوسانہ انداز میں

کہا۔ "اپنے اس ناچیز بندے کو اپنی رحمت میں پناہ دے، اے فانی انسانو، سجدہ کرو سجدہ کہ ہم سب مجبور بندے ھیں اور اللہ کی رحمت وسیع اور اس کی قدرت بےپناہ ھے!"

نورمت اور نزاکت نے گھبراکر ایک دوسرے کو دیکھا۔ یقیناً ان کے پیارے، خوبصورت، خاموش گاؤں قاراتاغ پر کوئی آفت ٹوٹی تھی جو ایک پہاڑی چشمے کے کنارے اونچی برف سے ڈھکی چوٹیوں کے دامن میں پناہ‌گزیں تھا۔ نورمت کا جی چاھا کہ امام کی طرح وہ بھی دعا کے لئے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے مگر پھر شرما گیا اور ھاتھ نیچے کر لئے۔

"اے مومنو، کیا میں نے اس وقت جب سب خیریت تھی، نہیں کہا تھا کہ یہ دراصل ھمارے گناھوں کی سزا ھے" وہ بڑی خاکساری کے ساتھ بات کر رھا تھا۔ "انسان کہیں بھی جائے، وہ اللہ کے غیض و غضب کی نظروں سے بچ نہیں سکتا۔ آہ اس کی مار بڑے غضب کی ھے!"

"مگر خط میں کیا لکھا ھے میرے باپ؟"

"معزز جناب امام صاحب، ھماری خالہ نے کیا لکھا ھے خط میں؟" نورمت اور نزاکت نے پوچھا۔

امام نے کچھ خاموش ھوکر کہا:

"قاراتاغ میں زلزلہ آ گیا ھے! قاراتاغ اب کہاں، اللہ نے اس کو صفحۂ ھستی سے مٹا دیا ھے۔"

خط نزاکت کے نام تھا اور اس سے کہا گیا تھا کہ چونکہ اس کی بوڑھی خالہ چھت گرنے سے دب کے مرگئی ھے اس لئے وہ آکر مرحومہ کی جائیداد پر قبضہ کرے۔ نورمت اور نزاکت کو یہ نہ معلوم ھو سکا کہ یہ واقعہ زلزلے کی وجہ سے ھوا تھا یا اس وجہ سے کہ ایک غریب کسان کی چھت پرانی ھوکر سڑکر بیٹھ گئی۔ نزاکت نے رونا پیٹنا شروع کر دیا تھا اور برآمدے کے ستون پر اپنا سر دے دے مار رھی تھی۔ نورمت حیران، پریشان اپنی بیوی کو تکے جا رھا تھا۔

اس اثنا میں تقدس مآب امام نے اپنے بےداغ ضمیر کو شرعی تکلیف دیتے ھوئے ان دونوں پر واضح کیا:

"وراثت پر تو ساتویں نسل تک دعوا کیا جا سکتا ھے

لیکن گناہ اور سزا کا سلسلہ تو ستر نسلوں تک چلتا رہتا ہے، ملا نورمت۔ اللہ کی مرضی سے تمہاری ضعیف خالہ کے سامنے زمین پھٹ گئی کیونکہ اس کی ایک رشتےدار نے بہت بڑا گناہ کیا تھا - اپنا چہرہ کھول دیا، نقاب اتار دی اور بےدین ہو گئی۔ ایسا کرکے اس نے اپنے آپ کو تو گناہ‌کار کیا ہی، اپنے سر پر لعنت تو اوڑھی ہی، اپنی عاقبت تو بگاڑی ہی، اپنے سارے رشتےداروں کو بھی اللہ کے غیض و غضب کا شکار بنا دیا۔"

"نہیں! نہیں!" نزاکت بدحواس ہوکر چیختی ہوئی زمین پر ڈھے پڑی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر اور چہرہ چھپاکر بین کرنے لگی۔ "ہائے خالہ، میری بےچاری خالہ، میری دکھیا خالہ..."

امام نے اسے بین پورا کر لینے دیا۔ نورمت کو وہ بین پوری طرح سن لینے دیا، پھر سنجیدگی کے ساتھ اپنی بات ختم کی:

"تمہارا گناہ بھرا گھر چھوڑکر اس ایمانی پرندے نے تمہیں جس بات کا اشارہ دیا تھا وہ پوری ہو رہی ہے! میرے مرشد ہزارشیخ نے اس پیڑ کے نیچے جو پیشین‌گوئی کبھی کی تھی وہ صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ مرشد نے فرمایا تھا: "جلد، بہت ہی جلد اسرافیل اپنا صور پھونکنےوالا ہے اور روز قیامت نمودار ہوگا۔ ہر مومن کو چاہئے اپنی روح کا جائزہ لے اور ایمان کی میزان پر اپنے نیک و بد اعمال کو تولتا رہے"۔ بےشک زلزلہ ابھی تو قاراتاغ میں آیا ہے۔ ہاں، قاراتاغ میں لیکن اس کافرانہ خیال سے اپنے دل کو تسلی نہ دینا کہ قاراتاغ بہت دور ہے۔ اللہ کے نزدیک قاراتاغ سے تمہارے گھر تک بس ایک قدم کا فاصلہ ہے۔" پھر امام نے ایک لمبی پتلی انگلی اٹھائی، ایک نکمے انسان کی انگلی اور ان دونوں کو خبردار کرتے ہوئے کہا: "ہو سکتا ہے کل ہی، ہاں کل ہی، زمین تمہارے نیچے ہلنے لگے اور تمہارے ہی گھر کی دیواریں گرکر تمہیں زندہ دفن کر دیں!"

امام کے یہ الفاظ واقعی ایک سچی پیشین‌گوئی معلوم

ہوتے تھے کیونکہ چند ہی دن بعد جائے تعمیر پر دیوار بیٹھ گئی۔ آخر امام کی فضیلت و علم کی شہرت یوں ہی تو نہیں تھی۔ اجی اس کے منھ سے تو خود ہزارشیخ بولتے تھے... اس کے بعد کسی کو اللہ کی اس مرضی میں کیا شک ہو سکتا تھا جس کے آگے کوئی دم نہیں مار سکتا تھا؟ کیا کوئی مجبور بندہ، کوئی لاعلم، فانی انسان، اللہ کے پیارے عبدالمجید خواجہ کی عقل و فراست پر شک لا سکتا تھا؟

نزاکت نے ایک بار پھر پرنجے استعمال کرنا شروع کر دیا اور اس کا شوہر نعمانچہ کا سب سے زیادہ دیندار باشندہ بن گیا۔

اچھا، تو نیلی مسجد کے امام نے جائے تعمیر پر "زلزلہ" آنے کی پیشین‌گوئی کی تھی۔ اناخان کو تیشیک‌قاپ‌قاق کی اس پہنچی ہوئی عورت کی پیشین‌گوئیاں یاد آئیں۔ وہ بھی تو ہزارشیخ کو ہی اپنا مرشد بتاتی تھی۔ چائے کا تاجر ان سب کا سرغنہ تھا اور نورمت کی خوش‌نصیبی تھی کہ وہ سر کچل گیا تھا لیکن اس کے الجھاوے ابھی باقی اور زندگی کو جکڑے ہوئے تھے۔ نورمت کی بھی قسمت کہیں نصرت‌اللہ کی سی نہ ہو جائے۔ امام اسے اپنے جال میں پھنسانے اور تباہ کر دینے کے لئے کافی چالاک ہے۔ اور صرف اسی کو کیوں...

اناخان نے نزاکت کی طرف جھک کر پوچھا:

"کیا تم نے نورمت کو امام کے گھر جاتے دیکھا ہے یا اس کے ساتھ کہیں اور جاتا ہے؟"

"نہیں" نزاکت دھیرے سے بولی۔ "وہ جاتا تو کہیں نہیں۔ میں اسے نکلنے ہی نہیں دیتی تھی اور ذرا سوچئے، میرے منع کرنے پر وہ بہت برا مانتا تھا لیکن میں نے امام کو ایک آدمی سے رات کو سڑک پر ملتے دیکھا ہے اور وہ آدمی بڑا بدمعاش ہے، بہن اناخان۔ یہ بات تو نورمت بھی کہتا ہے۔ جس دن بائے کے کہنے سے نورمت نے مجھے مارا تھا نا، اس دن وہ اس آدمی سے قدرت‌اللہ خواجہ کے یہاں ملا تھا۔ تم تو اس کو نہیں جانتی ہو میری بہن اور خدا نہ کرے کہ تم اسے کبھی

بھی جانو۔ یہ امام ہمارے پھاٹک پر کھڑا ہوکر اس سے نہ جانے کیا کیا کھسر پھسر کرتا رہتا ہے۔ میں نے کئی بار سنا ہے اس کی زبان پر ہزار بار پھٹکار! اور پھر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ہے کمبخت۔"

اناخان نے جو یہ سنا تو وہ دنگ رہ گئی۔ ایک دم اس نے نزاکت کے شانے پکڑ لئے۔

"وہ آدمی کیا چائے کا تاجر تو نہیں؟"

نزاکت یوں چپ ہو گئی جیسے اس نے اپنی زبان کاٹ لی ہو۔

"تم نے یہ بات چھپائے رکھی!" اناخان غصے سے بولی۔ "تم چائے کے تاجر کو جانتی تھیں اور تم نے مجھے نہیں بتایا۔"

نزاکت خاموش رہی۔ اناخان سمجھ گئی کہ وہ کس سے ڈر رہی ہے۔ ایک دم وہ چبوترے پر سے اٹھی۔ اب وقت ضائع کرنا جرم کرنے کے برابر ہوتا۔

"اچھا، اٹھو۔ فوراً میرے ساتھ چلو!"

نزاکت اس سے لپٹ گئی اور بڑی مضبوطی کے ساتھ بولی:

"بہن اناخان۔ یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔"

"ہاں، ہاں، مشکل تو یہی ہے۔"

"مگر آپ کہاں جانا چاہتی ہیں اس وقت؟ اب تو رات ہو گئی ہے۔"

"نہیں، نہیں، چلو ابھی اسی دم!"

بتیسواں باب

نزاکت نے جلدی جلدی اپنا نیا لال پرنجے پہنا اور کچھ اس طرح کہ جیسے اسے پرنجے پہنتے شرم آ رہی ہو اس نے

جلدی سے چراغ بجھا دیا۔ وہ جلدی جلدی راستے کو تقریباً ٹٹولتی اناخان کے پیچھے دوڑی۔ رات اندھیری تھی، اتنی اندھیری کہ آنکھ بند کرکے چلنا شاید زیادہ ٹھیک رہتا۔ پرنجے سے گزرتی ہوئی خزاں کی ٹھنڈی ہوا اسے لگ رہی تھی مگر وہ ایسی گرمی محسوس کر رہی تھی جیسے بخار چڑھا ہو۔

اناخان آگے آگے چلتی ہوئی کریموف کے دفتر جا رہی تھی جو ریلوے کالونی کے علاقے میں واقع تھا۔ اس نے سب سے کم فاصلےوالا راستہ منتخب کیا تھا اور سڑکوں کو پار کرتی، کچی دیواروں کے موکھوں سے ہوکر چھوٹے چھوٹے صحنوں سے گزرتی چلی جا رہی تھی۔ نزاکت اس بات کا کہ وہ کس علاقے سے گزر رہی تھی، کبھی سڑکوں کی نرم دھول سے اندازہ لگاتی جس میں اس کے ربڑ کے جوتے دھنس جاتے، کبھی اپنے قدموں کے نیچے پیال کی زوردار کھڑکھڑاہٹ سے، کبھی دکھائی نہ دینےوالے باڑوں کی گھاس اور گایوں کی مہک سے اور کبھی گاڑی کے اس بم سے جو یکایک یوں اس کے سر پر آ گیا جیسے کسی نے اس پر ڈنڈا گھمایا ہو...

اناخان اتنی تیز چل رہی تھی جتنی تیز وہ دن میں چل سکتی تھی۔ وہ نعمانچہ کے ایک ایک پیچ و خم کو اپنی ہتھیلی کی لکیروں کی طرح جانتی تھی۔ اسے راستہ بھولنے کا کوئی ڈر نہ تھا۔ ریلوے کالونی کو سب سے چھوٹا راستہ، قبرستان سے ہوکر گزرتا تھا اور اس نے بلا کسی پس و پیش کے اس راستے کا انتخاب کیا۔

نزاکت تو بس اتنا ہی کر سکتی تھی کہ اناخان کے پیچھے پیچھے چلتی رہے۔ اس کی سانس پھول رہی تھی، سارا جسم پسینے سے تر تھا، راستہ دیکھے بغیر وہ دوڑتی جا رہی تھی کہ پیچھے نہ رہ جائے۔ کانٹے اس کے لباس سے الجھ رہے تھے، اس کے پیروں میں چبھ رہے تھے، اوبڑ کھابڑ، روڑے پڑا ہوا راستہ نیچائی پر اترتا تھا جیسے کسی گھاٹی کو جا رہا ہو۔ اندھیرے میں نزاکت کا دماغ خراب ہوا جا رہا تھا۔ دور، ان کے بائیں طرف کو اچانک ایک روشنی اور پھر دوسری روشنی ٹمٹمائی۔

یہ جائے تعمیر کی رات کی شفٹ تھی۔ نزاکت نے ٹھوکر کھائی اور پھر لڑکھڑاکر مٹی کے ایک ڈھیر پر اوندھی ہو گئی۔ یہ کیا تھا؟ اگر خوف نے اس کا گلا نہ دبا لیا ہوتا تو وہ زور کی چیخ مارتی۔ کسی قبر کی مٹی کا ڈھیر! اناخان پاگل تھی... وہ اس کو کہاں لئے جا رہی تھی؟ نزاکت تو دن کی روشنی میں بھی یہاں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے اناخان کی آستین پکڑی اور بہت دھیرے سے سرگوشی کی: "بہن، اے بہن"۔ لیکن اناخان نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور اپنے قدموں کو تیزتر کر دیا، تیز اور تیز۔

چھوٹے چھوٹے کنکر پتھر ان کے قدموں تلے کھڑکھڑا رہے تھے اور نزاکت کو ایسا لگ رہا تھا کہ یہ زندہ جانوروں کی آوازیں ہیں جو چیخ رہے ہیں۔ اب اس نے قدموں کو ذرا اونچا اٹھا اٹھاکر چلنا شروع کر دیا تھا جیسے جست مارنےوالی ہے۔ اندھیرے کے اندر سے برفیلی، سرد ہوا نیچے کی طرف سے آتی ہوئی تیز سیٹیاں بجا رہی تھی۔

پھر راستہ ذرا ہموار ہو گیا اور ان کے سامنے ایک بہت بڑا سا زینےدار سایہ منڈلانے لگا۔ دونوں عورتوں کو تاریکی میں ٹھیک سے دکھائی تو نہ دیا مگر انہوں نے جلد ہی سمجھ لیا کہ یہ ہزار شیخ کے مقبرے کا کونےوالا کھنڈر ہے اور یہ گھوڑے کے بالوں کے گچھے اور پرانے تعویذ ہیں جو چتھڑا ہوکر ہوا میں لٹکے جھوم رہے ہیں۔

نزاکت نے بچوں کی طرح آنکھیں میچ کے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی نقاب اپنے چہرے پر ڈال لی۔

"اے، اے ذرا سنبھلی رہو تم۔ یوں ڈروگی تو مجھے بھی ڈرا دوگی" اناخان نے نزاکت کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔

پل بھر کے لئے دونوں نے رفتار آہستہ کی اور اپنے آگے پتھروں، روڑوں کی کھچر کھچر سنی۔ کیا کوئی چھپکلی تھی؟ نہیں۔ اتنی تیز آہٹ کسی چھپکلی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ نزاکت ڈر کے مارے کانپنے لگی۔ تھرتھراہٹ اناخان کو بھی محسوس

ہوئی۔ مقبرے کے اندر سے ایک پتلا سا سایہ تیزی سے نکلا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا...

یہ انسان تھے اور ایسا لگتا تھا مقبرے سے دوڑتے ہوئے نکل کر ان عورتوں کے راستے میں کولھوں کے بل بیٹھ رہے تھے۔

اناخان رک گئی۔ اس نے نزاکت کو سہارا بھی دیا، آھٹوں پر کان بھی لگایا۔ مقبرے کے نزدیک سایوں کی حرکت بھی رک گئی تھی۔ اناخان سوچنے لگی کہ کہیں یہ صرف اس کا واہمہ تو نہیں تھا اور یہ کہ دراصل ان دونوں کے سامنے کوئی بھی نہ تھا۔

دن کے وقت ہزارشیخ کے مقبرے پر اکثر "درویش" ادھر ادھر سے آکر اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ وہ لوکی کی کمنڈلیں لئے رہتے تھے اور جو لوگ اپنے رشتےداروں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے آتے ان سے خیرات مانگتے۔ پچھلے سال نمنگان سے کوئی آیا تھا جو "ایشان غیب‌داں" کہلاتا تھا۔ اس نے یہاں دیگ چڑھائی تھی – فقیروں، درویشوں اور "الله کے بھولے بھالوں" کے لئے شوربہ پکوایا تھا۔ کیا یہ وہی بدبخت لوگ تھے جو مقبرے کے قریب چھپے ہوئے تھے؟ شاید وہ یہاں رات گزارتے تھے؟

اناخان نے ایک قدم آگے بڑھایا تو فوراً وہ جنگلے کی طرح اس کا راستہ روک‌کر کھڑے ہو گئے اور وہ سمجھ گئی کہ وہ کوئی پرامن زائرین نہیں تھے۔ بہت ممکن تھا کہ اس کا اور نزاکت کا پیچھا کیا گیا ہو اور ان کی بات‌چیت سنی گئی ہو۔

مارے غصے کے اناخان کا ڈر گھٹ کے رہ گیا۔

"کون ہے؟" اس نے اونچی مضبوط آواز میں مطالبہ کیا۔ "کیا چاہتے ہو؟"

مقبرے کی سمت سے نیچی کھوکھلی آواز نے جواب دیا جیسے کہیں زمین کے نیچے سے آ رہی ہو:

"او، بےدین! اس مقدس مقبرے کے سامنے فوراً توبہ کر! ہم تجھے نوریہ کے پاس بھیج دیں گے جو تیری ہی طرح تھی..."

نزاکت نے ایک چیخ ماری اور بڑی بےبسی کے ساتھ

اناخان کے ہاتھ سے پھسل کر اس کے قدموں کے پاس گر پڑی۔

اناخان نے اپنے مخمل کے جیکٹ کا دامن الٹا اور ایک چھوٹی، دھات کی بنی ہوئی چیز کو ٹٹولا جو اندر اس جیب میں رکھی تھی جو خاص اسی کے لئے الٹی طرف سے پیوند کی طرح لگائی گئی تھی۔

"ٹھہرو، ابھی بتاتی ہوں، میں کیسی توبہ کرتی ہوں!" اس نے سوچا اور نزاکت کا کندھا جھنجھوڑا:

"اٹھ بہن، اٹھ!"

نزاکت نے کوئی جواب نہیں دیا، صرف اناخان کی ٹانگوں کو کس کر پکڑ لیا اور اپنا منھ اس کی پنڈلیوں سے رگڑتے ہوئے انہیں اتنی زور سے بھینچا جیسے وہ اناخان کو زمین پر گرا دینا چاہتی ہو۔

ان دونوں کے سامنے جو سائے تھے وہ متحرک ہونے اور عورتوں کی طرف بڑھنے لگے۔

"مرنے سے پہلے توبہ کر لے، لمبے بالوں والی چڑیل" کھوکھلی آواز پھر گونجی۔ "تیری آنکھوں میں خاک بھری جائے گی، تیری رگ رگ کو کیڑے چاٹ کر خشک کر دیں گے۔ تو ایک ایسا کھمبا بنا دی جائے گی جس پر جہنم کے ساتوں طبق ٹکے ہوں گے۔ آمین!"

"آمین!" کئی مردانہ آوازوں نے تاریکی میں دوہرایا۔

نزاکت نے پھر ایک چیخ ماری اور کسی پلے کی طرح پیں پیں کرتی، بدحواس روتی، چلاتی وہ چاروں ہاتھ پاؤں پر، چھپکلی کی طرح اس تیزی سے رینگی کہ اناخان اس کو روک بھی نہ سکی۔

"شریعت کے نام پر" وہ مدھم کھوکھلی آواز پھر گونجی۔ اس بار اس میں حکم دینے کا انداز تھا۔

اناخان نے اپنے قد کو پورا تانا اور زور سے صدا دی۔ اس کی آواز فخر سے تھرتھرا رہی تھی:

"سوویت اقتدار کے نام پر! بدمعاشو، راستے سے ہٹ جاؤ! سنا تم نے؟"

جواب میں ایک بھاری پتھر سنسناتا ہوا اس کی کنپٹی کے پاس سے نکل گیا، پھر ایک پتھر اور، پھر ایک اور...

نزاکت جس کا چہرہ اور ہاتھ بالکل چھل گئے تھے، آخرکار ان کانٹےدار جھاڑیوں سے باہر نکلی اور دوسرے لمحے اس نے اپنے پیچھے گولی چلنے کی آواز سنی۔

"وہ لوگ گولی چلا رہے ہیں۔ انہوں نے اناخان کو مار ڈالا" اس نے سوچا۔

پھر اس کے لبوں سے مایوسی کی ایک چیخ نکلی۔ اس نے اپنے ہونٹ کاٹ لئے اور پھر زمین پر گرکر اس طرح تشنج میں مبتلا ہو گئی جیسے اسے مرگی آ رہی ہو۔

اس کے بعد کیا ہوا یہ اسے ٹھیک سے یاد نہ تھا۔ ھذیانی حالت میں وہ زمین پر رینگنے لگی، پھر دوڑی، پھر ٹھوکر کھاکر گری۔ اس کا نیا پرنجے پتھروں اور کانٹوں میں اٹک اٹک کر جابجا سے پھٹ گیا تھا۔

اس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا کہ جائے تعمیر پر جہاں روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں، وہاں سے لوگ لالٹینیں، پھاوڑے اور کلہاڑیاں لےکر قبرستان کی طرف کیوں دوڑ رہے تھے۔ ویسے تو وہ دوڑتے ہوئے ادھر ہی جا رہے تھے جدھر سے گولی چلنے کی آواز آئی تھی مگر اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ دوسری طرف کو بھاگ رہے ہوں، خرگوشوں کی طرح دور بھاگے جا رہے ہوں۔

یہ خیال اس کے دماغ کو کھولائے دے رہا تھا کہ اناخان مر گئی اسی کی وجہ سے۔ اس کی رہی سہی طاقت بھی جواب دے گئی۔

اس کے لئے اپنے قدموں پر سنبھلے رہنا تقریباً ناممکن ہو رہا تھا۔ وہ آگے کو چکرائی اور دونوں ہاتھ پھیلاکے بےسود کسی سہارے کو تلاش کرتی ہوئی گر پڑی۔

"مدد۔ مدد۔ دوڑو" وہ اندھیرے میں کسی دیوار کی کھردری سطح کو چھوتے ہوئے چیخی۔ وہ خود اپنی آواز کو بھی نہیں پہچان سکی۔

اب وہ ایک گلی میں دوڑی جا رہی تھی، بےمعنی آوازیں نکالتی، منھ کھولتی، بند کرتی جس کو وہ سمجھتی کہ چیخ رہی ہے، مدد کے لئے پکار رہی ہے مگر آواز گھٹ چکی تھی۔

چوراہے پر ایک لمبی سی کچی دیوار نے اس کا راستہ روکا۔

دیوار میں ایک بڑا سا موکھا تھا۔ اور اسے دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی کہ وہ کہاں ہے۔ زمین پر، خزاں سے گرے پتوں کا ڈھیر تھا جو اس کے قدموں تلے چرمرا رہا تھا۔ برچ کا وہ قدیم پیڑ تھا جس کی شاخیں ننگی اور ٹیڑھی میڑھی تھیں اور وہ گول چھوٹا سا حوض۔ یہ نزاکت کی پڑوسن مستان کا جو موسیقی‌کار تھی، احاطہ تھا۔

"پروردگار، او آسمان‌والے۔ ارے خالہ مستان! بھائی مرائم!" نزاکت نے فریاد کرتی ہوئی، روتی ہوئی آواز میں پکارا۔

کوئی جواب نہیں ملا۔ چاروں طرف نیند کا سناٹا اور خاموشی طاری تھی۔

یکایک ایک کبڑا سایہ درخت کی آڑ سے نکلا اور دیوار کے سہارے چلنے لگا۔ نزاکت نے اس کو صاف طور سے دیکھا اور ایک بار پھر وہ ڈر کے مارے سن ہو گئی۔ اسے اپنی پیٹھ پر ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ کوئی دبے پاؤں اس کی ہی طرف بڑھتا آ رہا تھا۔

اور پھر وہ دھیرے دھیرے کتے کی طرح غراتا ہوا اس پر لپکا، بڑے وقت سے نزاکت ایک‌دم پیچھے ہٹ گئی اور اس کی گرفت میں نہ آ سکی البتہ اس کا پرنجے اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔

"داد"* وائے داد!" وہ دبی ہوئی، گھٹی آواز میں چیخی۔

نزاکت دوڑنے لگی مگر وہ سایہ اس تک پہنچ گیا، مضبوط انگلیوں سے اس کے کندھے پکڑے اور اسے زمین پر گرانے کے لئے

---

* خوف کی حالت میں مدد کو پکارنے کے لئے صدا۔ مترجم۔

پیچھے کی طرف کھینچا۔ نزاکت کسی نہ کسی طرح اپنا توازن سنبھال لے گئی۔ تب اس کا پیچھا کرنےوالے نے جلدی سے نزاکت کے منہ پر اپنا ھاتھ رکھکر اس کی لمبی لمبی چوٹیوں سے اس کے گلے میں پھندا کسنا شروع کر دیا۔

"چپ رہ" وہ غرایا۔ "تو اپنے پیروں سے چل کر اپنی قبر میں آ پہنچی ھے۔"

نزاکت حیران رہ گئی اور اس کا خوف کسی حد تک کم ہو گیا۔ یہ آواز اس کی جانی پہچانی تھی۔ اف، خدائے رحیم، کیا وہ غلطی پر ہو سکتی تھی؟ صرف آواز ھی نہیں بلکہ ھاتھوں میں بھی جوانی کی قوت نہ تھی: کوئی بوڑھا شخص نزاکت کو پھانسی دے رہا تھا۔ اور اب اسے کوئی شک نہ تھا کہ یہ وھی ھے۔ چگی داڑھی‌والا نیلی مسجد کا امام، عبدالمجید خواجہ۔

اس بات کا یقین ھوتے ھی نزاکت کے ھوش حواس بالکل درست ھو گئے۔ اگر آپ کو یقین ھو کہ آپ کا مقابلہ کسی بھوت پریت نہیں بلکہ جان پہچان کے کسی آدمی سے ھے تو لڑنا کہیں زیادہ آسان ھو جاتا ھے۔ نزاکت یہ بھی سمجھ گئی کہ قبرستان میں جو لوگ تھے ان میں یہ امام بھی شامل رہا ھوگا اور وہ چپکے سے وھاں سے بھاگ کر اب اس کے پھاٹک پر اس کو جا لینے کا منتظر رہا ھوگا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ وہ اس کا کچا چٹھا کھول دے گی۔ قاتل کہیں کا! اچھا تو یہ ھے تیری تقدیس اور پرھیزگاری!

نزاکت بل کھاکر اس کی گرفت سے آزاد ھو گئی، اپنے دونوں ھاتھوں سے خواجہ کی داڑھی کس کر پکڑ لی۔ امام درد کے مارے چیخ اٹھا۔ یوں تو آج تک کوئی مرد ایسا نہیں پیدا ھوا جو بال کھینچنے اور کھسوٹنے کے مقابلے میں عورت سے بازی لے جائے، پھر بھی امام نے ھمت نہ ھاری۔ ھم سب جانتے ھیں کہ جب کوڑے پڑنے کی نوبت آتی ھے تو جاھل پادری بھی پڑھنے لگتا ھے سو امام نے اپنے گھٹنے سے نزاکت کے پیٹ میں مارنا شروع کیا اور آخرکار اسے زمین پر گراکر بڑی پھرتی سے

اسی کے ملے دلے پرنجے سے اس کا منھ بند کر دیا تاکہ اس کی چیخیں نہ نکلنے پائیں۔

عین اسی وقت نورمت اپنے گھر میں یفیم دانیلووچ کی میزبانی کر رہا تھا۔ وہ لوگ جائے تعمیر سے سیدھے نورمت کے گھر آئے تھے اور نورمت کو خود ہی چائے تیار کرنی پڑی۔ اس نے سوچا کہ اس کی بیوی پڑوس میں کہیں گپ شپ کر رہی ہوگی مگر اسے یہ حیرانی ضرور ہو رہی تھی کہ اتنی دیر ہو گئی اور وہ اب تک واپس نہیں آئی۔

"لوگ کہتے ہیں کاجل کی کوٹھری میں گھسوگے یا کوئلے کی دلالی کروگے تو ہاتھ ضرور کالے ہوں‌گے لیکن برے آدمی کی صحبت میں تو انسان خود بھی برا ہو جاتا ہے۔ ہے نا بھائی نورمت؟" یفیم دانیلووچ نے پوچھا۔ وہ اپنے میزبان کے سامنے آلتی پالتی مار کے بیٹھا، ہلکی چینی کے بنے ہوئے پیالے میں سے چائے کی چسکیاں بھر رہا تھا۔

نورمت نے سر ہلاکر انکار کیا:

"نہیں بھائی، امام تو بڑا بے لوث اور سمجھدار آدمی ہے۔ بھلا امام عبدالمجید خواجہ کی صحبت میں آپ کیا برائی سیکھیں گے؟ وہ ہم سے ملنے آتا ہے تو صرف ہمیں نیکی سے زندگی گزارنے اور گناہوں سے بچنے کی راہ دکھانے کے واسطے اور ہم مسلمانوں میں تو یہ کوئی بری بات نہیں مانی جاتی۔"

"دیکھو بھائی، مجھے تمہارے مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے" یفیم دانیلووچ نے جواب دیا۔ "لیکن میں جو بات کہہ رہا ہوں اس کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تو اس کام کی بات کرتا ہوں جو ہم تم مل‌کر کر رہے ہیں۔ اب وہ زمانہ آ گیا ہے جب محنت کرنے ہی سے گھر میں خوشی خوشحالی اور میل محبت کی فضا پیدا ہوگی۔ کیا تم اس بات کو نہیں مانتے؟ بتاؤ نا۔"

"جی، میں مانتا ہوں۔"

"تو پھر مجھے یہ بتاؤ کہ یہ جو تمہارا مرشد ہے، یہ کام کی طرف سے تمہیں کیوں بددل کر رہا ہے؟ اور کام بھی ایسا

جو تم کو پسند ھے اور تم اسے محنت سے کرتے ہو۔ بتاؤ، ایسا کیوں ھے؟"
نورمت نے سر جھکا لیا۔
"تم ھی کھو، کیا کسی مومن کے لئے یہ گناہ ھے کہ وہ خود اپنی اور دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرے؟"
یفیم دانیلووچ نے اپنی بات جاری رکھی۔ "کیا ھمارا پروجیکٹ ایک ایسی چیز نہیں ھے جس سے بہتوں کا فائدہ ہوگا؟ اس کے متعلق تمھارے امام صاحب کیا فرماتے ھیں؟ اور یہ بھی بات ھے کہ جس شخص نے کبھی تنکا نہیں ھلایا اور ھمیشہ مفت کی کھائی وہ محنت کے متعلق بھلا کیا جانے گا؟"
"ھم لوگوں کو بچپن سے یہ تعلیم دی جاتی ھے کہ عالموں کی بات پر یقین کریں کیونکہ وہ شریعت کے محافظ ھیں۔"
"لیکن ظاھر تو یہ ھو رھا ھے کہ تم غلطی پر تھے۔"
"لیکن امام مجھے کیوں دھوکا دے گا؟" نورمت نے زور سے کہا۔ "اگر وہ یہاں آکر مذھب سے متعلق گفتگو کرتا ھے تو اس میں آخر اس کا کیا فائدہ ھے؟"
"فائدہ؟ فائدہ تو بے حد ھے، سراسر ھے" یفیم دانیلووچ نے جواب دیا۔ "ابھی سے اس نے باتیں بنا بناکر تم کو تمھاری دو بہت قیمتی چیزوں سے تو محروم کر ھی دیا ھے: ایک تو، اپنے کام سے تمھاری محبت اور دوسرے، تمھاری بیوی نزاکت کی آزادی..."
نورمت نے احتجاج کیا۔
"نہیں، نہیں، کسی نے میری بیوی سے کچھ نہیں کہا ھے، نہ امام نے اور نہ میں نے۔ جو کچھ نزاکت نے کیا وہ خود کیا ھے، اپنی مرضی سے کیا ھے۔"
یفیم دانیلووچ مونچھوں ھی مونچھوں میں مسکرایا اور چائے کا پیالہ رکھ دیا۔
"سوچو بھائی نورمت، سوچو کہ امام تمھارے خاندان کے لئے برکت لایا ھے یا نحوست، اس نے تمھیں بری طرح الجھا دیا۔ میں تو بس اتنا کھوں‌گا کہ اگر اس سے بھی بدتر حالت نہ ھو تو ھی غنیمت ھے۔"

"تو کیا کوئی مومن، کوئی عالم فاضل بزرگ میرے گھر آئے تو میں اس سے نکل جانے کو کہوں؟" نورمت بڑبڑایا۔ "پھر میرے مسلمان بھائی اور دوسرے لوگ کیا کہیں گے؟ وہ تو یہی کہیں گے کہ میں نے اپنی عزت، اپنا ایمان سب چھوڑ دیا۔"

"لیکن تمہارے ساتھی کیا کہیں گے؟" یفیم دانیلووچ نے سوال کیا۔

نورمت کو جواب دینے کی مہلت نہیں ملی۔

پھاٹک دھڑام سے کھلا۔ نورمت ایسا اچھلا کہ گرما گرم چائے اس کے ہاتھوں پر گر گئی۔

پیرافین لیمپ کی مدھم روشنی میں دونوں مردوں نے دیکھا کہ نزاکت سامنے کھڑی ہے۔ اس کی چوٹیاں کھلی ہوئی تھیں، کپڑے گھٹنوں تک پھٹے ہوئے تھے، اس کے رخسار جو عام طور پر گلابی رہتے تھے، اس وقت دھنکی روئی کی طرح سفید ہو رہے تھے، اس کی آنکھیں کسی پاگل عورت کی طرح پھٹی ہوئی تھیں، اس کے ہونٹ ہل رہے تھے مگر آواز نہیں نکل رہی تھی۔

کوئی ایک منٹ تک نورمت اپنی بیوی کو یوں دیکھتا رہا جیسے وہ اسے پہچان نہیں پا رہا تھا، پھر وہ ایک دم اس کی طرف دوڑا اور وہ اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں گر پڑی۔

نورمت نے سر اٹھایا تو عبدالمجید خواجہ کو پھاٹک کے پاس دیکھا۔ اس کی داڑھی نچی اور بکھری ہوئی تھی اور آنکھوں میں وحشت تھی۔ وہ اپنے پیچھے ایک لال پرنجے گھسیٹتا ہوا صحن میں آ گیا اور یفیم دانیلووچ کو دیکھے بغیر نورمت اور نزاکت کے سامنے دوزانو ہو گیا۔

نزاکت اپنے شوہر سے چمٹ گئی اور چیخنے لگی:

"یہ مجھے مار ڈالے گا! ہائے، یہ مجھے مار ڈالے گا!"

امام نے اس کو روکا:

"میں اللہ کا بندہ ہوں اور تمہارا غلام دیکھو، میں تمہارے سامنے دوزانو ہوں نورمت اللہ۔ اگر میری زبان سے تمہارے لئے، تمہاری خیریت کے لئے دعاؤں کے علاوہ کچھ اور نکلے تو میرا خدا مجھے سزا دے!"

"یہ مجھے مار ڈالے گا" نزاکت نے سسکیاں بھرتے ہوئے ایک بار پھر کہا۔

امام نے نزاکت کے پاؤں اور نورمت کے لانگ بوٹ پکڑ لئے۔

"یہ راز میرے اور اپنے درمیان رہنے دو، خدا کے نام پر تم سے یہ بھیک مانگتا ہوں... ہم لوگ ہم‌مذہب ہیں، تم میرے باپ ہو نورمت‌الله اور نزاکت میری بہن ہے...."

"کیا ہوا؟" یفیم دانیلووچ نے پوچھا۔

"یفیم دانیلووچ!" نزاکت زور سے چیخی اور اس کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا دئے۔

"اناخان... قبرستان میں ہے۔ اس نے!.. ان لوگوں نے!.. ان لوگوں نے اسے مار ڈالا..."

امام فوراً کسی بکرے کی جیسی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھاٹک کی طرف بھاگا لیکن نورمت نے دوڑکر اس کو پکڑا اور دیوار سے لگاکر دبا لیا۔

"اچھا تو یہ بات ہے، یہ تم ہو پارسا اور پرہیزگار بوڑھے!" وہ اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلایا۔

یفیم دانیلووچ نے نزاکت کا ہاتھ پکڑا۔

"قبرستان میں؟ کہاں؟ جلدی بتاؤ مجھے!"

"هزار شیخ کے مقبرے کے پاس۔"

"کھدائی مزدور، اسے ایسا مزہ چکھاؤ جس کا یہ مستحق ہے!" یفیم دانیلووچ شدید غصے سے چیخا۔ "اسے اپنے ہاتھوں سے نکل کر جانے نہ دینا!" اور وہ بڑی تیزی سے قبرستان کی طرف لپکا۔ تاریکی دھیرے دھیرے غائب ہو رہی تھی۔

تینتیسواں باب

شہری پارٹی کمیٹی کے دفتر میں ابھی کام نہیں شروع ہوا تھا، گلیارے خاموش اور سنسان تھے، صرف صفائی

کرنےوالی عورت دروازے کے پاس زینے پر بالٹی کھڑکھڑا رہی تھی۔

اناخان عورتوں کے شعبے میں اپنے چھوٹے سے دفتر میں ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ اس کے سر پر پٹی بندھی تھی، چہرہ زرد تھا اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

مٹھیاں بھینچ کر وہ اپنے ڈیسک کے سامنے کھڑی ہو گئی جس پر ایک کھلا ہوا اخبار رکھا تھا۔ پہلے ہی کالم پر ایک طویل مضمون تھا جس کو سرخ لکیر سے گھیرا گیا تھا۔ اس کی سرخی تھی: "غدار قیدیوں کے کٹھرے میں!"

چائے کا تاجر محمد سعید، سابق ٹیچر محمود خواجہ نعیمی، مقسوم پاچاجانف عرف ھڑیلا مقسوم، نیلی مسجد کا امام عبدالمجید خواجہ، مشہور جوئےباز کالا قولمت اور کئی درویش، ملا اور "اللہ کے بھولے بھالے" - آخرکار بدمعاشوں کی پوری ٹولی گرفتار ہو گئی تھی۔

اناخان کو وکیل سرکار مقرر کیا گیا تھا اور اس وقت وہ اپنے دل دماغ میں وہ شعلہ‌بار الفاظ ڈھونڈ رہی تھی جن سے اسے الزامات لگانا تھے۔ ان غداروں، ضمیر انسانی کے ان تاجروں اور ان جوئےبازوں پر جو لوگوں کی لاعلمی اور جہالت سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ یہ جو مذہب کے جھوٹے ٹھیکےدار تھے، ڈاکو تھے، جوراخان کے قاتل تھے۔

جوراخان... کاش کہ وہ زندہ ہوتی! وہ تو اپنے غصے کی آگ سے ان مجنونوں، ان قاتلوں کو جلاکر راکھ کر دیتی۔ وہ ایسے الفاظ کہتی جن کی گونج سات سمندر پار پہنچتی کہرے سے ڈھکے ہوئے اس شہر تک جہاں سے "چائے کے تاجر" ساری دنیا میں بھیجے جاتے ہیں۔

آج اناخان وہی الفاظ تلاش کرےگی۔

گلیارے میں دبی دبی آوازوں نے اس کے خیالات کو منتشر کر دیا۔ یہ عورتوں کی آوازیں نہیں۔ اناخان نے دلچسپی سے دروازے کی طرف دیکھا۔ اتنی صبح صبح کون آ سکتا ہے؟

پھر ایک ہاتھ نے ہچکچاتے ہوئے دروازے کو دھکا دیا اور سفید اونی شال میں لپٹا ہوا قمری کا سر دروازے کی دراز سے دکھائی دیا۔

"بہن اناخان، آپ یہاں؟ میں جانتی تھی کہ آپ یہاں پہنچ چکی ہیں۔"

قمری نے برف سے ڈھکے ربڑ کے جوتے گلیارے ہی میں اتار دئے اور ننگے پاؤں دفتر میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے بوڑھی عنظیرت کمر جھکائے چلی آ رہی تھی اور دادی "شکر اللہ" بغیر پرنجے کے تھی!

"اب اگر تم اپنے ربڑ کے جوتے گلیارے میں اتار دیتیں دادی عنظیرت، تو کیا نقصان ہو جاتا" قمری دہلیز پر بڑبڑائی۔ "تمہیں کب عقل آئے گی ۔دیکھو نا برف پگھلے گی اور دفتر کے فرش پر پانی ہی پانی نظر آئے گا۔" پھر اناخان سے بولی: "کیسی ہو بہن اناخان، اب طبیعت کیسی ہے؟ تمہیں ہمارے جانے کے بعد فرش پونچھنا پڑے گا۔"

"آئیے، آئیے، اندر آ جائیے" اناخان بولی۔ وہ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے عنظیرت کا ہاتھ پکڑا اور اسے لکڑی کے تخت پر بٹھا دیا۔ "آخر کار آپ نے دنیا کو اپنا منھ دکھانے کا فیصلہ کر ہی لیا... کہئے کون سی ہوا آپ کو یہاں اڑا لائی؟"

"میں ان کو تمہارے پاس لائی ہوں، اناخان پیاری" قمری نے بات کاٹی۔ "تم نے مجھ سے کہا تھا نا کہ میں ہر جگہ ان کا پیچھا کروں اور اس بوڑھی بے سینگ، شرمیلی بکری کو ہر جگہ اپنے ساتھ لے جاؤں... سو لو، سنبھالو!"

"تمہیں شرم نہیں آتی" عنظیرت نے تھکن کے مارے سر ہلاکر، ہونٹ چبھلاتے ہوئے کہا۔ "کون کہتا ہے تم مجھے یہاں لائی ہو؟ کیا میں یہاں کا راستہ نہیں جانتی؟ یا میں کسی کی بندوڑ ہوں۔ بیٹی اناخان، تم اس بہکی ہوئی جوان عورت کی بات میں نہ آنا، اس کی زبان تو کترکتر چلتی ہے۔ میں اپنے آپ آئی ہوں۔ باتیں دیکھو تو مولوی صاحب کی داڑھی کی سی لمبی لمبی اور پھوٹے دیدوں سے اتنا نہیں سوجھتا کہ مجھ میں جھک کر جوتے اتارنے کا دم کہاں ہے"۔

اناخان نے مسکرا کر دادی عنظیرت کو گلے لگا لیا۔

"جانے دیجئے، آپ مت اتارئیے اپنے جوتے عنظیرت خالہ، آپ کے جانے کے بعد میں ہزار بار فرش خود دھو دوں گی کیونکہ مجھے ہزار بار یہ خوشی ہوگی کہ اب آپ کھڑی تو ہوئیں اپنے پیروں پر اور آپ نے پرنجے تو اتارا۔ آپ کا بہت شکریہ میری اچھی خالہ..."

"ان کا شکریہ ادا کرنے کی کیا بات ہو گئی" قمری نے پھر چڑچڑےپن سے بات کاٹی۔ "شکریہ تو میرا ادا ہونا چاہئے۔ میں نے ہی تو کہا تھا کہ جب تک منھ کھول کر نہیں چلیں گی میں تو انہیں نہ تمہارے پاس لاؤں گی نہ تمہارا دفتر دکھاؤں گی، تمہارے گھر تو یہ چلنے پر تیار ہی نہیں ہوئیں۔ بولیں: "میں تو اناخان کے دفتر جاؤں گی، مجھے اس کا پارٹی کا دفتر دکھاؤ..." اب دیکھ لو یہ کتنی ڈھیٹ ہو گئی ہیں!"

"رضوان مجھ سے دو ہی سال تو بڑی ہے" عنظیرت نے دلیل پیش کی۔ "تو وہ روز یہاں آئے اور میں اس سے کس بات میں کم ہوں جو نہ آؤں؟"

"واہ، آپ کیوں نہ آئیں، میں تو آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی" اناخان نے کہا۔ "یقین مانئے خالہ عنظیرت، آپ تو پہچانی نہیں جاتیں۔"

"شکر اللہ کا، بیٹی۔ شکر اللہ..."

قمری نے فوں فوں کی:

"ارے، میری جان۔ یہاں آتے ہوئے تو تم مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ تم نے اپنا یہ "شکراللہ" چھوڑ دیا ہے۔"

عنظیرت نے جواب دیا:

"ہاں، ہاں، ٹھیک ہے۔ میں تو پھر کہوں گی کہ شکراللہ کہ میری وہ عادت چھوٹ گئی۔"

تینوں عورتیں خوش خوش ہنسنے لگیں۔

مگر دوسرے لمحے عنظیرت نے اپنے جھریاں پڑے ہونٹ ہاتھ سے پونچھے اور سنجیدگی سے بولی:

"لو، میں یہاں بیٹھی تم سے ٹھٹھول کر رہی ہوں اور تم

مجھ بڑھیا کو ہنسا رہی ہو مگر میں اس لئے تھوڑی آئی تھی، بیٹی۔ یہ کوئی ہنسی دل‌لگی کی بات ہے بھلا! اچھا تو یہ بتاؤ بیٹی اناخان کہ یہ سچ ہے کہ ان لوگوں نے..." اور بڑھیا نے انگلی اٹھاکے خبردار کرنے کا اشارہ کیا: "کہ ان ہی لوگوں نے ہماری ماں اور ہماری بہن جوراخان کو قتل کیا تھا؟ یہ چاروں طرف لوگ جو چرچا کر رہے ہیں تو یہ بات ٹھیک ہے؟"

"ہاں، خالہ عنظیرت، ٹھیک ہے۔"

اور کیا یہ بھی صحیح ہے کہ انہوں نے تم پر گولی چلائی تھی؟"

"جی نہیں، میرا معاملہ اور تھا۔ وہ مجھ پر پتھراؤ کرنا چاہتے تھے۔ میں نے ان پر گولی چلائی تو سب گیدڑوں کی طرح بھاگ لئے۔"

"تم نے؟.. تم نے ان لوگوں پر گولی چلائی بیٹی؟" عنظیرت نے اپنی سفید بھنویں اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"مگر... مگر تمہیں گولی چلانا آتا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"شکر الله، شکر الله" عنظیرت نے دھیرے سے کہا۔ وہ اس بات پر دعائیں دے رہی تھی جو اگر پچھلے ہی جاڑوں میں ہوئی ہوتی تو اس کی بڑے جوش و خروش سے مذمت کرتی اور لعنت بھی بھیجتی۔

"تو پھر وہ... بھاگ گئے.. کہا نا تم نے؟ گیدڑوں کی طرح؟"

"جی۔"

"اور وہ گولی کسی کے لگی؟"

"جی نہیں، میں نے ان کو ڈرانے کے لئے ہوا میں فیر کیا تھا، پھر جائے تعمیر پر سے ہمارے آدمی دوڑ پڑے..."

عنظیرت نے ایک لمبی "ہوں" کھینچی اور پھر اپنے کمزور ھاتھوں سے اناخان کو گلے لگا لیا اور اس کے پٹیاں بندھے سر کو تین بار چوما۔

"ارے آهسته! ان کو درد هوتا هوگا" قمری جلدی سے بول اٹھی۔ وہ غور سے اناخان کو دیکھ رهی تھی۔
"هونے دو درد" عنظیرت نے بے تصنع اهمیت کے ساتھ جواب دیا۔ "اب مجھے بھی اس کے درد سے درد هوتا هے، میرے اس بوڑھے سفید سر میں بھی تکلیف هوتی هے، قسم هے خدا کی میں نے کبھی نہیں سوچا تھا که اگر میں اپنا پرنجے پہنتی رهوں‌گی تو اس سے کسی کو نقصان هوگا اور سوچا تھا که اگر نزاکت پھر سے پرنجے پہننے لگی هے تو وہ جانے۔ بیٹی اناخان، میں بس بالکل یہی سوچتی تھی۔ اگر تم پہلے کبھی مجھ سے کہتیں که امام عبدالمجید خواجه نے نزاکت کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تو میرے دل میں تمهاری ذرا عزت نه رهتی، سن رهی هو میں کیا کہه رهی هوں؟"
"جی، سن رهی هوں عنظیرت خاله۔"
"تو بیٹی، اس لئے مجھے بھی درد هوتا هے اور اسی لئے آج میں نقاب میں اپنا منه نہیں چھپا سکی... مجھ سے هو هی نہیں سکا۔ اس لئے نہیں که اس هاتھ بھر کی زبان‌والی نے مجھ کو دھمکی دی تھی که وہ مجھے تمهارے پاس اور پارٹی دفتر نہیں لے چلے گی..."
قمری نے دونوں هاتھ اوپر اٹھائے اور اس کے اوبڑ کھابڑ دانتوں‌والے منه پر مسکراهٹ آئی۔
"تم بڑی ناشکری هو... بھول گئیں که گھنٹے بھر تک میں تمہیں شرم دلاتی رهی تھی اور اچھا، اب وہ بات تو مت بھول جاؤ جس کے لئے آئی هو۔"
"نہیں واہ، وہ کیسے بھول جاؤں‌گی" عنظیرت نے بڑے وقار سے جواب دیا۔ "اچھا تو اب میں بتاتی هوں که دراصل میں کیوں آئی هوں۔"
بڑی بی نے میز پر رکھے اخبار کی طرف اشارہ کیا۔
"تم نے سنا هے نا که اخباروں میں کیا لکھا جا رها هے؟" اس کے سوال کا لہجه ایسا تھا جیسے کسی سے لڑائی کا بہانه ڈھونڈ رهی هے۔ "اس شیخی‌باز قمری نے مجھے یه سب پڑھ‌کر سنایا۔ جو کچھ لکھا هے اسے خود اسی نے پڑھا۔ خدا جانے

اس کو پڑھنا کس نے اور کب سکھایا! بہرحال اسی نے مجھے سب سنایا تو بیٹی اناخان، میں اب تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ کوئی ایسا مرد ہونا چاہئے جسے ٹھیک سے پڑھنا لکھنا آتا ہو اور پھر اس سے کہوکہ وہ میری طرف سے لکھے کہ یہ امام عبدالمجید خواجہ جو ہے یہ خیر جہنم سے تو بچ ہی نہیں سکتا مگر اس دنیا میں بھی اس پر بالکل رحم نہ کیا جائے اور اس کے ساتھ کوئی رعایت نہ ہو۔ زمین ان لوگوں کو برداشت نہیں کر سکتی جنھوں نے جوراخان کو قتل کیا! ان لوگوں کو اخباروں میں یہ بات لکھنی چاہئے۔ اور وہ یہ بھی لکھیں کہ یہ باتیں بوڑھی عنظیرت نے کہی ہیں جو دادی شکراللہ کہلاتی ہے اور جس نے اپنی اتنی لمبی عمر میں کسی چیونٹی کو بھی دکھ نہیں دیا ہے۔ تو بیٹی، یہ سب وہ لوگ لکھ دیں گے میری طرف سے؟ ایں؟"

اناخان جواب دینے کے بجائے ٹیلی فون کے پاس گئی اور مقامی اخبار کے دفتر کو فون کیا۔ جلد ہی وہاں سے ایک لڑکی، دادی عنظیرت کو اخبار کے دفتر لے جانے کے لئے آ گئی۔

اناخان اپنی دوستوں کو دروازے تک رخصت کرنے گئی اور بولی:

"اب میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ مقدمے کے وقت مجھے کیا کہنا ہے اور یہ بھی کہ اب آپ نے واقعی اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دی ہے!"

"مگر بیٹی، میرے لئے کیا اخبار کے دفتر جانا ٹھیک ہوگا؟" عنظیرت نے اپنے ہاتھ سے اپنا پوپلا منھ چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ لوگ آپ کی تصویر لینا چاہتے ہیں، آپ کے بیان کے ساتھ چھاپیں گے۔"

"مگر یہ لڑکی کیا اچھی طرح لکھ پڑھ سکتی ہے؟"

"کون؟"

"یہ ایڈیٹوریل، جو وہاں سے آئی ہے؟ اگر کوئی مرد مجھ سے ملتا تو زیادہ ٹھیک رہتا۔"

"وهاں جاکے تو دیکھئے، مرد هی سے ملاقات هوگی" اناخان نے هنستے هوئے کہا۔
"هائے بیٹی، مجھے تو ڈر لگ رها هے" عنظیرت نے ٹھنڈی سانس لی۔
"آؤ، آؤ" قمری نے اس پر زور دیا۔ "یه گناه میرے سر پر۔"
جب دونوں عورتیں چلی گئیں تو اناخان دروازے پر دوبروخوتوف کو دیکھکر حیران ره گئی۔ وه قمری کی طرح هچکچاتا، شرماتا اندر آیا مگر اناخان نه جانے کیوں لرزنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رها تھا که اس کا دل کیوں تڑپ اٹھا هے۔ قمری نے تو گلیارے میں ربڑ کے جوتے اتار دئے تھے مگر دوبروخوتوف پائدان پر بڑی احتیاط سے اپنے جوتے رگڑ رها تھا۔ اناخان ایک ایسی گھری مسرت سے جس کا اسے محض خفیف سا شعور تھا، گھبرائی هوئی خاموشی سے انتظار کرتی رهی۔
"معاف کیجئے گا، میں اتنی صبح صبح آ پهنچا" اس نے دروازے هی پر سے کہا۔ "دراصل میں ادھر سے گزر رها تھا تو میں نے سوچا آپ کی خیریت دریافت کرتا چلوں۔"
"میں... میں بالکل ٹھیک هوں، آپ کا شکریه..." اناخان نے اتنا آهسته جواب دیا که جیسے وه بالکل ششدر ره گئی هو اور پھر وه اپنی میز کے پاس بیٹھکر غیرارادی طور پر اخبار کی سلوٹوں کو هاتھ سے برابر کرنے لگی۔
دوبروخوتوف آهسته آهسته گھبرایا هوا کمرے کے اندر آیا۔ اس نے چاروں طرف دیواروں پر نظر ڈالی اور میز کے سامنے یوں جاکر کھڑا هو گیا جیسے کوئی شخص درخواست دینے آیا هو۔
"یهیں میں پهلی بار جوراخان سے ملا تھا" آخر اس نے زبان کھولی۔ "اور ان سے اپنی گفتگو کو میں کبھی نهیں بھول سکتا۔ آپ کو شاید یه بات عجیب بلکه هو سکتا هے، مضحکه‌خیز لگے لیکن اس کمرے کو میں اپنا گھر سمجھتا هوں اور اس کے ساتھ میرے وهی جذبات وابسته هیں جو اس گھر

کے ساتھ ہو سکتے ہیں، جس سے میرے بچپن کی سب سے عزیز یادیں وابستہ ہوں۔ ایمان کی بات تو یہ ہے۔ دیکھنے میں بالکل صاف کہتا ہوں کہ آج مجھ پر جو کچھ گزر رہی ہے اور میرے ارد گرد جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچی کی نیچی رہ گئی ہے۔ کتنی مدت ہوئی اور کیا کیا کچھ ہو گیا جب سے میں یہاں آیا ہوں۔ آپ کو میری بات سے اتفاق ہے نا"؟

"ہاں، ہاں، ٹھیک ہے۔ اور کیا" اناخان نے جواب دیا، اس کی آواز بہک رہی تھی۔

وہ چاہتی تھی دوبروخوتوف سے بیٹھنے کو کہے، اس سے ہاتھ ملائے مگر اس سے کچھ کرتے نہ بنا۔

وہ خود ہی بیٹھ گیا۔ اس کے قریب آکر اس کے برابر میں کرسی رکھ کر بیٹھ گیا، چند لمحوں تک وہ اسے کن‌انکھیوں سے دیکھتا رہا پھر ایک‌دم سے اس نے اپنا ہاتھ اس کی کلائی پر رکھ دیا جو اخبار پر رکھی تھی۔ اناخان نے اپنا ہاتھ نہیں ہٹایا مگر اس کا رنگ یکایک لال ہو گیا۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں" اس نے بڑی نرمی اور سنجیدگی سے کہا۔ "رات میری آنکھ سوتے میں دو بار کھلی۔ دونوں بار میں نے خواب دیکھا تھا کہ قبرستان میں آپ کے اوپر پتھراؤ ہو رہا ہے۔ آپ مجھے معاف کر دیجئے گا، مجھ سے خفا نہ ہو جائیے گا اگر جو میں کہہ رہا ہوں وہ آپ کو برا لگے۔ میں اس قدر پریشان ہوا کہ میں نے یہاں آنے اور آپ کو ایک نظر دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ میں ابھی چلا جاؤں گا۔ مجھے آپ کے سلسلے میں سخت تشویش تھی۔ میں پورے خلوص کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اب یہ تشویش میرے وجود کا اتنا اہم حصہ بن چکی ہے کہ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

اناخان نے خاموشی اختیار کر لی تھی مگر اسے کن‌انکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ یہ دیکھ رہی تھی کہ وہ اپنے کانپتے ہونٹوں کو دانتوں سے دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اناخان

کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ رو پڑنے اور اس کے گرم ہاتھ پر اپنا سر رکھ دینے کو بیتاب تھی۔

"میں ابھی چلا جاؤں گا، ایک منٹ میں" اس نے کہا۔ "میری آپ سے ایک ہی درخواست ہے اور میں اس پر اصرار کر رہا ہوں۔ کبھی آپ کو کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آئے تو براہ کرم مجھے فوراً مطلع کیجئے گا... وعدہ کیجئے۔"

"مگر مجھے کیا ہو سکتا ہے" اناخان نے کہا۔ اب وہ نسبتاً زیادہ سکون محسوس کر رہی تھی۔

"وعدہ تو کر لیجئے" اس نے اپنی بات دوہرائی۔ "کیا آپ وعدہ کرتی ہیں؟"

"ہاں" اس نے جواب دیا۔

"اچھا، تو اب مجھے جانا چاہئے، خدا حافظ۔"

"خدا حافظ، سرگئی لووچ۔"

وہ اٹھکر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا اور پیچھے دیکھے بغیر، دروازہ بند کئے بغیر باہر نکل گیا۔

اناخان ڈیسک کے پاس کرسی پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی اور دیر تک اپنے اس ہاتھ کو دیکھتی رہی جس پر دوبروخوتوف نے اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ اس کا دل ڈر اور خوشی کی ایک عجیب ملی جلی کیفیت سے دھڑکتا رہا۔
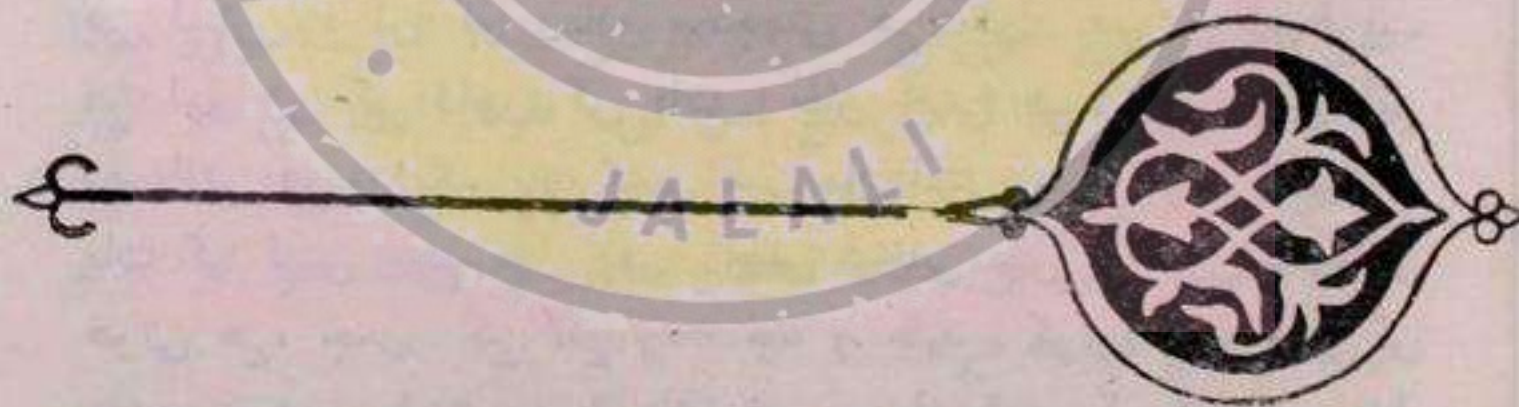
چونتیسواں باب

ایرگاش ایک چھوٹے سے کچے گھر میں رہتا تھا جو اسے اپنے باپ سے وراثت میں ملا تھا۔ دیواریں تو کب سے ہی گرنی شروع ہو گئی تھیں اور رنگ کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ انہیں دیکھکر جلد کی بیماری والے گھوڑے کا خیال آتا تھا۔ لیکن اسے اپنے گھر کے بارے میں سوچنے کی

فرصت ہی کہاں تھی۔ لوگ دل ہی دل میں خوش ہوتے اور کہتے:

"باپ ساری عمر بنکر رہا اور ایک انگوچھا نصیب نہ ہوا۔ بیٹا معماروں کا چیف ہے اور باپ سے پائے ہوئے گھر کی مرمت تک نہیں کر سکتا۔"

بیماری بھر یہ خیال ایرگاش کو ستاتا رہا، بستر میں گڑمڑ پڑا اداسی کے ساتھ اس اسٹول کو دیکھتے ہوئے جس پر دواؤں کی شیشیاں رکھی رہتیں۔ وہ سوچتا: "میں اپنا اور اپنی ماں کا ذرا بھی خیال نہیں کرتا۔ میں اپنی توانائی یا اپنا وقت نہیں بچاتا۔ اپنے کام کو سب کچھ دے رہا ہوں۔ اگر اچھا ہوتا تو رات اور دن میں بھی فرق نہ کرتا۔ میرے پاس تو حاجیہ سے اتنا کہنے کے لئے بھی وقت نہیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں..."

پھر بھی لوگ اس سے مطمئن نہ تھے؟ کس بات کے لئے اسے مورد الزام ٹھہرا رہے تھے؟ کیوں اس میں ہر وقت عیب نکالا کرتے تھے۔

وہ جانتا تھا یفیم دانیلووچ کیا کہتے:

"اناخان کو دیکھو، بانکے نورمت جیسے جاہل اور مذہبی لوگوں میں اس کے لئے کام کرنا کتنا زیادہ مشکل ہے لیکن وہ ان کو زیادہ سمجھتی ہے، ان سے زیادہ قریب ہے اور ان کے دلوں کی بات جان لیتی ہے۔ اور اسی لئے وہ باا‌ثر ہے۔ ایک بار کسی سے مل لیتی ہے، دل کھول کر بات کر لیتی ہے تو پھر جس شخص میں اسے دلچسپی ہوتی ہے، جس کے لئے وہ جد و جہد کرتی ہے اس کی تقدیر صحیح راستے پر آ جاتی ہے۔ وہ انسانوں کی قسمتیں بدل دیتی ہے۔"

خود ایرگاش بھی اناخان کے لئے بالکل یہی بات کہہ سکتا تھا: وہ ہر ایک کا خیال کرتی تھی، بڑی ہمت‌والی تھی اور اس سے کچھ سیکھنے میں کسی کو شرم نہیں آتی تھی۔ لیکن کیا ایرگاش کمیونسٹ نہ تھا؟ وہ کیا نوکرشاہی ذہنیت کا کوئی افسر تھا؟ کوئی مطلبی تاجر یا بس اپنی ہی ترقی کی فکر

کرنےوالا آدمی تھا؟ بھلا یہ الزامات کوئی اس پر لگائے تو سہی۔

کیا اس نے بھی اپنے جی جان سے دوبروخوتوف کی طرف‌داری نہیں کی تھی؟ کیا اس نے اپنے دشمن کے بیٹے بانکے نصرت‌اللہ کے لئے سب کچھ نہیں کیا تھا؟ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ عوام کی مسرت کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔

ایرگاش نے ایک آہ بھری، بھنویں سکوڑیں اور بستر پر کروٹیں بدلنے لگا۔ وہ نصرت‌اللہ کے پھوٹے مقدر کو بھول نہیں پا رہا تھا۔ بڑی تلخی کے ساتھ سوچنے لگا: "مجھ سے تو جو کچھ ہو سکا اس کے لئے کیا لیکن شاید اتنا کافی نہیں تھا! زیادہ کوشش کی ہوتی تو شاید وہ اسے بچا لیتا۔ کون جانے نصرت‌اللہ اس چائے کے تاجر کا کیا کیا بھانڈا پھوڑتا!" ایرگاش نے اس موقعے کو کھو دیا اور ناحق ایک بےوقوف نوجوان کی جان چلی گئی۔

انجینیر کے ہی معاملے کو لیجئے۔ ایرگاش تسلیم کر سکتا تھا کہ اس کی بےاعتباری، شک و شبہہ اور غیردوستانہ جھڑکیوں کے باوجود دوبروخوتوف نے حیرت‌ناک لیاقت کا ثبوت دیا تھا اور بہترین کام کرکے دکھایا تھا۔ "شاید میں نے کئی معنوں میں اس کے لئے رکاوٹیں پیدا کیں۔ ضرور پیدا کیں۔ مگر کیا ہوا؟ میں نے اس کی طرف‌داری بھی تو کی۔ وہ تو میرا فرض تھا۔ لیکن میں اس انجینیر کا ایک ساتھی، ایک رفیق نہیں بن سکا۔ اناخان مجھ سے زیادہ اس کو عزیز اور اس سے قریب ہے۔"

بخار اتر جانے کے بعد جب ایرگاش کا دماغ ذرا صاف ہوا تو وہ گھنٹوں اپنے اقدامات اور اپنی زندگی کے متعلق بار بار سوچتا رہتا تھا۔ آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ کام کے لئے اس کے دل میں جو جوش تھا وہ اس نے شعوری طور پر اپنے آپ میں پیدا کیا تھا اور اس کی جو یہ بےصبری اور قوت برداشت کی کمی تھی یہ اس میں بچپن سے تھی یعنی اس کی فطرت کا ایک حصہ تھی۔ ان دونوں باتوں

کے دو پہلو تھے: ایک تو ضروری اور مفید تھا کیونکہ وہ کام کو آگے بڑھانے اور لوگوں میں بھی اجتماعی شوق پیدا کرنے میں مدد دیتا تھا۔ اس بات سے انکار کرنا بےایمانی کی بات تھی۔ لیکن وہ دوسرا پہلو بھی تھا جس کی وجہ سے کئی غلطیاں ہوئیں اور کام بھی پچھڑ گیا۔

ایرگاش کے لئے اس کمزوری کو تسلیم کرنا آسان نہ تھا لیکن خود کو دھوکا بھی نہیں دیا جا سکتا تھا اور دوغلاپن تو بزدلی کے برابر ہوتا۔ تلخ بات صرف یہ تھی کہ ایسا نہیں تھا کہ وہ اس امر کو سمجھتا نہیں تھا۔ بلکہ یہ کہ اس نے اور پہلے کیوں نہیں سمجھا۔ اس کے اپنے سمجھنے سے پہلے ہی حاجیہ تک کو احساس ہو گیا تھا کہ اس میں تضاد ہے۔

جب ایرگاش کو یاد آیا کہ اس نے حاجیہ سے کس طرح بحث کی تھی تو اس کا جی چاہا کہ اپنا منھ پیٹ پیٹ کر روئے۔ حاجیہ کی سمجھداری پر وہ خوش تو ہوتا تھا مگر ساتھ ہی اس کو ایک چوٹ سی بھی لگتی تھی۔ پچھلی باتوں کو یاد کرکے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے خوشی کم ہوتی تھی چوٹ زیادہ لگتی تھی۔ اس نے مٹھیاں بھینچ لیں، دانت پیس‌کر اپنے آپ کو کوسا۔ وہ جانتا تھا حاجیہ اس سے محبت کرتی تھی، اس کی بیوی بننےوالی تھی لیکن کیا اب اس کا یہ مطلب ہوا کہ اسے خود اپنی بیوی سے کچھ سیکھنا ہوگا؟..

ابھی کتنے دن کی بات تھی کہ حاجیہ ایک جھینپو اور ان‌پڑھ لڑکی تھی؟ اناخان اس کے خط لکھتی تھی اور وہ تو بس لفافے پر ٹکٹ چپکانا جانتی تھی۔ اگر وہ ایرگاش کو اپنے سے بڑا مان‌کر کچھ عزت کرتی تو کون سی اس کی شان میں کمی آتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ کیسی محبت تھی کہ کوئی بھی بات کرو وہ بحث کی صورت اختیار کر لیتی تھی اور تقریباً ہرملاقات جھگڑے پر ختم ہوتی تھی؟ کیا شادی کے بعد بھی دونوں کا یہی حال رہےگا؟

ایرگاش کو خیال آیا کہ اس معاملے میں بھی غلطی اس کی اپنی ہی تھی اور اس خیال سے اسے اور کوفت اور

فکر ہوئی، سوچنے لگا: "میں واقعی بیمار ہوں، میں بالکل ٹوٹتا جا رہا ہوں، بکھرتا جا رہا ہوں۔"

ایک دن ایرگاش کی ماں اس سے بولی:

"دیکھو بیٹا، میری بات سنو اور یاد رکھو کہ میں تمہاری خیرخواہ ہوں۔ تمہاری اور حاجیہ کی سی محبت دنیا میں کم‌یاب ہے! ایسی محبت صرف افسانوں، داستانوں میں ملتی ہے، اس کی قیمت جانو، اس کی قدر کرو، اس کو مجھ بڑھیا کے تصور سے بھی زیادہ بہتر بناؤ۔ تم مرد ہو اور پھر پارٹی ممبر ہو تم ایسا کر سکتے ہو۔ اور دوسری بات یہ ہے میرے بیٹے کہ تمہارے دل میں جو نیکی ہے، جتنی اچھائیاں ہیں ان کو پوشیدہ نہ رکھو کیونکہ اور کوئی جانے یا نہ جانے، میں تمہاری ماں ہوں یہ یاد رکھو اور میں ضرور جان جاؤں گی۔ مگر حاجیہ بھی جانتی ہے، وہ بہت کچھ سمجھتی ہے۔ یقین مانو بیٹا، اسے تمہارے دل کی سب باتیں معلوم ہیں۔"

اس رات ایرگاش کی پلک سے پلک نہیں لگی۔ وہ بار بار دل میں اپنی ماں کی باتیں دوہراتا رہا جیسے کسی گیت کو زبانی یاد کر رہا ہو۔ صبح اس نے ماں سے کہا کہ حاجیہ کو بلا لائیے۔

"اسے جلدی سے بلا لاؤ ماں" اس نے کہا۔ "مجھے اس سے بات کرنا بہت ضروری ہے، دیکھو نا میں نے کل سے اس سے بات نہیں کی۔۔۔"

"وہ آئے گی" رضوان نے مسکراکے جواب دیا۔ "وہ خود ہی آئے گی بیٹا، تمہیں ساری زندگی ہی اس سے بات کرنا ہے اور پھر بھی تمہارا جی نہیں بھرے گا۔"

اس نے کپڑے بدلے، بستر درست کیا اور دواؤں کی شیشیوں‌والی تپائی کو گھر کے باہر پھینک دیا۔

حاجیہ جلدی جلدی، پھرتیلے قدموں سے چلتی ہوئی آئی۔ ساٹن کا روسی فیشن کا وہ لباس پہنے جو اس نے اپنے لئے ماسکو میں بنایا تھا۔ وہ زندگی کی مسرتوں سے بھرپور آئی اور کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے بڑی ہمت کے ساتھ ایرگاش کی طرف اپنے ہاتھ بڑھا دئے۔

"ایرگاش پیارے، اب بیماری سے بالکل ٹھیک ہو گئے نا؟"
"ہاں حاجیہ، میرا خیال ہے میں اب بالکل اچھا ہو گیا ہوں" اس نے الفاظ کو مختلف معنی دینے والے لہجے میں جواب دیا۔
دونوں ایک دوسرے کے گلے ملے اور یوں کہ جیسے مدتوں کے ہجر کے بعد یہ موقع آیا ہو۔
پھر ایرگاش نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور بظاہر ذرا خفگی کے ساتھ بولا:
"تمہیں کچھ پتہ بھی ہے کہ میں نے تمہیں کیوں بلوایا ہے؟ دیکھو ایسا ہے کہ میں بیماری میں بھی روز جائے تعمیر پر جانا چاہتا، یاد ہے؟ لیکن آج تو مجھے گھر سے نکلتے ڈر لگ رہا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میرے وہاں پہنچنے پر لوگوں کا ردعمل کیا ہوگا۔ ایسا لگے گا جیسے کسی اجنبی مقام پر جا رہا ہوں جہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ چلو... چلوگی نا؟"
حاجیہ اس کی آنکھوں میں کچھ ڈھونڈنے لگی۔
"سچ کہتے ہو؟"
"ارے اور کیا؟ میرا اعتبار نہیں؟"
نہ جانے کس فوری جذبے کے تحت حاجیہ نے اس کے سینے پر سر رکھ دیا مگر اس کا جواب غیرمتوقع تھا:
"اگر ایسا ہے تو پھر میرا خیال ہے کہ میں بھی جو کچھ سوچتی ہوں وہ آپ سے کہہ سکتی ہوں۔ ابھی کہہ دوں؟"
"جیسا تمہارا جی چاہے" ایرگاش نے کان کھڑے کرتے ہوئے کہا۔
"آپ کو پتہ ہے میں کیا پلان بنا رہی ہوں؟ جب ہم لوگ یہ مل بنا چکیں گے تو میں پھر پڑھنے کے لئے ماسکو چلی جاؤں گی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی مجھے بہت کچھ اور سیکھنا اور جاننا چاہئے۔ تو آپ مجھے جانے دیں گے؟"
ایرگاش بالکل ششدر رہ گیا اور چند لمحوں تک خاموش رہا۔
"میں نے تو سوچا تھا" آخر وہ بولا۔ "تم مجھ سے کہوگی

کہ جب ہم لوگ مل بنا چکیں گے تو ہم دونوں کی شادی ہو جائے گی۔"

"بے شک، وہ تو ہوگی لیکن میرا مطلب تھا شادی کے بعد! کیا آپ مجھے جانے دیں گے ایرگاش؟ میں صحیح معنوں میں ایک طالبہ بننا چاھتی ہوں اور کسی طرح آپ سے پیچھے نہیں رھنا چاھتی!"

ایرگاش پھر چپ ہو گیا۔ واہ بھئی کیا خوب مزاج پرسی ہوئی! اچھا ہوا اس کے ساتھ یہی ہونا چاھئے تھا۔ اب وہ کیا جواب دے، وہ چاھتا تو نہیں تھا کہ حاجیہ جائے، ھاں وہ بالکل نہیں چاھتا تھا کیا حاجیہ کو یہ معلوم تھا کہ وہ نہیں چاھتا۔

ایرگاش نے حاجیہ کی ٹھڈی اوپر اٹھائی، حاجیہ کی آنکھوں میں امید اور شبہہ دونوں کی پرچھائیاں تھیں۔

"اور میں؟ کیا مجھے پڑھنے کی ضرورت نہیں ھے؟ تمہیں اس بات کا بھی کبھی خیال آیا؟" اس نے پوچھا۔

"آپ کو ھے ضرورت، ایرگاش پیارے، لیکن مجھے آپ سے زیادہ ضرورت ھے، یاد رکھئے کہ میرے لئے یہ بات کتنی زیادہ اہم ھے اور ایک آپ ھی تو ھیں جو میرے دل کی بات سمجھ سکتے ھیں۔"

"ایک میں ھی ہوں" اس نے ھنستے ہوئے کہا۔ "اور کسی کے لئے تو شاید تم کو سمجھنا آسان ہوگا مگر میرے لئے تو بہت مشکل ھے حاجیہ..."

"تو کیا اس کا مطلب یہ ھے کہ آپ نہیں چاھتے کہ میں جاؤں؟" اس نے خوشامد کے لہجے میں کہا۔

ایرگاش نے نرمی کے ساتھ اس کی آنکھوں پر پیار کیا اور کانپتی آواز میں بولا:

"اچھا، جاؤ میں تمہارا انتظار کروں گا..." پھر اس نے دھمکی کے انداز میں کہا: "اور بعد میں میں پڑھنے جاؤں گا تو تم میرا انتظار کرنا۔ دیکھیں گے تم اس انتظار کو کتنا پسند کرو گی۔"

حاجیه اس سے اتنا کس کے لپٹ گئی کہ اسے درد کے مارے جھرجھری آ گئی۔

"ارے، ارے تم تو میرا دم نکال دوگی" اس نے سرگوشی کی۔ "میں اب بھی بیمار ہوں..."

"آپ بالکل ٹھیک ہیں میری جان" اس نے جواب دیا۔ "اور آپ میرے ہیں، میرے ایرگاش!"

جاڑوں کے موسم نے اپنی حاشیہ بندی شروع کر دی تھی، سرد ہوائیں، برف کی دھول اڑاتی بکھیرتی پھرتی تھیں۔ آسمان پر سے، کھرے سے ڈھکا، سرد سورج جھانک رہا تھا۔ دسمبر کا ایک دن بادل ناخواستہ آھستہ آھستہ نمودار ہو رہا تھا۔

ایرگاش ایک شہتوت کے پیڑ کے پاس کھڑا تھا، اس کے روئی بھرے جیکٹ کے سارے بٹن بند تھے، گلے میں مفلر بندھا تھا اور سمور کی ٹوپی آنکھوں پر جھکی ہوئی تھی۔ اس سب کے باوجود اسے سردی محسوس ہو رہی تھی لیکن اس کے دل میں گرمی تھی۔ پرانے شہتوت کی ننگی شاخوں پر ایک سرخ پرچم ہوا بھرنے میں بادبان کی طرح لہرا رہا تھا اور اس پر بڑے بڑے حروف میں پڑھا جا سکتا تھا:

"یاد رکھئے کہ ۸ مارچ کو ہم نے مل کے افتتاح کا عہد کیا ہے!"

ایرگاش اکیلا ہی جائے تعمیر پر آیا تھا، حاجیہ نے ٹیکنیکل اسکول کے دروازے پر اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ گھر میں اس نے ایرگاش کو کپڑے پہنانے میں آدھا گھنٹہ لگایا تھا اور یوں اڑھا لپٹا دیا تھا گویا وہ کوئی بچہ ہو لیکن یہاں تک آکر وہ یہ بہانہ کرکے چلی گئی کہ اسے بہت کام ہے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ایسا کیوں تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ایک مرد عورت کے سہارے آ رہا ہے، تاکہ ایرگاش کا وقار بنا رہے۔ وہ آفس میں گیا اور اسے یہ بھی خوشی ہوئی کہ راستے میں نہ تو یفیم دانیلووچ سے ملاقات ہوئی اور نہ دوبروخوتوف سے۔ وہ چاھتا تھا پہلے اکیلے ہی گھوم پھر کے دیکھ لے۔

وہ بنیاد کی خندق کی طرف گیا حالانکہ اب وہ بنیاد یا نیو تو تھی نہیں، اس کی جگہ تو مل کی اینٹوں اور کنکریٹ کی عمارت تھی جو تقریباً چھت تک پہنچ چکی تھی۔ مچان پر بےشمار لوگ کام کر رہے تھے اور مل میں ایسی حرکت تھی جیسی چیونٹیوں کے بل کے آس پاس ہوتی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایرگاش نے جائے تعمیر پر اتنے مزدور اور ایسی گرمی دیکھی۔ اس نے سوچا: "ہم لوگ اسی رفتار کی بات کرتے تھے! یہی خواب دیکھتے تھے اور سردی سے بھی کوئی اڑچن نہیں ہوئی۔" اور وہ برابر کثیر آوازوں کی بھنبھناہٹ سنتا رہا جو جلدی میں تھیں اور یہ بھی محسوس کراتی تھیں کہ لوگ خوشی خوشی کام کر رہے ہیں۔

ایرگاش کو ہر جگہ بدلی ہوئی نظر آئی۔ تعمیر کے آس پاس کہیں کوڑا کرکٹ، روڑے، پتھر کچھ نہیں، سڑکوں میں کوئی گڈھے نہیں۔ کیا سردی کے موسم نے ان کو ہموار کر دیا تھا؟ نہیں، یہ سب مزدوروں کا کیا ہوا اور اچھے انتظام کا نتیجہ تھا۔ سڑکوں پر ایرگاش نے ٹرک کے پہیوں کے نشانات دیکھے، لکڑی کے پہیوں کے نشان تھے تو سہی مگر بہت گہرے نہیں تھے جس کے معنی یہ تھے کہ اب گاڑیاں کم استعمال ہوتی تھیں اور پروجیکٹ کو کافی مشینیں مہیا کر دی گئی تھیں۔ ایرگاش کو یاد آیا کہ خزاں کے موسم میں اس کے پاس جو واحد فورڈسن ٹریکٹر تھا اس میں خرابی پیدا ہو جانے سے کیسی گڑبڑ ہوئی تھی۔ اب تو ایک کیٹرپلر ٹریکٹر تھا اور اس کو چلانے کے لئے ایک سمجھدار آدمی بھی مل گیا تھا۔ یہ تھی اصلی طاقت۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا اور اب وہ طاقت پوری طرح استعمال ہو رہی تھی! بہت خوب ہوا تھا یہ تو! اتنے میں ایک بڑی سی ٹرک آئی جس کے پیچھے بھی ٹھیلہ جڑا تھا، وہ عمارتی لکڑی کے تختوں سے لدی تھی، اجنبی سا ایک نوجوان ڈرائیور جس کی ٹوپی کے نیچے سے سنہری بالوں کی ایک لٹ ماتھے پر نکل آئی تھی کیبن میں سے کودا اور پکارا:

"اے بھائی دیہاتی! سگریٹ پلاؤگے؟"

"صرف دیسی تمباکو ہے، گھریلو قسم کا" ایرگاش نے ٹرک کے پاس جاکے کہا اور تمباکو کا بٹوہ نکالا۔

"وہ تو دنیا کا بہترین تمباکو ہوتا ہے" اس ڈرائیور نے بٹوہ لیتے ہوئے کہا۔ "کیوں، سردی لگ رہی ہے، کیا؟"

"ہاں، خود ہی دیکھ لو۔"

"تو پھر یہاں مٹر گشتی کیوں کرتے پھر رہے ہو؟ کام کرو تو دیکھنا کتنی جلد جسم میں گرمی آ جاتی ہے، یہاں ہمارے پاس بہت کام ہے، اتنا کہ تمہارے لئے بھی نکل سکتا ہے۔"

ایرگاش نے ذرا فکرمندی کے ساتھ اس کے ٹرک کی طرف سر سے اشارہ کیا۔

"تمہیں یقین ہے کہ اس سردی میں تمہارا ٹرک جمے گا نہیں؟ انجن تم نے بند کر دیا ہے۔"

"میری موٹر؟ اور جم جائے؟" اس نے ہاتھ سے بنائے سگریٹ کا سرا دانتوں سے کتر کے تھوکا۔ "ارے میں تو جب چاہوں تب اسے بلی کی طرح غرغروا دوں۔ اور اس پالے کو تم پالا کہتے ہو، یہ کیا حقیقت رکھتا ہے ایسے پالے میں تو انسان جمی برف کے نیچے گڈھے میں نہا سکتا ہے!"

دونوں نے ایک ہی دیاسلائی سے سگریٹ جلائے۔

"مگر تمہیں کس چیز نے روک رکھا ہے" ایرگاش نے ڈرائیور کے مضبوط جسم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ بڑاوالا نالا تو ابھی جما بھی نہیں، بہاؤ تیز ہے اور برف میں چھید کرنے، گڑھا بنانے کی بھی ضرورت نہیں، میں تمہاری جگہ ہوتا تو ضرور کود پڑتا۔"

"یہاں کوئی باتھ ہاؤس نہیں ہے" ڈرائیور ذرا افسوس کے ساتھ بولا۔ "اس نالے کے کنارے ایک حمام ہونا چاہئے تھا جہاں واقعی بھاپ نصیب ہو سکتی، اگر یہاں آس پاس کہیں حمام ہوتا تو میں تو وہ پہلا آدمی ہوتا جو اس میں غوطہ مارتا۔"

ڈرائیور نے ایک چٹخارہ بھرا پھر ایکدم سے آواز میں ہنسی کا رنگ پیدا کرکے بولا:

"ویسے یہاں ایک آدمی ایسا ہے جسے تمہارے اس نالے میں ایک غوطہ دینا چاہئے تو وہ کوئی بات ہوگی!"

"کون آدمی؟" ایرگاش نے حیران ہوکر پوچھا۔

"ارے مقامی چیف!" ڈرائیور نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "اس کا نام ایسا ہے کہ مجھے کبھی یاد ہی نہیں رہتا - ریگاش یا کچھ ایسا ہی ہے۔"

ایرگاش ہنسا مگر مری ہوئی آواز میں پوچھا:

"لیکن اس نے کیا کیا ہے جو اسے غوطے کی سزا ملنی چاہئے۔"

"وہ بڑا سرپھرا، بڑا گرم‌مزاج ہے! سنا ہے نہ اپنے کو بخشتا تھا نہ کسی اور کو، کسی مقصد کے حصول کے لئے اس کی طرف سلیقے سے چلنے کے بجائے سر کے بل غوطہ لگا دیتا تھا، ایسا گھومتا تھا جیسے آگ لگا مکان! تم تو جانتے ہو، لوگوں کو ایسی باتیں پسند نہیں آتیں۔ آخر ایک محنت‌کش کیا چاہتا ہے؟ یہی نا کہ لوگ اس کے کام کا احترام کریں اور اگر آپ اس کا احترام کریں گے تو وہ بھی آپ کی عزت کرے گا۔ یقین مانئے اس معاملے میں وہ بالکل ادھار نہیں رکھے گا، شرطیہ کہتا ہوں! لیکن اس چیف نے تو وہ دھائیں دھائیں مچائی کہ خود ہی بیمار ہو گیا اور اب بستر سے نہیں اٹھ پاتا۔ یہاں اس نے ایسی گڑبڑ کر دی تھی کہ..."

"کیسی گڑبڑ؟"

"اب میں تو یہاں نہیں تھا جو دیکھتا اس لئے میں تم کو ٹھیک سے نہیں بتا سکتا لیکن مزدور لوگ مجھے بتاتے ہیں کہ ایک بار وہ لوگ چھ ہفتے کام کرتے رہے اور وہ سارا کام اکارت گیا کیونکہ وہ لوگ ریت پر دیوار کھڑی کرتے رہے تھے!" ڈرائیور نے ٹوپی پیچھے کو کھسکائی۔ "لیکن مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ چیف نوجوان اور ذہین ہے اور ہے بڑا ہردلعزیز جس سے بات کرو وہ اس کی بیماری کی وجہ سے غمگین ہے... تو بھائی، یہ ہیں ہمارے حالات۔"

ایرگاش نے سر جھکا لیا، اس کا دل بھر آیا تھا۔

صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ یہ ڈرائیور لینن‌گراد سے آیا

تھا، اس کا ٹرک خالتورین کارخانے کا بنا ہوا تھا۔ بہت اچھی مشین، ایسے تحفوں کا کیا کہنا۔ لیکن مشین کے ساتھ یہ ڈرائیور بھی خوب تھا بلکہ کچھ خوب‌تر ہی تھا۔ اندازگفتگو سے وہ سائیبریا کا رہنےوالا لگتا تھا مگر بہرحال وہ کوئی سچا محنت‌کش تھا، پیتروگراد کا کوئی مزدور!

"اچھا خیر، ہم اپنی غلطیوں ہی سے سیکھتے ہیں" ایرگاش نے کہا۔ "تم نے خود ہی ابھی کہا کہ وہ چیف نوجوان ہے۔"

"سیکھتے ہیں! ہم تو اسے سکھاکے ہی رہیں گے" ڈرائیور نے بڑے مزے میں کہا۔ "اسے تو بس اتنا ہی کرنا ہے کہ وہ سیکھنے پر آمادہ ہو جائے، سیکھنا چاہے اور دل سے چاہے..." پھر یکایک اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آگئی: "کہو دوست، تم ہی تو وہ نوجوان نہیں ہو جس کی باتیں ہو رہی ہیں۔"

"ہاں۔"

ڈرائیور نے ایرگاش کی پیٹھ پر ایک دھپ دیا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو!"

"نہیں، جھوٹ کیوں بولوں گا، میں ہی ایرگاش سلطانوف ہوں۔"

ڈرائیور نے سگریٹ کا ٹرا تھوکا۔

"ارے یہ تو کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا! چلو اچھا ہوا ہماری تمہاری ملاقات ہو گئی۔ تو تم نے برا مانا، چیف؟ اچھا میں نے جو کچھ کہا وہ ٹھیک نہیں ہے کیا؟ بتاؤ، کیا میری باتیں بکواس تھیں؟"

"نہیں۔ جو کچھ تم نے کہا وہ سب سچ ہے۔ کسی ایک آدمی سے غلطی ہو سکتی ہے مگر عوام غلطی نہیں کر سکتے۔ میں تو تمہارا بہت مشکور ہوں کہ تم نے مجھ سے صاف صاف بات کہہ دی۔"

"اب باتیں نہ بناؤ! کسی کو اچھا نہیں لگتا کہ اس پر نکتہ‌چینی کی جائے" ڈرائیور نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"بس یہی ایک کام تو ہے جو مجھے خوبی کے ساتھ کرنا

نہیں آتا" ایرگاش نے جواب دیا۔ "لیکن میں خود لوگوں کی غلطیوں پر نکتہ‌چینی کرنا جانتا ہوں۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو الگ الگ نظروں سے دیکھا اور زور سے ہاتھ ملاتے ہوئے دونوں قہقہہ مار کے ہنسنے لگے۔

اتنے میں مزدوروں کی ایک ٹولی ٹرک کے پاس آئی اور وہ لوگ بغیر کسی گڑبڑ یا شور پکار کے تختے اتارنے لگے۔ ایرگاش نے دیکھا کہ سب مزدوروں کے ہاتھوں پر دستانے تھے اور وہ روئی پڑے نئے جیکٹ پہنے تھے۔

ان کو ایک کے بعد ایک تختے اتارتے اور ایک طرف جماتے دیکھکر ایرگاش سے نہیں رہا گیا، اس نے ایک بار غرا کے اپنے سرد ہاتھوں کو زور زور سے ملا پھر ان پر تھوکا اور ٹرک کی طرف دوڑکر اس نے ایک تختے کا سرا پکڑا۔

"ذرا ہاتھ لگانا، تو پھر ہم دونوں ہی میں گرمی آ جائے گی" اس نے ڈرائیور کو زور سے آواز دی۔

"کھینچو! ایک، دو...." ڈرائیور نے بڑے مزے میں کہا اور تختے کا دوسرا سرا پکڑ لیا۔

دونوں نے ایک لمبا اور بھاری تختہ کھینچا اور مل‌کر جھکے ہوئے اسے تختوں کے اس انبار کے پاس لے گئے جو ٹرک سے کوئی دس قدم پر تھا۔

لیکن جب ایرگاش سیدھا کھڑا ہوا اور اس نے پھر ٹرک کی طرف دوڑکر جانے کا ارادہ کیا تو ایک آدمی نے اس کی راہ روک لی۔ اس آدمی کے چہرے پر فکرمندی اور ناراضگی کے آثار تھے۔ ایرگاش کو بانکے نورمت کو پہچاننے میں بس ذرا ہی دیر لگی۔

"رک کے چیف، ذرا رک کے" نورمت نے کچھ ایسے سخت لہجے میں کہا جیسے ایرگاش کی حرکت اسے بہت ہی بری لگی ہو۔ "یہ آپ کا کام نہیں ہے!"

ایرگاش نے بڑے مزے میں آکر نورمت کے سینے پر ایک ٹھوکا دیا۔

"تم کہاں سے آ گئے؟ اور مجھے یہ احکام کیوں دے رہے ہو؟"

"میں یہاں کا انچارج ہوں! یہ تو سب میری مصیبت ہے، آپ کی اپنی مصیبت تو خود ہی بہت کافی ہے، میں تو آپ کے کام میں دخل نہیں دیتا..."

"یہ ٹھیک کہتے ہیں، چیف" ڈرائیور بولا۔ "تم اپنے کام کی سوچو، اپنی گاڑی سے سامان اتارو۔"

ایرگاش بڑی بےبسی مگر دلچسپی کے ساتھ نورمت کو دیکھنے لگا۔

"بھائی نورمت، اب تم نے بتایا کہ انچارج ہو تو مجھے معلوم ہوا۔ معاف کرنا مجھے تو خبر ہی نہیں تھی۔ بڑی خوشی ہوئی سن کر۔ کرتے رہو کام تم اچھے چیف ہو! مجھے تو شبہہ ہے کہ میں بھلا اس سے کیا بہتر ثابت ہو سکتا..."

"آپ تو میرا مذاق اڑا رہے ہیں بھائی ایرگاش۔"

"نہیں، واہ، مجھے تو تمہاری وجہ سے خوشی ہے بھائی نورمت!" ایرگاش نے احتجاج کیا۔ "اور بہن نزاکت کیسی ہیں؟ اچھی تو ہیں نا؟"

"خود ہی آکر دیکھو نا" نورمت نے چیلنج کے انداز میں کہا۔

"میں ضرور آؤں گا، بلکہ آج ہی آؤں گا۔"

"بڑی خوشی سے ہم لوگ تمہارا خیرمقدم کریں گے" نورمت نے جھک کے کہا۔

مزدوروں نے ایرگاش کو گھیر لیا اور سب ایک ساتھ بولنے لگے، ایرگاش کی اور اس کی ماں کی خیریت پوچھنے لگے۔

پھر کنکریٹ مکسر کے پاس موٹی موٹی کیلیں جڑے بھاری بوٹوں کی بھدا بھد برف جمی زمین پر سنائی دی اور ماماجان دوڑتا ہوا، پکارتا ہوا آ پہنچا:

"بیٹا، بیٹا!"

ماماجان کے پیچھے پیچھے دوبروخوتوف اور یفیم دانیلووچ تیزی سے وہاں پہنچے۔

"سنا، ماماجان نے کیا کہا؟ بیٹا" یفیم دانیلووچ انجینیر سے بولا۔ "یہ بڑے میاں ٹھیک ہی تو کہتے ہیں، ایرگاش نعمانچہ کا بیٹا ہی تو ہے۔ ایک پیارا، چھیتا بیٹا!"

تتمہ

موسم بہار میں نعمانچہ کی گلیاں کیچڑ سے اس قدر بھر جاتی تھیں کہ گزرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ لوگ ربڑ کے جوتے پہن کر باہر نہیں نکلتے تھے کیونکہ ایک کچی دیوار سے دوسری تک کیچڑ ہی کیچڑ ہوتی تھی اور وہ بھی اتنی گہری کہ لانگ بوٹوں سے ہاتھ دھو بیٹھنا بھی کوئی خاص بات نہ تھی۔ گاڑیوں کے پہئے اس گہری کیچڑ اور پانی کے گڈھوں میں پھنس جاتے اور صبح سے رات گئے تک گاڑی‌بانوں کی چیخ پکار اور گالیوں کوسنوں کا شور مچتا رہتا۔ بہار کے برف پگھلنے کے موسم میں عام طور پر گاڑی‌بان اور پیدل چلتے لوگ سبھی نعمانچہ کا کاوا کاٹ کے نکل جانے کی کوشش کرتے تھے۔

لیکن اس سال بنکروں کے اس قدیم قصبے میں پہلی بار پکی سڑک پر پہئے دوڑ رہے تھے، گلیوں میں سے ایک کنکر پڑی ہوئی سڑک تھی۔ ویسے وہ پتلی تھی یعنی ایک اونچے قد کا آدمی آسانی سے پھاندکر اسے پار کر سکتا تھا۔ مگر وہ صاف ستھری اور پختہ تھی اور بارش کے بعد چمکنے لگتی تھی۔ یہ سڑک قبرستان کو جاتی تھی، اس جگہ سے گزرتی ہوئی جس کا نام کسی زمانے میں نئی اقتصادی پالیسی‌والے قدرت‌اللہ کے کارخانے کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہ بھی کل کی بات لگتی تھی کہ اس علاقے پر بائے کی حکومت تھی لیکن اب تو لوگ اس کو تقریباً بالکل بھول چکے تھے۔ پچھلے جاڑوں میں

گویا عام رضامندی سے لوگوں نے اس سڑک کو "مل والی سڑک" کہنا شروع کر دیا۔ یہ نام نعمانچہ کے لئے نہایت غیرمعمولی تھا۔

بہار جلد ہی آ گئی اور موسم بہت اچھا تھا لیکن ۸ مارچ بہت ہی سرد دن ثابت ہوا جیسا کہ بعض اوقات بہار میں بھی ہو جاتا ہے۔ صبح سے دیواروں کی چوٹیوں، چھتوں اور پیڑوں کی ڈالیوں پر ہلکی برف کے سفید گالے نظر آنے لگے سرمئی رنگ کی پھوار مسلسل پڑے جا رہی تھی۔ نالوں جوھڑوں پر سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی لیکن اس سب کے باوجود لوگوں کی امنگیں جوان تھیں اور ان پر اوس نہیں پڑ سکتی تھی۔ دوپہر کو شہر کے تمام حصوں سے، لوگوں کے دل کے دل مل اسٹریٹ یا "مل والی سڑک" پر اکٹھا ہو گئے۔ سب ہی نے اپنے اچھے اچھے رکھاؤں کپڑے پہنے اور عباؤں اور لباسوں پر لال فیتے باندھے تھے۔ لڑکیوں کے بالوں میں تازے پھول تھے۔ لوگ جلوس بنا بناکر نکلتے ہوئے پرانے اور نئے گیت گاتے جاتے تھے۔ آپس میں ہنسی مذاق چھلیں۔ اور سب ہی اس رائے کا اظہار کر رہے تھے کہ بھئی نعمانچہ کی سب ہی گلیاں اسی طرح پتھر کنکر ڈال کر پکی کر دی جائیں تو کتنا اچھا ہو۔

یہ ساری بھیڑ مل کی پکی، اونچی عمارت کے سامنے جمع ہو گئی، تازی اینٹوں سے بنی ہوئی دیواریں بارش میں پکے اناروں کی طرح سرخ دکھائی دے رہی تھیں۔ صرف چوڑے وسیع پھاٹک کے اوپروالی دیوار پر پلستر کرکے سفیدی کی گئی تھی۔ ایسی سفیدی جس میں نیلاھٹ جھلکتی تھی جیسے صاف دھلا نیل دیا ہوا، سفید سوتی کپڑا - یہ رنگ بنکر عورتوں نے خاص طور پر پسند کیا تھا - دونوں پھاٹکوں کے بیچ ایک سرخ ربن بندھا تھا۔

تاشقند سے بھی کچھ مہمان آئے تھے۔ تقریریں ہوئیں۔ نعمانچہ کے لوگوں کو مبارک باد دی گئی۔ پھر اناخان خاموشی کے ساتھ آھستہ آھستہ چلتی ہوئی گیٹ تک آئی۔ ایرگاش ذرا بھنویں چڑھاکر اور ذرا مسکراکر اس کے سامنے ایک بڑی

سی دفتری قینچی پیش کی۔ اناخان نے سب سے پہلے مل کے سامنے سر جھکایا پھر ان لوگوں کے سامنے جنھوں نے اس کو تعمیر کیا تھا، اور سرخ ربن کو بیچ سے کاٹ دیا۔ یفیم اور دوبروخوتوف نے لوہے کی لنڈی کھسکائی اور بھاری پھاٹکوں کو ڈھکیل کر کھول دیا اور پھر ہر شخص نے دیکھا کہ اندر بڑی سی روشن عمارت میں دھات کے بڑے بڑے کرگھے جگمگا رہے تھے۔ یہ کرگھے جو ریلوے ورکشاپ کے انجنوں کی طرح مضبوط اور بھاری بھرکم تھے، قطاروں میں لگے ہوئے تھے۔

اور عین جس وقت اناخان لال ربن کو کاٹ رہی تھی لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ کہرے اور بارش سے جدوجہد کرتا ہوا سورج یکایک دھند کو چیر کر باہر نکل آیا، مل کی نیلی مائل سفید دیوار یکایک یوں چمکنے لگی جیسے وہ ریشم کی بنی ہو، آسمان پر قوس قزح نکل آئی۔ ہوا چلنے لگی، آسمان صاف ہو گیا اور جیسے اور اوپر چلا گیا۔ فضا میں لطیف گرمی پیدا ہو گئی۔

مل کے ٹھیک سامنے واقع چوک میں ایک چھوٹا سا مستطیل چبوترہ بنا ہے جو دوب سے ڈھکا رہتا ہے۔ اس کے چاروں طرف لوہے کا ایک جنگلا لگا ہے جو گھٹنوں گھٹنوں اونچا ہے۔

اس چبوترے پر سیاہ سنگ مرمر کی ایک تختی لگی ہے اور اس پر صرف ایک نام لکھا ہوا ہے: "جوراخان"... نہ پیدائش کی تاریخ نہ موت کی۔

لیکن آج کوئی تیس سال سے، شروع بہار سے لے کر آخر خزاں تک لوگ اس تنہا قبر پر پھول لے کر آتے رہے ہیں۔

یہ پھول تقریباً ہر روز لائے جاتے ہیں۔

اور یہ، سیاہ تختی پر کبھی بھی نہیں مرجھاتے۔

پڑھنے والوں سے

دارالاشاعت ترقی اس کتاب، اس کے ترجمے، ڈیزائن اور طباعت کے متعلق آپ کی قیمتی رائے اور آئندہ مطبوعات کی تجاویز اور مشوروں کا بصد شکریہ خیرمقدم کرے گا۔
براہ کرم اپنے تبصرے اور مشورے مندرجہ ذیل پتے پر بھیجئے:

دارالاشاعت ترقی کی شاخ
۳۰۔ نوائی اسٹریٹ
تاشقند۔ سوویت یونین

Progress Publishers Branch
30, Navoi Street.
Tashkent, U.S.S.R.

اسقد مختار (سن پیدائش ۱۹۲۰ء) - نامور ازبیک شاعر اور ادیب ھیں۔ وہ عہد حاضر کو اپنی تخلیقات کا موضوع بناتے ھیں۔ اسقد مختار کی مختصر اور طویل نظموں، ناولوں اور ناولٹوں میں سوویت ازبیکستان اور ازبیک عوام کی زندگی کی عکاسی کی گئی ھے جو اس سرزمین کا زانا روپ بدلتے ھوئے حیات نو کی تعمیر میں مصروف ھیں۔
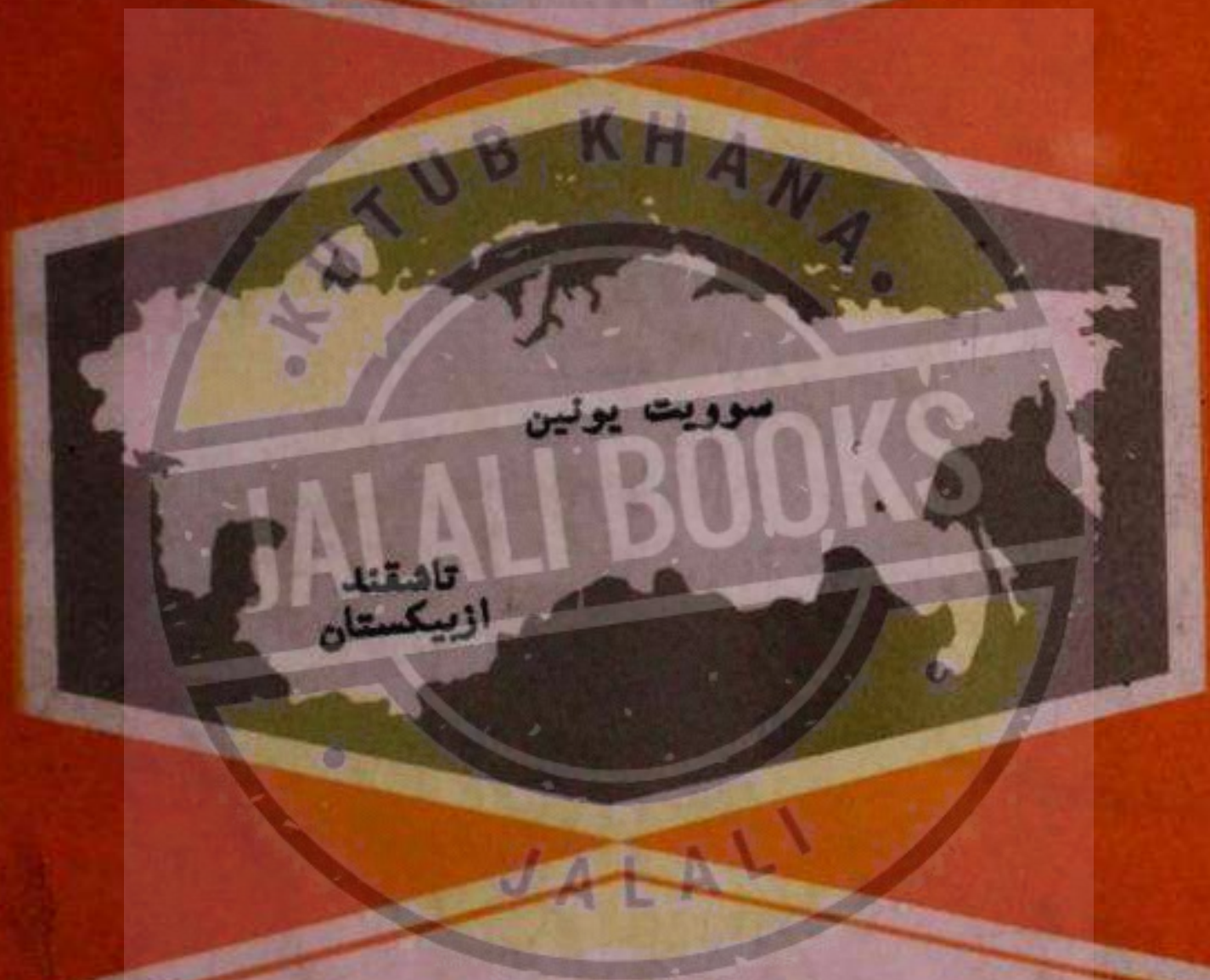
اسقد مختار نے اپنے ناول "بہنیں" میں دکھایا ھے کہ ازبیک عوام نے شدید جدوجہد کے حالات میں کس طرح نئی سوشلسٹ زندگی تعمیر کی ھے، کس طرح انھوں نے اس زندگی کے کٹر دشمنوں پر غلبہ حاصل کیا، کس طرح صدیوں پرانے مضر عقائد اور تعصبات کا خاتمہ کر دیا گیا اور کس طرح ستم‌زدہ ازبیک خواتین اپنے مقدر کی حقیقی مالک بن گئیں۔